انجمن ترقی اردو پاکستان کا ماہوار ترجمان

قومی زبان

جلد ۲۸ شمارہ ۱

جنوری سنہ ۱۹۶۶ء

سالانہ قیمت
دس روپے

فی پرچہ
ایک روپیہ

انجمن ترقی اردو پاکستان

بابائے اردو روڈ

فہرست

ریڈیو کی نئی نشری پالیسی

اس وقت ہمارا ملک جن حالات سے دوچار ہے۔ ان کا اوّلین تقاضہ ہے کہ جدید سائنسی علوم سے ملک کی نئی نسلوں کو روشناس کرایا جائے۔ کوئی بھی ترقی پزیر ملک اس وقت تک ترقی یافتہ ممالک کی صف میں شامل نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ سائنس کی تعلیم سے بہرہ ور نہ ہو۔ مگر جب تک یہ ضرورت کسی غیر ملکی زبان سے پوری کی جاتی رہے گی اس میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہو سکتی۔ غیر ملکی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے میں ایک بڑی دشواری یہ ہوتی ہے کہ طلبہ برسوں تک اس زبان کو سیکھنے اور اس کے اصولوں سے مانوس ہونے میں معروف رہتے ہیں اور اس کے باوجود انہیں اپنے اس مقصد میں ناکامی ہوتی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ڈیڑھ سو سال کی طویل مدت میں برصغیر پاک و ہند میں ایسے بہت کم افراد پیدا ہوئے جنکی انگریزی زبان سے واقفیت کو درجۂ استناد حاصل ہوا ہو۔ اسی طرح بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے کے باوجود ایک بھی شخص ایسا پیدا نہیں ہوا جسے سرسید، شبلی، حالی اور آزاد کے برابر رکھا جا سکے۔ اس صورت حال کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے نوجوان اپنی عمر کا بیشتر حصہ جس میں تخلیقی قوتیں نشوونما پاتی ہیں اور صلاحیتیں اجاگر ہوتی ہیں احساس کمتری کے ساتھ انگریزی زبان سیکھنے میں صرف کر دیتے ہیں اور ان کی شخصیت اور صلاحیت ابھر نہیں پاتی۔

پاکستان بننے کے بعد بھی جب ہم ایک آزاد اور خود مختار قوم کی حیثیت میں تاریخ کے صفحے پر ابھرے تو بجائے اس کے کہ اس قومی نقصان کی تلافی فوری طور پر کی جاتی ہمارے حکام نے صورت حال کو جوں کا توں رہنے دیا۔ اس قوم نے جس کا نعرہ یہ تھا کہ ہم محض اپنی تہذیب و تمدن اپنی تاریخ و روایات اور اپنی زبان و ادب کے لئے ایک جداگانہ ملک چاہتے ہیں۔ انگریزی کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ اور اس اٹھارہ سال میں انگریزی نے آزادی سے قبل کے مقابلے پر اور زیادہ مضبوطی سے قدم جما لئے۔ خدا جانے یہ راستہ ہمیں کس عہد تاریک کی

طرف لے جاتا کہ دشمن کی ایک للکار نے قوم کو ایک بار پھر اپنی روشن منزل یاد دلادی ۔ اور ملک کا ہر فرد ۔ ملک کے سربراہ سے لیکر ایک مزدور اور کسان تک پھر اسی نشے میں سرشار ہوگیا ۔ اور اس مبارک موقع پر بھٹکے ہوئے راہی کو اپنی کھوئی ہوئی منزل بھی یاد آگئی ۔ جس پر اردو کا پرچم اور قومی حمیت کا نشان لہرا رہا تھا ۔ اس نازک گھڑی میں ریڈیو پاکستان نے ملک و ملت کے دل کی دھڑکنوں کو ایک آہنگ اور ایک لے بخشی تھی جس کا اظہار وزیر اطلاعات و نشریات خواجہ شہاب الدین کے اس انقلاب انگیز اعلان سے ہوا جو انہوں نے نشریاتی پالیسی کے سلسلے میں کیا ہے ۔ خواجہ شہاب الدین نے ۱۴ر نومبر ۱۹۶۵ء کو یہ فرمایا کہ ریڈیو پاکستان سے معلومات و اطلاعات ایسی زبان یا زبانوں میں نشر کی جائیں گی جو زیادہ سے زیادہ لوگ آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ انگریزی نشریات کا بوجھ کم سے کم ہونا چاہیے ۔ ان کی جگہ قومی اور علاقائی زبانوں کے پروگراموں میں اضافہ ہونا چاہیے ۔ آپ نے وضاحت کی کہ انگریزی میں مقامی خبریں غیر ضروری ہیں ۔ اسی طرح نیوزریل پروگرام ، موضوعاتی مذاکرے اور مباحثے قومی و علاقائی زبانوں میں ہونے چاہئیں نہ کہ انگریزی زبان میں انگریزی موسیقی کی جگہ عالمی اور مسلم ممالک کی موسیقی کو خصوصی طور پر نشر ہونا چاہیے ۔

خواجہ شہاب الدین کا یہ برمحل اور انقلاب انگیز اقدام پشاور سے چٹاگانگ تک سراہا گیا ۔ اخبارات نے اداریئے لکھے ۔ سرکاری اور نیم سرکاری اداروں نے دلی خیر مقدم کیا ۔ مزدوروں ۔ طالب علموں اور پڑھے لکھے طبقوں کی جانب سے خوشی کا اظہار کیا گیا ۔ اور حکومت کے اس اقدام کو قابلِ مبارکباد قرار دیا گیا ۔ حضرت جوش ملیح آبادی نے کہا " ہماری غلامی کی روح فنا ہوگئی " جناب فیض احمد فیض نے کہا " یہ بہت اچھی بات ہے کہ یہ احساس پیدا ہوا اور اب ہماری نشریات صرف ایک طبقے تک محدود نہیں ہوں گی " کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے فرمایا " حکومت کا یہ اقدام قابلِ تعریف ہے لیکن اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک کی انتظامیہ میں اور دوسرے شعبوں میں بھی انگریزی ختم کردی جائے " میجر آفتاب حسن نے کہا " حکومت کا یہ فیصلہ ذہنی آزادی کی طرف ایک اہم قدم ہے ۔ زیڈ ۔ اے بخاری نے اس مبارک اقدام کو سراہا ۔ ثانوی تعلیمی بورڈ کے چیرمین جناب قیصر حسین بختیاری نے کہا " نئی پالیسی حقیقتاً ذہنی اور فکری انقلاب کا باعث ہوگی اور عظیم تر پاکستان کی حامل "

تمام علمی اداروں نے حکومت کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ حکومت نے قومی زبان کی ترقی و ترویج کی طرف نہایت مستحسن قدم اٹھایا ہے ۔ صدر ایوب نے سچ کہا تھا ۔ کہ " قوم نے اپنے آپ کو پالیا "

اسِ انجمنِ گل میں

انجمن ترقی اُردو کے نئے اراکین

انجمن کی تنظیم نو کے بعد اُردو کے بہی خواہوں نے انجمن کے معاملات سے دلچسپی لینی شروع کر دی ہے ۔ گزشتہ دنوں میں جن اردو دوستوں نے انجمن کے قواعد و ضوابط کے تحت رکنیت حاصل کی ہے ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں ۔

۱۔ جناب خان بہادر غلام محمد دستان صاحب ۔ رکن قومی اسمبلی (رکن دوامی)
۲۔ جناب عبدالمجید خاں صاحب ۔ کراچی (رکن)
۳۔ محترمہ رضیہ غلام علی صاحبہ (رکن)

رسالہ "اردو" کا اجرا

انجمن کے سہ ماہی جریدے "اردو" کو از سر نو شائع کرنے کے انتظامات مکمل کئے جا چکے ہیں ۔ نئے دور کا پہلا شمارہ جنوری ۱۹۶۶ء میں شائع ہوگا ۔ واضح رہے کہ بابائے اردو کی وفات کے بعد "اردو" کا صرف ایک شمارہ ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا تھا جو "بابائے اردو نمبر" تھا ۔

محمد حسین آزاد (جلد دوم) کی اشاعت

ڈاکٹر اسلم فرخی کے تحقیقی مقالے "محمد حسین آزاد" کی دوسری جلد شائع ہو گئی ہے ۔ یہ جلد ۲۹۲ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں آزاد کے ادبی کارناموں پر تفصیلی بحث کی گئی ہے ۔

انجمن ترقی اردو کے لئے ایک لاکھ روپیہ

انجمن ترقی اردو کو بلدیہ کراچی کی جانب سے ایک لاکھ روپے کی گراں قدر امداد دی گئی ہے ۔ جو اردو کالج کی زیر تعمیر عمارت کے لئے خصوصی طور پر منظور کی گئی ہے ۔ اس امداد کی قرارداد کی توثیق بلدیہ کے آئندہ اجلاس میں ہو گی ۔ جس کے بعد یہ رقم انجمن کے حوالے کر دی جائے گی ۔ اس قرارداد میں یہ کہا گیا ہے کہ بابائے اردو نے زبان و ادب کی جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں ان کے اعتراف کے طور پر یہ رقم انجمن ترقی اردو کو دی جا رہی ہے ۔

صدر انجمن ثانوی تعلیمی بورڈ میں

انجمن ترقی اردو کے صدر جناب اختر حسین نے ۵ ار نومبر کو ناظم آباد میں ثانوی تعلیمی بورڈ کے نئے دفاتر کا معائنہ کیا۔ آپ نے اس موقع پر فرمایا "اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے سلسلے میں ثانوی و اعلیٰ ثانوی تعلیمی بورڈ کراچی کی مساعی قابل تحسین ہے" آپ بورڈ کے چیرمین جناب قیصر حسین بختیاری اور دوسرے اعلیٰ افسران سے گفتگو فرما رہے تھے۔ آپ نے کہا "ایک طالب علم کسی علم کو اپنی قومی زبان کے ذریعے جس آسانی سے سیکھ سکتا ہے۔ وہ کسی بھی غیر ملکی زبان کے ذریعے ممکن نہیں۔ اس کے علاوہ قومی زبان کے ذریعۂ تعلیم ہو جانے کے سبب سے طالب علم کو اپنی تہذیب اور تمدن کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے" جناب اختر حسین نے قیصر حسین بختیاری صاحب کی نگرانی میں بورڈ کی تعلیمی خدمات پر اظہار مسرت کیا۔

انجمن ترقی اردو لاڑکانہ

انجمن ترقی اردو لاڑکانہ ایک فعال تحریک کی حیثیت میں اس علاقے کا ایک اہم تہذیبی مرکز بن گئی ہے انجمن میں اس علاقے کی تمام قابلِ ذکر شخصیتیں دلچسپی کا اظہار کرتی ہیں اور اس طرح اردو کی ترویج کا کام نہایت خوبی سے ہو رہا ہے انجمن کی طرف سے اب تک بیس سے زیادہ اہم ادبی اجتماعات منعقد ہو چکے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ اردو کی تحریک سابق سندھ کے تمام علاقوں میں روز بروز پھیل رہی ہے اور عوام اس میں دلچسپی لے رہے ہیں۔

اردو کے لئے تجاویز

صدر انجمن ترقی اردو شاخ کیماڑی جناب محمد رفیق نے اردو کی ترقی کے لئے مندرجہ ذیل تجاویز پیش کی ہیں۔ اردو مدرسے کھولے جائیں۔ اردو شبینہ مدرسے ناخواندہ افراد کے لئے جاری کئے جائیں اور ہر شخص اردو میں خط و کتابت کرے۔ عدالتوں میں جج صاحبان اپنے فیصلے اردو میں دیں۔ وکلا جرح اور بحث اردو میں کریں۔ عرائض نویس اردو میں درخواستیں لکھیں۔ پولیس تھانوں میں صرف اردو میں روزنامچے لکھے جائیں۔ شادی بیاہ کے دعوت نامے اور سپاسنامے اردو میں چھپوائیں جائیں اور رہنما جلسوں سے صرف اردو میں خطاب کریں۔ جناب محمد رفیق صاحب نے توقع ظاہر کی ہے کہ اگر حامیان اردو، علما، اساتذہ اور طلبہ اپنا یہ اصول بنالیں تو پھر اردو کے رائج ہونے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہے گی۔

جناب ملک خدا بخش بچا
وزیر تعلیم حکومت مغربی پاکستان

خطبۂ صدارت

جناب ڈائرکٹر صاحب[2]، معزز خواتین و حضرات!

میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اردو اکیڈمی کے اجلاس خصوصی میں مدعو کر کے اس مفید ادارے کے نصب العین، پروگرام اور سرگرمیوں سے براہ راست واقفیت حاصل کرنے کا موقع دیا۔ آپ نے اور محترم ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب نے اپنی تقریروں میں جس محبت آمیز اور محبت انگیز پیرائے میں میرا ذکر کیا ہے اس کے لئے میں ان کا دلی ممنون ہوں۔ محبت میرا سرمایہ زندگی ہے، اور میں اس متاع گراں بہا کو ' جس سے ملے' جہاں سے ملے، جس قدر ملے' فضل باری اور عطائے ربانی سمجھ کر بصد شکر قبول کر لینے کا عادی ہوں۔

محبت اور درد دل کے رشتے کو تو شاعر لوگ جانیں، میں تو اتنا جانتا ہوں کہ سید صاحب اور میں عمر کی جس منزل میں ہیں وہاں درد لازمۂ حیات ہوتا ہے جس سن و سال میں انسان کی ہڈیاں تک دکھنے لگیں اس میں بھلا اس کا دل ناآشنائے درد کیونکر رہ سکتا ہے؟ اور پھر جس زمانے اور جس دور کی یادگار ہم لوگ ہیں، اس میں تو ہمیں بدشعور کو پہنچتے ہی یہ سبق دیا جاتا تھا ؎

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

ہمیں بتلایا جاتا تھا کہ انسان بننے کے لئے دل پیدا کرنا لازم ہے۔ انہی تعلیمات کا اثر تھا کہ اقبال نے ہماری نئی نسل کو یہ پیغام دیا ؎

---

[1] ۲۰ نومبر ۶۵ء کو مغربی پاکستان اردو اکیڈمی کے خصوصی اجلاس میں یہ خطبہ پڑھا گیا۔

[2] ڈاکٹر وحید الدین صاحب ڈائرکٹر مغربی پاکستان اردو اکیڈمی۔

از درون ایں گلے بے حاصلے
بس غنیمت داں اگر روید دلے

مجھے اندیشہ ہے کہ ہماری نئی نسل اس شعر کو اقبال کی رجعت پسندی پر محمول کرے گی کیونکہ جس قسم کی تعلیمی غذا پر انہوں نے پرورش پائی ہے اس میں ذہنی صحت کا راز انہیں یہ بتلایا جاتا ہے کہ دل کی بجائے دماغ پیدا کرو۔

اپنی اُفتادِ طبع کے اعتبار سے اگرچہ میں دل کی حالت کا قائل ہوں مگر دماغ کا بھی منکر نہیں۔ میرے خیال میں تعلیم ایسی ہونی چاہیئے کہ ہمارے طلبہ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں سے "مسلم ٹیکنوکریٹ" بن کر نکلیں۔ انسانی علوم سے اپنی والہانہ شیفتگی کے ساتھ ساتھ میں سائنسی اور مشینی علوم کی بے پناہ اہمیت کو بھی تسلیم کرتا ہوں۔ کیونکہ آج ہم دھات اور پتھر کے زمانے میں نہیں بستے بلکہ برقی اور جوہری توانائی کے دور میں زندگی بسر کر رہے ہیں، جس میں سائنسی اور مشینی علوم میں مہارت حاصل کرنا یا کم از کم واقفیت حاصل کرنا لازمی ہو گیا ہے۔ بقول سر ولفرڈ لے گراس کلارک (Sir Wilfrid Le Gross Clark) آج ہم ایک ایسی سائنسی دنیا میں رہتے ہیں جس میں ہماری زندگی سوئچ موڑنے، بٹن دبانے، ٹیلی فون کا ڈائل گھمانے، گیئر بدلنے غرض کسی نہ کسی مشین کے استعمال کے گرد گھومتی رہتی ہے۔ ہم میں اکثر غیر ماہرین ہوتے ہیں جو ماہرین کی دنیا میں سانس لیتے ہیں۔ ہمیں جو علم حاصل ہے، اس کے صحیح ابلاغ و انطباق میں ناکامی کی وجہ سے ہم اسے موثر طور پر استعمال کرنے میں بالعموم قاصر رہتے ہیں اور ان علوم میں انسانی بہبود کی جو قوت موجود ہے وہ انہام و تفہیم کے موثر وسائل نہ ہونے کی وجہ سے کئی دردناک برائیوں کا منبع بنی ہوئی ہے۔ موجودہ دور کے سائنسی علوم کو سیکھنے، جاننے، سمجھنے اور استعمال کرنے کے لیئے دو اصولوں کو رہنما بنائے بغیر چارہ نہیں۔ اول یہ کہ علم ایک مسلسل جاری رہنے والی سرگرمی ہے اور دوسرے یہ سرگرمی باہمی تعاون کی بنیاد پر قائم ہے۔

علم کو جب ہم باہمی تعاون کی سرگرمی مانتے ہیں۔ تو اظہار و ابلاغ کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے جس میں ذریعۂ تعلیم اور زبان کا سوال خود بخود ابھر آتا ہے۔ عجلت، سرعت اور تیز رفتاری کے اس دور میں جب کہ سائنسی ایجادات کے بل بوتے پر انسان چاند پر کمندیں ڈال رہا ہے، ان سائنسی ایجادات کی برکات سے مستفید تو تمام لوگ ہوتے ہیں لیکن جن سائنسی معلومات کی بنا پر یہ ایجادات معرض وجود میں آئی ہیں وہ عام انسانوں کی دسترس سے روز بروز دور تر ہوتی چلی جارہی ہیں۔ آج ہمارا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ انسانوں کو جدید ترین سائنسی معلومات کے ہم قدم کیسے رکھا جائے، یعنی کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ انسانوں کو جدید ترین سائنسی معلومات بہم پہنچانے میں وقت کی بچت کیسے کی جائے۔ وقت کی بچت کا ایک اہم طریقہ یہ ہے

یہ تعلیم ایسی زبان کو بنایا جائے۔ جسے زیادہ سے زیادہ لوگ کم سے کم وقت میں سیکھ سکیں اور ظاہر ہے کہ
ے لئے ایسی زبان اردو ہی ہو سکتی ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ کیا اس زبان میں اس قدر وسعت ہے کہ وہ اپنے
ن میں تمام سائنسی علوم کو سمیٹ سکے۔ ہمارے بعض سائنسدانوں کا اب بھی یہی خیال ہے کہ اردو زبان ابھی
ابل نہیں کہ یہ تمام سائنسی علوم کے افکار و نظریات، مطالب و مفاہیم کے بیان و اظہار پر قدرت رکھتی ہو۔
کے ظرف میں ابھی سائنسی اصطلاحات کے لئے مزید وسعت و گہرائی پیدا کرنے کی ضرورت ہے مجھے یہ جان کر
ہوئی ہے۔ کہ اردو اکیڈمی نے اس نہایت ہی اہم اور بنیادی کام کو سرانجام دینے کا بیڑا اٹھا رکھا ہے۔ مجھے
ات کا پوری طرح احساس ہے کہ یہ کوئی آسان کام نہیں۔۔ بلکہ سخت ریاضت اور پتہ ماری کا کام ہے۔ چند
ل جب میں سیکرٹری زراعت تھا تو مجھے زمینداروں اور کاشتکاروں کے لئے زراعت کے مختلف موضوعات
و میں کتابیں لکھوانے کے سلسلے میں جو مشکلات پیش آتی تھیں، ان سے مجھے اس بات کا پوری طرح احساس
ا ہے کہ یہ کام فرہاد کی تیشہ زنی سے جوئے شیر بہانے کے مترادف ہے۔ جناب معتمد عمومی نے اردو اکیڈمی
کردگی کی جو تفصیل پیش کی ہے وہ امید افزا ہونے کے ساتھ ساتھ مسرت بخش بھی ہے۔ اکیڈمی نے قانونی
ے، قاموس الاصطلاحات، اور اسی طرح کی دوسری مطبوعات شائع کر کے ملک و ملت کی ایک بہت
خدمت انجام دی ہے۔

لارڈ میکالے نے گورنمنٹ آف انڈیا کے نام اپنی ایک یادداشت (مورخہ ۲ فروری ۱۸۳۵ء) میں
اور سنسکرت کی کتابوں کی مذمت میں ایک طنزیہ زہر آلود جملہ یہ بھی تحریر کیا تھا کہ ان کتابوں میں جو
شائع ہوتا ہے، وہ تعلیمی نقطۂ نظر سے اتنا غیر افادی ہوتا ہے، کہ محض چھپائی کی وجہ سے اس کاغذ کی
سادہ کاغذ سے بھی کم رہ جاتی ہے۔ میکالے کی اس متعصبانہ رائے سے قطع نظر، یہ ایک حقیقت ہے کہ
کتابیں مواد کے اعتبار سے واقعی اس قدر گھٹیا ہوتی ہیں کہ محض چھپائی کی وجہ سے ان کی قیمت اتنی ہی ضخامت
سادہ اوراق سے بھی کم رہ جاتی ہے۔ اور اس کے مقابلے میں بعض کتابیں اپنے معلوماتی مواد کی بدولت
لے اور جواہرات میں تلنے کے لائق ہوتی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اکیڈمی کی سرگرمیوں سے ملک میں اعلیٰ پائے کی
ں کی اشاعت میں بہت مدد ملے گی۔ جس ادارے کے ناظم اعلیٰ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی جیسے نابغۂ سائنسداں
معتمد ڈاکٹر سید عبداللہ جیسے صاحب نظر ہوں اس کی کامیابی میں شک ہی کیا ہو سکتا ہے۔

میں حکومت مغربی پاکستان کی طرف سے انہیں یقین دلاتا ہوں کہ حکومت بدستور اکیڈمی کی مالی اعانت
سرپرستی کرتی رہے گی۔

غالباً یہاں یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ موجودہ ہنگامی حالات میں ملک کی سب سے اہم ضرورت

دفاع ہے ۔ جب ملک کی بقا اور سالمیت کو خطرہ ہو تو ہم ملک کی دفاعی ضروریات کو کسی طور بھی نظر انداز نہیں کر سکتے ۔ ہماری شیر دل افواج نے جو کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں، وہ ہم سب کے لئے باعث فخر ہیں۔ لیکن جنگ کا خطرہ ابھی ٹلا نہیں ۔ زخم خوردہ بھارتی عفریت کا سر ابھی پوری طرح سے کچلا نہیں گیا۔ اس لئے ہماری اصلی ضروریات دوسری تمام ضروریات پر مقدم و فائق ہیں ۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ حال ہی میں حکومت نے اپنے بجٹ سے نو کروڑ روپیہ بچا کر دفاعی مقاصد کی طرف منتقل کر دیا ہے ۔ ان حالات میں حکومت کے محدود موجودہ وسائل کے پیش نظر کچھ زیادہ توقعات قائم کر لینا مناسب نہ ہوگا ۔ بہر حال میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گا کہ اس مفید ادارے کی ہر طرح سے مدد کی جائے ۔ میں اس ادارے کے کارپردازان سے درخواست کروں گا کہ وہ اس ضمن میں کوئی جامع اسکیم مرتب کر کے پیش کریں ۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ حکومت اس پر پوری سنجیدگی اور ہمدردی سے فوری غور کرے گی ۔

پاکستانی قوم کے لئے اردو زبان کا مسئلہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ ہماری قومیت کی تشکیل و استحکام اور عوام میں علوم کی اشاعت اور ترقی میں اردو زبان کلیدی اہمیت کی حامل ہے ۔ اس لئے ہر وہ ادارہ اور ہر وہ شخص جو اس زبان کی نشو و نما میں حصہ لے رہا ہے وہ صرف ہمارے ہی نہیں بلکہ آنے والی نسلوں کے شکریئے کا بھی مستحق ہے ۔

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی ہے کہ اکیڈمی ایک نصب العین کے تحت ایک مخصوص دائرہ کار میں سرگرم عمل ہے ۔ اور دوسرے اداروں کے ساتھ اس کا تصادم نہیں ۔ میں دعا کرتا ہوں کہ سائنسی معلومات کو ملک کے بچے بچے تک پہنچانے، علم کے چراغ کو گھر گھر روشن کرنے اور علم و اخلاق کی بنیادوں پر کردار کو مستحکم بنانے کے عزائم میں اللہ تعالیٰ آپ کو کامیابی اور کامرانی عطا فرمائے ۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

میں قاموس الاصطلاحات کی پیش کش کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں ۔ خدا کرے کہ اکیڈمی اس طرح کی معتبر کتابیں چھاپتی رہے ۔ حکومت ایسے کاموں کی حوصلہ افزائی کرتی رہے گی ۔ مکرر شکریہ کے بعد میں تقریر ختم کرتا ہوں ۔

بابائے اردو

درسِ زندگی

مندرجہ بالا عنوان سے پطرس بخاری مرحوم نے ایک کتاب مرتب کی تھی جس میں مختلف قوموں کے مشاہیر کے ایسے مضامین شامل ہیں، جن میں انہوں نے زندگی کے بارے میں اپنے نظریات کی وضاحت کی ہے۔ یہ کتاب مرتب کی وفات کے کئی سال بعد حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں بابائے اردو کا ایک مضمون "بڑا آدمی" کے عنوان سے شامل ہے جو بطور خاص اس کتاب کے لئے لکھا گیا تھا۔ کتاب کے ناشر کے شکریے کے ساتھ یہ مضمون "قومی زبان" میں شائع کیا جاتا ہے (ادارہ)

میرا بچپن میرٹھ ضلع کے ایک دور افتادہ گاؤں میں گزرا۔ یہاں میری ننھیال تھی۔ گھر کے قریب مسجد تھی اور پاس ہی مکتب تھا۔ یہاں لوگوں کی زندگی عجب عالم بے خبری میں بسر ہوتی تھی۔ باہر کی دنیا کی خبر گاہے گاہے آ گئی تو آ گئی ورنہ کچھ نہیں۔ اس زمانے کی ایک بات مجھے اب تک یاد ہے۔ ایک روز نہ معلوم کیونکر سارے گاؤں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ روس آ رہا ہے۔ یہ سنتے ہی ہم سب سہم گئے اور گھروں کے دروازے بند کر لئے۔ ہم بچے چوری سے چھت پر چڑھ کر روس کے آنے کی راہ دیکھنے لگے۔ اب جو کبھی یہ بات یاد آتی ہے تو حیرت ہوتی ہے۔ روس کی ہیبت جیسی اس وقت تھی، اب بھی اس سے کچھ کم نہیں۔ آخر اس روسیہ میں کوئی بات تو ہے۔ یہ امنِ عالم کے داعیوں کے لئے دعوتِ فکر ہے۔

اس گاؤں سے میں جلد ہی چلا آیا۔ دوسرے کئی مقامات پر رہنے اور پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ آخر میں جب مدرسۃ العلوم مسلمانان (محمڈن اینگلو اورینٹل کالج) علی گڑھ کے اسکول اور دارالاقامہ میں داخل ہوا تو میری آنکھیں کھلیں۔ ایسا معلوم ہوا کہ میں ایک نئی دنیا میں آ گیا ہوں۔ سید نے یہ بستی کچھ سوچ ہی کر بسائی تھی۔ یہاں عام پڑھائی کے سوا کچھ اور بھی تھا۔ اس کی فضا میں قومیت اور اسلامیت کی مہک تھی۔ جو کھیل اور ہنسی

پائی جاتی تھی ۔ پہلے دور سے ۔ دو تین سال بعد قریب سے کالج کے بانی سرسید کو دیکھنے، بات چیت کرنے، پاس اٹھنے بیٹھنے اور ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ تو یہ راز کھلا کہ 'بڑا آدمی' کسے کہتے ہیں ۔ ان کے راستے میں ناقابل بیان مشکلات اور اوگھٹ گھاٹیاں تھیں ۔ وہ اپنے خلوص و صداقت، فراست اور اخلاقی جراءت سے سب پر غالب آ گئے ۔ ان کی بڑائی اس میں تھی کہ انہوں نے اصول پر وقتی مصلحت کو ترجیح نہیں دی ۔ اور باطل سے مرعوب نہیں ہوئے ۔

علی گڑھ کالج کے بعد مدت تک حیدر آباد دکن میں رہا ۔ یہ بالکل دوسری دنیا تھی ۔ سرسید کے علاوہ اپنی قوم کے بعض اور بڑے لوگوں سے بھی ملنے جلنے اور ان کے ساتھ کام کرنے اور ان کی زندگی کے ظاہر و باطن کو دیکھنے کا موقع ملا ۔ اس خاصی بڑی عمر میں (جو اس وقت ۸۶ سال کے لگ بھگ ہے) میری نظر سے زندگی کے بہت سے نشیب و فراز اور اقبال و زوال کے منظر گزرے ہیں ۔ ان واقعات اور تجربات سے جو سبق حاصل ہوئے ہیں وہ میرے دل پر نقش ہیں ۔ ایک تو یہ کہ بے مقصد زندگی، زندگی نہیں آوارگی ہے دوسرا یہ کہ انسان اپنی قسمت خود بناتا اور بگاڑتا ہے ۔ اس میں شک نہیں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تائید غیبی (قدرت کی طرف سے ہو یا کسی دوسری جانب سے) یا اتفاق حسنہ ہماری زندگی میں داخل ہو کر کچھ دیر کے لئے ہماری منزل کی صعوبت آسان کر دیتے ہیں ۔ لیکن یہ سہارے ناپائیدار اور کمزور ہوتے ہیں ۔ انسان کی کامیابی اس کی خود اعتمادی، خلوص، اخلاقی جراءت اور قوت ایمانی میں ہے ۔ مایوسی اور ناکامی لوازم زندگی میں سے ہیں ۔ ایک باعزم شخص ان سے ہراساں ہو کر پیچھے نہیں ہٹتا ۔ یہ ہماری قوت ایمانی کو ابھارتی اور سوئے ہوئے جذبات کو بیدار کرتی ہے ۔

تیسری بات جو مختلف افراد اور جماعتوں کے حالات زندگی کے دیکھنے سے مجھ پر آشکار ہوئی وہ یہ ہے کہ دوسروں کی خوشی میں اپنی خوشی ہے اور یہ صرف خدمت سے حاصل ہو سکتی ہے ۔ خدمت میں وہ سب کچھ آ جاتا ہے جس سے کسی کے دل کی کلی کھل جائے ۔ ذاتی تجربے اور تاریخ و سوانح کے مطالعے سے ایک بات یہ بھی واضح ہوئی کہ حصول مقصد کے لئے خلوص بلاشبہ لازم ہے ۔ لیکن اس کے ساتھ عقل بھی درکار ہے ۔ نادان مخلص خطرناک ہوتا ہے ۔

سرسید حالات و افکار

از

بابائے اردو

پیر حسام الدین راشدی

ڈاکٹر عترت حسین زبیری

یہ سال ۱۹۵۸ء کی بات ہے اور مارچ کی ۲ تاریخ تھی۔ ہمیں بھنبھور جانا تھا۔ بھنبور کو تو اب غالب سب ہی جانتے ہیں لیکن اس وقت سوائے ایک مخصوص حلقے کے کسی کو نہ اس کی طرف توجہ تھی نہ اس کی خبر تھی آج اس کی کھدائی کا افتتاح ہونے والا تھا۔

کراچی سے صبح تقریباً ۸ بجے ہمارا قافلہ چلا۔ جناب ممتاز حسن صاحب فائنس سکریٹری، مسٹر کوریل ڈائرکٹر محکمہ آثار قدیمہ، ڈاکٹر خان موجودہ ڈائرکٹر آثار قدیمہ، یہ نیازمند اور ایک جرمن خاتون ڈاکٹر اینمری شیمل بہاولپور شاہ لطیف اور علامہ اقبال پر بہت کچھ لکھنے کی وجہ سے پاکستان بھر میں بہت معروف و معزز ہیں۔ لیکن اس وقت پہلی بار کراچی تشریف لائی تھیں۔ ہمارے قافلے میں ایک اور بھی معزز شخصیت شامل تھی۔ قامت طویل، سفید رنگ شباہت شریفانہ اور خوبصورت، داڑھی منڈی ہوئی، مونچھیں چھوٹی، آنکھوں میں چمک، آواز نرم سنجیدہ اور باوقار اپنی وضع قطع کے لحاظ سے دوست نما، کشادہ دل اور مستانہ اداؤں کا حامل، سر پر ڈھیلی ڈھالی چھاتہ نما فلیٹ ہیٹ بڑے پائنچے والی کھلی کھلی پینٹ، فرفل نما کوٹ، لباس کی وضع قطع اور تراش و خراش سے قطعی بے نیاز۔ یہ تھے مرکزی حکومت کے تعلیمی مشیر ڈاکٹر عترت حسین زبیری۔

غالباً ان سے میری ملاقات کا یہ پہلا دن تھا۔ بھنبور تک پہنچتے پہنچتے ہم ایک دوسرے سے مانوس ہو گئے اور جو کمی تھی وہ ممتاز حسن صاحب نے ایک دوسرے سے تعارف کراتے وقت اپنے دلکش انداز بیان سے پوری کر دی بھنبور کی پہاڑی پر جب ہم نے قدم رکھا تو ہم دونوں دوست تھے۔ ایک دوسرے کے قریب آچکے تھے۔ ایک دوسرے کے لئے دل میں گرمی محسوس کر رہے تھے اور باہمی ربط بڑھانے کے لئے اپنے اپنے دلوں میں ایک کشش محسوس کر رہے تھے۔

کھدائی کا افتتاح خود ممتاز حسن صاحب نے زمین پر پہلا پھاوڑا چلا کے کیا اس سے پہلے کہ اس قدیم تاریخی دفینے

کے سینے میں شگاف کیا جائے ہم نے بڑے خلوص کے ساتھ دعا مانگی یہ دعا بارگاہِ خداوندی میں عترت حسین زبیری نے پڑھی تھی -

ایک دن صبح صبح ٹیلیفون کی گھنٹی بجی -

" خلیفہ الواثق باللہ کا زمانہ کیا ہے "

" ۲۲۷ھ سے ۲۳۲ھ تک ! "

" اچھا تو آپ فوراً چلے آئیں "

یہ ممتاز حسن صاحب کا فون تھا - ان کی آواز اضطراری تھی جس سے میں نے سمجھا کہ کوئی بہت ہی اہم مسئلہ درپیش ہے -

جب بھی کوئی اہم بات ہوتی ، کوئی دلچسپ چیز دریافت ہوتی ، کوئی مخطوطہ ملتا ، میوزیم کے لئے کوئی چیز خریدنے کے لئے سامنے آتی ، تاریخی دستاویز مل جاتی کسی بہت بڑے علمی کام کا پروگرام بنانے یا کسی علمی انجمن کا قیام مقصود ہوتا تو ممتاز حسن صاحب کی آواز ٹیلیفون پر اس طرح تیز ، اضطراری اور تشویشناک ہو جاتی ہے کہ گویا شہر میں آگ لگ گئی ہو اور وہ فائر بریگیڈ کو اطلاع دے رہے ہوں - یا کسی مرگ ناگہانی کی افسوسناک اطلاع ان کے اعزا تک پہنچا رہے ہوں ، بڑے صاحب صبر و تحمل ہیں ، بڑے تجربہ کار اور گہرے ہیں ایک پیاری بچی مر گئی تو اپنے انداز سے کبھی اضطراری کیفیت پیدا نہ ہونے دی - چھوٹے موٹے اور بھی ایسے مسائل زندگی میں آئے جو کافی گھبراہٹ پیدا کر سکتے تھے - لیکن یہ شخص کسی طرح بے قرار نہیں ہوا - یہ بیقراری یہ اضطراب اور یہ ہیجانی کیفیت فقط اس وقت ظاہر ہو جاتی تھی جب کوئی علمی مسئلہ یا معاملہ درپیش آتا تھا ، یہ کیفیت اس وقت اور بھی بڑھ جاتی تھی جب سے عترت حسین زبیری نے ایجوکیشن کا چارج لیا تھا ، دونوں ہم مذاق تھے ، دونوں علم دوست تھے اور دونوں ہم کیش و ہم مشرب تھے - لہذا دونوں ہم نفس بن چکے تھے اور دونوں پاکستان کے لئے کچھ کرنے پر تلے ہوئے تھے ، یہ اضطراری کیفیت اور جلد بازی ، زبان اور عمل میں پھر تو لازمی تھی -

سینٹرل سیکریٹریٹ میں فائنس سکریٹری کے دروازے پر چپراسی میرا منتظر تھا ، جیسے ہی اندر داخل ہوا میں نے دیکھا کہ یہ دونوں حضرات ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے مجھے دیکھ کر ایسے فاتحانہ انداز میں مسکرائے ، جیسے انہوں نے کوئی بڑا راز دریافت کر لیا ہو یا انہیں کسی بہت بڑے دفینے کا سراغ مل گیا ہو ، یا ایک ایسے مسئلے کو انہوں نے سلجھا لیا ہو جس کو سلجھانے کے لئے پوری امت چودہ سو سال سے سر مار رہی ہو -

میں جب کرسی پر بیٹھا اس وقت زبیری صاحب نے اپنی جیب سے بڑی احتیاط کے ساتھ ایک لفافہ نکالا - زبیری صاحب جب مسکراتے تھے تو ان کی دلی شگفتگی کے آثار ان کے چہرے پر ظاہر ہو جاتے تھے ، پیشانی کشادہ تھی

اس پر نازک سی شکنیں پڑجاتی تھیں، جو بہت خوبصورت اور دلنشیں معلوم ہوتی تھیں، دانت بہت ہی اچھے تھے جیسے موتی جڑے ہوئے ہوں، مسکراتے وقت دانتوں کا توازن اور جڑاو دیکھنے والے کو مسحور کرلیتا تھا، لفافہ دیتے وقت جو مسکراہٹ ان کے چہرے پر لہرائی وہ مجھے بہت بھائی اور اب بھی جب میں اس کا تصور کرتا ہوں تو دل کی عجیب حالت ہوجاتی ہے۔

"کہیئے جناب" ممتاز حسن اور زبیری صاحب کے منہ سے بیک وقت نکلا۔

"یہ کیا ہے؟"

"واثق باللہ کا سکہ ہے"

"کہاں سے ملا؟"

"بھنبور سے!"

بعد میں معلوم ہوا کہ یہ طلائی دینار دنیا میں یک و تنہا ہے زبیری صاحب اور ممتاز حسن کے لئے اس سے زیادہ اور کیا دولت ہوسکتی تھی؟ دونوں خوش تھے۔

اس کے بعد دونوں ثقافتی، علمی، اور کلچرل تحریکات میں اور زیادہ سرگرم ہوئے۔

یہ بھی سال ۱۹۵۸ء کی ہی بات ہے دس بجے صبح کا وقت تھا، وہی فائننس سکریٹری کا آفس، وہی ممتاز حسن اور وہی عترت حسین زبیری ایک صحبت آج کے سلسلے کی پہلے ہوچکی تھی ہم نے بحکم سرکار اردو ڈولپمنٹ بورڈ کراچی کی بنیاد ڈالی۔ ممتاز حسن کی تحریک تھی اور زبیری صاحب کی تائید، ایک اسکیم بنانے والا اور دوسرا بے دریغ روپیہ دینے والا۔ پھر کیوں نہ اسکیمیں بنتیں اور کس طرح نہ اجرا ہوتا، آج اردو ڈولپمنٹ بورڈ کی اساسی کمیٹی کا دوسرا اجلاس تھا، یاد نہیں کہ میرے سوا اس وقت اور کون کون ممبر حاضر تھے۔

اس میٹنگ میں زبیری صاحب نے لغت کے اصول اور لغت نویسی کے فن اور لوازمات پر ایک بلند پایہ علمی مقالہ پڑھ کر اجلاس کا افتتاح کیا۔ مجھے معلوم نہیں کہ وہ مقالہ کیا ہوا، اب ان کے کاغذات میں ہے بھی یا نہیں اگر وہ شائع ہوجائے تو کیا کہنا۔ بڑے کام کی چیز ہے۔

اسی اجلاس اور اسی میٹنگ میں طے پایا کہ ادارہ اردو کی مبسوط تاریخی لغت مرتب کرے۔ مولوی عبدالحق بابائے اردو مرحوم و مغفور لغت کے رئیس بنائے گئے۔ حضرت جوش ملیح آبادی کا علمی مشیر کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ ایک ذیلی کمیٹی بنائی گئی جس کے متعدد اجلاس سندھی ادبی بورڈ کے دفتر میں اور میرے گھر پر منعقد ہوئے جن میں ضابطے، اصول اور دفتری قوانین وضع کئے گئے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اور ڈاکٹر شوکت سبزواری

خو... [illegible]

ڈاکٹر عترت حسین زبیری غالباً مشرقی پاکستان کی کسی یونیورسٹی سے مرکزی حکومت کے تعلیمی مشیر ہو کر آئے تھے۔ بڑے جذبے لے کر، اور بہت کچھ کرنے کی ٹھان کر پہنچے تھے۔ ممتاز حسن جیسے صاحب فضل و دانش اور علم پرور مالی مشیر کے ساتھ اشتراک عمل نے ان کے جذبے اور بہت کچھ کرنے کے عزم کو اور جلا بخشی اور قوت پہنچائی۔

دونوں کا خیال تھا کہ ایک ملک، ایک ملت، ایک قوم اور ایک حکومت کی عزت اور آبرو مندی کا انحصار چند جدید قسم کی عمارتوں اور قیمتی سوٹوں میں ملبوس کارندوں پر نہیں ہوتا بلکہ ایک قوم اس وقت آبرومند بنتی ہے اور ایک ملک اس وقت دنیا میں عزت پاتا ہے۔ جب اس کے پاس تاریخ کا سرمایہ وسیع پیمانے پر محفوظ ہو، قدیم آثار کا سلسلہ مرتب اور منظم ہو۔ کتب خانے، میوزیم اور علمی انجمنیں افراط سے ہوں۔ اپنی تاریخ وراثت اور ثقافتی روایات کی عظمت کی بنیادیں، فقط مستحکم نہ ہوں بلکہ ان پر شعور کے ساتھ پندار بھی ہو۔ ان کا یہ خیال بالکل صحیح ہے دنیا کی دوسری معزز قومیں اپنی قدیم روایات ہی کی بنا پر دنیا میں عزت اور آبرو کے ساتھ دیکھی جاتی ہیں۔ دولت کی افراط، بڑی بڑی کوٹھیاں، صوفے اور ریفریجریٹر، ایک ملت کو "نو دولتا" تو بنا سکتے ہیں لیکن عظمت اور وقار نہیں بخش سکتے۔ اس وقار اور عظمت کی دیواریں فقط ثقافتی ورثے کی بنیادوں پر اٹھتی ہیں۔

عترت حسین زبیری نے آنے کے بعد ممتاز حسن صاحب سے مل کر مذکورہ بالا اصول کے تحت اس نئے ملک کو اپنی وراثت سے آشنا کرنے کے لئے تیز تیز قدم اٹھانے شروع کئے تھے۔ ان کی راہ میں کوئی کانٹا حائل نہیں تھا۔ دونوں کی شخصیتیں حرف گیری سے بالاتر تھیں۔ دونوں کے کردار انگشت نمائی سے مبرا تھے۔ اس لئے انہوں نے مل کر بہت سے کام کئے اور کئی علمی ادارے بنائے۔ آج جو تھوڑی بہت ثقافتی عزت حاصل ہے وہ انہیں کارناموں کی رہین منت ہے۔

غالباً ۱۹۵۸ء کے نومبر کا مہینہ تھا۔ میں ستمبر سے اپنے گھر میں بیمار پڑا ہوا تھا۔ شام کو ۸، ۹ بجے کے درمیان یہ دونوں دوست میرے پاس آئے۔ ممتاز حسن کی یہ عادت ہے جب انہیں کوئی صدمہ پہنچتا ہے تو بظاہر ضبط سے تو کام لے لیتے ہیں لیکن اندر ایک الاؤ جلتا رہتا ہے۔ ایسی حالت میں جب انہیں کوئی دلخواہ دوست مل جاتا ہے تو اکثر وہ شعر پڑھنا شروع کر دیتے ہیں اور ضبط کے باوجود آنکھیں بھی بھر آتی ہیں۔ کبھی کبھی ٹھنڈی سانس بھرنے لگتے ہیں اور آنکھ بچا کر آنکھوں کی تری کو خشک کرتے رہتے ہیں۔

عترت حسین زبیری انگریزی کے جید عالم تھے۔ ایسے عالم اور ایسے استاد کہ خود اہل زبان کے درمیان بھی انہوں نے ڈنکے کی چوٹ اپنا مقام پیدا کر لیا تھا۔ لیکن وہ باوجود اس کے بھی چونکہ نو دولتے نہیں تھے وہی مشرقی وہی مسلمان وہی پاکباز اور وہی عبادت گزار، اور وہی عالمانہ، کسر نفسی اور سادہ دلی۔ ڈھیلے ڈھالے انگریزی لباس میں ایک مشرقی جسم اور مسلمان کی روح چھپی ہوئی تھی، انہیں انگریزی اشعار اور ضرب الامثال کے ساتھ ساتھ فارسی اور

اردو کے شعر بھی ازبر تھے اور موقع بموقع اشعار کا استعمال کرنا خوب جانتے تھے۔

مجھے قلب کی بیماری تھی۔ یہ دونوں دوست احتیاط کرتے تھے کہ میرے سامنے کسی تکلیف دہ واقعہ کا اظہار نہ ہونے پائے۔ ممتاز حسن صاحب کی بچی کا انتقال ہو چکا تھا، دل پر آرے چل رہے تھے، گھر ماتم کدہ بنا ہوا تھا، لیکن جب پرسش احوال کے لئے میرے پاس آتے تو کوشش یہی ہوتی کہ مجھ پر ان کے اندر کی کیفیت ظاہر نہ ہونے پائے، لیکن آخر کہاں تک وہ مومن ہیں اس لئے باوجود ہزار ضبط اور تحمل کے بھی، ان کے دل کی کیفیت ان کے چہرے سے ظاہر ہو جاتی ہے۔ وہ ہزار چھپائیں لیکن چہرہ راز داں کبھی نہیں بن سکتا۔

اس شام کو وہ غیر معمولی طور پر مضطرب تھے میں نے دیکھا عشرت حسین زبیری صاحب بھی ملول ہیں۔ میں تاڑ گیا لیکن جرأت نہیں ہوئی کہ پوچھوں۔ میں خود بھی ڈر رہا تھا۔ اگر کوئی ایسی ویسی خبر ہوئی تو نہ جانے کیا حال ہو۔ دونوں نے اشعار پڑھنے شروع کئے۔ دونوں کے چہروں پر رنگ آتے جاتے رہے اور ممتاز حسن نے کئی بار آنکھ بچا کر آنسو بھی پونچھے۔

کسی اسکیم کے متعلق میں نے بات نکالی تو میں نے دیکھا کہ دونوں دوست دستور کے مطابق گرمجوشی سے اس طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ ہاں ہوں کر کے ٹالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بہرحال کوئی ایک بات ایسی تھی کہ جواب دیئے بغیر ان کے لئے کوئی چارہ نہیں تھا۔ دونوں مجبور تھے۔ اس وقت راز کھلا کہ جناب عشرت حسین زبیری اپنے عہدے سے عنقریب سبکدوش ہونے والے ہیں لہذا اب وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ سارے عزائم اور تمام پروگرام ختم اور حوصلے سرد پڑ چکے تھے۔

ممتاز حسن جب کسی روحانی اذیت میں مبتلا ہوتے ہیں تو فوراً کسی دلخواہ دوست کا گھر "پناہ" کے لئے ڈھونڈتے ہیں اور کچھ ساعتیں بیٹھ کر دل بہلا کر، پھر چلے جاتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اس وقت بھی زبیری صاحب کے سبکدوش ہونے سے سخت روحانی کوفت اور اذیت میں مبتلا تھے۔ اور انہیں "پناہ" کی ضرورت تھی۔

بات تھی بھی نازک اور دکھ دینے والی۔ ابھی تو پاکستان کے علمی اور ثقافتی استحکام اور عظمت کے لئے یہ دونوں حضرات جو کچھ کرنے والے تھے، اس کی فقط ابتدا ہوئی تھی۔

زبیری صاحب کو اس کا دکھ نہیں تھا کہ وہ اپنے عہدے سے سبکدوش ہو رہے ہیں۔ کہتے ہیں۔

پائے گدا لنگ نیست   ملک خدا تنگ نیست

صاحب علم تھے، صاحب عمل تھے، ان کو خدا نے وہ دولت عطا کی تھی جو نہ زوال پذیر ہونے والی تھی اور نہ ختم ہونے والی چیز تھی۔ جہاں جاتے وہیں عزت پاتے۔ شیر جس جنگل میں پہنچتا ہے وہیں اپنا شکار کر لیتا ہے۔ چنانچہ ہوا بھی ایسا ہی۔ وطن سے نکلے۔ لوگوں نے سمجھا غریب الوطن ہو گئے۔ لیکن وہ غیروں میں گئے اور اپنوں سے زیادہ

سرفرازی پائی -

عترت حسین زبیری اور میری یہ آخری ملاقات تھی - پھر وہ یورپ چلے گئے اور میں منیلا پہنچ گیا، ایک دوسرے کی خبر نہ رہی - ایک مرتبہ ممتاز حسن کے پاس ان کے خطوط دیکھے - دوستوں کی یاد اور وطن کی محبت میں کوئی دلدوز اشعار لکھے ہوئے تھے - معلوم یہ ہوتا تھا کہ ان کا جسم تو جہاں وہ ہیں انتہائی آرام سے ہے، لیکن ان کی روح بیقرار ہے دوستوں کے لئے اور وطن کے - ایک دن شام کو میں پرانی تصویریں دیکھ رہا تھا - مجبور کے اس سفر میں ثمیا نے جو تصویریں کھینچی تھیں وہ سامنے آگئیں، ممتاز حسن، ڈاکٹری ائمری شفیل، رول کوریل اور ڈاکٹر عترت حسین زبیری جناح نما ٹوپی، ڈھیلا ڈھالا انگریزی لباس، چوڑی پیشانی، شگفتہ چہرہ، کئی لمحوں تک ان پرانی یادوں میں ڈوبا رہا -

دوسرے دن صبح کو معلوم ہوا کہ عترت حسین زبیری غریب الوطنی میں اس جہان فانی سے کل رخصت ہوگئے، یہ وہی دن تھا، جس دن میں ان کی تصویریں دیکھ رہا تھا -

موت برحق ہے، ہر ایک کو مرنا ہے، ایک موت انفرادی موت ہوتی ہے، ایک موت وہ ہوتی ہے جو خاندان پر اثر انداز ہوتی ہے، ایک موت وہ ہے جس کا اثر پورے قبیلے پر پڑتا ہے، لیکن ایک موت ایسی بھی ہوتی ہے جس کا اثر اجتماعی زندگی اور پورے معاشرے پر پڑتا ہے، یہ ایک عالم کی موت ہوتی ہے جس سے پوری ملت کو نقصان پہنچتا ہے عترت حسین زبیری کی موت فرد کی موت نہیں ہے، یہ موت وہ نہیں جس کا اثر فقط خاندان پر پڑے یا قبیلہ متاثر ہوا ہو، یہ موت وہ ہے جو پورے ملک اور تمام ملت کے لئے نقصان کا موجب ہوئی -

عترت حسین زبیری روز روز قوموں میں پیدا نہیں ہوتے، قوموں کو ایسے افراد کے اٹھ جانے سے جو نقصان پہنچتا ہے، اس کا احساس بہت دیر میں ہوتا ہے لیکن اس احساس کے اثرات عارضی نہیں - بلکہ ابدی ہوتے ہیں، زخم جب ٹھنڈا ہوتا ہے اسی وقت اس میں درد کی شدت پیدا ہوتی ہے -

---

اردو کے سپاہی

شمیم احمد

سیّد عابد علی عابد

لاہور میں "انٹرویو ہم" کا خاتمہ میں نے ایک ممتاز ادیب اور شاعر سید عابد علی عابد پر کیا۔ البتہ دو شخصیتوں سے ملنے اور ان کو دیکھنے کی حسرت دل میں ہی رہی ایک جسٹس ایس۔ اے رحمٰن جو اُن دنوں کراچی آئے ہوئے تھے اور دوسرے حمید احمد خاں صاحب جو ایک اسلامی ملک کے دورے پر گئے ہوئے تھے۔ عابد صاحب سے میرا غائبانہ تعارف پہلے ہی سے اتنا تھا کہ مجھے ان کی تصویر بنانے کے لئے کسی جدوجہد کی ضرورت نہ تھی۔ اُن کی بعض غزلوں کے اشعار میرے ذہن میں گونج رہے تھے۔ اُن کے بعض بہت اہم ادبی اور تحقیقی مضامین کا اندازِ تحریر اُن کو میرے لئے بہت مانوس بنا چکا تھا۔ ایسے ترجمے جن کی ضرورت اردو کو خدا جانے کب سے تھی، عابد صاحب کے ذریعے ہی اردو کے قارئین تک پہنچ چکے تھے۔ ادب، فلسفہ، تاریخ وہ کون سا میدان تھا، جس میں انہوں نے طبع زاد کاوشوں یا ترجموں کے ذریعے اردو کو فراموش کر دیا ہو۔ وہ اردو کے مبلغ نہ سہی مگر اردو کے شیدائی پرستار۔ خدمت گزار اور محسن ہیں۔ کیونکہ انہوں نے جو کچھ کیا ہے۔ خاموشی سے اردو اور اردو ادب کے لئے کیا ہے اور سالہا سال سے وہ اس مہم میں معروف ہیں۔ درس و تدریس کے ذریعے خدا جانے انہوں نے کتنے اردو آشنا اور اردو کے شیدائی پیدا کر دیئے۔ یہ ایک جہاد تھا جس پر وہ ہمیشہ کمر بستہ رہے۔ اور میں اس کی اہمیت کو پہلے سے محسوس کرتے ہوئے اُن سے ذاتی سوالات کرنا چاہ رہا تھا۔ عابد صاحب شاعر کی خاکساری اور شرمیلے انداز کے ساتھ تفصیل سے گریز کرتے رہے۔ اور اپنی زندگی کے بارے میں اتنی کامیابی سے ہر سوال کا جواب غیر ذاتی بناتے گئے کہ جب میں اُن کے پاس سے اٹھا تو مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ میرے کاغذ پر سوائے ان کی ذات کے ہر سوال کا جواب موجود تھا۔ یہ جوہر مجھے ان کی شاعرانہ افتادِ طبع کا معلوم ہوا ایمائیت اور ابلاغ تو اُن کا فن تھا مگر ایک اچھے شاعر کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ واقعات کو اور ذاتی تجربات کو اتنی کامیابی سے چھپا لیتا ہے کہ وہ تجربہ یا واقعہ زندگی کے عام واقعات کا اظہار بن جاتا ہے اور رپورٹنگ غائب ہو جاتی ہے۔ پھر شاعر یہ بھی جانتا ہے کہ اسے غیر ضروری باتیں کہاں سے نظر انداز کرنی ہیں۔ اور تفصیل سے کیسے گریز کرنا ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ میں آن سے ان کی زندگی کے بارے میں کچھ معلوم کرنے سے قاصر رہا - یہ میری نااہلیت سمجھئے یا شدت احساس
کا فاصلہ -

عابد صاحب مجلس ترقی ادب کے ترجمان "صحیفہ" کے مدیر کی حیثیت میں مجھے پہلی نظر میں چودھری محمد علی کے
بھائی نظر آئے - چہرے کی بناوٹ ویسی ہی تھی مگر جب میں نے سامنے سے ان پر نظر کی تو اُن کا چہرہ اتنا نرم اور نازک
نظر آیا کہ سیاست مجھے شاعری محسوس ہونے لگی - یہ چودھری محمد علی نہیں تھے عابد علی عابد تھے - اور جب وہ بولے تو
ان کی آواز میں ایک ایسا ہلکا اور نرم وزن محسوس ہوا جو الفاظ سے ماورا شاعری کا ایک خصوصیت شمار ہوتا ہے -
وہ کہہ رہے تھے " اردو کوئی مسئلہ نہیں ہے جس پر ڈبیٹ کرائی جائے - یا اس کے مفید یا مضر اثرات پر بحث کی جائے
اردو ایک زبان ہے اور زبان کسی اصول سے نہ اچھی ہوتی ہے نہ بُری اور نہ اس کو اختیار کرنے یا نہ کرنے پر کسی مباحث
کی ضرورت ہے - زبان شخصیت اور محسوسات کے اظہار کا آلہ ہے اور میں جب اس آلے کو استعمال کرتا ہوں تو گویا اسے
اپنے لئے واحد اور بہترین ذریعۂ اظہار سمجھ کر ہی استعمال کرتا ہوں - البتہ بعض آلے مصنوعی ہوتے ہیں جو کبھی ذات کا
حصہ نہیں بنتے جب ایک لنگڑے آدمی کی لکڑی کی ٹانگ اسے کبھی اپنے جسم کا جیتا جاگتا حصہ نہیں معلوم ہوتی - انگریزی
پاکستان کے عوام کی زبان نہیں ہے اور جس محدود طبقے میں بولی جاتی ہے اس کے لئے بھی وہ لکڑی کی ٹانگ ہے جس
سے انہیں کبھی تسکین نہیں ہو سکتی " یہ عابد صاحب نہیں بول رہے تھے اُن کی شاعری بول رہی تھی - انہوں نے ایسی
علامت دریافت کی تھی جس کو میں سن کر چونک پڑا تھا - یہ لکڑی کی ٹانگ کب تک ہمارے لئے لازمی رہے گی
یہ سوچ کر مجھے اذیت ہو رہی تھی -

عابد صاحب پھر گویا ہوئے " جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستانی قوم ایک ٹانگ سے محروم ہے اور اس کی
ضرورت ایک لکڑی کی ٹانگ ہے مجھے ان سے صرف اتنا کہنا ہے کہ کاش وہ اپنے گونگے ہونے کا بھی اعتراف
کر لیتے " پھر ذرا جوش سے بولے " کیا ہم میں سے کوئی اس بات کا اعتراف سچے دل سے کرنے کے لئے تیار ہے
کہ وہ لنگڑا اور گونگا ہے اگر نہیں تو پھر انگریزی زبان کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہونی چاہیئے "

میرے متعدد سوالات کے جواب میں عابد صاحب نے اردو کے سلسلے میں اس سے زیادہ گفتگو لاحاصل سمجھی -
اور میرا اس وقت یہ تاثر تھا کہ کاش میں ایک ایک پاکستانی افسر اور قائد سے یہ سوال کر سکتا کہ کیا وہ لنگڑا
اور گونگا ہے ؟

مولوی عبدالحق صاحب کے سلسلے میں عابد صاحب کا لہجہ عقیدتمندانہ ہو گیا - " مولوی عبدالحق اردو کے
اولین معماروں میں تھے - اُن کا کارنامہ اردو کی عمارت کی تعمیر تھا - ان کو ادب کے معیار پر پرکھ کر کوئی فیصلہ کرنا
[illegible] مکان معمار بناتا ہے اور مکین اپنی رہائش اپنے طور پر اختیار کرتے ہیں اس کی تزئین کرتے

۔ اس کو سلیقے سے رہن سہن کے قابل بنانے ہیں۔ اگر کوئی مکان کی تعمیر کا اطلاق مکینوں پر کرنے لگے تو یہ نادانی
ں۔ مولوی صاحب نے یہ مکان تیار کرنے میں جو جدو جہد کی وہ ہماری تاریخ کا ایک حصہ ہے اور ہم مکینوں کو
احسان کو فراموش کر کے خود کو خانہ بردوش ثابت نہیں کرنا چاہیے "

یہ تھے عابد علی عابد اردو کے سپاہی نہیں اردو کے شاعر۔ مگر میرے لئے تو تخیل اور عمل کا مرقع تھے۔ انہیں تا دیر سلامت رکھے۔

عابد صاحب نے لاکھ کچھ نہ بتایا ہو مگر ہم اپنے قارئین کے لئے عابد صاحب کی زندگی کے بارے میں ضروری معلومات مہیا کر رہے ہیں۔ سید عابد علی نام، عابد تخلص۔ ۱۷ ستمبر ۱۹۰۶ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ڈیرہ اسمٰعیل خاں میں پائی جہاں اُنکے والد سید محمد عباس صاحب فوج میں ملازم تھے۔ اس کے بعد رنگ محل مشن ہائی اسکول میں تعلیم پاتے رہے۔ ۱۹۲۳ء میں بی۔ اے اور ۱۹۲۵ء میں ایل ایل بی۔ اپنے فطری ذوق وشوق کی بنا پر اس درمیانی وقفے میں " دلکش" " ہزار داستان" نامی رسائل کی ادارت بھی کرتے رہے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب عابد صاحب ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے ادبی حلقوں میں مشہور ہوئے۔ ۱۹۲۵ء میں عابد صاحب نے گجرات میں وکالت شروع کی۔ مگر علمی و ادبی ذوق انہیں لاہور کھینچ لایا آپ کے مطالعے کا دور پھر شروع ہوا۔ اسی اثنا میں فارسی میں ایم۔ اے کیا۔ عربی کے تنقیدی ادب کا مطالعہ بھی اسی زمانے میں کیا اور دیال سنگھ کالج میں فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ جہاں چار سال کام کرنے کے بعد اسلامیہ؟ ... سی کالج لاہور چلے گئے اور شعبۂ السنہ شرقیہ کے صدر مقرر ہوئے۔

۱۹۴۲ء میں دوبارہ دیال سنگھ کالج میں فارسی کے پروفیسر کی حیثیت سے آئے اور قیام پاکستان کے بعد اسی کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ آج کل مجلس ترقی ادب سے متعلق ہیں۔

گرد و پیش

ناشکائتیں پچھلے دنوں اخبارات کے نمائندوں نے اپنے بعض کالموں میں تین شکایتوں کی طرف اشارہ کیا ہے
چونکہ ان تینوں باتوں کا تعلق ایک مخصوص ذہنیت اور قول و عمل کے تضاد سے ہے اس لئے ان
طرف اشارہ کرنا ضروری ہے ۔ پہلی شکایت تو ایک نمائندے کو یہ ہے کہ پاکستان کونسل لاہور جو ایک قومی ادارہ
، اور ہماری تہذیبی سرگرمیوں کا مرکز بھی ہے وہاں پہنچکر یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اس ادارے کا تعلق پاکستان سے
، کیونکہ سارا ماحول ایک پاکستانی کے لئے اجنبی ہے ۔ نہ صرف طرزِ احساس و فکر کی وجہ سے بلکہ اُس زبان کی
سے بھی جو عہد غلامی کی سب سے بڑی یادگار ہے ۔ دوسری شکایت اسٹوڈینٹس یونین جناح کالج کی صدر اور
بات کو ہے جنہوں نے ایک مشترکہ بیان میں جامعہ کراچی کے وائس چانسلر سے پرزور اپیل کی ہے کہ بی اے
ل اور بی ایس سی فائنل میں انگریزی کا کورس نہ صرف جامعہ کی یادداشتوں کے خلاف ہے بلکہ اس کی کوئی افادیت
نہیں ہے ۔ تیسری شکایت ایک ایسے غیر ملکی کو ہے جو پاکستان کی خبروں سے بہت زیادہ دلچسپی رکھتا ہے اور
کا خیال ہے کہ انگریزی خبروں کے بلیٹن کی تخفیف سے پاکستان کی خبروں کا دائرہ محدود ہو جاتا ہے ۔ تیسری شکایت
ہر دو شکایتوں سے متضاد معلوم ہوتی ہے مگر یہی وہ بنیادی ذہنیت ہے جو باقی دو شکایتوں کا سبب بنی ہے ۔ لہٰذا
یک غیر ملکی کے اُن جذبات کا پورا احترام کرتے ہوئے جو پاکستان کے لئے ظاہر ہوئے ہیں یہ عرض کرنا چاہتے ہیں ۔ کہ
ا ایسے باشعور غیر ملکیوں کے لئے دس کروڑ پاکستانی افراد کی خواہشات کی نفی کرنا کسی طرح بھی ایک آزاد قوم کے شایان
ن نہیں ۔ دوسرے یہ کہ انگریزی خبروں کو یکسر ختم نہیں کیا گیا ہے ۔ بلکہ اُن کے بعض بلیٹن ختم کر کے قومی زبانوں کے بلیٹن
ل کئے گئے ہیں ۔ لہٰذا ایک غیر ملکی کو دو وقت انگریزی خبریں سننے کو مل جاتی ہیں جو اُن کے لئے کافی ہیں ۔ رہیں باقی دو
تیں تو قول و فعل کے اسی تضاد نے پاکستان کو گھن کی طرح کھانا شروع کر دیا ہے ۔ مگر اب تو حکومت اور عوام کے
بان بھی زبان کی دوئی ختم ہو چکی ہے ۔ یہ قومی ادارے آخر کس پاکستان کی نمائندگی کر رہے ہیں ۔

غفلت کی ایک اور مثال مرکزی طبی کانفرنس کی طرف سے حکیم نیر واسطی نے اسلامی ملکوں سے رابطہ پیدا کرنے کی جو تجویز پیش کی ہے اس میں انہوں نے زبان کے سلسلے میں ہماری کوتاہی اور غفلت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ عرب ملکوں میں ہمارے سفارت خانوں میں ایسے روشن خیال علما بھی بھیجے جائیں جو عربی زبان میں پاکستان کا موقف عربوں پر واضح کر سکیں۔ کیونکہ عربوں کو انگریزی سے نفرت ہے اور وہ یہ زبان کم جانتے ہیں اس لئے عربی کا استعمال ایسے ملکوں میں بہت مفید ہوگا آپ نے اسی سلسلے میں حیرت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ میں دس ہزار افراد ایسے موجود ہیں جو اردو سمجھتے اور بولتے ہیں حیرت ہے کہ ہماری طرف سے اُن کو اُردو میں ایسا مواد مہیا کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی گئی جس کے ذریعے یہ ہمارے حالات سے باخبر ہو کر عربوں کو ہماری دشواریوں اور مسائل سے آگاہ کر سکیں۔

تصویر کا دوسرا رُخ

ایک اہم فیصلہ ۵ / نومبر کی ایک خبر مظہر ہے کہ ضلع کونسل سکھر کے ایک اجلاس میں یہ طے کیا گیا ہے کہ آئندہ ضلع کونسل۔ یونین کونسل۔ تحصیل کونسل اور ٹاؤن کمیٹی کی تمام کارروائی اُردو میں ہوگی۔ اور اس کے ساتھ اس فیصلے پر فوری طور پر عمل کرنے کا تہیہ کیا گیا ہے۔

ایک اہم مطالبہ وفاقی ایوان ہائے صنعت و تجارت کے ایک رکن جناب چودھری عبدالرحمن نے یہ مطالبہ کیا ہے کہ اسمبلیوں کی کارروائی صرف قومی زبان میں ہونی چاہیئے۔ اور سرکاری دفاتر میں فوری طور پر اردو کا نفاذ عمل میں آنا چاہیئے۔ چودھری عبدالرحمن نے انگریزی نشریات کے جزوی خاتمے کا خیر مقدم کیا ہے اور کہا ہے کہ جب تک ہم سرکاری دفتروں اور قومی اداروں میں اسی قسم کے فیصلوں پر عمل نہیں کریں گے۔ قومی زبانیں اپنا اصل مقام حاصل کرنے سے قاصر رہیں گی اور اُن کی افادیت بھی کم ہوگی۔

جمعیتہ المدرسین حیدرآباد کا اجلاس جمعیتہ المدرسین حیدرآباد کے ایک اجلاس میں چند قراردادیں منظور کی گئی ہیں جن میں یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ اردو اسکولوں کے لئے ڈپٹی انسپکٹر اور تعلقہ دفتر سے تمام گشتی مراسلے صرف اردو میں جاری کئے جائیں اور تعلقہ دفتر کی طرف سے اسکولوں کتب خانوں اور انعامات کے لئے تمام کتابیں بچوں کے ذہنی معیار کے مطابق صرف اردو ہی میں روانہ کی جائیں۔

لندن میں اُردو لندن میں ایک چھ سالہ بچی مارگریٹ پراسرار طور پر غائب ہوگئی۔ لندن پولیس نے اس کی گمشدگی کے سلسلے میں جو اشتہارات جگہ جگہ لگائے ہیں۔ اُن میں اُردو کے اشتہارات بھی شامل ہیں۔ جن پر اُردو میں لکھا ہے "نوٹس۔ اگر آپ نے اس لڑکی کو دیکھا ہو تو براہ مہربانی پولیس کو اطلاع کریں گ

ـالدین اظہر کا بیان

مرکزی اردو بورڈ کے ڈائرکٹر جناب احمد الدین اظہر نے صدر کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے نئی نشریاتی پالیسی کا خیر مقدم کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ صدر ایوب نے ـانہ نشری تقریر کے لئے اردو کو اختیار کر کے پوری قوم کو رہنمائی کا اصول بخش دیا ہے۔ اُن کے اس اقدام سے ـ دفتری اور معاشرتی زندگی سے تعلق رکھنے والے ادارے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔ چنانچہ ریڈیو اور ـویژن کے اداروں نے فوری طور پر اس کا اثر قبول کیا۔ انہوں نے ریڈ کراس کے نام کی تبدیلی پر بھی اظہار مسرت ـد کیا جوں جوں ہم اپنی زبان کو پھیلنے کا موقع دیں گے اس میں وسعت ہمہ گیری اور گہرائی پیدا ہوگی۔ اگر ہم یہ ـتے رہے کہ اردو پہلے انگریزی کی طرح سمجھ جائے پھر ہم اسے استعمال کریں گے تو یہ دن کبھی نہیں آئے گا۔ یہ دن صرف ـوقت طلوع ہو سکتا ہے جب ہم خود اعتمادی کا ثبوت دیں اور اظہار مطلب کے لئے حتی الامکان اردو سے کام لیں ـکی روشن مثال صدر مملکت نے قائم کی ہے۔

ـیزی نہیں چلے گی۔

سردار غلام فرید ڈپٹی کمشنر ملتان نے جب میاں چنوں کی ایک نواحی یونین کونسل کا معائنہ کیا تو کتاب معائنہ میں انہوں نے دیکھا کہ اُن سے پہلے معائنہ کرنے والے افسروں ـنی رائے انگریزی میں لکھی ہے۔ آپ نے کہا کہ اب پاکستان میں انگریزی نہیں چلے گی اور تمام افسروں اور ملازمین ـہیے کہ اردو لکھیں اردو پڑھیں اور اردو بولیں۔ کیونکہ قومی زبان سے ہی قومی ذہن پیدا ہوتا ہے جبکہ غیر ملکی ـن احساس کمتری اور غلامانہ ذہنیت کی مظہر ہے۔

ـوس الاصطلاحات کی رسمِ پیشکش

مغربی پاکستان اردو اکیڈمی کے زیر اہتمام اردو میں شائع ہونے والی ایک کتاب "قاموس الاصطلاحات" کی رسم پیشکش ـقریب لاہور میں منعقد ہوئی۔ جس میں صوبائی وزیر تعلیم ملک خدا بخش بچّا مہمانِ خصوصی تھے۔ اس خصوصی ـس سے خطاب کرتے ہوئے ادارے کے معتمد عمومی ڈاکٹر سید عبد اللہ نے فرمایا" یہ اکیڈمی مرحوم ڈاکٹر ـیر احمد صاحب نے اردو کے ذریعے سے علوم و فنون کی اشاعت کے لئے قائم کی تھی۔ چنانچہ اب تک یہ اکیڈمی ـنس اور سماجی علوم اور کتب حوالہ تک اپنے کام کو محدود کئے ہوئے ہے۔ اور یہ امر ہمارے لئے باعثِ فخر ہے ـن اکیڈمی کو کم و بیش ڈیڑھ سو سائنسدانوں اور سماجی علوم کے عالموں کا تعاون حاصل ہے۔ اکیڈمی کے پانچ ـے دائرے ہیں۔ علمی، فنی اور سائنسی کتابیں (درسی اور غیر درسی) لکھوانا اس کے علاوہ کتب حوالہ کی تدوین۔ ـنسی موضوعات پر طلبہ اور عوام سے اردو میں انعامی مضمون لکھوانا۔ ہر سال سائنس کے موضوعات پر لیکچر دلوانا ـطلبہ کے لئے جو سائنس کے امتحان اردو میں دینا چاہتے ہیں، لاہور میں اردو کالج کا انتظام اور باہر کے طلبہ کے ـ امدادی لٹریچر مہیا کرنا۔ ذریعۂ تعلیم اور دفتری زبان کے سلسلے میں علمی کانفرنسیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم

وسائل کی کمی کے باوجود، یہ سب کام مسلسل کئے جارہے ہیں۔ گزشتہ چار سال میں اس ادارے نے معمولی گرانٹ کے باوجود جو کام کیا ہے اس کے اعداد و شمار یہ ہیں۔ ۲۰ کتابیں چھاپیں۔ ۷۴ لیکچر دلوائے۔ (۸۰) انعامات تقسیم کئے۔ باہر کے چار ہزار طلبہ کو امدادی مواد پہنچایا۔ تین کانفرنسیں کیں۔ طلبہ کو اردو کالج میں سائنس کی تعلیم دی۔ اردو ذریعۂ تعلیم کی مہم جاری کی اور نشر نامے بھجوائے" ڈاکٹر سید عبداللہ نے مزید فرمایا کہ یہ اکیڈمی ایک ایسے سائنسدان عالم کی یادگار ہے جو ملک بھر میں سائنس کے اردو کالج اور عام معلوماتی مراکز کھولنا چاہتا تھا" آپ نے کہا کہ اردو اکیڈمی کا تازہ ترین کارنامہ، قاموس الاصطلاحات کی اشاعت ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کے بعد ڈاکٹر رضی الدین صدیقی وائس چانسلر اسلام آباد یونیورسٹی اور مغربی پاکستان اردو اکیڈمی کے ڈائرکٹر نے تقریر کی۔ آپ نے فرمایا "قاموس الاصطلاحات جو پروفیسر شیخ منہاج الدین مرحوم سابق پروفیسر و صدر شعبۂ طبیعیات اسلامیہ کالج پشاور و سابق رجسٹرار پشاور یونیورسٹی کی تصنیف ہے۔ اردو اکیڈمی کو اس کی اشاعت کا فخر حاصل ہورہا ہے۔ یہ اردو میں سائنسی علوم کی اصطلاحات کی جامع قاموس ہے۔ پروفیسر شیخ منہاج الدین مرحوم نے ۱۹۲۵ء میں اس کی تدوین کا کام شروع کیا اور دوسرے فرائض کے ساتھ ساتھ اس کا مواد جمع کرتے تھے۔ ۱۹۴۹ء میں اسلامیہ کالج پشاور سے ریٹائر ہونے کے بعد انہوں نے قاموس کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا اور ۱۹۵۵ء کے بعد سے تو وہ شب و روز اس کی تدوین میں مصروف رہے اور زندگی کے آخری لمحے تک ان کا یہ انہماک برابر جاری رہا۔ تا آنکہ ۲۳ راپریل ۱۹۶۳ء کو وہ اس دار فانی سے رخصت ہوگئے" ڈاکٹر رضی الدین صدیقی صاحب نے مزید فرمایا۔ قاموس الاصطلاحات میں نظری سائنس، عملی سائنس اور دیگر علوم کی کم و بیش ساٹھ ہزار انگریزی اصطلاحات کے لئے اردو مترادفات جمع کئے گئے ہیں۔ اس میں میڈیکل سائنس، سرجری، طبیعیات، کیمیا، نباتیات، حیوانیات، ریاضیات، انجینئرنگ، فلکیات، ارضیات، جغرافیہ، اخلاقیات، منطق، سیاسیات، اقتصادیات، عمرانیات، شماریات، معدنیات، تعمیرات، جرثومیات، علم تشریح اور دیگر علوم و فنون سے متعلق اصطلاحات شامل ہیں" آپ نے کہا "میں بڑی مسرت اور احساس فخر سے اس قاموس کو جس کا انتساب عالی جناب ملک امیر محمد خاں گورنر مغربی پاکستان نے قبول فرمایا ہے اب پبلک میں لاتے ہوئے اس کا نسخہ بطور پیش کش مغربی پاکستان کے وزیر معارف جناب ملک خدا بخش بچا صاحب کی خدمت میں پیش کرتا ہوں" (جناب ملک خدا بخش بچا صاحب کا خطبۂ صدارت" قومی زبان" کے اسی شمارے میں دیا جارہا ہے۔)

آئینہ خانے میں

برٹرینڈ رسل کا اعلان حق نامور برطانوی مفکر لارڈ برٹرینڈ رسل نے کہا ہے کہ ایشیا کو جنگ سے بچانے

کے لئے مسئلہ کشمیر کا تصفیہ بے حد ضروری ہے۔ آپ نے اپنے ایک خط میں پاکستان کے اس مطالبے کو جائز اور منصفانہ قرار دیا ہے کہ فائر بندی اور مسئلہ کشمیر کا سیاسی تصفیہ ایک ہی بات ہے اور دونوں باتوں پر ساتھ ساتھ عمل ہونا چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ کشمیری عوام کو یہ حق ملنا چاہیے کہ وہ آزادانہ رائے شماری کے ذریعے اپنے مستقبل کا فیصلہ کر سکیں۔

ایک تردید

پاکستانی ہائی کمیشن دہلی نے بھارتی خبررساں ایجنسی کی اس خبر کی پرزور تردید کی ہے کہ حکومت پاکستان نے مشہور بنگالی شاعر نذر الاسلام کے پس ماندگان کی ماہانہ پنشن بند کر دی ہے۔ ہائی کمیشن کے اعلامیے میں بتایا گیا ہے کہ ہنگامی حالات میں ادائیگی میں تاخیر کے معنی پنشن کا بند ہونا نہیں ہے۔ بعد کی خبر میں بتایا گیا ہے کہ یہ پنشن اسی طرح جاری ہے۔

پروفیسر بوسانی کا اعتراف

اٹلی کے ممتاز عالم جناب اے بوسانی نے ایک تقریر میں اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ اسلام نے دنیا کو نہ صرف روح کی سائنس عطا کی ہے بلکہ مادے کی سائنس سے بھی مالا مال کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ یورپ اور دنیا کے دیگر ممالک کی موجودہ سائنس اور ثقافت، اسلامی سائنس ـ تکنیک اور ثقافت کی مرہون منت ہے۔ ممتاز پروفیسر نے اپنی تقریر میں متعدد مثالوں سے یہ ثابت کیا اور کہا کہ سسلی کے شاہ فریڈرک دوم نے مسلمان علما اور سائنس دانوں کے کارناموں پر انہیں خراج تحسین پیش کیا تھا۔

پاکستانی طالب علم طارق علی

برطانیہ کی ایک نئی انقلاب پسند سیاسی جماعت " دی ریڈیکل الائینس " نے اعلان کیا ہے کہ اگلے عام انتخابات میں قانون کے بائیس سالہ طالب علم مسٹر طارق علی برطانوی وزیر خارجہ مسٹر مائیکل اسٹیوارٹ کے مقابلے میں انتخاب لڑیں گے۔ مسٹر طارق علی آکسفورڈ یونیورسٹی یونین کی انجمن مباحثہ کے صدر بھی رہ چکے ہیں اور یونین کے انتخابات میں انہوں نے سابق لیبر وزیر خارجہ گارڈن واکر کے صاحبزادے کو شکست بھی دی تھی۔

ایک ادیب کا انجام

اٹھاون سالہ روسی مصنف تارسس کو جو دو کتابوں کا مصنف ہے اور جس کی شہرت مغرب سے نکل کر دنیا کے دیگر ممالک تک پھیلتی جا رہی ہے۔ روس میں پاگل اور ذہنی مریض قرار دے دیا گیا ہے۔ ابتدا میں وہ کمیونسٹ تھا مگر جب اس نے ادیب کی حیثیت سے اپنے ضمیر کی آواز پر لکھا تو پہلے اسے ناپسندیدہ قرار دیا گیا اور جیسے جیسے اس کی تصانیف مغرب میں مقبول ہوتی گئیں ویسے ویسے روس میں اس کی قدر و منزلت گھٹتی گئی۔ اب یہ حال ہے کہ امریکہ اور برطانیہ کے بینکوں میں اس کے نام لاکھوں پونڈ جمع ہیں اور وہ خود روس میں پاگل خانے میں زندگی کے دن گزار رہا ہے۔

تعلیمی۔ تہذیبی اور علمی خبریں

ادارہ مصنفین پاکستان کی ایک تقریب

ادارۂ مصنفین پاکستان کراچی نے "لاہور کو سلام" کے نام سے ایک شعری تقریب منعقد کی جس کی صدارت اختر حسین صدر انجمن ترقی اردو نے فرمائی۔ اس تقریب میں لاہور کے مہمان ادیبوں اور شاعروں نے حالیہ جنگ کے بارے میں اپنے تاثرات پیش کئے۔ جناب اختر حسین نے مہمان شعرا اور ادیبوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے موجودہ ہنگامی دور میں ادیبوں اور دانشوروں کی خدمات کا اعتراف کیا۔ جناب جمیل الدین عالی معتمد پریس ٹرسٹ و انجمن ترقی اردو نے اُن ادیبوں اور شاعروں کا تعارف کرایا جو اس تقریب کے شرکت کے لئے لاہور سے تشریف لائے تھے۔ جناب انتظار حسین نے ایک مضمون پڑھا اور صفدر میر نے اپنی نظم "لاہور" سنائی۔

بزم ثقافت کا رزمیہ مشاعرہ

خیرپور سرکٹ ہاؤس میں ۸ر نومبر کو بزمِ ثقافت کے زیر اہتمام ایک رزمیہ مشاعرہ ہوا جس کی صدارت خیرپور ڈویژن کے کمشنر جناب رفیق عنایت مرزا نے کی۔ آپ نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا "ادیب و شاعر قوم میں فکری انقلاب کے ضامن ہیں اور انہیں انسانی ثقافت اور تاریخ میں ہمیشہ اعلیٰ مقام حاصل رہا ہے اور شعرا نے ہر دور میں نہ صرف حالات کی عکاسی کی ہے بلکہ قوموں کی صحیح رہنمائی بھی کی ہے۔"

ریڈیو کے فنکاروں کے لئے مراعات

جناب ظہور آذر ڈائرکٹر جنرل ریڈیو پاکستان نے ۱۲ر نومبر کو اپنی ایک پریس کانفرنس میں بتایا کہ حکومت پاکستان اس بات پر رضامند ہوگئی ہے کہ ریڈیو پاکستان کے اسٹاف آرٹسٹوں کو مراعات دی جانی چاہئیں۔ انہوں نے ان مراعات کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ انہیں گریجویٹی کا حق حاصل ہوگا۔ اور ان سے سالانہ کنٹریکٹ کے بجائے اب پانچ سال کا کنٹریکٹ کیا جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ یہ فیصلے پاکستان کی نشریات کے مستقبل کے لئے نہایت خوشگوار ثابت ہوں گے۔

نشریات کو بہتر بنانے کے لئے

"ریڈیو پاکستان کی نشریات کو بہتر بنانے کے لئے عوام سے تجاویز طلب کی جائیں گی" یہ بات ۱۲ر نومبر کو براڈ کاسٹنگ کمیٹی کے چیرمین جناب ممتاز حسن نے ایک پریس کانفرنس میں کہی۔ آپ نے کمیٹی کے اس فیصلے کا اعلان کرتے ہوئے بتایا کہ نشریات کے بارے میں ایک جامع سوالنامہ جاری کیا جائے گا جو ملک بھر کے دانشوروں، نشریات سے دلچسپی رکھنے والوں، مختلف انجمنوں اور اداروں کو تقسیم کیا جائے گا۔ اور ان کے جوابات کی روشنی میں نشریات کو

بہتر بنانے کی کوشش کی جائے گی - جناب ممتاز حسن نے ریڈیو پاکستان کی اُن خدمات کو خراجِ تحسین بھی پیش کیا جو اس نے ہنگامی حالات میں انجام دی ہیں

ادارۂ مصنفین پاکستان کا وفد

ادارۂ مصنفین پاکستان کے منصوبے کے مطابق ایک چار رکنی وفد نے مغربی پاکستان اور کشمیر کے مختلف محاذوں کا دورہ کیا - جس کا مقصد یہ تھا کہ واقعاتِ جنگ - سے متعلق صحیح معلومات اور تجربات حاصل کئے جائیں اور پھر اُن کی بنیاد پر قومی دفاع کے لئے قلمی مہم شروع کی جائے - وفد میں - سید انور معتمد ادارۂ مصنفین کراچی شاخ - صہبا لکھنوی مدیر ماہنامہ افکار - غازی صلاح الدین سب ایڈیٹر روزنامہ لیڈر اور شفیع عقیل روزنامہ جنگ شامل تھے -

شہر شہر اور گلی گلی

ادارۂ مصنفین پاکستان کے جنرل سکریٹری جناب جمیل الدین عالی نے اپنے ایک بیان میں کہا ہے کہ ادارہ کچھ عرصے بعد ملک کے دونوں حصوں کے درمیان ادیبوں اور شاعروں کا تبادلہ کرے گا جو کئی شہروں کا دورہ کریں گے - اور پاکستان و بھارت کی جنگ پر اپنی تحریریں پڑھینگے اس پروگرام کے تحت شعرا اور ادیب مغربی پاکستان کے پانچ اور مشرقی پاکستان کے چار شہروں کے محلوں اور گلیوں میں اپنی تخلیقات سے عوام کو روشناس کرائیں گے -

دانشوروں کی مجلس مذاکرہ

لاہور میں ایک مجلس مذاکرہ ۱۲ر نومبر کو منعقد ہوئی جس میں متعدد دانشوروں اور اہم ادبی شخصیتوں نے حالیہ جنگ کے پاکستانی ادب پر تاثرات کا جائزہ لیا - اور متعدد دانشوروں نے اس خیال سے اتفاق ظاہر کیا کہ ہمارے ادب میں اب خود اعتمادی - حب الوطنی اور سامراج دشمنی کے عناصر غالب آ گئے ہیں اور ادب برائے ادب کا مریضانہ نظریہ ہمیشہ کے لئے دفن ہوگیا ہے مذاکرے میں جن حضرات نے حصہ لیا ان میں سید مطلبی فرید آبادی ، نعیم صدیقی ، احمد الدین اظہر اور ڈاکٹر عبد السلام خورشید قابلِ ذکر ہیں -

اسلامی قانون کا انسائیکلوپیڈیا

اسلامی ریسرچ کے مرکزی ادارے نے اسلامی قانون کا انسائیکلوپیڈیا شائع کرنے کا منصوبہ بنایا ہے - اس وقت اس ادارے میں ۳ پروفیسر ۲ ریڈرز ۵ ریسرچ فیلو اور ۲ محقق شامل ہیں - اس کے علاوہ چند ایسے علما کی خدمات بھی حاصل کی جائیں گی جو جدید سائنس کے ماہر ہوں گے اور دنیا کے موجودہ مسائل کی روشنی میں اسلام کا پیغام پیش کرنے میں مدد دیں گے - ریسرچ کے عملے کا تقرر ارکان کی اسلامی تعلیم اور تجربے کی بنیاد پر کیا گیا ہے -

محاذِ سخن کی اشاعت

اسلامیہ کالج سکھر میں انجمن محبانِ وطن سکھر کے زیرِ اہتمام شعری مجموعہ " محاذِ سخن " کی تقریبِ افتتاح میں تقریر کرتے ہوئے سکھر کے ڈپٹی کمشنر جناب شیخ اظہار الحق نے

فرمایا کہ بھارتی جارحیت کے خلاف پاکستانی ادیبوں اور شاعروں نے جو خدمات انجام دی ہیں انہیں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ آپ نے ادیبوں اور شاعروں سے اپیل کی کہ وہ عوام میں اس جذبے کو برقرار رکھنے کی سعی کریں جو ان میں پیدا ہو چکا ہے۔

ملتان پریس کلب میں

تھنکرز فورم کے جنرل سکریٹری اور انکم ٹیکس کے کمشنر جناب تجمل حسین نے ۲۸ نومبر کو ملتان پریس کلب میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ آرٹسٹوں اور ادیبوں نے ملک کے دفاع کے لئے جو نمایاں خدمات انجام دی ہیں ان سے ہمارے ادب کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے۔ ہمارے ادیب ملک کے محافظ اور قوم کے معمار کی حیثیت سے اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔

اردو ٹائپ کی تیاری

ٹائپوگرافیکل ریسرچ سینٹر کے ڈائرکٹر جناب زیڈ۔ اے۔ تمنائی ۲۲ نومبر کو برطانیہ اور یورپ کے دیگر ملکوں کے دورے پر روانہ ہو گئے جناب تمنائی آئی اردو بورڈ کی ٹائپ رائٹر کمیٹی کے رکن اور فنی مشیر بھی ہیں۔ وہ جرمنی میں اردو ٹائپ رائٹر بنانے والی کمپنی کو پاکستان کے لئے اردو ٹائپ مشینیں تیار کرنے کے لئے فنی امداد دیں گے۔ واضح رہے مغربی جرمنی کے ایک کارخانے نے اردو ٹائپ رائٹر کا جو تختہ تیار کیا تھا اسے پاکستان کا معیاری کلیدی تختہ تسلیم کر لیا گیا ہے۔

دانشوروں کی ایک تجویز

ادارۂ محبان عالم اسلامی کے زیر اہتمام مجلس مذاکرہ میں تقریر کرنے والے تمام مقررین نے ۲۷ نومبر کو لاہور میں اس بات پر زور دیا ہے کہ پاکستان کو اسلامی ملکوں کا ایک طاقتور بلاک بنانا چاہیے۔ مجلس مذاکرہ کے صدر جناب چودھری نذیر احمد نے اپنی تقریر میں کہا کہ حالیہ پاک بھارت جنگ کے دوران پاکستان کو اسلامی ملکوں کی جانب سے جو اخلاقی اور مادی امداد ملی ہے وہ ظاہر کرتی ہے کہ دنیا میں ایک "اسلامی بلاک" کی تشکیل کے امکانات روشن ہیں۔ مجلس مذاکرہ سے ڈاکٹر سید عبداللہ اور ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے بھی خطاب کیا۔

وائس چانسلروں کا اجتماع

مغربی پاکستان کی سات یونیورسٹیوں کے تمام وائس چانسلروں کا ایک اجلاس ۳۰ نومبر کو لاہور میں ہوا۔ صوبائی وزیر تعلیم ملک خدا بخش بُچا صدارت کر رہے تھے۔ معلوم ہوا ہے کہ اس اجلاس میں جن اہم مسائل پر غور و خوض ہوا ہے اُن میں فوجی تربیت، تعطیلات کی معیاد اور ذریعۂ تعلیم شامل ہے۔ ذریعۂ تعلیم پر خصوصیت سے اردو کو انگریزی کی جگہ دینے پر تبادلۂ خیال کیا گیا۔

یادوں کے چراغ

شاہ لطیف بھٹائی کی یادگار

شاہ عبداللطیف بھٹائی کلچرل کمیٹی نے فیصلہ کیا ہے کہ ان ادیبوں اور فنکاروں کو جو اس عظیم درویش اور شاعر کے پیغام اور فلسفے کی وضاحت بہتر انداز میں کر سکیں انعام دیا جائے گا۔ کمیٹی کے اجلاس میں جو کمشنر حیدرآباد جناب سرور حسن خاں کی صدارت میں بھٹ شاہ میں ہوا تھا یہ طے کیا گیا کہ شاہ بھٹائی کی تصانیف پر بہترین مضمون لکھنے والے کو ایک طلائی تمغہ دیا جائے گا اور اس سلسلے کی بہترین تصویری پیش کش پر پانچ سو روپے اور فوٹو گرافی کی بہترین کاوش پر تین سو روپے دیئے جائیں گے۔ کمشنر نے کمیٹی کو ہدایت کی ہے کہ شاہ لطیف کے اشعار کا ترجمہ اردو۔ بنگالی اور دیگر علاقائی زبانوں میں کیا جائے تاکہ پاکستان کے تمام افراد کو ان کا فلسفہ اور پیغام سمجھنے میں مدد ملے۔ کمیٹی نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ بھٹ شاہ کلچرل سینٹر شاہ لطیف کے مقبرے کے تصویری کارڈ بھی شائع کر کے فروخت کرے اور عجائب خانے کے لئے ایک کیوریٹر کا تقرر بھی کرے۔

جسٹس کیانی کی تیسری برسی

پاکستان کے مشہور قانون داں اور عظیم مفکر جسٹس ایم۔ آر کیانی کی تیسری برسی پاکستان کے طول و عرض میں بہت عقیدت سے منائی گئی۔ ان کے آبائی وطن شاہ پور میں یہ برسی مرحوم کے خاندان والے مناتے ہیں مگر انہوں نے اس مرتبہ تمام اخراجات دفاعی فنڈ میں دینے کا فیصلہ کیا جس سے بہتر خراج عقیدت مرحوم کو پیش نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جسٹس کیانی مرحوم دلاہور میں بھی خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے جلسے ہوئے۔ ایک جلسہ ہائی کورٹ بار روم میں منعقد ہوا جس میں مختلف مقررین نے مرحوم کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔

اقبال تصویروں میں

فقیر سید وحید الدین کی تازہ ترین کتاب "اقبال تصویروں میں" قومی عجائب گھر کو پیش کر دی گئی۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے نیشنل بینک کے مینیجنگ ڈائریکٹر جناب ممتاز حسن نے فرمایا کہ علامہ اقبال پہلے فلسفی تھے جنہوں نے اسلامی معاشرے کی "نئی زندگی" کے لئے واضح منشور پیش کیا اور اسلام کو ایک ایسی قوت قرار دیا جو انسان کو جغرافیائی اور نسلی حدود سے نکال کر ایک نئی دنیا میں پہنچا دیتی ہے۔ اس سے قبل ڈائریکٹر محکمۂ آثار قدیمہ جناب الیف۔ اے خاں نے فقیر سید وحید الدین اور ان کی پیش کردہ کتاب کا شکریہ ادا کیا۔

یوم ظفر علی خاں

۲۸ نومبر کو لاہور میں پاک و ہند کے عظیم رہنما و صحافی مولانا ظفر علی خاں کا یوم منایا گیا۔ اخبار فروش یونین کی طرف سے منعقدہ ایک جلسے میں علامہ علاؤ الدین صدیقی نے کہا کہ

اس برصغیر میں صدیوں سے اسلام کی حفاظت کی جو تحریک چل رہی تھی - مولانا ظفر علی خاں اسی تحریک کی ایک نمایاں کڑی تھے - اخبار فروش یونین کے سکریٹری مولانا حبیب اور صدر چودھری عبدالرشید نے بھی مولانا کی یاد میں تقریریں کیں - صدر جلسہ جناب جسٹس احمد جان نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ اس برصغیر کے مسلمان مولانا ظفر علی خاں کے احسانات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے وہ ایک ایسی شخصیت تھے جس نے اپنے قلم اپنی زبان اور اپنی علمیت سے پاک وہند کو بیرونی سامراج سے آزادی دلائی - جلسے سے خطاب کرنے والوں اور مولانا کو منظوم خراج عقیدت پیش کرنے والوں میں عبداللہ ملک، احمد ندیم قاسمی اور استاد دامن قابلِ ذکر ہیں -

عبدالماجد مرحوم کی یاد میں

ریڈیو پاکستان کے مشہور فنکار اور ادیب عبدالماجد مرحوم کی یاد میں آرٹ کونسل کی عمارت میں ایک خصوصی تقریب منائی گئی - جس میں مقررین نے مرحوم کی صلاحیتوں پر روشنی ڈالی اور موسیقاروں نے قومی نغمے پیش کئے - اس کے علاوہ ایک مشاعرہ بھی ہوا جس کی صدارت حکیم محمد سعید دہلوی نے فرمائی اور تمام قابلِ ذکر شعرا نے شرکت کی مشاعرہ رزمیہ نظموں اور تخلیقات پر مشتمل تھا -

عرش تیموری کی برسی

روزنامہ جنگ کے ادارے کی طرف سے عرش تیموری مرحوم کی پہلی برسی کے موقع پر ایک جلسہ منعقد کیا گیا - جس میں ادارے کے کارکنان کے علاوہ دیگر اہلِ علم نے بھی عرش مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا - سید محمد تقی نے اپنی تقریر میں کہا کہ ادیب اپنے قلم کی طاقت پر زندہ نہیں رہ سکتا - یہ ہمارے معاشرے کا المناک اور تاریک پہلو ہے - جس کی وجہ سے عرش کو اپنی صلاحیتوں سے کام لینے کا پورا موقع نہیں ملا - اس موقع پر فاتحہ خوانی بھی ہوئی -

ماتم میں ہم شریک

ادارۂ قومی زبان ان سانحوں پر دلی رنج کا اظہار کرتا ہے جن کا صدمہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، جناب الطاف گوہر اور ارم لکھنوی کو برداشت کرنا پڑا ہے - ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی اہلیہ محترمہ، جناب الطاف گوہر کے والدِ محترم اور ارم لکھنوی کی والدہ ماجدہ کے انتقال پر اپنا دلی افسوس کا اظہار کرتے ہوئے ان حضرات کے غم میں برابر کا شریک ہے - خدا مرنے والوں کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے - آمین

○

گنج ہائے گراں مایہ

انجمن کے مخطوطات کی وضاحتی فہرست (جلد دوم)

مرتبہ افسر صدیقی امروہوی

دوسری جلد کے مندرجہ ذیل مخطوطات پر قومی زبان میں حواشی شائع ہو چکے ہیں

۱۔ وصیت نامہ ․․․․․
۲۔ فتح المجاہدین مسکین
۳۔ شفاعت نامہ عبدالقادر
۴۔ قصہ شاہ جمجمہ کمترین
۵۔ تلقین الہدیٰ عاصی
۶۔ تنبیہ العوام شاہ محمد بدھن احقر
۷۔ مثنوی گوہر ابراہیم گوہر
۸ حملہ حیدری ذوالفقار علی صفا
۹/۱۰۔ محی الدین نامہ (دو نسخے) عبدالملک عبد
۱۱۔ دیوان ہمت خواجہ ہمت علی خاں
۱۲۔ گنج قدرت اعزالدین خاں نامی
۱۳۔ فتح نامہ یٰسین
۱۴۔ پند نامہ جعفر زٹلی
۱۵۔ دیوان تمنا اسد علی خاں تمنا
۱۶۔ تاریخ فیض عام مہدی
۱۷۔ حشر نامہ ․․․․
۱۸۔ قصیدہ غوثیہ رحمت اللہ
۱۹۔ نصائح الاطفال رضا
۲۰۔ نصیحت نامہ ․ ․ ․
۲۱۔ مذمت بے نمازاں ․ ․
۲۲/۲۶۔ شمائل نامہ (پانچ نسخے) عبدالمحمد ترین
۲۷/۲۸۔ تنبیہ نامہ (دو نسخے) ولی
۲۹۔ معجزہ حضرت فاطمہ فاروقی
۳۰/۳۲۔ دیوان فراق (تین نسخے) ثناء اللہ خاں فراق دہلوی
۳۳۔ صبح نوبہار عشق محمد باقر آگاہ
۳۴۔ گلزار عشق ″ ″
۳۵۔ ندرت عشق ″ ″

اس شمارے میں مندرجہ ذیل مخطوطات پر تفصیلی حواشی دیے جا رہے ہیں۔

۱۔ محبوب القلوب محمد باقر آگاہ
۲۔ ″ ″ (نسخہ ثانی) ″ ″

محبوب القلوب

سائز ۸ × ۶ صفحات ۱۳۴ سطور ۱۱ سنہ تصنیف ۱۲۱۲ھ/۱۷۹۷ء سنہ کتابت ۱۲۳۱ھ

محبوب القلوب مولوی محمد باقر آگاہ کی ایسی تصنیف ہے جس کے شروع میں نثری دیباچہ بھی ہے یہ دیباچہ ۱۷۹۲ء میں صدی عیسوی کے آخر کی دکنی نثر کا نمونہ سمجھنا چاہیئے جو تو طرز مرصع سے سات سال قبل لکھا گیا اور فورٹ ولیم کالج کلکتہ جس کے سر ابتدائی نثری کتابوں کی اشاعت کا سہرا ہے اس دیباچہ کی تصنیف سے ۸ سال بعد جاری ہوا۔

ڈاکٹر زور مرحوم نے محبوب القلوب کا سنہ تصنیف ۱۲۰۷ھ تحریر کیا ہے (تذکرہ مخطوطات اول ص ۴۲ و چہارم ص ۱۱۱) ہاشمی مرحوم کی تحقیق بھی یہی ہے (فہرست کتب خانہ سالار جنگ ص ۴۵) لیکن نسخہ زیر تبصرہ میں یہ سنہ ۱۲۲۴ھ ہے مصنف نے کتاب کے آخر سنہ تصنیف و تعداد ابیات کا اظہار کر دیا ہے ؎

تھا ششم سال بارہ سو اوپر جب   بقال خوش ہوا ہے یہ مرتب
تمام ابیات ان کی اسے مساعد   ہوئے چار الف و تر سٹھ بے قصائد

اس تعداد میں قصائد کی ابیات (۱۱۰) اور شامل کر لی جائیں تو کل اشعار (۴۱۷۳) ہو جاتے ہیں۔ مخطوطہ میں غلط سنہ درج ہونے کا اشتباہ اس لئے نہیں ہو سکتا کہ ایک مطبوعہ نسخے میں بھی جو مطبع معدن فیض سے ۱۲۸۱ھ میں شائع ہوا اور جس کا ایک نسخہ انجمن کے کتب خانہ خاص میں موجود ہے یہ بیت اسی طرح چھپی ہوئی ہے۔

آگاہ نے محبوب القلوب کی تصنیف میں متعدد فارسی کتابوں خصوصاً بحجتہ الاسرار سے مدد لی ہے ؎

بہت نسخوں سے یہ مضمون لیا ہوں   بہت تحقیق سے اس کو لکھا ہوں
ولیکن بحجتہ الاسرار سے یار   ہے اصل ان سبکی بے تکرار اے یار

آگاہ اپنی زبان کو اردو نہیں کہتے بلکہ مقامی زبان قرار دیتے ہیں اور وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ یہاں اردو کو کوئی سمجھتا ہی نہیں سب اُمّی ہیں ؎

لکھا ہوں صاف یہ نظم اے برادر   کہ ہے کام اُمّیوں سے اس میں اکثر

اولیا چار قسم پر لکھے ہیں -

اس کے بعد چاروں قسموں کی تشریح بیان کرکے ان کتابوں کے نام گنائے ہیں جن سے محبوب القلوب کی تصنیف میں مدد لی گئی ہے یعنی (۱) انوار الناظر فی مناقب السید عبد القادر (۲) روضة النواظر و نزهة الخواطر فی مناقب السید عبد القادر (۳) بهجة الاسرار و معدن الانوار (۴) خلاصة المفاخر (۵) روض الناظر (۶) روض الظاهر (۷) درالفاخر یہ سب کتابیں عربی میں ہیں فارسی کی کتابوں میں ترجمہ خلاصة المفاخر تحفة القادریہ - مناقب غوثیہ اور محبوب المعانی کا نام دیا ہے - ان میں آخری کتاب کی بہت تعریف کی ہے جس کے مصنف میر محمد صادق قادری اورنگ آبادی ہیں -

مصنف نے کتاب کو گیارہ وصل اور ۸۴ جلووں میں تقسیم کیا ہے - پہلے پانچویں دسویں گیارہویں وصل میں دو دو - چوتھے وصل میں تین تیسرے اور آٹھویں وصل میں چار چار - دوسرے وصل میں پانچ - ساتویں وصل میں چھ - چھٹے وصل میں سات اور نویں وصل میں گیارہ جلوے ہیں -

نثری دیباچہ اس بیت پر ختم ہوتا ہے ؎

اے ترا خط خوب و لفظ و معنی و اسلوب خوب ❊ بر زبانِ اہلِ دل نامِ تو محبوب القلوب

اصل کتاب کا آغاز ان ابیات سے ہوتا ہے ؎

کرے کوئی حمد تیرا کیا الٰہی ❊ کہ ہے قدرت تری مہ تا بماہی
تو ہے خلاقیت میں ایسا قادر ❊ کہ یک کن سے کیا عالم کو ظاہر
ہیں عالم مردہ اے محی (دو) عالم ❊ حیات ان کو ہے تیرے سے بہر دم

اختتام :-

پڑھ اس کو ہوئیگا مسرور تو جب ❊ دعا کر با قر حیراں کیتیں جب
کہ شاید تجہ دعا سے اے برادر ❊ عاصی اوسکے بخشے جائیں یکسر
ملے جمعیت دل اوسکو ہر آن ❊ ہور اوسکا خاتمہ ہووے با ایمان
میں لکھتا ہوں یہاں اب یک قصیدہ ❊ نہایت بے تکلف اور رسیدہ
لکھا نہیں مثنوی میں جو کرامات ❊ یہاں لکھتا ہوں کچھ تلمیح کے سات
ہور اوس میں حال اپنا بولتا ہوں ❊ گرہ طالع کی اپنے کھولتا ہوں
پس اوس کے بعد لکھ دوسرا قصیدہ ❊ بپا یاں می رسانم ایں جریدہ
ہے یہ دوسرا قصیدہ شاعرانہ ❊ ہے مانند ردیف اپنے یگانہ

پہلا قصیدہ - مطلع ؎

پڑا ہوں ورطۂ اندوہ و محنت میں بحیرانی مری اب دستگیری کر تو لے محبوب سبحانی

مقطع ؎

اگر پاویں گے تیری مہر سے رنگ قبولیت یہ آنسو میرے ہو جاوینگے سب لعل بدخشانی

دوسرے قصیدہ کا مطلع و مقطع یہ ہے ؎

کیوں حسن کا دکھا دے ہے کرّ و فر آفتاب ٹک دور کر نقاب کہ ہو شیر آفتاب

آیات تیری نسخۂ آفاق میں رقم یوں پاویں جس کا ہو ورق اصغر آفتاب

ترقیمہ :- الحمد اللہ رب العالمین و شکر و للہ رب العالمین والفضل وللہ رب العالمین وتمت الکتاب مستطاب ملک الوہاب اعنی محبوب القلوب تصنیف حضرت محمد باقر آگاہ شافعی ویلوری رحمۃ اللہ علیہ والرضوان - نقل کتاب پہلے بعرصۂ دو ماہ بکمال پراگندگی اور دفع وبائے طاعون کے واسطے حضرت جناب محبوبیت کا وسیلہ کہ گزشتہ حضرت یازدہم ماہ ربیع الثانی بروز پنجشنبہ شریف کیتیں شروع کیا ہوں اور دسویں جمادی الآخر بروز چہارشنبہ ۱۳۱۶ھ کے تین بخط کج مجہ غلام غوث الثقلین غلام محی الدین حسین بن حضرت غلام محمد صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ والرضوان

اس ترقیمے کے بعد کاتب نے کچھ اپنے حالات لکھے ہیں جس کا اختتام ایک دعا پر ہوتا ہے پھر آگاہ کے قصیدۂ ثانی کی زمین میں دو مطلعی قصیدہ تحریر کیا ہے جس کے مقطع میں مبیّن تخلص آیا ہے شاید یہ تخلص کاتب کا ہو - مقطع یہ ہے ؎

بس اب مبیّں دعا پہ قصیدے کو ختم کر دشمن ترا ہو ذرّہ ، محب خوشتر آفتاب

تمت الکتابت مستطاب ملک الوہاب اعنی محبوب القلوب مع قصائد و بتاریخ دسویں جمادی الآخر بروز چہارشنبہ ۱۳۱۶ھ مقدمہ .... وسیلہ سے حضرت حبیب و محبوب کے نجات دارین ملجاوینگے آمین یارب العالمین

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد بہ رب العباد و بحق شاہ بغداد و بخط غلام محی الدین حسین بن حضرت غلام محمد صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ والرضوان باتمام رسایند

دو سادہ صفحات کے بعد کاتب نے ایک اور عبارت لکھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس محبوب القلوب کا مخطوطہ ۲۶ محرم الحرام ۱۳۲۰ھ کو اپنے مرشد سید ابوبکر عبدالرزاق شاہ عرف پیر ...

قبلہ قادری باشندہ چیکری کی نذر کیا - اس عبارت کی آخری سطر میں لکھا ہے " رجوع غلام محی الدین حسن نائیطی بن حضرت غلام محمد صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ والرضوان ساکن نیلونگل ڈ -

محبوب القلوب کے چار نسخے کتب خانہ آصفیہ میں ہیں جن کے نمبر سوانح میں (۱۵، ۸، ۲۳، ۴۳) اور مناقب میں (۵۳ - ۹۶) ہیں ایک نسخہ جامعہ عثمانیہ میں ہے اس کا نمبر ۳۲ ہے ایک نسخہ کتب خانہ سالارجنگ میں ہے نمبر ۹۹۴ - نیز ادارۂ ادبیات حیدرآباد میں تین نسخے ہیں ۲۹۶ جلد اول ۱۹۷ و ۸۲ جلد چہارم ،ایک نسخہ برٹش میوزیم میں ہے (اورنیٹل ۱۰ ۶۵)

محبوب القلوب (نسخہ ثانی)

سائز ۸½ × ۵½ صفحات ۳۶۵ سطور ۱۳ سنہ تصنیف ۱۲۰۶ھ سنہ کتابت ۱۲۴۹ھ

محبوب القلوب کا یہ مخطوطہ پہلے نسخے کے مقابلے میں کافی قدیم ہے - تقریباً تمام صفحات کرم خوردہ ہو چکے ہیں لیکن غنیمت یہ ہے کہ کرم خوردگی کا اثر متن پر بالکل نہیں صرف سادہ حاشیہ چھلنی ہوا ہے - خط نستعلیق تو ہے مگر اس میں پختگی نہیں ہے - عنوانات سرخ روشنائی سے لکھے ہیں جدولیں بالکل نہیں ہیں

محبوب القلوب میں کچھ ابیات ایسی ملتی ہیں جن کی زبان پنجابی اور ہریانی زبان سے مماثلت رکھتی ہے - مثلاً ؎

کہا سرور خلیل صرصری سے   مرنیگا نا تو جب لگ قطب ہوسے

نہوگا صرصری نے قطب جب لگ   نہ مرجا ڈیگا بے شبہ وہ تب لگ

پہلی بیت میں " ہوسے " اور دوسری بیت میں " صرصری نے نہوگا " پنجاب کی نمائندہ ہیں

مخطوطہ زیر تبصرہ کا آغاز و اختتام پہلے نسخے کے مطابق جو آخر میں دونوں قصیدوں کے پورے اشعار ہیں البتہ ترقیمہ کے بعد ایک منقبت اور ایک مناجات فارسی زبان کی زائد لکھی ہوئی ہے جو نسخہ اول میں نہیں تھی -

لطافت شعر کی وہ جانتے ہیں نزاکت اس کی کچھ پہچانتے ہیں
بہی اردو کی زباں میں نیں کہا میں کہ اوس بہاکے کو یہاں کوئی جانتے نیں

محبوب القلوب میں غوث صمدانی محبوب سجانی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے اوصاف حمیدہ کا بیان ہے عنوانات سرخ روشنائی سے فارسی زبان میں لکھے گئے ہیں خط پختہ نستعلیق ہے۔ جس میں قدامت کی جھلکیاں جگہ جگہ نظر آتی ہیں مثلاً ؎

یہی کہتا سب کو وہ تاج اکابر اوٹھو تم سب ولی اللہ کے خاطر
ہوئی جب اوس سے یہ صورت کئی بار مریداں اوس سی پوچھی ای صفا کار
تو اب سب اولیا کا مقتدا ہے یہہ پر کے کے ادب کا وجہ کیا ہے

مولوی محمد باقر آگاہ کے حالات ان کی تصانیف کے سلسلے میں درج کئے جا چکے ہیں لیکن یہاں ایک اہم بات کا اظہار ضروری ہے ڈاکٹر زور اور ہاشمی مرحومین نے ان کا سنہ وفات ۱۲۲۰ھ لکھا ہے صاحب صبح وطن نے بھی صفحہ ۱۰ پر یہ عبارت درج کی ہے "بچہار دہم ماہ ذیحجہ سنہ الف و مائتین وعشرین ہجری گریبان قبای مستعار ہستی درید" لیکن ابو طیب خاں والا نے جو آگاہ کے شاگرد رشید تھے ایک قطعہ تاریخ وفات لکھا ہے اس قطعہ سے ۱۲۲۱ھ برآمد ہوتے ہیں چنانچہ خود صاحب صبح وطن نے بھی تاریخی مصرعہ کے نیچے ۱۲۲۱ھ لکھے ہیں۔ اس لئے ان کا صحیح سنہ وفات ۱۲۲۱ھ ہی تصور کرنا چاہیئے قطعہ یہ ہے ؎

چو رخت از دار دنیا بست آگاہ دریغا وا دریغا وا دریغا
پے تاریخ آں از درد جانکاہ نمودم بہ عجیب فکر والا
بگفتا از سر ماتم سرو شم فاھا ثم اھا ثم اھا

۱۲۲۱ھ

آخری مصرعہ کے اعداد اس طرح ہوتے ہیں

فا - ھا - ثم - اھا - ثم - اھا

۸۱ - ۶ - ۵۴۰ - ۷ - ۵۴۰ - ۷ = ۱۱۸۱

۱۱۸۱ میں ماتم کے سر یعنی دم کے اعداد (۴۰) جمع کرنے سے ۱۲۲۱ ہوگئے۔

آغاز:۔ "المدد یا حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی شیئاً للہ"

بعد حمد و نعت کے محمد باقر آگاہ شافعی قادری ویلوری توفیق دیوے اسے حق سبحانہٗ تعالیٰ کہتا ہے کہ مناقب حضرت محبوب سجانی کے علی جدہ وعلیہ الصلوٰۃ والسلام بے حساب ہیں اوس مناقب شریف کو علما اور

نئے خزانے

جولائی ۱۹۶۵ء کے علمی و ادبی رسائل و اخبارات کے مضامین کا موضوع وار اشاریہ

موضوعات

اس اشاریہ کی ترتیب میں جولائی ۱۹۶۵ء کے مندرجہ ذیل رسائل اور اخبارات سے مدد لی گئی ہے۔ گزشتہ مہینوں کے وہ رسائل بھی پیش نظر رہے ہیں جو بعد میں دستیاب ہوئے

ماہنامہ آجکل دہلی جولائی ۶۵ء　ماہنامہ ثقافت لاہور جولائی ۶۵ء　ماہنامہ کتابی دنیا کراچی جولائی ۶۵ء
〃 ادبی دنیا لاہور 〃 〃　〃 جامعہ دہلی 〃 〃　〃 معارف اعظم گڑھ 〃 〃
سہ ماہی اردو ادب علی گڑھ ۶۵ء شمارہ ۳-۴　〃 جام نو کراچی 〃 〃　〃 نیرنگ خیال لاہور 〃 〃
ماہنامہ اردو ڈائجسٹ لاہور جولائی ۶۵ء　〃 چراغ راہ 〃 〃　〃 ہمدرد صحت کراچی 〃 〃
― اقبال ریویو کراچی 〃 〃　〃 خاتون دکن حیدرآباد جون جولائی　ہفت روزہ چٹان لاہور
ماہنامہ انجمن اسلامیہ میگزین 〃 جون جولائی ۶۵ء　سہ ماہی خرام چاٹگام ۶۵ء نمبر ۴　〃 صدق جدید لکھنؤ
〃 انوار اسلام رام نگر بنارس مئی 〃　― زادیے حیدرآباد نمبر ۲　〃 لاہور لاہور
〃 الرحیم حیدرآباد جولائی 〃　ماہنامہ زندگی رام پور جولائی ۶۵ء　〃 ملاپ حیدرآباد
〃 الشجاع کراچی 〃 〃　〃 ساقی کراچی 〃 〃　〃 ہماری زبان علی گڑھ
سہ ماہی العلم 〃 اپریل تا جون 〃　〃 سب رس حیدرآباد 〃　〃 روزنامہ انجام کراچی
ماہنامہ الفرقان ربوہ جولائی 〃　〃 شاعر بمبئی 〃 〃　〃 امروز لاہور
〃 برہان دہلی 〃 〃　〃 صبح امید 〃 〃　〃 جنگ کراچی
〃 بنیات کراچی 〃 〃　سہ ماہی صحیفہ لاہور 〃 〃　〃 حریت 〃
〃 پیام عمل لاہور 〃 〃　ماہنامہ طلوع اسلام 〃 〃　〃 کوہستان لاہور
〃 تجلی دیوبند 〃 〃　〃 عارف لاہور 〃 〃　〃 مشرق 〃
〃 ترجمان القرآن لاہور 〃 〃　〃 فکر و نظر کراچی 〃 〃　〃 نوائے وقت 〃
〃 تحریک دہلی 〃 〃　〃 قومی زبان 〃 〃
〃 تہذیب الاخلاق لاہور 〃 〃　〃 کتاب لکھنؤ 〃 〃

اردو ادب

ادبی تحقیق و تنقید

ابوذر عثمان	اکبر اور مسئلہ زبان	ہماری زبان، ص ۳ تا ۴، ۸ جولائی
احمد شجاع، حکیم	دہلی کی چند ادبی صحبتوں کی یاد	ہمدرد صحت، ص ۱۱ تا ۲۳، جولائی
اختر اورینوی	تنقید اور قدروں کا مسئلہ	آج کل، ص ۷ تا ۱۲، جولائی
اختر وقار عظیم	حفیظ کی غزل	ساقی، ص ۴۲ تا ۴۶، جون
اظہر قادری، پروفیسر	دبستان اردو	جام نو، ص ۱۷ تا ۲۰، جولائی
الطاف گوہر	خطبۂ صدارت [1]	ساقی، ص ۳ تا ۶، جون
انیس فاطمہ بریلوی، سیدہ	افغانی ادب	العلم، ص ۹ تا ۱۳، اپریل تا جون
ایوبی، محمد اسحٰق	حضرت امجد کی رباعیات	ملاپ، ص ۵ + ۸، ۲۱ جولائی
تاثیر صدیقی	شعراء کی دلچسپ قسمیں [2]	چٹان، ص ۴ + ۱۲، ۱۲ ″
تحسین سروری	اردو ادب کے غیر ادبی مآخذ	قومی زبان، ص ۳۰ تا ۳۳، ″
جوش ملسیانی	احسن مارہروی کی شاعری	″ ″ ص ۳۳ تا ۳۴، ″
چندرا کوشانیس	نئی پود ناراض کیوں	خرام ″ ۱۵ تا ۴۲،
حامد حسن قادری، مولانا	جامع التواریخ	قومی زبان، ص ۴۳ تا ۵۸، جولائی
حمیدہ ہما	اردو شعراء اور بذلہ سنجی	انجام، ص ۵، ۱۸ جولائی
خلیق انجم، ڈاکٹر	لہر لہر ندیا گہری [3]	شاعر، ص ۲۲ تا ۲۹، جولائی
دیوی سنگھ چوہان	شاہ تراب چشتی کا دور	صبح امید، ص ۱۷ تا ۱۹، ″
رفعت نواز	شام اور سائے [3]	شاعر، ص ۴۳ تا ۴۶، ″
سروری، پروفیسر	اردو ادب کے اہم مسائل	ملاپ، ص ۱، ۱۴ ″
سلطان شاہد	مطالعہ کے رجحانات	لاہور، ص ۱۰ تا ۱۴، ۱۲ ″
شمیم احمد	رپورتاژ کا موضوع	آجکل، ص ۳ تا ۱۹، جولائی
شوکت علی خاں، صاحبزادہ	اکبر کے نورتن کی ایک نادر تحریر	برہان، ص ۳۰ تا ۴۴، ″
شہریار، ع۔ م	حسرت موہانی اور سرقہ	انجام، ص ۸، ۱۲ جولائی
عابد، سید عابد علی	ملی اور لسانی زوال پذیری	اقبال ریویو، ص ۷۹ تا ۱۱۲، جولائی

---

[1] حلقۂ ارباب ذوق کے چھبیسویں سالانہ اجلاس میں پڑھا گیا۔ منقول از ہفت روزہ ملاپ حیدرآباد۔ [2] زبیر رضوی کی کتاب۔ [3] وزیر آغا کی [illegible]

مصنف	عنوان	ماخذ
عارف، فضل الٰہی	اصلاح زبان	اردو ڈائجسٹ، ص ۱۲۳ تا ۱۲۵، جولائی
عندلیب شادانی	تحقیق اور اس کا طریق کار	صحیفہ، ص ۱ تا ۲۷، جولائی
غبار یاور	ادب کی تاریخی بنیادیں	جام نو، ص ۱۶ تا ۲۸، ؍؍
غلام ربانی، سید	روزمرہ	جامعہ، ص ۵۶ تا ۶۳، ؍؍
کرمانی، امان اللہ	ہم اردو اور ہماری تاریخ	انجام، ص ۶، ۱۲ جولائی
نوکل، جے آر؛ مترجم: جمیل طاہر	مطالعہ کی افادیت	امروز، ص ۳، ۴ جولائی
مجیب اللہ ندوی، حافظ	سیرت مولانا سید محمد علی مونگری از سید محمد الحسنی	معارف، ص ۱۶ تا ۲۸، ؍؍
محمد عمر، ڈاکٹر	میر کا سیاسی و سماجی ماحول	برہان، ص ۵۴ تا ۵۸، ؍؍
منور لکھنوی، علامہ	اردو مشاعرے، شاعری و ادب	خاتون دکن، ص ۶ تا ۹، جون جولائی
نادم سیتاپوری	گور غریباں - سرشار کا ایک المیہ ناول	ہماری زبان، ص ۶ تا ۷، ۲۲ جولائی
نسیم چغتائی		
نعمت اللہ خاں	مصطلحات علمیہ اور شاعر کی خصوصیات	چٹان، ص ۱۶ + ۱۸، ۵ ؍؍
وقار احمد رضوی	ادب کی تاریخ لغوی اور اصطلاحی ماہیت	معارف، ص ۴۴ تا ۶۰، ؍؍
پروش ترمذی	میر کی داستان عشق	تہذیب الاخلاق، ص ۷ تا ۱۷، جولائی
———	پاکستانی ادب کا سرسری جائزہ	زاویے، ص ۱۳ تا ۱۷
———	باسط بھوپالی کی غزل میں جدید رجحانات	شاعر، ص ۳۰ تا ۳۳، جولائی

افسانہ و ناول

مصنف	عنوان	ماخذ
اسد نذیر	قیام پاکستان کے بعد ہمارا ناول	تہذیب الاخلاق، ص ۳۵ تا ۵۱، جولائی
سہیل عظیم آبادی	اردو میں ناول نگاری	ملاپ، ص ۱۰، ۱۴ جولائی
عثمان عرفانی	موجودہ دور اور مختصر افسانہ	زاویے، ص ۲۸ تا ۳۲،
محمود شکیل	اردو افسانے کے عصری رجحانات	ملاپ، ص ۱۰، ۲۸ جولائی

ڈرامہ

مصنف	عنوان	ماخذ
ثاقب شیخ	[illegible] میں لاہور کے اسٹیج پر ڈراما کی ناکامی کے اسباب	نیرنگ خیال، ص ۱۵ تا ۱۶ + ۱۴، جولائی
جمیل جالبی	آغا حشر اور ڈرامے کی روایت	تحریک، ص ۷ تا ۸، جولائی
عبدالمغنی	ڈرامہ کا اثر جدید احساسات پر	چراغ راہ، ص ۵۶ تا ۵۹، جولائی

شاعری اور مشاعرے

اثر فاروقی	تثلیث — اردو نظم میں نیا تجربہ	خاتون دکن/ص ۱۸ تا ۲۱/ جون جولائی
سخاوت مرزا	حیدرآباد کا ایک مشاعرہ	قومی زبان/ص ۵۹ تا ۶۰ + ۹۲/ جولائی
شاغل قادری	کچھ غزل کے بارے میں	خاتون دکن/ص ۱۴ تا ۱۷/ جون جولائی
	نظم جو غزل ہو کر رہ گئی	خرام/ص ۳۸ تا ۴۰/

دیگر زبانوں کا ادب (ہندی و فارسی)

جعفر رضا، زیدی	ہندی شاعری کا ایک تاریخی جائزہ	معارف/ص ۵۱ تا ۷۰/ جولائی
عابدی، ڈاکٹر سید امیر حسن	ہندوستان میں فارسی زبان کا مطالعہ اور اسکا مستقبل	" " ۹ تا ۱۴/ "

اردو زبان اور اس کے مسائل

اظہر، اے ڈی	غریب اردو	چٹان/ص ۲ تا ۱۴/ ۱۲ جولائی
حیدر، پروفیسر شیخ	عدالتوں میں اردو کا رواج	العلم/ص ۶۵ تا ۷۱/ اپریل تا جون
خالد کاشمیری	لندن میں اردو	نوائے وقت/ص ۵/ ۱۷ جولائی
سردار جعفری	اردو — سیکولرازم کا پرچم	ہماری زبان/ص ۷/ یکم جولائی
صلاح الدین احمد	اردو کے چند مسائل	ادبی دنیا/ص ۵۶ تا ۶۳/ "
عبدالمغنی	مسئلہ اردو کے دو رخ	ہماری زبان/ص ۳ تا ۴ + ۷/ ۱۵ جولائی
گیان چند، ڈاکٹر	زبان کا مسئلہ	شاعر/ص ۱۰ تا ۲۳/ جولائی
منظر سلیم	یہ کہاں کی دوستی ہے	کتاب/ص ۳۸ تا ۴۱ + ۴۶/ "
نارنگ، ڈاکٹر گوپی چند	بات کرنے میں گزرتی ہے[1]	ہماری زبان/ص ۳ تا ۴ + ۶/ یکم جولائی

آپ بیتی

آغا صادق	آغا صادق	خرام/ص ۱۱ تا ۱۴ + ۷۳/
	شیخ بوعلی سینا کی کہانی ان کی اپنی زبانی	نوائے وقت/ص ۲/ ۱۵ جولائی
ناظر کاکوروی	آشفتہ سری میری — علی گڑھ کی یادیں (۲)	العلم/ص ۵۳ تا ۶۴/ اپریل تا جون

---

[1] امریکہ میں اردو تعلیم کا مسئلہ

اسلامی دنیا اور اس کے مسائل

احمد بیلو، الحاج	تقریر	فکر و نظر، ص ۲۵ تا ۲۶، جولائی
العریف، عبداللہ	"	" " " ۳۸ تا ۴۳، "
امین الحسینی، مفتی محمد	"	" " " ۴۰ تا ۴۲، "
زکی یمانی، احمد	عدل اجتماعی اور اس کی اسلامی بنیادیں	" " " ۴۸ تا ۸۰، "
صواف صباح، شیخ	تقریر	" " " ۶۱ تا ۶۴، "
عبداللہ، شیخ محمد	"	" " " ۳۵ تا ۳۹، "
علال الفاسی، الاستاد	"	" " " ۲۷، "
فضل الرحمٰن، ڈاکٹر	"	" " " ۳۳ تا ۳۷، "
فیصل، جلالۃ الملک شاہ	"	" " " ۱۳ تا ۱۹، "
فیصل شاہ		
مترجم :- فاروق مودودی	رابطہ اسلامی کانفرنس میں شاہ فیصل کی تقریر	ترجمان القرآن، ص ۵۳ تا ۶۰، جولا
محمد ابراہیم، شیخ	تقریر	فکر و نظر، ص ۲۰، جولائی
محمد مبارک، پروفیسر	ثقافت اسلامی کے نظام کی تشکیل	" " " ۸۱ تا ۹۰، "
نیروا سلی، حکیم	ترکیہ اور ایران سے ہمارا رشتہ محبت و اخوت	نوائے وقت، ص ۷، ۲۴، "
	سفارشات مجالس[1]	فکر و نظر، ص ۱۰۹ تا ۱۱۰، جولائی

تاریخ

آفتاب ہاشمی	مملکت اسلامیہ میں طریقہ جنگ	حریت، ص ۵، ۳۰ جولائی
" "	" " " (۲)	" " ۵، ۳۱ "
احمد حسن بدایونی، حافظ	نواب محمد علی خاں والی ٹونک کی معزولی اور ..... سفرنامہ حجاز و لندن (۳)	العلم، ص ۴۳ تا ۵۱، اپریل تا جو
اقتدار حسین صدیقی	تاریخ نادری	جامعہ، ص ۳۳ تا ۴۲، جولائی
جہاد کشمیر	جہاد کشمیر — ایک خونچکاں داستان	انجام، ص ۴، ۱۲ جولائی
خالد، ابوالسیف	اٹھارویں صدی میں اسلامی اتحاد کی ایک ناکام کوشش	نوائے وقت، ص ۲، ۲۲ جولائی

---

[1] رابطۂ اسلامی کانفرنس کی مقررہ مختلف کمیٹیوں کی منظور کردہ تجاویز

ضیاالدین پنڈت، محمد	اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے[1]	برہان، ص ۱۲ تا ۳۶، جولائی
ن رضوانی	بہادر بلوچ	جنگ، ص ۲، ۲۴ر "
" "	" "	" " ۱۱، ۳۱ر "
ہابی، انتظام اللہ	تیمور	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۱۹، جون جولائی
سید، ظہور عالم	ماؤنٹ بیٹن کی پاکستانی دشمنی (۱)	نوائے وقت، ص ۳، ۹ر جولائی
" "	" " " (۲)	" " " ۳، ۱۰ر "
بدی امروہوی، مولانا نسیم احمد	حضرت شاہ ابوسعید حسنی رائے بریلوی کے روابط حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان سے	الرحیم، ص ۹۵ تا ۱۱۰، جولائی
ب الدین، محمد	دریائے نیل (۸)	العلم، ص ۴ تا ۲۶، اپریل تا جون
حسین نقوی، سید	احساس گناہ — یزید کا اعتراف[2]	پیام عمل، ص ۱۴ تا ۱۷، جولائی
ماہر حسین	موہنجو ڈارو — قدیم تہذیب کا گہوارہ	کوہستان، ص ۱۲، ۱۵ر "
———	تاریخ کے خونین اوراق	جنگ، ص ۱۱، ۳ر جولائی
———	مسولینی کے آخری سو دن	" " ۲، ۳۱ر "
———	گیلی پولی کا معرکہ — پہلی عالمی جنگ	انجام، ص ۲، ۱۲ر "

تعلیم

مدانسر	مخلوط تعلیم — ۲	چراغ راہ، ص ۴۷ تا ۵۵، جولائی
نفیس احمد جعفری	تعلیم اور مذہب	ثقافت، ص ۳ تا ۵، جولائی
سعید انصاری	مولانا شبلی اور اصلاح تعلیم	جامعہ، ص ۸ تا ۴۲، "
ففت، محمد سرور	ابتدائی جماعتوں میں نصاب تعلیم — ایک جائزہ	نوائے وقت، ص ۶، ۲۳ر "
وفی، ایم صدیق	" " " " "	" " " ۶، ۲۸ر "
مظہر	تعلیمی عمل میں تدریسی طریقوں کی اہمیت	کوہستان، ص ۳+۶، ۲۷ر "
شکور صابری	مغربی پاکستان میں فنی تعلیم کا مسئلہ	نوائے وقت، ص ۶، ۳۰ر "
ترجمہ: مولوی معین الدین افضل گڑھ	علامہ برہان الدین زرنوجی کے تعلیمی نظریات (۳)	العلم، ص ۲۷ تا ۴۳، اپریل تا جون

تعلیمی اور تحقیقی ادارے

برالدین صدیقی	ادارہ ادبیات اور ایوان اردو	سب رس، ص ۳ تا ۴، جولائی

---

[1] ٹیپو سلطان شہید کے خلاف سازشیں۔ [2] مولانا تمنا عمادی کے مضمون "شہادت عظمیٰ" مطبوعہ نگار پاکستان بابت ماہ اکتوبر ۱۹۶۸ء

	معروفیات ادارہ ـــ علمی، ادبی اور ثقافتی (۱۹۶۴ء)	سب رس، ص ۱۱ تا ۱۴، جولائی
	تاثرات[1]	، ، ، ص ۵ تا ۱۰، ،
الطاف حسن قریشی	پنجاب یونیورسٹی اپنے وائس چانسلر کی نظر میں	کوہستان، ص ۳، ۲ر ،
عبدالقادر، مفتی	مدرسہ دار الرشاد پیر جھنڈا سندھ	الرحیم، ص ۱۳۴ تا ۱۴۴، ،

تہذیب و معاشرت

رفعت، سید مبارز الدین	ہندوستانی مسلمانوں میں شادی کی رسمیں	خاتون دکن، ص ۱۰ تا ۱۳، جون جولائی
فضل الرحمٰن جعفری	اسلامی معاشرت کے خدوخال	ہمدرد صحت، ص ۳۰ تا ۳۴، جولائی
کارنیلیس، جسٹس اے آر	عوامی معاملات اور مذہبی تعلیمات	نوائے وقت، ص ۳، ۱۷ر جولائی
ـــــــــ	قدیم ہند و معاشرے میں ستی کی رسم	انجام، ص ۳، ۳ر جولائی

سائنس

انور صابری، محمد	لے زر ـــ ایک حیرت انگیز ایجاد	اردو ڈائجسٹ، ص ۱۳۵ تا ۱۴۰، ؟
عبدالوہاب	مریخ کی تصویر کشی	کوہستان، ص ۱ + ۱۲، ۲۵ر جولائی
مترجم :- وحید الحسن ہاشمی	خلا ر	تہذیب الاخلاق، ص ۱۹ تا ۳۴، ،

سیاسیات

جاشدی، پیر علی محمد	مشرق و مغرب	جنگ، ص ۱۲، ۳ر جولائی
، ،	، ،	، ، ۱۲، ۴۴ر ،
، ،	، ،	، ، ۱۲، ۱۳ر ،
شہید، ظہور عالم	پاکستان، ایران اور ترکی میں تعاون	نوائے وقت، ص ۲، ۲۱ر ،
ظہیر، حافظ احسان الٰہی	انقلاب الجزائر	چٹان، ص ۲ تا ۱۳، ۱۹ر ،
فرید احمد	میثاق استنبول	انجام، ص ۳ + ۶، ۲۴ر ،
مجیب اشرف	حضرت شاہ ولی اللہ کے سیاسی افکار	جامعہ، ص ۵۴ تا ۵۲، جولائی
مودودی، ابو الاعلیٰ	خلافت راشدہ سے ملوکیت تک	ترجمان القرآن، ص ۲۳ تا ۵۲، جولائی
	معاہدہ استنبول	کوہستان، ص ۳ + ۶، ۱۲ر جولائی
	بھارت میں صدر راج ـــ جنرل کری آپا کی تجویز	نوائے وقت، ص ۳، ۲۴ر جولائی

---

[1] متعدد اصحاب اور اداروں کے تاثرات " ادارہ ادبیات اردو " کے متعلق

سیر و سیاحت

آزاد بن حیدر	نیل سے دجلہ تک	حریت، ص ، جولائی
، ، ،	، ، ، (۲)	، ، ۶ ، ۲۵ ، ،
ابن انشا	لنکا، سراندیپ	انجام، ص ۲ ، ۱۲ ، ،
، ،	کولمبو (۳)	، ، ۲ ، ۲۶ ، ،
ڈورتھی ڈینرانا		
مترجم: آباد شاہ پوری	صحرا کا اجنبی	اردو ڈائجسٹ، ص ۷۹ تا ۹۵، جولائی
رشیدہ رضویہ	برسلز	استجارع، ص ۵۳ تا ۵۷، ،
عالی، جمیل الدین	دنیا رے آگے (۱۰۵)	جنگ، ص ۲، ۲۶، جولائی
مرتضیٰ صدیقی، ڈاکٹر محمد	مشرقِ وسطیٰ میں تین ہفتے	ملاپ، ص ۱، ۲۱، ،
وجاہت علی، سید	۷۰ روپے میں سیر جہاں (۲۱)	انجام، ص ۲، ۵، ،
	، ، ، (۲۲)	، ، ۷، ۱۲، ،
	، ، ، (۲۳)	، ، ۱۲، ۲۴، ،
	، ، ، (۲۵)	، ، ۱۲، ۳۱، ،
یوسف حسن	مشرقی پاکستان کا ہوائی سفر	نیرنگ خیال، ص ۵ + ۸، جولائی

شخصیات

آزاد، مولانا ابوالکلام

آزاد، ابوالکلام	کردار مرشدؒ	عارف، ص ۷۲ تا ۷۳، جولائی
ابوذر عثمانی	شہید اعظمؒ	ہماری، ص ۷، ۸، جولائی
شعیب اعظمی	نہرو اور مولانا آزاد (تعلقات کے آئینے میں)	اردو ادب، ص ۱۱۹ تا ۱۲۹،

اقبال، علامہ

اظہر، احمد الدین	اقبال کی برسی (نظم)	چٹان، ص ۵، ۱۲، جولائی
بلگرامی، ڈاکٹر سید حامد حسن	ثقافت اسلامیہ کی روح	جنگ، ص ۳، ۳، ،

بلگرامی، ڈاکٹر سید حامد حسن	ثقافت اسلامیہ کی روح ــ علامہ اقبال کے نقطۂ نگاہ سے	جنگ، ص ۹، ۲۶ر جولائی
خان رضوانی	ملتان میں حکیم الامت کی یاد	〃 〃 ۲، ۶ر 〃
زرینہ ثانی، پروفیسر	اقبال کا نظریہ وحدت الوجود	تہذیب الاخلاق، ۵۲ تا ۵۵، جولائی
محمد تقی، سید	اقبال چند فکری بحثیں	صحیفہ، ص ۹ تا ۱۶، جولائی
میر ولی الدین، ڈاکٹر	اقبال اور تصور فقر	الرحیم، ص ۸۵ تا ۹۴، 〃
ناصر، نعیم احمد	اقبال کا فلسفہ دید وشنید	اقبال ریویو، ص ۶۶ تا ۸۰، 〃

غالب

طالب صفوی، محمد عباس	غالب کی صد سالہ برسی	آجکل، ص ۱۶ تا ۲۶، جولائی
عبداللہ قریشی، محمد	عظمت غالب	اقبال ریویو، ص ۸۱ تا ۹۶، 〃
میمونہ انصاری، ڈاکٹر	غالب (تحقیق وتنقید)	الشجاع، ص ۵۹ تا ۷۴، 〃

نہرو، پنڈت جواہر لال

آزاد، جگن ناتھ	زوال علم وہنر مرگ ناگہاں اس کی	اردو ادب، ص ۹۰ تا ۱۰۵،
ابو سالم	پنڈت نہرو اور سوشلزم	〃 〃 〃 ۵۱ تا ۵۹،
احسن نشاط	جواہر لال نہرو اور ان کا نظریۂ زبان	〃 〃 〃 ۱۹۰ تا ۱۹۸،
تارا چند، ڈاکٹر	جواہر لال مورخ کی حیثیت سے	〃 〃 〃 ۲۱ تا ۴۴،
جعفر حسن، ڈاکٹر	پنڈت نہرو کی شخصیت اور کردار کے چند منور پہلو	〃 〃 〃 ۷۳ تا ۷۸،
حسن عسکری پلکھنوی	پنڈت جواہر لال نہرو کا عقلی مقام	〃 〃 〃 ۱۶۴ تا ۱۸۹،
ریاض الرحمٰن شروانی	جواہر لال نہرو کا سیاسی کارنامہ	〃 〃 〃 ۱۰۵ تا ۱۱۸،
سرور، آل احمد	نگہ بلند، سخن دلنواز جاں پرسوز	〃 〃 〃 ۱ تا ۱۴،
سعید احمد اکبر آبادی	پنڈت نہرو کا فلسفہ سکولرازم	〃 〃 〃 ۴۱ تا ۵۰،
سندر لال، پنڈت	جواہر لال اور گاندھی جی	〃 〃 〃 ۲۵ تا ۳۱،
شعیب اعظمی	نہرو اور آزاد ــ تعلقات کے آئینے میں	〃 〃 〃 ۱۱۹ تا ۱۲۹،
شکیل، عبد الغفار	جواہر لال نہرو اور اردو	〃 〃 〃 ۱۲۵ تا ۱۴۳،
صابرہ، زیدی	مرے قدح میں ہے صہبائے آتشیں پنہاں	〃 〃 〃 ۷۹ تا ۸۹،
فراق گورکھپوری	ایک روشن دماغ	〃 〃 ۲۳۶ تا ۲۴۰،

معین الرحمٰن	پنڈت نہرو لڑکپن سے نوجوانی تک	اردو ادب، ص ۱۳۰ تا ۱۴۴،
وحید اختر، ڈاکٹر	جدید ذہن کی دریافت	" " " ۱۶۰ تا ۱۷۱،
ہمایوں کبیر، پروفیسر	نہرو — ایک انسان ایک ادیب	" " " ۱۷۱ تا ۲۰۰،

دیگر شخصیات

ارشد صابری	ڈاکٹر امیر حسن صدیقی	انجام، ص ۵، ۲۵ جولائی
اسرار بصری	مقبول انور داؤدی	چٹان، ص ۴، ۵ ، "
" "	زیڈ اے سلہری	" " ۴ + ۱۲، ۱۹ ، "
اقبال اسد	بی کے دت — بھگت سنگھ کا جری ساتھی	امروز، ص ۳، یکم اگست
اقتدار حسین خاں	اردو ادب میں یلدرم کا مقام	ادبی دنیا، ص ۳۴ تا ۵۶، جولائی
انور سیوانی، پروفیسر	نظیر اکبر آبادی — ایک نئی روایت	خرام، ص ۲۵ تا ۳۷،
بدر منیر، محمد	فریڈرک نیٹشے	ادبی دنیا، ص ۵۷ تا ۶۴، جولائی
برکاتی، حکیم محمود احمد	شاہ محمد محدث دہلوی شاہ ولی اللہ کے ایک گمنام فرزند	الرحیم، ص ۱۱۱ تا ۱۱۶، جولائی
برکاتی، منظور الحسن	اختر شیرانی کے اساتذہ	آجکل، ص ۴۰ تا ۴۴، "
حسن کمال	وزیر آغا — ایک جدید شاعر	کتاب، ص ۴۲ تا ۴۷، "
رازق الخیری، مولانا	میدان اردو کا شہسوار	ادبی دنیا، ص ۳۰ تا ۴۲، "
سعادت نظیر	دور ماضی کی ایک یادگار ہستی (رائے گردھاری پرشاد ساقی)	آجکل، ص ۳۴ تا ۳۹، "
سلیمان پاشاہ، ڈاکٹر	نظیر ایک عوامی شاعر	زاویے، ص ۱۸ تا ۳۲،
شاہ احمد دہلوی	فیض صاحب	ساقی، ص ۵۷ تا ۶۱، جون
شمیم احمد	ڈاکٹر سید عبداللہ	قومی زبان، ص ۵ تا ۱۰، جولائی
شہابی، انتظام اللہ	سراج الدولہ	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۹، جون جولائی
" "	دلاور جنگ مولوی احمد اللہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کا پس منظر	" " " ۹ تا ۱۴، " "
" "	امام ابوالحسن ماوردی	" " " ۱۶، " "
" "	مشاہیر ملت[۱]	" " " ۱۷ تا ۲۲، " "

پیام خواجہ حسن نظامی برحلقہ ادب پاکستان کے صدر حامد نظامی کے نام مشاہیر کے پیغامات کے اقتباس

———	یوم خواجہ حسن نظامی پر مشاہیر کے پیامات[1]	نیرنگ خیال، ص ۹ تا ۱۲، جولائی
———	امن کا شہید — ہیمر شولڈ	جنگ، ص ۲، ۳ر جولائی
———	احمد محمد بشیر ابزی حاموں — عمل کیمیائی کے ماہر	〃 〃 ۳، یکم 〃
———	حضرت خواجہ محمد قاسم موہڑہ شریف (مری)	نوائے وقت، ص ۲، ۲۹ر 〃
———	شاہ محمد غوث	〃 〃 ۳۰، ۵، ۱۷ر جولائی
———	مبارک ساغر — جنگ آزادی کا ایک سپاہی	〃 〃 〃 ۳، ۲۹ر 〃
———	بابا جیون شاہ	انجام، ص ۲، ۱۰ر جولائی
———	محمد شعیب	〃 〃 ۱۱، ۱۰ر 〃

صحافت

امداد صابری	۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی — حریت پسند اخبار	انجام، ص ۱۱، ۳ر جولائی
〃	〃 〃	〃 〃 ۱۱، ۵ر 〃
خورشید، عبدالسلام	اضلاعی اخبارات کا مستقبل	لاہور، ص ۱۶ تا ۱۷، ۱۹ر جولائی
———	آساہی — جاپان کا کثیر الاشاعت اخبار	نوائے وقت، ص ۳، ۴ر 〃
———	نیویارک ٹائمز	〃 〃 ۳، ۱۵ر 〃
———	اخبارات کا ضابطۂ اخلاق	〃 〃 ۲، ۲۲ر 〃

فنون لطیفہ

شفیع عقیل	روس کے لوک ناچ	جنگ، ص ۵، ۹ر جولائی
صغیر احمد جارچوی	فنون و لطافت	العلم، ص ۴۰ تا ۴۸، اپریل تا جون

کتابیات

ابو سلمان شاہجہانپوری	نئے خزانے (جنوری فروری ۱۹۶۸ء کے رسائل و اخبارات کا اشاریہ) (۲)	قومی زبان، ص ۱۲ تا ۲۹، جولائی
برنی، ضیاء الدین احمد	رسالوں پر طائرانہ نظر — مضامین کا تعارف	کتابی دنیا، ص ۱۳ تا ۱۵، 〃
———	فہرست مضامین سب رس حیدرآباد ۱۹۶۸ء	سب رس، ص ۹ تا ۳۳، 〃

---

[1] عابد نظامی کے نام

کتب خانے

شہریار، ع - م	کتب خانہ اسلامیہ کالج لاہور	انجام، ص ۵، ۲۵ر جولائی
نسیم، ڈاکٹر کے بی	نادر کتابوں اور مخطوطات کا مخزن	
	کتب خانہ اسلامیہ کالج لاہور	امروز، ص ۲، ۴ر جولائی

لسانیات

وقار احمد رضوی	زبان کا اصولی و نفسیاتی شعور	کتاب، ص ۴۸ تا ۵۰، جولائی

مکاتیب

مولانا حالی	ایک خط کا عکس	ادبی دنیا، ص ۹ تا ۱۰، جولائی
عبداللہ، شیخ	مکاتیب شیخ	چٹان، ص ۹ تا ۱۰ + ۲۲، ۵ر "
" "	" "	" " ۵ تا ۱۶، ۱۲ر "
" "	" "	" " ۸ + ۱۶، ۱۹ر "
" "	" "	" " ۹ تا ۱۰ + ۲۲، ۲۶ر "
مرتب: عبدالقوی دسنوی	مکاتیب بنام اختر شیرانی[1]	ہماری زبان، ص ۳ تا ۴ + ۸، ۲۲ر ج
خرم علی	تبرک - چراغ حسن حسرت کا ایک خط	چٹان لاہور، ص ۱۱ + ۲۲، ۱۹ر

مذہبیات

قرآن و تفسیر

حسن علی جامعی	قرآن کی معجزانہ تاثیر	چٹان، ص ۱۵ تا ۱۶، ۵ر جولائی
عبدالماجد دریابادی، مولانا	سورۃ القدر	صدق جدید، ص ۴ تا ۵، ۱۶ر "
علی نقی النقوی، سرکار سید العلما، علامہ سید	تفسیر القرآن	پیام عمل، ص ۷ تا ۸، جولائی
محمد یوسف	تفسیر القرآن میں سلف صالحین کی پیروی	عارف، ص ۱۹ تا ۲۵، "
مودودی، ابو الاعلیٰ	الدخان (۲)	ترجمان القرآن، ص ۷ تا ۱۳، جولا

---

[1] متعدد حضرات کے خطوط ماخوذ از انتخاب و بہارستان

سنت و سیرت نبویؐ

مصنف	عنوان	ماخذ
بھگوان، رانا بھگوان داس	معراج مبارک — کمال بشریت	انجام، ص ۲، ۱۰ر جولائی
جعفر شاہ پھلواری، مولانا	اشک بے اختیار	اردو ڈائجسٹ، ص ۲۷ تا ۳۰، جولائی
حنیف ندوی، مولانا محمد	دانائے کل	" " ص ۲۵ تا ۳۰، "
صفدر سلیمی	انقلاب عظیم کا داعی اعظم	طلوع اسلام، ۴۰ تا ۴۴، "
علی نقی النقوی، سرکار سید العلماء علامہ سید	خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰؐ	پیام عمل، ص ۹ تا ۱۳، جولائی
متین عکری	شریعت کاملہ اور سنت	چٹان، ص ۵ تا ۱۶، ۲۲ر "
مودودی، مولانا سید ابوالاعلیٰ	کتنا ہمہ گیر تھا وہ انقلاب	اردو ڈائجسٹ، ص ۱۱ تا ۳۳، جولائی
مترجم :- محمد احمد	اخلاق النبی صلی اللہ علیہ وسلم	بینات، ص ۷، تا ۴۲، جولائی
ـــــــــ	عروج و زوال حضرت سالیمات کا بصیرت افروز خطبہ	چٹان، ص ۲۰۰۴، ۱۲ر جولائی
ـــــــــ	قرآن اور صاحب قرآن — بائبل کا اعتراف (۱)	" " ۱۸ تا ۱۸، ۲۶ر "
ادریس، مولانا محمد	سنت جاریہ اور آئمہ مجتہدین	بینات، ص ۲۵ تا ۴۰، "
اسمٰعیل الندوی، محمد	امیت رسول (۱)	صدق جدید، ص ۲ تا ۷، ۱۷ر
" "	" " (۲)	" " ۷، ۲۳ر"
" "	" " (۳)	" " ۷، ۳۰ر"

حدیث و فقہ

مصنف	عنوان	ماخذ
امینی، مولانا محمد تقی	احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت	برہان، ص ۵ تا ۲۰، جولائی
عبد العلی، بحر العلوم		
مترجم :- حبیب اللہ غضنفر	تنزلات ستہ	اقبال ریویو، ص ۳۳ تا ۶۵، جولائی
محمد رفیع	علم حدیث	انجام، ص ۲، ۳۱ر جولائی

عقائد

مصنف	عنوان	ماخذ
احمد قادری، سید	جاہلیت عرب کے عقیدے	زندگی، ص ۹ تا ۱۴، جولائی
امام الدین، ابو محمد	افکار داود اور عقیدہ رسالت قسط نمبر ۵ حصہ دوم	انوار اسلام، ص ۱۹۷ تا ۲۴۴، مئی
حنیف ندوی، مولانا محمد	مرجیہ کے عقائد	ثقافت، ص ۲ تا ۲۷، جولائی
سلطان سہیل	آخرت اور اس کے حریف عقائد	زندگی، ص ۳۳ تا ۳۸، "

مسائل ومباحث

ابوالعطا جالندھری	اسلام کا معیار نجات[1]	الفرقان، ص ۲ تا ۱۵، جولائی
بھگوان، رانا بھگوانداس	مسجد نبوی بعہد رسالت مآب صلعم	صبح امید، ص ۱۲ تا ۱۶، ء
پروفیسر	جہاد	طلوع اسلام، ص ۷ تا ۴۴، جولائی
جلال الدین عمری، مولانا	امر بالمعروف ونہی عن المنکر	زندگی، ص ۵۱ تا ۵۲، جولائی
حیدری القادری، حکیم پیر	عرب کے مذاہب	انجام، ص ۲، ۱۳ر جولائی
رئیس احمد جعفری	قرشیت (مسلسل)	ثقافت، ص ۲۸ تا ۳۲، جولائی
ذکریا، مولانا محمد	روح اور ... کی حقیقت	بینات، ص ۴۲ تا ۴۴، ء
شفقت بخاری	اسلام اور سماجی بہبود کا تصور	نوائے وقت، ص ۲، ۹ر ء
عبدالماجد دریابادی	بائبل کی ایک جھلک	صدق جدید، ص ۵ + ۴، ۱۴ر ء
غلام رسول	مذہب کی ضرورت کیوں؟	لاہور، ص ۱۲ تا ۱۵، ۱۹ر ء
فواد شاکر	بیت اللہ کے مہمانوں کے ساتھ چند لمحے	ثقافت، ص ۳۳ تا ۳۷، جولائی
کمالی، عبدالحمید	مقولہ صفات اور حقیقت اسماء	اقبال ریویو، ص ۱ تا ۳۳، ء
گیلانی، عباد اللہ	اسلام (۳)	لاہور، ص ۴ + ۱۷، ۱۲ر ء
" "	" (آخری قسط)	" ، ص ۱۴ تا ۱۵ + ۱۷، ۲۶ر ء
محمد یوسف اصلاحی، مولانا	اللہ	زندگی، ص ۲۲ تا ۳۱، ء
معین الدین احمد ندوی، شاہ	انسانی عظمت وشرف اور مرد مومن کی ذمہ داریاں	معارف، ص ۵ تا ۲۸، ء
نعیم صدیقی	منع حمل کی تباہ کاریاں (۴)	صدق جدید، ص ۷، ۹ر ء
واحدی، ملا	صبر کا قرآنی مفہوم	ہمدرد صحت، ص ۵ تا ۹، ء
ولی حسن ٹونکی، مفتی	طلاق اور ازدواجی زندگی میں اس کا مقام	بینات، ص ۱۴ تا ۴۵، ء
	اسلام اور مثالی معاشرہ	انجام، ص ۲، ۱۳ر جولائی

نفسیات

رئیس امروہوی	وہ — یعنی — خوف	جنگ، ص ۵، ۲۶ر جولائی

وفیات

———	لیڈی عبدالقادر انتقال کر گئیں	مشرق، ص ۱، ۳۰ر جولائی

---

[1] ویدک دھرم، عیسائیت اور اسلام میں ایک موازنہ

آہ مرزا علی احمد — طلوع اسلام، ص ۵ تا ۱۰، جولائی

مطبوعات جدیدہ (نئی کتابوں پر تبصرے)

نام	مصنف	تبصرہ نگار	حوالہ
...ان بنگلہ تعلیم	سید وحید قیصر ندوی	شین عین	جنگ، ص ۵، ۹ر جولائی
...ح اسلام اقبال کی نظر میں	غلام عمر فاروق	م - ج	معارف، ص ۷۹، "
...ریحان	مرتبہ: لطیف ملک	غ - م	الرحیم، ص ۱۴۵ تا ۱۴۶، "
...پ سے ملیے[1]	علی جواد زیدی	عبداللطیف اعظمی	جامعہ، ص ۵۴ تا ۵۵، "
...اع اور باب اجتہاد	کمال فاروقی	غ - م	الرحیم، ص ۱۴۸ تا ۱۵۰، "
" "	" "	—	طلوع اسلام، ص ۵۷ تا ۷۰، جولائی
...شاس کتب مقدسہ	غلام احمد (نائیلی)	—	خاتون دکن، ص ۴۸، جون جولائی
...کار نوشاہہ	سید شریف احمد شرافت	محمد ایوب قادری	العلم، ص ۱۱۹، اپریل تا جون
...ردو ڈائجسٹ سالنامہ ۱۹۶۵ء	—	ع - ق	زندگی، ص ۵۶، جولائی
...ردو شاعری کا مزاج	ڈاکٹر وزیر آغا	ارخم	کوہستان، ص ۶، ۲۵ر "
" "	" "	شین عین	جنگ، ص ۳، ۳۰ر "
...ردو کا بہترین انشائی ادب	ڈاکٹر وحید قریشی	د - ل	ادبی دنیا، ص ۱۱۴ تا ۱۱۷، جولائی
...سلام اور زندگی	اشرف علی تھانویؒ	ا - ح - ف	اردو ڈائجسٹ، ص ۵۷، "
...سلامی اور تعلیماتی درسیات (انگریزی)	ایم ایم شریف	ش - ن	زندگی، ص ۶۰ تا ۶۲، جولائی
...نگار فیض نمبر	—	خلیل الرحمن اعظمی	ہماری زبان، ص ۱۲، یکم "
" "	—	ع - س	صبح امید، ص ۳۳ تا ۳۴، "
" "			شاعر، ص ۳۷ تا ۴۷، "
...جمال والکمال تفسیر سورۂ یوسف	قاضی محمد سلیمان منصورپوری	ع - ق	زندگی، ص ۵۷ تا ۵۸، "
...نتخاب کامریڈ (انگریزی)	سید رئیس احمد جعفری	مولانا عبدالماجد دریابادی	صدق جدید، ص ۶، ۲۳ر "
...ہاؤالدین زکریا	نور احمد خاں فریدی	ر - ا - ج	ثقافت، ص ۶۱ تا ۶۲، جولائی

[1] شخصیتوں کے ہلکے پھلکے خاکے

باپ کے خطوط بیٹی کے نام سیرۃ فاطمۃ الزہرا بہ طرز خطوط	—	—	زندگی، ص ۵۸ تا ۵۹، جولائی
پاس گریباں	سلیمان ادیب	خلیل الرحمٰن اعظمی	ہماری زبان، ص ۱۲، یکم "
پنجابی لوک گیت	—	ص - ح - ن	لاہور، ص ۱۶، ۲۶ر جولائی
پنج دریا	محمد افضل خاں	شین - ع	جنگ، ص ۵، ۹ر "
تحفۃ الخواص اردو ترجمہ درۃ الغواص	ابو محمد القاسم بن علی الحریری مترجم:- وائی - ایس طاہر علی	غ - م	الرحیم، ص ۱۵۰ تا ۱۵۲، جولائی
تذکرہ شیخ محمد بن طاہر پٹنی	سید ابوظفر ندوی	ر - ا - ج	ثقافت، ص ۶۰ تا ۶۱، "
تعلیمات اسلام	محمد عابد حسن	میم - الف	جنگ، ص ۳، ۳۰ر جولائی
تعلیمی مسائل	سید الطاف علی بریلوی	اخلاص حسین زبیری	العلم، ص ۱۱۷ تا ۱۱۹، اپریل تا جون
تلاش حق	—	ح - م - الف	جنگ، ص ۳، ۳۰ر جولائی
تلامذہ میر	امداد صابری	ش - ر	جام نو، ص ۶۴ تا ۶۵، "
تھوڑی دیر اہل حق کے ساتھ	یونس نگرامی	م - ج	معارف، ص ۸۰، جولائی
جامعہ کی کہانی	عبد الغفار مدھولی	ع - س	صبح امید، ص ۱۳۱، "
"	"	ص - ا - ب	کتابی دنیا، ص ۱۰ تا ۱۱، "
"	"	ع - م	آجکل، ص ۴۷، جولائی
حج وزیارت	عون احمد قادری	ع - ق	زندگی، ص ۵۹ تا ۶۰، "
حریر سنگ	شاہ حسن عطا ندوی	ص - ا - ب	کتابی دنیا، ص ۱۱، "
حیدرآباد کے ادیب	مرتبہ:- زینت ساجدہ	—	شاعر، ص ۶۲، "
خالی مکان	محمد علوی	و - ا	ادبی دنیا، ص ۱۲۰ تا ۱۲۱، "
خوشحالی کی تلاش	مترجم:- جلیس عابدی	اولاد احمد صدیقی	ہماری زبان، ص ۱۲، ۱۵ر جولائی
داغ فراق	شاد امرتسری	و - ا	ادبی دنیا، ص ۱۲۱ تا ۱۲۲، "
دس پیغمبر	سید بشیر احمد سعدی	مرتضیٰ حسین فاضل	صحیفہ، ص ۷۴ تا ۷۵، "
دساتیر عالم	محمد خلیل اللہ	ا - ح - ق	اردو ڈائجسٹ، ص ۱۵۶، "
دشت امکان	عزیز حامد مدنی	الف - ن	جنگ، ص ۵، ۹ر جولائی
دشت وفا	احمد ندیم قاسمی	غلام جیلانی اصغر	ادبی دنیا، ص ۱۲۳ تا ۱۲۵، جولائی
ڈاکٹر اقبال کے افکار و تصورات (انگریزی)	سید عبد الواحد	ا - ح - ق	اردو ڈائجسٹ، ص ۱۵۸، جولائی

نام	مصنف	تبصرہ نگار	حوالہ
ن آتش انتخاب	مرتب:- ڈاکٹر وحید قریشی و مولانا حسرت موہانی	گوہر نوشاہی	صحیفہ، ص ۷۸ تا ۷۹، جولائی
سے دلی تک	سید ضمیر حسن	ع۔م	آجکل، ص ۴۶، "
کار فقیر جلد اول و دوم	فقیر سید وحید الدین	الطاف علی بریلوی	العلم، ص ۱۱۵ تا ۱۱۷، اپریل تا جون
ن پیاسی ہے	بیش - سروج	ع۔س	صبح امید، ص ۳۳، جولائی
ب رنگ (انتخاب مضامین نظم و نثر)	مرتبین:- عرش صدیقی / مسعود اشعر	و۔پ	جام نو، ص ۶۵، جولائی
ید اور اصلاح معاشرہ	شاہد حسین رزاقی	ع۔ق	زندگی، ص ۶۳، "
ر (مجموعہ کلام)	جسٹس ایس اے رحمن	ر۔ا۔ج	ثقافت، ص ۳۹ تا ۵۸، جولائی
ینہ چاہیئے (مجموعہ کلام)	شاد عارفی	ع۔م	آجکل، ص ۷۴، جولائی
انح عمری علامہ راشد الخیری (عصمت کا سالگرہ نمبر)	مرتبہ:- رازق الخیری	ا۔ح۔ق	اردو ڈائجسٹ، ص ۱۵۶ تا ۱۵۷، جولائی
بنت الملوک	مولوی لطف علی بہاولپوری	گوہر نوشاہی	صحیفہ، ص ۷۹ تا ۸۰، جولائی
ست شب	محسن بھوپالی	رشید نثار	خرام، ص ۱۲۷ تا ۱۲۹،
بل بدایونی کی رومانی شاعری	ڈاکٹر شکیل الرحمٰن	ع۔س	صبح امید، ص ۳۴ تا ۳۵، جولائی
اب ثاقب	ثاقب زیروی	راغب مراد آبادی	لاہور، ص ۹، ۱۲ر جولائی
ادت عظمیٰ	سید اکبر علی	ش۔ر	جام نو، ص ۴۴، "
یشہ و تیشہ (کلام)	شاہد صدیقی / مرتب:- مجتبیٰ حسین	ع۔م	آجکل، ص ۷۴، جولائی
کے پھول (مجموعہ قطعات)	عبدالحمید ارشد	ا۔ط۔ف	لاہور، ص ۱۷، ۱۲ر "
بفہ خوشنویساں	مولوی احترام الدین احمد شاغل	محمد ایوب قادری	العلم، ص ۱۲۰ تا ۱۲۸، اپریل تا جون
سدالدین عارف	نور احمد خاں فریدی	ر۔ا۔ج	ثقافت، ص ۵۹، جولائی
ب درد	سہیل اختر	عارف عبدالمتین	ادبی دنیا، ص ۱۱۷ تا ۱۱۹، جولائی
"	جلال الدین بھٹی	ص۔ا۔ب	کتابی دنیا، ص ۱۰، جولائی

انشائیے، خاکے اور رپورتاژ

نام	مصنف	تبصرہ نگار	حوالہ
صحیفۂ محبت	مہدی افادی		
	مرتب :- ڈاکٹر محمود الٰہی	عبداللطیف اعظمی	جامعہ / ص ۵۵ تا ۵۶ / جولائی
صور اسرافیل (گجراتی کلام کا مجموعہ)	حبیب پالنپوری	—	معارف / ص ۸۰ / جولائی
عرب قبل اسلام	مولانا ذکاء اللہ دہلوی	ص - ا - ب	کتابی دنیا / ص ۱۱ / "
عرب قوم پرستی	ابوالحسن علی ندوی	ارخم	کوہستان / ص ۶ / ۲۵ / "
عروج وزوال امت	امجد القادری	ے - میم - الف	جنگ / ص ۳ / ۳۰ / "
علاج خوف و حزن	سید ولی الدین	م - ج	معارف / ص ۷۹ / جولائی
غالب کے کلام میں الحاقی عناصر	نادم سیتاپوری	مولانا عبدالماجد دریابادی	صدق جدید / ص ۷ / ۳ / "
غم فروزاں (مجموعہ کلام شاد صدیقی)	مرتب :- نیاز بدایونی	—	جام نو / ص ۶۵ تا ۶۶ / جولائی
فارقلیط	عبدالعزیز خالد	ع - ح	صبح امید / ص ۳۵ / "
کاروان صحافت	ڈاکٹر عبدالسلام خورشید	ا - ط - ف	لاہور / ص ۱۶ / ۲۶ / "
کامل اکمل حقانی	میر عزیز اللہ حقانی	ا - ح - ق	اردو ڈائجسٹ / ص ۱۵۵ / جولائی
" " "	"	لام - کاف	جنگ / ص ۵ / ۹ / جولائی
کلیات مومن (دو حصے)	مرتبہ :- کلب علی فائق	ا - ح - ق	اردو ڈائجسٹ / ص ۱۵۷ / جولائی
گلبانگ (مجموعہ کلام)	سحر عشق آبادی	ع - م	آجکل / ص ۶ / ۴ / جولائی
گنج الاسرار	حضرت نوشہ گنج بخش قادری	محمد ایوب قادری	العلم / ص ۱۱۹ تا ۱۲۰ / اپریل تا جون
لنگے کی ڈائری	کمال احمد رضوی	گوہر نوشاہی	صحیفہ / ص ۷۷ / جولائی
لہر لہر ندیا گہری (شعری مجموعہ)	زبیر رضوی	منظر سلیم	کتاب / ص ۶۱ / "
مثنوی سرالاسرار	ڈاکٹر خواجہ معین الدین جمیل	ع - ف	ترجمان القرآن / ص ۶۷ تا ۶۸ / جولائی
مراثی نسیم (جلد اول)	سید قائم رضا نسیم امروہوی	مرتضیٰ حسین فاضل	صحیفہ / ص ۷۵ تا ۷۷ / جولائی
مسلم نصیبیات	ڈاکٹر امیر حسن صدیقی	ا - ح - ق	اردو ڈائجسٹ / ص ۱۵۸ / "
مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش	سید ابوالحسن علی ندوی	س - ا	برہان / ص ۶۱ تا ۶۴ / جولائی
مغرب میں مذہب	سعید احمد اکبر آبادی	ص - ا - ب	کتابی دنیا / ص ۱۶ / "
مقام غالب	سید مبارز الدین رفعت	مرتضیٰ حسین فاضل	صحیفہ / ص ۷۳ تا ۷۷ / "
مکتوبات عبدالحق (محدث دہلوی)	مرتب :- قاضی احمد عبدالصمد	ر - ا - ج	ثقافت / ص ۶۰ / جولائی
نادان	رئیس احمد جعفری	[illegible]	[illegible]

نام	مصنف	تبصرہ نگار	حوالہ
سمجھاون	رام داس مرتب:۔ ڈاکٹر عبدالستار دلوی	ع۔م	آجکل، ص ۷۴، جولائی
اسلامی مشاہیر اسلام کی نظر میں	مرتب:۔ خلیل احمد حامدی	ع۔ف	ترجمان القرآن، ۶۹، جولائی
یات (خیالات نمبر)	-	-	ہمدرد صحت، ص ۱۵۹، "
س آذر	راشد آذر	وحید اختر	ہماری زبان، ص ۱۲، ۲۲، "
شرق	نور الصباح بیگم	ص۔ا۔ب	کتابی دنیا، ص ۱۶، جولائی
ب معانی	تلوک چند محروم	-	شاعر، ص ۷۲ تا ۷۳، "
دوستان کی تاریخ بچوں کے لئے	-	نعمان احمد صدیقی	ہماری زبان، ص ۸، ۸ جولائی
ع مسیح انجیل کے آئینے میں	مولانا سید حامد علی	ع۔ق	زندگی، ص ۵۵ تا ۵۷، "

اسٹوڈنٹس ڈکشنری کا خاص ایڈیشن

بابائے اردو مرحوم کی "دی اسٹوڈنٹس انگلش اردو ڈکشنری"
کا ایک خاص ایڈیشن اعلیٰ قسم کے بائیبل پیپر پر
چھاپا گیا ہے۔ اس کاغذ کی وجہ سے
ڈکشنری کا حجم بہت کم ہو گیا ہے

مضبوط جلد
قیمت
اکیس روپے

انجمن ترقی اردو

بابائے اردو روڈ
کراچی

انجمن ترقی اردو پاکستان کا ماہوار ترجمان

قومی زبان

جلد ۲۸ شمارہ ۲

فروری ۱۹۶۶ء

سالانہ قیمت
دس روپے

فی پرچہ
ایک روپیہ

انجمن ترقی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ
کراچی

فہرست

جناب اختر حسین
صدر انجمن ترقی اردو

ادیب اور قومی یک جہتی

خواتین حضرات

میں انجمن مصنفین پاکستان کا ممنون ہوں کہ مجھے آج کے اجتماع میں شرکت کا موقع دیا گیا۔ ایک قومی ثقافتی ادارے یعنی انجمن ترقی اردو کے ایک کارکن کی حیثیت سے یوں بھی میرا فرض تھا کہ میں آج کی مجلس میں شامل ہو کر لاہور کے ان اہل قلم کے خیالات سے استفادہ کرتا جن کی آتش نوائیوں نے بھارتی جارحیت کے دوران نہ صرف اہل لاہور بلکہ تمام قوم کے دل گرما دیے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ لاہور پر حملہ ہونے کی اطلاع پاتے ہی وہاں کے عوام اور بطور خاص دانشوروں پر جو پہلا ردعمل ہوا وہ اپنی یا اپنے اہل و عیال کی حفاظت کو بھول کر مادر وطن کی حفاظت کے لئے میدان میں نکل آنا تھا۔ ان کے ہاتھ میں ہتھیار نہ تھے لیکن ان کی قلمیں تلواریں بن گئیں ان کی شیریں بیانی رزم آرائی میں بدل گئی اور علمی ادبی مجلسوں کے عادی گلی گلی کوچے کوچے گھوم کر عوام کے کھلے اجتماعات میں رجز پڑھنے لگے، ادب برائے ادب کے نقادوں نے ادب برائے زندگی کا علم اٹھا لیا مرمریں ہتھیاروں میں بیٹھنے والے بموں اور گولوں سے کھیلنے پر تیار ہو گئے۔

یہ حضرات اور وہ تمام دانشور اور اہل قلم جن کی نمائندگی کرنے آج یہ مہمان تشریف لائے ہیں نہ صرف اہل کراچی بلکہ تمام ملک کے اہل قلم اور عوام کے شکریے کے مستحق ہیں۔ اس موقع پر میں کراچی کے ادیبوں کو بھی خراج تحسین پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کیونکہ انہوں نے جس جذبے اشتیاق اور خلوص سے ادبی محاذ پر جنگ میں حصہ لیا وہ بھی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ کراچی یقیناً محاذ سے دور تھا لیکن اہل کراچی روحانی اور جذباتی طور پر محاذ اور اہل محاذ سے کس قدر قریب رہے اس کا اندازہ

ل ۱۴ر نومبر ۶۵ء کو رائٹرز گلڈ کے زیر اہتمام ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں ادیبوں کی ان خدمات کا اعتراف کیا گیا جو انہوں نے جنگ کے زمانے میں انجام دیں۔ جناب اختر حسین نے اس جلسے میں بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ ان صفحات پر جناب موصوف کی تقریر کا متن شائع کیا جا رہا ہے۔

ان کی تحریریں ان کے نغموں اور ان کی دوسری کارروائیوں سے آسانی ہو جاتا ہے نا انصافی ہو گی اگر اس ضمن میں ملک کے دوسرے تمام شہروں کا ذکر نہ کیا جائے جہاں کے عوام اور اہل قلم اپنی بساط اور حوصلے کے مطابق اس جنگ میں پوری طرح شریک رہے اور آج بھی ہیں۔

جنگ کے جو فوری اثرات دانشور طبقے پر مرتب ہوئے ان کے بارے میں بہت کچھ کہا جا رہا ہے اور خوشی کی بات یہ ہے کہ اس سلسلے میں کوئی اختلاف رائے نہیں۔ اس جنگ میں کوئی دانشور یا دانشوروں کا کوئی طبقہ انفعالیت کا شکار نہیں ہوا جب کہ دوسری جنگ عظیم میں انگریز جیسی قوم میں PACIFISTS پیدا ہو گئے تھے۔ ہمارے کسی طبقے کے کسی فرد نے دفاعی سرگرمیوں میں عملی حصہ لینے سے گریز نہیں کیا کسی نے ممکن قربانیوں سے دریغ نہیں کیا کسی نے گروہ بندی کی بات نہیں اٹھائی کوئی کسی قسم کی نظریاتی الجھنوں کا شکار نہیں ہوا۔

خواتین و حضرات

یہ یکتائی یہ یک جہتی جو قوم کو اس جنگ کی بدولت ملی ہے میری ناچیز رائے میں آپ کا سب سے بڑا سرمایہ سب سے بڑی قوت اور ایک طرح سب سے بڑا نصب العین ہے۔ یہ وہ صورت حال ہے وہ منزل ہے جس کے لئے اٹھارہ برس سے پاکستان کی تمام حکومتیں سینکڑوں کوششیں کرتی رہتی تھیں۔

دانشوروں کے اجتماع میں ذہنی یک جہتی کی شرح شاید غیر ضروری معلوم ہو لیکن جو بات میں عرض کر رہا ہوں اگر وہی آپ کے دل میں بھی ہو تو مجھے اپنی ہم خیالی کے صدقے میں معاف کر دیجئے گا۔ مجھے عرض یہ کرنا ہے کہ ایک نئی قوم مسلسل ذہنی یک جہتی کے بغیر ایک عظیم قوم نہیں بن سکتی اور اگر پاکستان کو قومی عظمتوں کی منزلوں سے گزرنا ہے تو آپ کو اپنی ذہنی اور فکری یک جہتی کے تجربے سے مدتوں گزرنا ہو گا اختلافی زندگی کی نوبت بہت دن بعد ہونی چاہیے اختلاف کے نتائج ہم آپ بہت دیکھ چکے ہیں اور اب کہ اتفاق نے اپنا پہلا جلوہ دکھا دیا ہے نہایت ضروری ہے کہ اس پرچم کو مضبوطی سے تھام لیا جائے۔

مگر! یہ ذہنی اور فکری یک جہتی چند مسلسل قربانیوں کا مطالبہ بھی کرتی ہے۔ اسے برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ آپ انفرادی صوبائی شہری اور جماعتی تعصبات سے مسلسل بلند رہیں یہ کہنا آسان ہے مگر اس پر عمل نہایت مشکل ہے اور یہی مشکل عمل وہ آنچ ہے جس میں تپ کر آپ کی ذات آپ کا ضمیر اور آپ کا قلم ایک عظیم قوم ایک عظیم قوم کے اجزائے ترکیبی مرتب کرے گا۔ آپ کی نسل پاکستان کی تاریخ میں بڑی اہمیت کی حامل ہے اور اگلی نسلوں کے سامنے سب سے پہلے جوابدہ ہو گی کیونکہ آپ نے آزادی کی تحریک دیکھی ہے آزادی دیکھی ہے تقسیم کے مصائب دیکھے ہیں آزادی کی ذمہ داریاں دیکھی ہیں آپ نے آپس کے نفاق و افتراق کے نقصانات دیکھے ہیں اور اب اتفاق سے فوائد آپ کی دسترس میں ہیں خواتین حضرات میں بطور یاددہانی پھر عرض کروں گا کہ آپ کی ذمہ داری بہت بڑی اور تاریخی ذمہ داری ہے

مجھے یقین ہے کہ اب ادیب اور دانشور اپنی سرگرمیوں کو مثبت اور باضابطہ طریقے سے آگے بڑھانے پر غور کر رہے ہوں گے۔ میں نے دیکھا ہے کہ ادارے اور افراد رزمیہ اور قومی نظموں مقالوں افسانوں اور ڈراموں کے مجموعے شائع کر رہے ہیں۔ ہماری بہادر فوجوں کو جس خلوص اور بے ساختگی سے خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے وہ یقیناً اس قابل ہے کہ اسے جمع کر کے گھر گھر پہنچایا جائے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اہل علم انفرادی اور اجتماعی طور پر پاکستان کے قیام اس کے محرکات اور اس کے نصب العین پر ریسرچ کریں اور امہات الکتب تصنیف کریں۔ جہاں تک سرحدوں کا تعلق ہے ہمیں خدا کے بعد اپنی فوجوں اپنے سالاروں اور اپنی حکومت پر بھروسا کرنا ہوگا اور ہمیں یقین ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو رہے ہیں۔ مگر چند مورچے ہمیں اپنے گھر میں بھی کھولنے پڑیں گے۔ نئی نسلوں کے لئے ابھی تک ایسی کتابیں کافی تعداد میں شائع نہیں ہوئیں جو تحریک پاکستان کے بارے میں تفصیلی مواد فراہم کریں۔ مغربی تہذیب اور ادب نے ابھی تک ہمارے اذہان میں قدم جمار کھے ہیں اور ابھی تک ہم نہ صرف مشرق سے بلکہ خود اپنے تہذیبی اور ثقافتی ورثے سے پوری طرح آگاہ نہیں ہیں۔ بہت سے افراد اور بہت سی جماعتوں کو یہ کام بھی پورا کرنا ہوگا۔ آج افریشیائی تحریک سے واقفیت بھی ہمارے لئے بے حد ضروری ہو گئی ہے کیونکہ اس جنگ کے زمانے میں ہم نے دیکھ لیا کہ ہمارے مغربی دوست کتنی دور ہمارے ساتھ چل سکتے ہیں۔ ایک بڑے اور آزاد ملک کی حیثیت سے ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم سب قوموں سے تعلقات استوار رکھیں لیکن افریشیائی برادری کی رکنیت ہمارے لئے قطعی ناگزیر ہے اور اس رکنیت کے بہت سے تقاضے ہیں جو ہماری قوم کو پورے کرنے ہوں گے۔ ان کے سیاسی یا خارجی شعبوں پر گفتگو کرنا میرا کام نہیں میں آپ کی توجہ اس مسئلے کے چند علمی پہلوؤں پر مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ افریشیائی برادری ایک بڑی برادری ہے ایک خطے میں سینکڑوں قومیں اور ملک شامل ہیں اور ایک بڑے ملک کی حیثیت سے پاکستان کے لئے لازمی ہے کہ وہ دوسرے افریشیائی ممالک کی تواریخ، تہذیب فکری ارتقا اور زبان و ادب سے گہری واقفیت حاصل کرے۔ یہ سارا کام صرف حکومت کے بس کا نہیں جو ہزاروں دوسرے کاموں میں معروف ہے بلکہ اہل علم اور اہل قلم کا ہے۔ میری تجویز ہے کہ ہر شہر میں افریشیائی معلوماتی ادارے یعنی انسٹی ٹیوٹ آف افرو ایشین اسٹڈیز ——— قائم کئے جائیں جہاں گاہ بگاہ افریشیائی تاریخ و ادب کے ماہرین مذاکروں اور مباحثوں میں حصہ لیں بلکہ وہاں چھوٹے یا بڑے پیمانے پر ایسی کتابیں اور رسالے بھی جمع کئے جائیں جن میں اس وسیع خطۂ زمین کے بارے میں تفصیلی معلومات جمع ہوں۔ آپ لوگ خود تحقیق و ترجمہ کے ذریعے ایسا مواد فراہم کر سکتے ہیں۔ آج تک جتنی توجہ ہم نے مغربی ادب کے ترجموں اور اس کی تحقیق پر دی ہے اگر اس کا عشر عشیر بھی ایشیا اور افریقہ پر صرف کیا گیا ہوتا تو آج ہمارے کتب خانے زیادہ امیر اور علم افزا ہوتے۔ بہرحال یہ نہایت ضروری ہے کہ آپ اپنے خاندان کے افراد کو جانیں صرف ان کے نام جاننا ہی کافی نہیں بلکہ ان کی خصوصیات ان کی اہلیت اور ان کے نظریات سے واقفیت بھی ناگزیر ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ کوئی آپ کو جانے اور مانے تو

آپ پر بھی فرض ہے کہ اسے جانیں پہچانیں اور مانیں ۔ میں اس معاملے پر اس لیے زور دے رہا ہوں کہ افریشیائی برادری سے گہری واقفیت نہ صرف علمی طور پر ہمارے لئے مفید ہے بلکہ ہمارے طویل المیعاد دفاع میں بھی ہمارے کام آئے گی ۔ یہ ایک بدیہی بات ہے آپ اسے مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں ۔

خواتین و حضرات

آپ نے خود محسوس کیا ہوگا کہ جن تخلیقی سرگرمیوں نے ہمارے بہادروں کے دل گرمائے وہ قومی زبانوں میں لکھی گئیں یہ کوشش کسی کے حکم یا تحریک پر نہیں کی گئی بلکہ لکھنے والوں کے قلم آپ ہی آپ اپنی قومی زبانوں میں آگ اور پھول برسانے لگے یہ اس لئے ہوا کہ گو ملک کی سرکاری زبان بدقسمتی سے اب تک انگریزی ہے مگر سوچنے والوں کے ذہن مقامی فضا میں سوچتے ہیں ۔ اور جب ان کا جذبہ بے اختیار ہوتا ہے تو ان کی زبان اور قلم فطری طور پر قومی زبان ہی کا سہارا ڈھونڈتی ہے ۔ آپ نے دیکھا کہ گو ہمارے بیشتر شہری اور فوجی افسران انگریزی جانتے ہیں بلکہ کافی تعداد میں جوان بھی انگریزی سمجھ لیتے ہیں ——— لیکن ان کے دلوں میں جو بات پہنچائی گئی ہے وہ قومی یا علاقائی زبانوں میں ۔ انگریزی زبان کا ایک گیت ایسا نہ لکھا جا سکا جو ہمارے جذبات کی ترجمانی کر سکے اور ہمارے اردو بنگالی یا علاقائی زبانوں کے گیتوں جیسی مقبولیت حاصل کر سکے ۔ یہ ہم سب کے لئے ایک بہت بڑا سبق ہے اور میری ناچیز رائے میں یہ بھی اسی قومی یک جہتی کا ایک مظہر ہے جس کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا ہے ۔

خواتین و حضرات

اگر میں نے آپ کا وقت ضائع کیا ہو تو اس کے لئے معذرت خواہ ہوں لیکن آج صورت حال کچھ ایسی ہے کہ پرانے چشمے بھی رواں ہو گئے ہیں ۔ میں سپاہی نہیں کہ محاذ پر جا سکوں ۔ ادیب نہیں کہ قلم کی تلوار چلا سکوں مگر میں بھی اسی ملک کا ایک شہری ہوں جہاں مادر وطن کی حفاظت سالمیت اور عظمت کی تحریک نے ایک عظیم اور تاریخی منزل کو چھو لیا ہے ۔ اگر میری گزارشات پر مناسب غور ہوا اور اچھے نتائج برآمد ہوئے تو میں سمجھوں گا کہ یہ سمع خراشی بے سود نہ تھی ۔

خدا بخش بچا
...یت مغربی
ن

خطبہ

بتقریب جلسۂ عطائے اسناد، پشاور یونیورسٹی

منعقدہ ۲۴ دسمبر ۶۵ء

محترم وائس چانسلر صاحب، فاضل اساتذہ اور عزیزان ملت!

...بلم
...ں وائس چانسلر صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے اس جامعہ کے جلسۂ تقسیم اسناد میں شرکت کی دعوت دے کر ...ن وطن کی خوشیوں میں شریک ہونے کا شرف بخشا اور آپ کے سامنے اپنے خیالات پیش کرنے کا موقع دیا۔
...رغ التحصیل نوجوانو! جامعۂ پشاور کے قیام کے کوئی بیس سال قبل علامہ اقبال علیہ الرحمۃ نے اس خطے کے افغانان ...علمی کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا تھا۔

تیری بے علمی نے رکھ لی بے علموں کی لاج
عالم فاضل بیچ رہے ہیں اپنا دین ایمان

وہ زمانہ تھا جب ہندوستان غلام تھا، پاکستان معرض وجود میں نہیں آیا تھا اور میکالے کے نظریۂ تعلیم کے تحت جو ...یہاں نافذ تھا، اس تعلیم کا مقصد حصولِ معاش اور خلعتِ انگریز حاصل کرنے سے آگے نہیں بڑھتا تھا جسے وہ ...قوم کے لئے مہلک خیال کرتا تھا۔

وہ علم نہیں، زہر ہے احرار کے حق میں
جس علم کا حاصل ہے جہاں میں دو کفِ جو

...اور

فیصلہ تیرا ہے کیا؟ اے مرے فقر غیور
خلعتِ انگریز یا پیرہن چاک چاک

...یہی تو وہ علم تھا، جو انسان کو فکر معاش دے کر اس کی روح قبض کر لیتا تھا۔ یقیناً ایسے علم سے تو بے علمی ہی

بہتر ہے۔

آج سے اٹھائیس سال قبل ہمیں آزادی نصیب ہوئی، تو ہم نے آداب آزادی سیکھنے کے لئے مغرب کے سیاسی، اقتصادی، معاشرتی، ثقافتی اور تعلیمی نظریات کی طرف رجوع کیا۔ اب تعلیم کا مقصد حصول معاش کے علاوہ آزادئ عقل اور آزادئ فکر قرار پایا، اور اسے سیاسی آزادی کا تتمہ گردانا گیا، مغربی تعلیم کے ان خطرناک جراثیم کو سرسید احمد خاں، نواب محسن الملک اور شبلی ایسے علمبرداران تعلیم مغربی نے بھی دیکھ لیا تھا اور انہیں ان کے مہلک اثرات کا کچھ کچھ اندازہ بھی ہو گیا تھا چنانچہ اپنی اپنی حد تک انہوں نے نوجوانوں کو اس سے خبردار بھی کیا۔ خود سرسید احمد خاں اپنے مقالات میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں " جہاں کسی نے کوئی ڈگری پائی، اس نے سمجھ لیا کہ میں بہت بڑا عالم بن گیا..... نادا جب آزادی کو دہ جزو ایمان بناتا ہے اور یہ سمجھتا بھی نہیں کہ آزادی کیا چیز ہے "۔ اس طرح نواب محسن الملک نے تہذیب الاخلاق میں اپنے ایک مضمون میں مغربی تعلیم پر تنقید کرتے ہوئے لکھا " ہم نہ صرف مشرقی امراض کے لئے معالجے کے محتاج ہیں۔ بلکہ ہم کو ایسے طبیب کی ضرورت ہے۔ جو مغربی بیماریوں سے بھی بچائے " مگر ایسے طبیب کی تلاش میں ہم ابھی تک سرگرداں ہیں۔

آزادی پاکر ہم جمہوریت کے متوالے بنے، مگر جمہوریت کے پنپنے کے لئے جس خاص قسم کی فکری ذمہ داری پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسے ہمارے لوگوں کی اکثریت نے آزادئ عقل کے منافی خیال کیا۔ لنکن نے جمہوریت کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا۔

> " جہاں تک مجھ میں غلام بننے کی صلاحیت نہیں، وہیں تک مجھ میں آقا بننے کی بھی صلاحیت نہیں۔ یہ قول میرے تصور جمہوریت کی وضاحت کرتا ہے اور اس سے جو بات بھی اختلاف کی حد تک مختلف ہے، وہ جمہوریت نہیں ہے "۔ ہماری تعلیم میں آزادئ عقل اور بے لگامئ فکر کی وجہ سے ہمارے ملک میں جمہوریت کو رکاوٹوں پر رکاوٹیں پیش آتی رہیں۔ اور اقبال تو آج سے بہت پہلے یہاں تک کہہ گزرا تھا کہ آزادئ افکار انسان کو حیوان کی سطح تک لے جاتی ہے :۔

ہو عقل اگر خام، تو آزادئ افکار
انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

"عقل خام اور فکر بے لگام کی آزادی" کا نتیجہ ہمیشہ یورپ کی اس بے عنوان آزادی BOHEMIAN FREEDOM کی صورت میں نکلا کرتا ہے جس کی بنیادیں انکار، تشکک اور غیر ذمہ دارانہ آزادی پر استوار ہوتی ہیں۔ خیالات کے مہار کے لئے آخر کوئی مرکز تو ہونا چاہیے کیونکہ اگر افکار کو بے لگام چھوڑ دیا جائے تو اس کی منزل ذہنی بغاوت، اخلاقی بے راہ روی بد لحاظی اور خود غرضی کے سوا اور ہو ہی کیا سکتی ہے۔

مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر
چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام

ت میں یکسوئی اور مرکزیت پیدا کرنے کے لئے سب سے پہلے تعلیم اور علم کا نصب العین متعین ہونا چاہیے۔ افلاطون
لیمات کا مرکز و محور پوری انسانی شخصیت کی نشو ونما قرار دیا تھا اور انسان کی شخصیت جسمانی، عقلی، تخیلی، جذباتی اور
نی صلاحیتوں کا ایک ایسا گلدستہ ہے جس میں کسی ایک پھول کی کمی بھی انسان شناس نگاہوں کو خار بن کر کھٹکتی ہے
نیکہ اس گلدستے کو سرے سے منتشر کر دیا جائے۔ لہٰذا ہمیں ایک ایسا محیط حیات نظام تعلیم درکار ہے جو زندگی کے
ے رنگا رنگ کی شیرازہ بندی کرکے اس جہان رنگ و بو کو ہمارے لئے فردوس قلب و نظر بنا دے اور اسی کا دوسرا
قادت و تمدن (CULTURE) ہے جسے سقراط نے "پیارے پن سے پیار" (Love of loveliness) سے
م کیا تھا۔

ظاہر ہے کہ "پیارے پن سے پیار" اس کلچر کا نام نہیں جو ڈرائنگ روم کی تزئین و آرائش، پتلون کے پائنچوں میں
بثی کالر کی سختی، ٹائی کی گرہ کی خوشنمائی، سبے سلوٹ کوٹ اور چمکدار و نوکدار جوتوں تک ہی محدود ہے۔ یہ آپ
ن شائستگی بھی بڑے کام کی چیز سہی مگر حیاداری، لحاظ داری، وضع داری، شرافت، قناعت، تواضع، بڑوں کا
، چھوٹوں سے پیار، صلہ رحمی، ایثار و قربانی، متانت اور استقامت، دردمندی اور غمگساری کی کلیاں اور پھول
مرجھانے لگیں جن کے خوشنما و دلربا گلدستوں سے آج تک طاق انسانیت کو سجایا جاتا رہا ہے۔

شاید حسن تمدن کے بارے میں ہی گفتگو کرتے ہوئے اقبال نے "حسن را بے انجمن دیدم خطا ست، کہا تھا" حسن
ن" دیکھنے کے لئے سینما ورائٹی شو اور رقص و سرود کی محفلیں ہی تو درست نہیں ہیں کہ ان مشاغل میں کھو کر ہمارا معاشرہ
، وحریت، عاجزی اور انکسار، ہمدردی و غمگساری سے غافل ہو جائے اور اپنے اردگرد بکھرا ہوا انسانی دکھ
ظر ہی نہ آئے اور اگر نظر آ بھی جائے تو آنکھوں میں آنسو آنے کی بجائے ماتھے کی شکنیں ابھریں اور بھنویں تن جائیں
ا مقصد یہی کبھی نہیں ہو سکتا۔ ہاں بات صرف اتنی ہے کہ

علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود

جب مغربی تعلیم فکر معاش کا دامن تھامے ہمارے نظام تعلیم میں داخل ہوئی تھی تو انگریزوں نے تعلیم اور
ی کو اس طرح مضبوطی کے ساتھ باہم مربوط کر دیا کہ انہیں آج تک جدا کرنے میں بڑی دشواریاں پیش آ رہی ہیں۔ ایک
ملک میں یہ جدائی کچھ اتنی ضروری بھی نہیں رہی۔ روٹی بھی تو آخر زندگی کا ایک بنیادی مسئلہ ہے اور اسے حل
کے لئے تعلیم سے مدد ضرور لینی چاہیے۔ البتہ خیالات کی یہ تبدیلی بہت ضروری ہے کہ اب تعلیم کا مقصد کلرکی یا
ی نوکری ہی نہیں ہونا چاہیے بلکہ تعلیم کے ذریعے اپنی صلاحیتوں کے مطابق زراعت اور صنعت و حرفت کے
نوں میں پیشہ ورانہ مہارت پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس ضمن میں سائنٹفک علوم اور سائنٹفک

ٹکنالوجی ناگزیر اور لابدی ہیں۔

یہ سچ ہے کہ سائنٹفک علوم اور سائنٹفک ٹکنالوجی نے جسمانی اعتبار سے انسان کو اتنا سکھ پہنچایا ہے، اور اتنی آسودگی بخشی ہے کہ ان کے زیر اثر آکر انسانی زندگی کا طور طریقہ بالکل بدل گیا ہے یہ سب سائنس ہی کی برکات کا نتیجہ ہے کہ مغرب کے تمام کاموں میں چابکدستی مہارت و لیاقت، تحقیق و جستجو کا ایسا حسین امتزاج ملتا ہے کہ ہم حیرت سے دنگ رہ جاتے ہیں۔

یہاں تک تو سب ٹھیک تھا مگر ظلم یہ ہوا ہے کہ مغرب میں سائنس نے پہلے تو ایک فلسفے اور فلسفے سے بڑھ کر ایک بے خدا مذہب کی شکل اختیار کر لی ہے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ زندگی میں اب غیر اخلاقی قدروں کا چلن بھی ایک سائنٹفک بات سمجھی جاتی ہے چنانچہ تن آپروری خود غرضی اور بیدردی کے بوجھ تلے انسان کی روح دم توڑ رہی ہے اور حیرت ہوتی ہے کہ جس انسان کے اندر اللہ تعالےٰ نے خود اپنی روح پھونک کر اسے حیوانی سطح سے بلند کر کے احسن التقویم کے مقام پر فائز المرام کیا تھا وہ اپنی روح کشی کے باعث جوہر انسانیت کھو کر حیوانی سطح سے گرتا ہوا اسفل السافلین بنتا چلا جا رہا ہے۔ اقبال نے سچ ہی تو کہا تھا۔

علم بے عشق است از طاغوتیاں
علم با عشق است از لاہوتیاں

"علم بے عشق" کی آفات سے دنیا تنگ آکر "علم با عشق" کی تلاش میں سرگرداں ہے اور یہ "علم با عشق" کا اسلامی کردار پاکستان کے تعلیمی نظام کو ہی ادا کرنا ہے۔

اسلام اذواقِ زندگی کا گلا نہیں گھونٹتا بلکہ علی الاعلان کہتا ہے کہ جو لوگ اذواقِ زندگی کا گلا گھونٹنا چاہتے ہیں ان سے ذرا پوچھو تو کہ زینت کی چیزیں اللہ تعالےٰ نے تم پر کب حرام کیں؟ اس لئے سائنس کے بے خدا فلسفے کو چھوڑ کر ہم سائنس کے معلوم کردہ حقائق اور ان معلوم شدہ حقائق کی بنا پر حاصل کردہ ٹکنالوجی سے پورا پورا استفادہ کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ لیکن جہاں تک فلسفہ سائنس کا تعلق ہے اسے ہمیں ہرقل کے نام حضور صلعم کا پیغام "اسلم تسلم" یعنی اسلام لاؤ سلامتی پاؤ دے کر مشرف با اسلام کرنا ہی پڑے گا۔ اگر ایک غیر مسلم سائنسداں علم طبیعات (PHYSICS) کی تعریف یوں کرتا ہے کہ "فزکس مادے کا علم ہے"، اور ایک مسلمان سائنسداں علم طبیعات کی تعریف یوں کرے "فزکس اللہ تعالےٰ کے اس نظام تخلیق و ربوبیت کی سائنس کا نام ہے جو مادی دنیا میں ظہور پذیر ہوا ہے" تو اس میں کونسی بات غیر سائنٹفک ہے؟ اسی طرح بائیولوجی کی تعریف اب اگر یہ کی جاتی ہے کہ "بائیولوجی زندگی کی سائنس ہے" اور اگر ہم اس تعریف کو یوں بدل دیں کہ "بائیولوجی اللہ تعالےٰ کے اس نظام تخلیق و ربوبیت کی سائنس کا نام ہے جو خدا کی تخلیق کردہ دنیائے زندگی میں ظہور پذیر ہوا ہے" تو اس میں آخر سائنسی نقطۂ نظر سے کیا قباحت ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ اگر

ہم اپنے نصاب علوم کو اس طرز پر مرتب کرنا شروع کر دیں تو ہمارے تعلیم یافتہ بالخصوص سائنسی علوم کے تربیت یافتہ نوجوانوں کے اذہان میں مادی اور اسلامی اقدار کا خوفناک تصادم چند ہی سال میں دور ہو سکتا ہے اور انہیں دورِ حاضر کی اعتقادی کشمکش سے نکال کر ان میں ایمان پیدا کر کے ان کی فکری توانائیوں میں بے پناہ اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کا فرانہ نہاد زمانے کو اسی طرح علمبردار اسلام بنایا جا سکتا ہے۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ یہ تمام مشرف بہ اسلام علوم ایک مرکز پر سمٹ کر ایک ایسی آئیڈیالوجی کو تشکیل دیں گے جو مذہب کے فروعی اختلافات کو کم بلکہ ختم کرنے میں بڑی مدد دے گی اور اس طرح ہمیں اپنی پاکستانیت اور اسلامیت کے لئے ایک نہایت ہی ٹھوس، مستحکم اور وسیع بنیاد میسر آجائے گی اور ہماری قومیت روز بروز مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جائے گی۔

یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے کہ دنیا کے عظیم ترین سائنسدانوں کی ایک بہت بڑی اکثریت ہمیشہ خدا کی ہستی کی قائل رہی ہے۔ ہمارے کالجوں اور ہماری یونیورسٹیوں میں بھی سائنس پڑھنے والے طلبہ عام طور پر دوسرے علوم پڑھنے والے طلبہ کی نسبت زیادہ خدا پرست اور دیندار ہوتے ہیں۔ دوسرے مذاہب کے بارے میں تو کچھ زیادہ معلوم نہیں البتہ اسلام کے بارے میں یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اسلام اور سائنس میں بہت قریبی رشتہ ہے۔ اگلے وقتوں کے مسلمان سائنسدان اس رشتے کو خوب پہچانتے تھے اور اسے مضبوط سے مضبوط تر بنانے کی فکر رکھتے تھے۔ چنانچہ شہرۂ آفاق تصنیف "تاریخ تعارف سائنس" کے مصنف سر سارٹن ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "ہم مسلمانوں کی سائنس کو اس وقت تک صحیح طور پر کیسے سمجھ سکتے ہیں جب تک اس حقیقت کو پوری طرح نہ ذہن نشین کر لیں کہ وہ قرآن کے محور کے گرد گھومتی ہے۔"

افسوس کہ ہم اپنے علمی ورثے سے بالکل بے خبر اور غافل ہیں۔ ہم میں سے کتنے لوگ جانتے ہیں جابر بن حیان نے کیمسٹری میں اپنے تجربات کے ذریعے عمل تقطیر (Filtration) عمل تبخیر (Evaporation)، عمل کشید (Distillation) اور عمل تصعید (sublimation) کے طریقوں کو کتنی ترقی دی اور کتنے نئے مرکبات دریافت کر ڈالے۔ عبد الملک بن اصمعی نے بائیولوجی میں گھوڑے، اونٹ اور دوسرے وحوش کی اناٹومی وغیرہ پر کتنا کام کیا ہے۔ جرجانی نے جیومیٹری میں کتنے نئے مسائل کا حل پیش کیا ہے۔ علم الجبرا تو خالص مسلمان عربوں کی دریافت ہے۔ ثابت بن قرہ نے پیرابولا (Parabola) اور پیرابولائیڈ (Paraboloid) پر رسائل تحریر کئے۔ ابوذکریا رازی، بو علی سینا نے طب اور خواص الادویہ پر کس قدر تحقیقاتی کام کیا تھا اور زریں دست آنکھوں کا کتنا بڑا ماہر سرجن تھا۔ آخر ان عظیم مسلمان سائنسداں اور عالموں کا کہاں تک ذکر کیا جائے۔

اسلامی علوم و افکار کے اسی ورثے سے خوشہ چینی کر کے مغرب نے سائنسی میدان میں اتنی ترقی کی ہے کہ "تعمیر انسانیت" کا مصنف بریفالٹ لکھتا ہے "اگرچہ یورپ کی ترقی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس پر اسلامی تہذیب کے فیصلہ کن

اثرات کی حیرت نگی ہو لیکن یہ اثر کہیں بھی اتنا واضح اور اہم نہیں جتنا کہ اس طاقت کے ظہور میں ہے جو دنیائے جدید
مخصوص اور مستقل قوت اور اس کی کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے یعنی سائنس اور سائنسی طرزِ فکر۔ لیکن آج یہ
ہے کہ ہم اپنی روایات کو فراموش کر کے جدید علوم سائنس کو مغربی تہذیب کی برکات میں شمار کرتے ہیں ۔

اے بعشق دیگراں دل باختہ
آبروئے خویش را نشناختہ

آخر ایسا کیوں نہیں ہو سکتا کہ ہم جدید سائنس، جدید ٹکنالوجی اور دیگر جدید علوم کو مسلمان کر کے دنیا
ایک نئی تہذیب اور ایک نئے تمدن کو جنم دیں؟ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عقل کو دین کی اساس اور علم
ہتھیار قرار دیا ہے ۔ میرا ایمان ہے کہ اگر جدید علوم کی تلوار کو مشرف بہ اسلام کر کے ذوالفقار حیدر بنا لیں تو اس
صرف اپنے تمدن کی، اپنی تہذیب کی اور اپنے ملک کی حفاظت کر سکتے ہیں بلکہ اس پُر امن ہتھیار کی بدولت
دنیا فتح کر سکتے ہیں؟

میں یہ بات بالخصوص آپ سے اس لئے بھی کہہ رہا ہوں کہ اس خطے کے لوگ ہتھیار رکھنے کے عادی اور ہتھیار
استعمال سے خوب واقف ہیں ۔ اور پھر اقبال نے یہ بھی تو کہا تھا کہ ؎

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندۂ صحرائی یا مردِ کہستانی

اور :۔

مدرسے نے تری آنکھوں سے چھپایا جن کو
خلوت کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش

فرزندانِ اسلام! ہر لحظہ کروٹیں بدلتے ہوئے زمانے کے پیغام کو سنیے، اور اپنی خودی کو پہچانیے اور
یاد رکھیے کہ ہماری قومی خودی اسلام سے عبارت ہے ۔ اقبال نے شکایتاً کہا تھا کہ "ہزار پارہ ہے کہسار کی مسـ
لیکن الحمد اللہ کہ پاکستان نے افغانانِ کہسار کی مسلمانی کو متحد کر کے چٹان بنا دیا ۔ یہاں چلتے چلتے ایک حکایت
حضرت سلمان فارسی سے کسی نے قومیت اور حسب و نسب پوچھا تھا تو آپ نے جواب دیا تھا "سلمان ابن اسلام"
اس سلمانی کے لئے کوہ و بیاباں کی فضائیں بہت سازگار ہیں ۔

ہے شیخ بہت اچھی مکتب کی فضا لیکن
بنتی ہے بیاباں میں فاروقی و سلمانی

آپ نے اپنی تعلیم مکمل کر لی ہے مگر اس جامعہ سے نکلنے سے پیشتر میں آپ کو خبردار کرنا چاہتا ہوں کہ

(۱) اس جامعہ نے آپ کو علم سے مسلح تو کر دیا ہے لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ عشق کی تیغ جگر دار تو کوئی اور اڑا لیجائے اور آپ کے ہاتھ میں علم کی خالی نیام رہ جائے۔

(۲) عزیزان من! زندگی کرنے کو ہنر چاہیے کیونکہ یہاں صرف علم ہی کام نہیں آتا بلکہ بصیرت اور عمل کام آتے ہیں یعنی اپنی ذات، اپنے نصب العین، اپنی صلاحیت کار کا مکمل شعور حاصل کر کے زندگی بھر محنت، ثابت قدمی اور استقلال سے کام لینا ہے جسے اقبال سوز جگر کہتا ہے ؎

زندگی کچھ اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے
زندگی سوز جگر ہے علم ہے سوز دماغ
علم میں دولت بھی ہے لذت بھی ہے قدرت بھی ہے
ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ

(۳) گبن نے کہا ہے کہ ہر شخص دو قسم کی تعلیم رکھتا ہے۔ ایک تو وہ تعلیم ہے جسے وہ دوسروں سے حاصل کرتا ہے اور دوسری تعلیم وہ ہے جس میں وہ خود اپنا استاد بنتا ہے۔ زندگی کے تجربات سے سبق لینا اور صحیح نتیجہ اخذ کرنا اسی دوسری تعلیم کے ضمن میں آتا ہے جسے بعض لوگ حکمت کا نام بھی دیتے ہیں۔ اور حکمت کی ضرورت انسان کو عمر بھر رہتی ہے اسی لئے کوپر نے کہا تھا کہ علم اس بات پر نازاں ہے کہ اس نے اتنا کچھ سیکھ لیا مگر حکمت بیچاری عاجز ہے کہ اسے کچھ زیادہ معلوم نہ ہو سکا۔

(۴) مادی تعلیم اور عملی زندگی کے متعلق بہت کچھ بیان ہو چکا اب میں باطنی مطالعے اور باطنی تعلیم کا تھوڑا سا ذکر کرنا چاہتا ہوں جسے بعض لوگ روحانی تعلیم کا نام بھی دیتے ہیں۔ میں اسے تصوف کے نام سے موسوم کرنے میں کوئی مضائقہ خیال نہ کرتا بشرطیکہ یہ ایسا تصوف ہو جو انسان کو ہفت افلاک ہی کی سیر نہ کرائے بلکہ زمین پر چلنے میں بھی اس کے لئے کوئی دشواری نہ رہے۔ ایسا تصوف انسان کے لئے یقیناً مفید ہے کیونکہ اس منزل عشق کی وادی میں زندگی میں صد سالہ مسافت کے فاصلے ایک آہ سے ہی طے ہو جاتے ہیں۔ کنگسلے کا قول ہے کہ "تار کا علم وقت کی بچت کرتا ہے، تحریر کا علم انسانی گویائی اور رفتار کی بچت کرتا ہے، انسانی عقل کے قوانین کا علم دماغی مشقت سے بچاتا ہے۔ اور روح کے قوانین کا علم۔ (سبحان اللہ) کیا چیز نہیں بچاتا؟"

حقیقت یہ ہے کہ من مندر میں بڑا ہی چین اور سکھ ہے۔ لیکن اس میں داخل ہونے کے آداب آنے چاہئیں۔

میں اپنے ان عزیز نوجوانوں کو جو اس جامعہ سے اسناد پا کر عملی زندگی یا اعلےٰ ترین تعلیمی منازل میں قدم رکھ رہے ہیں خلوص دل کے ساتھ مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اللہ تعالےٰ انہیں کاوش و محنت کا اجر عظیم عطا فرمائے۔ تاکہ ان کی انفرادی زندگی قوم کے وسیع تر مفادات کی امین بن جائے۔

مجھے قوی امید ہے کہ یونیورسٹی کے قابل، محنتی اور صاحب درد وائس چانسلر صاحب کی رہنمائی میں اس جامعہ کے اساتذہ درس و تدریس کا اعلیٰ معیار قائم رکھنے کا تہیہ کئے ہوئے ہیں اور میں دعا کرتا ہوں اللہ تعالےٰ انہیں اپنے نیک ارادوں میں برکت دے۔

میں یقین دلاتا ہوں کہ موجودہ حکومت تعلیم کی اہمیت و افادیت کا پورا پورا احساس رکھتی ہے اور اپنے وسائل کے مطابق تعلیم کی ترقی کے لئے ہر قسم کی سہولت دینے پر آمادہ ہے۔ اس امر کا اندازہ ان حقائق کی روشنی میں بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۹۵۹ء میں تعلیم پر کل خرچ ۱۰ کروڑ روپے ہوتا تھا جو اب ۴۰ کروڑ تک پہنچ گیا ہے۔ ۱۹۵۹ء میں درسگاہوں کی تعداد بیس ہزار تھی جو اب چالیس ہزار ہو گئی ہے اور ۱۹۵۹ء میں طلبہ کی تعداد ۲۲ لاکھ ہوا کرتی تھی جو تقریباً ۴۴ لاکھ تک پہنچ چکی ہے۔ بالخصوص اس علاقے میں تو گزشتہ اٹھارہ سال میں پرائمری اسکول، ہائی اسکول اور کالج کی تعداد چوگنی ہو گئی ہے اور طلبہ کی تعداد کالجوں میں چھ گنا سے آٹھ گنا اور ہائی اسکولوں میں پانچ گنا ہو گئی ہے۔

میری دعا ہے کہ آپ کی اور حکومت کی مساعی سے پاکستان کا تعلیمی مستقبل درخشندہ اور تابناک ہو۔ تاکہ تعلیم کے ذریعے سے اقوام عالم میں ہم ممتاز جگہ حاصل کر سکیں۔

پاکستان پائندہ باد

فروری ۶۶ء

ڈاکٹر شوکت سبزواری

اردو کی اصل اور اس کی ابتدا

زبانیں دو قسم کی ہیں۔ قدیم یا اصلی۔ یہ وہ زبانیں ہیں جنہیں ہم ام الالسنہ یعنی زبانوں کی اصل یا سرچشمے کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ ان کی ابتدا بھی ہو سکتی ہے، گروہ بندی کر کے ان کے خاندان بھی بنائے جا سکتے ہیں۔ لیکن کسی قدیم قریباً ہمسر مخصوص متعین جانی پہچانی زبان کو ان کا ماخذ قرار نہیں دیا جا سکتا، سنسکرت، لاطینی، یونانی، قدیم فارسی وغیرہ آریائی، عربی، عبرانی، سریانی، اشوری وغیرہ سامی، تامل، تلگو، کنڑی وغیرہ دراوڑ خاندان کی زبانیں سب اس قسم میں شامل ہیں۔ دوسری قسم ان زبانوں کی ہے جو کسی قدیم زبان سے ماخوذ اور ان سے متفرع ہونے کی وجہ سے جدید فرعی یا غیر اصلی کہلاتی ہیں۔ ان زبانوں کی اصل کے بارے میں بھی سوال کیا جا سکتا ہے اور ابتدا کے بارے میں بھی۔ یہ زبانیں کسی قدیم اصلی زبان کی کوکھ سے پیدا ہوئیں، جس طرح گھنے چھتنار درخت کے موٹے تنے سے چھوٹی بڑی شاخیں نکلتی ہیں۔ اس لئے قدرتی طور پر ایک جستجو کرنے والے کے دل میں خلش ہوتی ہے کہ معلوم کرے:۔

۱۔ ان زبانوں کا ماخذ، منبع، سرچشمہ یا اصل قدیم جانی پہچانی زبانوں میں سے کون سی زبان ہے؟

۲۔ یہ زبانیں کس زمانے میں اپنی اصلی زبان سے بچھڑیں اور کب انہوں نے اصلی زبان سے مختلف یا موجودہ امتیازی خط وخال اختیار کئے؟

اردو، جسے ہندی اور ہندوستانی بھی کہا جاتا ہے، جدید فرعی یا غیر اصلی زبان ہے۔ اس کی اصل اور ابتدا دونوں سے بحث ہونی چاہیے۔ لیکن اردو کی اصل پر بحث کرنے سے پہلے ایک لسانیاتی اصول کی وضاحت ضروری ہے۔ یہ اصول جدید لسانیات کے مسلمات میں سے ہے، لسانیات کی متداول کتابوں میں اسے دلائل و شواہد سے ثابت کر دیا گیا ہے، اس لئے یہاں صرف اس کی وضاحت پر اکتفا کروں گا۔ وہ اصول یہ ہے کہ زبان کے سرمایہ الفاظ و اصول و اصوات میں سے صرف اصوات و اصول اس قابل ہیں کہ زبان کے ماخذ کے سلسلے میں زیر بحث آئیں۔ کسی زبان کا ماخذ دریافت کرنا ہو تو زبان کے عام ڈھلے ڈھلائے مفرد یا مرکب الفاظ ملا نعہ کو، جو زبان کے ڈھانچے یا کینڈے کے لئے اوپر سے منڈھی ہوئی کھال یا جھلی کی سی

حیثیت رکھتے ہیں، نظر انداز کر کے الفاظ عامہ، بنیادی آوازوں (مادوں) اور صرفی نحوی قواعد و اصول کو دیکھنا چاہیئے کہ
کس زبان کے ہیں اور آس پاس کی کس قدیم اصلی زبان کے بنیادی سرمائے سے ماخوذ ہیں -

مانعہ اور مطلقہ الفاظ کی دو قسمیں ہیں - الفاظ مطلقہ کو الفاظ عامہ بھی کہتے ہیں - خاص خاص معانی دینے والے الفاظ مانعہ ہیں - جیسے گھوڑا، گاڑی، بچہ، پتنگ، اچھا، محبت، عداوت وغیرہ اور وہ الفاظ جو کسی خاص مفہوم و معنی کے لئے وضع نہیں ہوئے، ہر موجود پر بطریق تبادل ان کا اطلاق ہو سکتا ہے، الفاظ مطلقہ یا الفاظ عامہ ہیں - جیسے یہ، وہ، جو، کیا، کیوں، جب، تب، کب وغیرہ - سنسکرت گرامر میں انہیں سرونام (سرو = سب) کہتے ہیں اور عربی گرامر میں مُبہمات
ان کی حسب ذیل چھ قسمیں ہیں -

۱- ضمیریں (پرش واچک) وہ، تو، تم وغیرہ
۲- اعداد (سنکھیا واچک) ایک، دو، تین وغیرہ
۳- ظروف (ستھان واچک) جب، کب، تب -
۴- اسمار اشارہ (درشک) یہ، وہ، اس -
۵- اسمار موصولہ (سمبندھی) جو -
۶- حروف استفہام (پرشن واچک) کیا، کیوں -

ان میں سے الفاظ مانعہ میں عام طور سے لین دین ہو جاتا ہے - تجارتی سامان کی طرح اس زبان کے الفاظ اس زبان میں اور اس زبان کے الفاظ اس زبان میں چلے آتے ہیں اس لئے یہ الفاظ زبان کا بنیادی سرمایہ نہیں سمجھے جا[تے] زبان کے ماخذ کے سلسلے میں خاص طور سے ان الفاظ کو جو کسی دوسری زبان سے درآمد ہوئے نظر انداز کر دیا جا[تا] ہے - تت سم ہوں کہ تدبھو یعنی اصل شکل میں درآمد ہوئے ہوں یا بدلی ہوئی شکل میں - ذخیرہ الفاظ میں سے صرف الفاظ عامہ کو پیش نظر رکھا جاتا ہے کہ وہ زبان کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں یا بنیادی آوازوں میں مادوں ا[ور] صرفی و نحوی قاعدوں کو جو زبان کا ڈھانچا، کالبد یا پیکر ہیں - مثلاً اردو ہی کو لیجئے - اس کے سرمایۂ الفاظ میں عربی زبان کے الفاظ بھی ہیں اور فارسی، ترکی، پرتگالی، تلیگو، گجراتی، فرانسیسی کے الفاظ بھی - عربی سامی خاندا[ن] کی زبان ہے - فارسی کا تعلق ہند ایرانی سے ہے - ترکی تورانی قبیلے کی ہے - تلیگو دراوڑ ہے، انگریزی تیوتانی[،] فرانسیسی اور پرتگالی لاطینی ہے - اگر اردو کے ان الفاظ کو بنیاد بنا کر اصلیت کا کھوج لگائیں تو اردو کس خاندان [کی] ہو گی اور مذکورہ بالا زبانوں میں سے اس کا رشتہ کس زبان سے قائم کیا جائے گا -

زبان کے سرمایہ الفاظ کو لے کر اردو کی اصل کا سراغ لگانا بے سود بھی ہے اور گمراہ کن بھی - اس سے جویائے حقیقت بہک سکتا ہے - علم و فضل کے لحاظ سے وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو جیسا کہ ڈاکٹر ہورنلے اور گریرسن کے ساتھ پیش

اول اول ان عالموں نے اردو کے بارے میں یہ رائے قائم کی کہ اس کی اصل برصغیر پاک و ہند کی کوئی خاص زبان نہیں۔ کئی زبانوں کے ملاپ کا نتیجہ ہے۔ ڈاکٹر ہیورنلے نے لکھا:۔

" اردو مقابلۃً حال کی پیداوار ہے۔ یہ دہلی کے نواح میں، جو مسلم اقتدار کا مرکز اور برج، مارواڑی، پنجابی کا سنگم تھا، بارہویں صدی عیسوی میں پیدا ہوئی، مقامی باشندوں اور مسلمان سپاہیوں کے اختلاط و ارتباط سے ایک ملی جلی زبان (اردو) وجود میں آئی جو صرفی نحوی اصول کی حد تک برج ہے۔ اگرچہ اس میں پنجابی اور مارواڑی کی آمیزش بھی ہے۔ اس کے کچھ الفاظ دیسی ہندی ہیں اور کچھ بدیسی یعنی فارسی و عربی "

(گوڈین زبانوں کی گرامر، مقدمہ، ص ۶/۷)

ڈاکٹر گریرسن نے اس پر حاشیہ چڑھایا:۔

" اردو قواعد اور فرہنگ الفاظ کے لحاظ سے مخلوط، عام اور مشترک زبان ہے۔ اس میں شمالی ہندوستان کی مقامی بولیوں کے علاوہ عربی، فارسی، ترکی، تلیگو زبان کے الفاظ بھی شامل ہیں۔ اس کے صرفی نحوی قواعد نے شمالی ہند کی عام بولیوں سے خوشہ چینی کی ہے۔ اس لئے یہ کہنا ممکن نہیں کہ وہ کسی ایک مخصوص اور معین زبان سے ترقی پا کر بنی ہے۔"

(کلکتہ ریویو، ج ۷۱، ص ۱۵۶)

۱۹۰۰ء کے قریب برصغیر کی زبانوں کا لسانیاتی جائزہ لیا گیا اور اردو کا صرفی نحوی تجزیاتی مطالعہ ہوا تو ان کی آنکھیں کھلیں، اور گریرسن نے صحیح عالمانہ جذبے کے تحت اپنی غلطی کا اعتراف ان الفاظ میں کیا:۔

" ہندوستانی کے آغاز کے بارے میں آج تک اہل علم نے (جن میں خود بھی شامل ہوں) جو کچھ لکھا ہے میر امن کے دیباچہ باغ و بہار سے متاثر ہو کر لکھا ہے۔ میر امن کے بیان کے مطابق اردو ان مختلف لوگوں کی بولیوں کا معجون مرکب ہے جو دہلی کے بازاروں میں جمع ہو گئے تھے۔ اس غلط فہمی کو اول اول سر چارلس لایل نے ۱۸۸۰ء میں دور کیا۔ اور اب ہندوستانی زبانوں کے تفصیلی لسانیاتی جائزے نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہندوستانی (اردو) بالائی دوآبہ اور مغربی روہیل کھنڈ کی (بول چال کی) زبان ہے ان گھڑ اور گنوار الفاظ و محاورات نکال کر اسے ادبی نکھار سنگھار دے دیا گیا ہے "

(ہندوستان کا لسانیاتی جائزہ ج ۹، حصہ ۱، حاشیہ ص ۴۴)

ڈاکٹر گریرسن کے اس اعتراف کے بعد یہ امر قریب قریب طے ہو چکا ہے، اس پر مزید بحث کی ضرورت نہیں کہ اردو کی اصل برصغیر پاک ہند کی ایک قدیم مخصوص اور متعین زبان ہے جس سے ترقی پا کر اردو وجود میں آئی ہے۔ سچ یہ ہے کہ

یہ کون سی زبان ہے اور برصغیر کے کس علاقے میں بولی جاتی تھی؟

ڈاکٹر گریرسن، جولز بلاک، چٹرجی اور دوسرے ائمہ فن اردو کے عمیق تجزیاتی مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ اردو کا ماخذ شورسینی پراکرت اور مغربی اپ بھرنش ہے جو آج سے تقریباً پندرہ سو (۱۵۰۰) سال پہلے دوآبہ گنگ و جمن کے بالائی حصے میں بولی جاتی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ اردو کے موجودہ خط و خال شورسینی پراکرت اور مغربی اپ بھرنش سے بہت ملتے ہیں۔ اردو میں اور ان زبانوں میں غایت درجے کی بنیادی مشابہتیں ہیں۔ لیکن اردو اصوات و اصول کا ایک بہت بڑا سرمایہ ایسا ہے جو غائر تقابلی مطالعے کے بعد ان زبانوں سے، یا یوں کہیے کہ ان زبانوں کے ان روپوں سے جن کا ذکر ہیم چندر اور دوسرے قواعد نویسوں نے کیا ہے، ماخوذ نظر نہیں آتا، میں اپنی کتاب داستان زبان اردو میں (ص ۹۹-۹۸) تفصیل کے ساتھ اس کا ذکر کر چکا ہوں۔ یہاں صرف ایک دو نکات دہراؤں گا۔

۱- اردو کے عام رجحان کے خلاف پنجابی کی طرح اپ بھرنش میں مخلوط حروف صحیح کا استعمال عام تھا جیسے۔ بھلّا (بھلا) بھگّا (بھاگا) تجّھ (تجھ) مجّھ (مجھ) بپّ (باپ) اپّا (اپنا) وغیرہ۔

۲- مغربی اپ بھرنش کے اسما و صفات سندھی کی طرح عام طور سے "ــُ" پر ختم ہوئے ہیں جیسے کنتُ (کانت) اینتُ (آتا) آکٹھُ (آکٹھ) گنُ (گن) کاسُ (کس) وغیرہ۔

۳- اپ بھرنش نے قدیم پراکرت 'ت' کو 'د' سے بدل لیا اردو میں 'ت' برقرار رہی۔ جیسے کیلد (سنسکرت کریڈت = کھیلتا ہے)۔

شورسینی پراکرت میں بھی قدیم پراکرت (یا سنسکرت) کی "ت" پنجابی کی طرح "د" سے بدل گئی تھی جیسے: چلت (سنسکرت)، چلَد (پراکرت)، چلدا (پنجابی) چلتا (اردو)۔

۴- اردو میں فاعلی (آلی) حالت کا اظہار (نے) سے ہوتا ہے، اپ بھرنش میں یں یا ئن سے جیسے۔ دیویں یا دیون (دیو نے) "نے" ئن سے ماخوذ نہیں ہو سکتا۔

اردو بے شبہ پراکرت سے ماخوذ ہے، لیکن یہ پراکرت وہ نہیں جس کے قواعد ہیم چندر اور برصغیر کے دوسرے قواعد نویسوں نے اپنی کتابوں میں لکھے۔ میرا خیال ہے کہ اردو نے جس پراکرت سے ارتقا پایا وہ بول چال کی زبان تھی جو شورسینی پراکرت اور مغربی اپ بھرنش سے پہلے یا ان کے پہلو بہ پہلو دوآبہ کے بالائی حصے میں بولی جاتی تھی / پالی، شورسینی، مغربی اپ بھرنش اس بول چال کی پراکرت کے نکھرے ہوئے ادبی روپ ہیں۔

یہ پراکرت بول چال تک محدود رہی اس لئے اس کے نمونے دستیاب نہیں ہوتے۔ اور آج ہمیں اس کے خط و خال الگ کرنے میں دقت پیش آتی ہے۔ میں نے موجودہ اردو اور قدیم مغربی ہندی کے سرسری تقابلی مطالعے کے بعد اس کی لسانی خصوصیات متعین کرنے کی ایک نا تمام اور تشنہ سی کوشش کی ہے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ یہ پراکرت ایسے میں

سل قرار دے رہا ہوں سنسکرت، پالی، شورسینی پراکرت، مغربی اپ بھرنش کے سلسلۃ الذہب کی ایک گم شدہ
ـ

ردو کی اصل متعین ہو جانے کے بعد اس سلسلے کا دوسرا سوال سامنے آتا ہے کہ اردو کس زمانے میں اپنی اصل سے
ب اس نے اصل زبان سے مختلف یا موجودہ روپ اختیار کیا ؟
ہاں پھر ہمارے سامنے ایک کڑی منزل آتی ہے اور وہ ہے اردو کی قدیم تحریری دستاویزوں کا فقدان ۔ ہمیں
دیم بے میل مستند تحریری نمونے نہیں ملتے ۔ پرتھی راج راسو ہرچند قدیم تحریری دستاویز ہے لیکن بے میل نہیں۔
ن کو خالص قدیم اردو (ہندی) نہیں کہا جا سکتا۔ امیر خسروؒ کی طرف جو ریختہ منسوب ہے وہ قدیم نہیں ۔ چودھویں
دی کا ہے ۔ دوسرے مستند نہیں، یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ امیر خسروؒ کا ہے اور اگر اسے امیر خسروؒ کا کلام
تو اس کا کیا ثبوت ہے کہ وہ دست برد سے محفوظ رہا ۔ یہ کلام سفینہ کی بجائے سینہ بسینہ زبانوں پر منتقل ہوتا
پہنچا ہے اس لئے اس کا امکان ہے کہ رائج زبان اور محاورے کے مطابق اس میں حسب ضرورت ردو بدل ہوتا
س لئے یہاں بھی ہمیں زیادہ تر قیاس سے یا کٹی پھٹی منتشر ادھر ادھر بکھری ہوئی شہادتوں سے کام لے کر فیصلہ کرنا
اردو کس زمانے میں اپنی اصل سے بچھڑی ۔
لماء لسانیات جنہوں نے برصغیر کی آریائی قدیم و جدید زبانوں پر تحقیقی کام کیا ہے گیارہویں صدی عیسوی کو
۔ آریائی زبانوں کے ابھار کا زمانہ بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ برصغیر پاک ہند کی زبانوں نے اپنی اپنی اپ بھرنشوں
ے کے لگ بھگ ابھر کر یا یوں کہیئے کہ بچھڑ کر موجودہ شکل اختیار کی ۔ یہی زمانہ اردو کے ابھار کا ہے ۔ اردو نے
کا نام اردو بعد میں پڑا) ۱۰۰۰ء کے بعد اپنا قدیمی چولا بدلا اور آہستہ آہستہ اس کے موجودہ خط و خال نمایاں
ی وہ پوری طرح ابھرنے بھی نہ پائی تھی اور پرزے ہی جھاڑ رہی تھی کہ مسلمان فاتحانہ شان سے دہلی میں داخل
ہوں نے اس زبان کو نکھارا ۔ ڈاکٹر بیلی ۱۱۹۳ء کو اردو کا یوم میلاد قرار دیتے ہیں ۔ میں کہتا ہوں کہ ۱۰۰۰ء
ابھار کا زمانہ ہے اور ۱۱۹۳ء نکھار کا ۔ ۱۰۰۰ء میں اردو نے آنکھ کھولی اور ۱۱۹۳ء کے بعد نشو و نما پا کر وہ
دی کہ اپنی باتوں سے لوگوں کا دل بہلائے ۔ اس پر تفصیل سے میں دوسرے باب میں بحث کروں گا ۔
ے دو شبہات کا ازالہ کرتا چلوں ۔
میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ دو یا دو سے زیادہ زبانوں کے رشتے لسانی مشابہتوں کی بنا پر طے کئے جاتے
رشتے کئی قسم کے ہیں ۔ ماں بیٹی کا رشتہ، خالہ بھانجی کا رشتہ، بہن بہن کا رشتہ ۔ اس میں شبہ نہیں کہ دو
لسانی مشابہتیں یہ بتاتی ہیں کہ یہ دو زبانیں ایک دوسرے کی عزیز ہیں ۔ ان میں ایک رشتہ ہے ۔ کیا رشتہ
میں معلوم ہوتا ۔ رشتے کی نوعیت متعین کرنے کے لئے یہ دیکھنا ہوگا کہ ان زبانوں کے ملتے جلتے سرمائے

سے جن کی بنا پر ان کے عزیز قریب ہونے کا فیصلہ کیا گیا، کس زبان کا سرمایہ قدیم ہے یا ان دو زبانوں میں سے کس زبان کا سرمایہ ایسا ہے جو دوسری زبان کے سرمائے سے ماخوذ نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی زبان کا سرمایہ دوسری زبان کے سرمائے سے زیادہ قدیم ہے یا اس کا کچھ سرمایہ ایسا ہے جو اس کی عزیز دوسری زبان کے لسانی سرمائے سے نہیں لیا جا سکتا تو یہ زبان دوسری زبان کی بیٹی نہیں بہن ہوگی۔ اور یہ کہا جائے گا کہ یہ زبانیں کسی تیسری زبان سے ترقی پا کر وجود میں آئیں۔ میں ایک دو مثالوں سے اس کی وضاحت کروں گا۔

برصغیر کی جدید بولیوں میں سے اردو برج اور پنجابی سے بہت ملتی ہے۔ ان زبانوں میں گہری لسانی مشابہتیں ہیں چنانچہ ان لسانی مشابہتوں سے فریب کھا کر ہی بعض اہل علم نے برج کو اور بعض نے پنجابی کو اردو کی اصل بتایا ہے اردو میں جمع بنانے کا قاعدہ تنہا اس امر کا ثبوت ہے کہ اردو برج سے ماخوذ نہیں۔ برج میں اسم کے آخر میں "ن" بڑھا کر جمع بنا لی جاتی ہے۔ جیسے گھوڑا سے گھوڑن، سب سے سبن، برج باسی سے برج باسین وغیرہ وغیرہ۔ اردو میں مذکر کی جمع کا قاعدہ مونث کی جمع کے قاعدے سے مختلف ہے: فاعلی حالت میں جمع اور طرح بنتی ہے اور غیر فاعلی حالت میں اور طرح۔ مذکر میں الف پر ختم ہونے والے اسما کی جمع فاعلی حرف صحیح پر ختم ہونے والے اسما سے اور مونث میں "ی" پر ختم ہونے والے الفاظ کی جمع حرف صحیح پر ختم ہونے والے الفاظ سے مختلف ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

	مذکر			مونث	
	فاعلی	غیر فاعلی		فاعلی	غیر فاعلی
۱۔ مرد	مرد	مردوں	۱۔ کرسی	کرسیاں	کرسیوں
۲۔ گھوڑا	گھوڑے	گھوڑوں	۲۔ عورت	عورتیں	عورتوں

اس پیچیدہ قاعدے کی موجودگی میں کیا کوئی شخص بقائمی ہوش و حواس برج کو اردو کی اصل قرار دے سکتا ہے۔

اسی طرح پنجابی فعل حال "کردا اے" "پڑھدا اے" سے اردو فعل حال "کرتا ہے" "پڑھتا ہے" زیادہ قدیم ہے۔ اس لئے کہ یہ صیغے قدیم پراکرت کے حالیہ تمام "کرت" "پٹھنت" سے لئے گئے ہیں جن میں "ت" ہے۔ اردو نے "ت" کو برقرار رکھا پنجابی نے "د" سے بدل لیا۔ اس کے علاوہ اردو میں قدیم پراکرت پٹھ کا ہائیہ "ڑھ" کی شکل میں موجود رہا پنجابی میں وہ "ڑ" ہو گیا۔ بیس تیس وغیرہ اعداد کا "س" پنجابی بیہ، تیہ کی "ہ" سے اور اردو "ہے" کی "ہ" پنجابی "اے" کے الف سے، اردو "اور" کا الف پنجابی "ھور" کی "ھ" سے زیادہ قدیم ہے۔ پنجابی نے قدیم پراکرت "س" کو "ہ" سے بدلا "ہ" کو "ا" سے اور "ا" کو "ہ" سے۔ یہ لسانی شہادتیں ہرگز اس قابل نہیں کہ انہیں نظر انداز کر دیا جائے۔

یہاں سے ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ اردو کی ابتدا کے کیا معنی ہیں؟ ابتدا کو استعارے کے طور پر اہل علم پیدائش

(باقی پر صفحہ)

جلیل قدوائی

انشائے ہاشمی فرید آبادی

مولوی سید ہاشمی فرید آبادی مرحوم سے میری سب سے پہلی ملاقات کراچی میں غالباً ۱۹۴۸ء میں محبّی شجاع احمد زیبا کے ذریعہ ہوئی جو ان دنوں "قومی زبان" کے مدیر اور اردو کالج میں لکچرار تھے ۔ مرحوم انجمن ترقی اردو کے شریک معتمد کے عہدے پر فائز تھے اور "تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت" لکھ رہے تھے ۔ قیام اس بڑے کمرے میں تھا جو انجمن کی عمارت میں آج کل جناب صدر کی نشست کے لئے مخصوص ہے ۔ عالم باعمل اور صاحب طرز انشا پرداز ہونے کے علاوہ موصوف کی ذات میں ایک ایسی کشش تھی اور شخصیت اتنی باغ و بہار تھی نیز مہمانوں اور دوستوں کی خاطر مدارت میں انہیں ایسا انہماک تھا کہ عمروں کی تفاوت کے باوجود جلد ہی ہم دونوں بے تکلف ہو گئے ۔ ان کے ہاں بعض دوسری بڑی لیکن آزاد اور بے باک شخصیتوں مثل عبدالرحمٰن صدیقی مرحوم سے بھی ملاقاتیں ہوئیں اور اس امر نے ہماری بے تکلفی میں اضافہ کر دیا ۔ حالت یہ تھی کہ اگرچہ بابائے اردو سے نیازمندی کہیں زیادہ پرانی تھی مگر ان کی خدمت میں توقف و تامل کے ساتھ مگر ہاشمی صاحب کے پاس تقریباً ہر ہفتہ پابندی سے حاضری ہوتی ۔ شعر و ادب ، فلسفہ و الٰہیات تاریخ و سیران صحبتوں میں موضوع گفتگو ہوتے اور لطائف و ظرائف کی بھی کمی نہ ہوتی اپنی نظمیں بالخصوص نظم "ناگن" لہک لہک کر زوردار آواز میں اور ہاتھ اٹھا اٹھا کر بہت خوب سناتے تھے ۔

میں کبھار اور میں رہتا تھا ۔ میرے گھر پر ایک تقریب تھی ، اس سلسلے میں ایک شاندار مشاعرہ منعقد کیا تھا ۔ موصوف نے صدارت فرمائی اور اس کی کارروائی "قومی زبان" میں جس کے وہ نگراں بھی تھے شائع کی ۔ پھر میں جیکب لائن چلا گیا ۔ ہاشمی صاحب وہاں بھی کئی بار تشریف لائے ۔ اس اثنا میں وہ لاہور بھی آئے گئے مگر کچھ دن بعد انجمن سے بے تعلق اختیار کی اور واقعی لاہور رہنے چلے گئے ۔

کراچی سے باہر رہے تو خط و کتابت کا سلسلہ قائم ہو گیا ۔ مگر مراسلت دیر دیر سے اور خاص خاص امور کے سلسلے ہی میں ہوئی ۔ لاہور کے دوران قیام میں کئی بار ان کے مستقر پر جا کر ان سے ملا ۔ پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے زیر ترتیب انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے ترجموں کی نظر ثانی و تحشیہ نیز دیگر متفرق کاموں میں معروف تھے ۔ پروفیسر شفیع مرحوم

کی علمیت اور اخلاق کے بے حد معترف تھے لیکن بابائے اردو کی جدائی کی کسک سینہ میں موجود تھی ۔ بات چیت کے درمیان اُن کا ذکر آجاتا تو آواز قدرے گلوگیر ہو جاتی ۔ ایک بار بولے " خیرسولوی صاحب کو اختیار ہے میرے بارے میں جو چاہیں سمجھیں اور کہیں میں تو خدا جانتا ہے ہر نماز کے بعد ہاتھ پھیلا کر ان کی صحت اور درازی عمر کے لئے دعا کرتا ہوں " ادھر بابائے اردو بھی انہیں اپنے پاس بلانے کے لئے بہانے ڈھونڈھ رہے تھے ۔ ترقی اردو بورڈ کا قیام عمل میں آیا تو انہوں نے ہاشمی صاحب کو مدیر لغات کے اسامی پر مقرر کر اکے دوبارہ کراچی بلالیا ۔

اس بار کراچی میں ہاشمی صاحب کا قیام پی ای سی ایچ سوسائٹی میں اپنے داماد کے نو تعمیر مکان میں ہوا اگرچہ علیحدہ مکان کی تلاش جاری رہی ۔ میں بھی اس زمانے میں اسی علاقے میں مقیم تھا اور قرب کے باعث ہماری آمد و رفت اور میل ملاقات مزید بڑھ گئی ۔ لغات کا دفتران دنوں انجمن کے کتب خانۂ خاص میں تھا جہاں بابائے اردو بطور مدیر اعلیٰ کام کرتے تھے ۔ ہماری ملاقاتیں وہاں بھی ہوئیں مگر گھروں پر زیادہ ہوتیں ۔ رمضان شریف آگئے تو افطار کا سلسلہ چھڑا ، کبھی ان کے ہاں کبھی میرے ہاں افطار کی دعوت ہوتی ۔ کلفٹن پر جاکر بھی کئی بار روزہ افطار کیا ۔

میرے گھر تشریف لاتے تو بچوں کے لئے کوئی نہ کوئی کھانے پینے کی چیز ضرور ساتھ ہوتی ۔ افطار سے خاصا پہلے آجاتے اور نماز مغرب کے بعد تراویح سے پہلے تک کا وقت ہمارے ساتھ گزارتے ۔ افطار کے وقت کیا کیا خوش گپیاں ہوتیں ۔ بچوں سے بہت مانوس تھے میرے سب سے چھوٹے بچے کا تاریخی نام "محمد بختیار جلیل" انہیں کا دیا ہوا ہے ۔ اس سے بڑی بچی تزئین جسے ہم لوگ پیار میں پاری کہتے ہیں اس وقت بھولی اور نا سمجھ ہی تھی ۔ ہاشمی صاحب کے نام کے ساتھ فرید آبادی کے جزو کو " فریدہ باجی " کہتی تو خوب ہنستے اور اپنے پاس بلا کر اُسے چوم لیتے ۔ میری بیوی سے بھی بہت خوش تھے اور ان کے سلیقے کی تعریفیں کرتے ۔ جب میں ناریتھ ناظم آباد میں اپنے نو تعمیر مکان میں رہنے چلا آیا اور ہاشمی صاحب تشریف لائے تو کوٹھی کی نئی آرائش سے خوش ہو کر پہلے بیوی کی طرف دیکھا پھر مجھے اور بولے " میاں ! غزل تو ان کی اور داد آپ لینی چاہتے ہیں ؟ " اس کوٹھی کا تاریخی نام موصوف نے " دمن عزف " رکھا تھا اور میری بیوی کو شوخی سے " بیگم عزف " کہتے تھے ۔

میرے ناریتھ ناظم آباد چلے آنے کے بعد ملاقاتوں کا سلسلہ کم ہو گیا مگر مراسلت بڑھ گئی ۔ کچھ دن پہلے موصوف نے بابائے اردو کی نوّد سالگی کا جشن منانے کے سلسلے میں ایک عبدالحق جوبلی کمیٹی قائم کی تھی ۔ مجھے اس کا اعزازی معتمد مقرر کیا گیا مگر بعض وجوہ سے اس پروگرام پر عمل نہ ہو سکا بلکہ افسوس وہی ہمارے درمیان اختلافات کا باعث بن گئی ۔ آخر میں نے اس سے علیحدگی اختیار کرلی پھر مجھے اپنی بیوی کی شدید علالت اور علاج کے سلسلے میں دو تین ماہ کے لئے راولپنڈی میں قیام کرنا پڑا ۔ کراچی واپس آیا تو موصوف ترقی اردو بورڈ سے مستعفی ہو کر لاہور واپس جا چکے تھے اور وہیں کچھ عرصہ بعد ان کا انتقال ہو گیا ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ افسوس کہ وفات سے پہلے مجھے ان سے ملاقات کا موقع نہ مل سکا ۔

میرے پاس ہاشمی صاحب کے بہت سے خطوط تھے ۔ ان میں سے جو جمع ہو سکے پیش کئے جاتے ہیں ۔ مندرجہ بالا بیانات کے

ہ بہت سی اور باتوں کا تذکرہ بھی ان خطوط میں ملے گا ۔ حوالہ طلب امور کی میں نے حواشی میں تشریح کر دی ہے ۔ ان کی طبیعت کی
ی اور حاضر جوابی خطوط کی ہر سطر سے نمایاں ہے ۔ ان کی سیرت کے کئی اور دلچسپ گوشے بھی ان خطوط سے بے نقاب ہوتے
۔ ان کے انداز بیان میں ایک خاص دلکشی ہے ۔ زبان کی تازگی اور برجستگی کے ساتھ ساتھ جا بجا دلی کا محاورہ اور روزمرہ مزا
، جاتا ہے ۔ بابائے اردو کے خطوط کی سادگی ، روانی اور بے تکلفی کے برخلاف ہاشمی صاحب کے ہاں ایک تکلف ، ایک اہتمام
پاتا ہے جو ان کے نثر کا عام انداز ہے مگر اس اہتمام میں آمد کی شان ہے اور بلا کا زور ہے ۔ نیاز اور آزاد کے ہاں بھی اہتمام
مگر اس میں تصنع آورد اور ایک طرح کا رکھ رکھاؤ پایا جاتا ہے جس کی وجہ سے ان کے خطوط اصلیت سے دور معلوم ہوتے ہیں
ہ وہ بے ساختگی ، وہ آمد اور وہ شیرینی نہیں جو ہاشمی صاحب کے خطوط میں ہے ۔

(۱)

لاہور

ماڈل ٹاؤن ۲۲ر مارچ ۱۹۵۲ء

مہر فرمائے مکرم ، تسلیم

آپ کا نوازش نامہ ملا ۔ مجھے انتظار تھا کہ کراچی روانگی کی تاریخ مقرر کر کے آپ کو اطلاع دوں ۔ مگر اب تک مقرر
ہ کر سکا ۔ تاہم اس سے آپ خود قیاس کر لیں کہ انشاء اللہ جلد کراچی آنا چاہتا ہوں ۔ یہاں سے آپ کے مسودے کی نشاں دہی کرنا
شکل ہے ورنہ کیا عذر ہو سکتا تھا ۔ فقط

ہاتی عند التلاقی

خاکسار

سید ہاشمی

(۲)

لاہور ۸ر اگست ۱۹۵۲ء

مہر فرمائے مکرم ، تسلیم

۴ر اگست کا نوازش نامہ کل سہ پہر کو ملا ۔ کم فرصتی کی وجہ سے مختصر جواب پر اکتفا کرتا ہوں ۔ معاف کیجئے گا ۔ یہاں

غالباً اقبال یا اصغر پر میرے مضامین میں سے کسی کی طرف اشارہ ہے ۔ یہ دونوں مضمون " اردو " سہ ماہی میں شائع ہوئے مگر اس وقت ان میں کسی
ہ کا مسودہ گم ہو گیا تھا ۔ اصل مضمون ہاشمی صاحب کو دیا گیا تھا جو انجمن سے ترک تعلق کر کے لاہور چلے گئے تھے ۔

کے دفتر میں باقاعدہ درخواست کا وقت بہت دن ہوئے گزر چکا ۔ مگر "بے قاعدہ" سفارش کی ہر وقت گنجائش نکل سکتی ہے ۔ دیکھیئے جو (بقول دلی والوں کے) کوئی داؤں لگ جائے تو ہاتھ چلائیں گے۔[1]

قاضی صاحب (ڈپٹی سکریٹری انجمن ترقی اردو) کا جو پرچہ آپ نے بھیجا تھا۔ غالباً آپ کے خط کے ساتھ معدوم ہوا[2] ۔ میرا قصد اسی مہینے یا عیدالضحیٰ کے بعد ہی کراچی آنے کا ہے ۔ انشاء اللہ ملاقات اور تفصیل سے بات وہاں ہوگی ۔ والسلام

بندۂ پناہ گزیں

سید ہاشمی

(۳)

مو ڈل ٹاؤن ۔ لاہور

بی ۱۱۸

۱۳ راگست ۱۹۶۳ء

مہر فرمائے مکرم ، تسلیم

مولوی محمد شفیع[3] صاحب سے گفتگو ہوئی ۔ مقررہ تاریخ تو نکل چکی ہے مگر مجلس تقررات کا جلسہ ابھی نہیں ہوا ۔ لہذا آپ پسند کریں تو سکریٹری دفتر انسائی کلوپیڈیا آف اسلام کے عہدے کے لئے صدر دفتر کو درخواست اپنے محکمے کے ذریعے جلد بھیج دیں ۔ ان کو دی چیرمین ، انسائی کلوپیڈیا آف اسلام ڈیپارٹمنٹ ، پنجاب یونیورسٹی کے عہدے سے آپ خطاب کر سکتے ہیں ۔

مجھے آپ نے نقول اسناد بھیجی تھیں لیکن وہ پورا لفافہ کہیں رکھ کر بھول گیا ۔ تلاش سے نہیں ملا ۔ لہذا آپ دوسری نقول درخواست کے ساتھ منسلک فرما دیں ۔ یہاں مجھے مل گئیں تو واپس آپ کو بھیج دوں گا ۔ درخواست دینی ہے تو ہفتے عشرے کے اندر رجسٹری بھیج دینی چاہیئے مجھے اطلاع دے دیجیئےگا ۔ اگر آپ چاہیں تو علیحدہ پرچے پر اُن کو میرا حوالہ لکھ دیجئے گا ۔

یہ خدمت دفتری اور کسی قدر علمی قسم کی ہے ۔ شفیع صاحب دریافت کرتے تھے کہ آپ عربی بھی جانتے ہیں ۔ تنخواہ غالباً سات سو ماہانہ ہے ۔

اور سب خیریت ہے ۔ جیسا کہ پہلے لکھ چکا ہوں خدا نے چاہا تو میں عید کے بعد کراچی کا قصد رکھتا ہوں ۔ والسلام

خاکسار سید ہاشمی

---

[1] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے اُردو ایڈیشن کے لئے پنجاب یونیورسٹی نے ایک اسامی کا اشتہار دیا تھا ۔ تجویز ہوئی کہ حکومت پاکستان سے اپنی خدمات اُدھر منتقل کرالوں ۔ مگر چونکہ یونیورسٹی نے مرکزی قاعدہ کے مطابق میری تنخواہ میں پچیس فیصد کا اضافہ نیز پنشن اور رخصت کی مدات کی رقوم کی ادائی منظور نہیں کی اس لئے حکومت نے تجویز نامنظور کر دی ۔

[2] یہ غالباً قاضی احمد میاں مرحوم کی تحریر تھی اس مضمون کی کہ دفتر انجمن میں مسودۂ مضمون متذکرہ بالا نہیں ملتا

[3] علامہ ڈاکٹر مولوی محمد شفیع مرحوم جو پنجاب یونیورسٹی میں اس وقت شعبۂ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے ناظم اعلیٰ تھے ۔

(۴)

۱۰ اگست ۵۳ء

مکرمی دام الطافہم، تسلیم

دوسرا کارڈ ملا۔ مولوی محمد شفیع صاحب نے آپ کی درخواست اور خط مجھے دکھایا تھا۔ میں نے جو کلمۂ خیر مناسب محل ہوا ان سے کہا۔ خدا کرے کوئی مفید نتیجہ برآمد ہو۔

میں انشاء اللہ ۵ ستمبر کی صبح روانہ ہو کر جمعہ ۷ ستمبر کی صبح ڈاک گاڑی سے کراچی پہنچوں گا۔ اطلاعاً گزارش ہے۔

بندۂ پناہ گزیں

سید ہاشمی

(۵)

کراچی

مورخہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۵۳ء

مہر فرمائے مکرم زاد الطافہم

آپ کا نوازش نامہ اور مرحوم لیاقت علی خاں کی تقریر کا انگریزی ترجمہ ملا[۱]۔ اس تکلیف فرمائی اور یاد آوری کا دلی شکریہ۔ ...ی کامیابی پر آپ کی تحسین بڑی ہمت افزائی کا موجب ہے۔ مجھے آپ نے ناحق شامل کیا۔ اپنے بوڑھے ہو جانے میں بھی مجھے ...ہے۔

لیاقت علی خاں صاحب کے اس جواب سے مولوی صاحب کو بہت آزردگی ہوئی تھی۔ چارہ سازی کی توقع پر بلایا تھا۔ انہوں ...ہ فرمایا ہمدردی، انصاف، حقیقت تینوں سے خالی نظر آیا۔ رہی انشاء اللہ خان والی بات کہ ع

جو انُ نے دی مجھے گالی سلام میں نے کیا!

...ن کی جوبلی کے موقع پر شہید ملت نے جو تقریر اردو میں ارشاد فرمائی تھی غالباً انجمن کی پنجاہ سالہ رپورٹ کے لئے ہاشمی صاحب نے مجھ سے ...رمائی تھی اس لئے کہ مرکزی محکمۂ اطلاعات کے زبانوں کے شعبہ کا نگراں تھا۔ اس وقت اصلی تقریر تو نہ مل سکی اس کا انگریزی ترجمہ میں نے کیا ...ہی بھیج دیا تھا۔

...راہ انکساری میرے اس قول سے انکار ہے کہ جوبلی کی کامیابی میں جن بزرگوں کا ہاتھ تھا ان میں موصوف بھی شامل تھے۔

یہ شاعری یا عاشقی میں ممکن ہے۔ لیاقت علی خاں کے لئے مولوی صاحب سے ایسے ردعمل کی امید نہیں ہو سکتی تھی۔

بندۂ پناہ گزیں

سید ہاشمی

(۶)

لاہور

۲۸ / نومبر ۵۸ء

مہرفرمائے مکرم - دام الطافہم

آپ کے ۱۴ / اور ۱۵ / نومبر کے کارڈ دونوں کل دوپہر ایک ہی ڈاک سے صادر ہوئے۔ خوشی ہوئی اور وہ دیہاتی مثل یاد آئی کہ چپڑی اور دو دو ......

کراچی اگست میں میرا آنا ہوا تو خیال یہ تھا کہ آپ جولائی میں لاہور جانے والے تھے، چلے گئے ہوں گے۔ کچھ دن بعد یہ غلط فہمی دور ہوئی تو کوئی اچھا رستا نہ ملا۔ آپ کے دفتری اوقات بھی مکان کا دروازہ کھٹکھٹانے میں مانع ہوگئے۔ خیر، بار زندہ صحبت باقی، آئندہ سہی۔ والسلام والاکرام

خاکسار

سید ہاشمی

(۷)

لاہور　　　　۲۶ / دسمبر ۵۸ء

بی ۸ - ۱۱ ماڈل ٹاؤن

مہرفرمائے مکرم، دام الطافہم

عنایت نامہ ملا۔ ... ڈاکٹر مولوی محمد شفیع صاحب کو بھی آپ وہی مضمون جو مجھے لکھا ہے تحریر کیجئے۔ میرا حوالہ (اپنے تعارف کے لئے) دیدیجئے۔ امید ہے وہ مجھ سے مشورہ فرمائیں گے ورنہ میں گفتگو چھیڑ دوں گا، انشاءاللہ۔ اگرچہ یہ ترجمہ اور نظرثانی کا کام بھی یہاں قریب الاختتام ہے[1]۔ رخصت میں آپ کیا کر رہے ہیں؟ کوئی نہ کوئی ادبی، علمی مشغلہ ضرور جاری رکھیں۔

آپ کو ایک زحمت دینے کا مجھے بھی خیال آگیا وہ یہ کہ آپ کے محکمے سے "پاکستان" نام کے سالنامے انگریزی اور اردو میں چھپا کرتے تھے۔ بعض ابتدائی سنین میں چند مضمون پاکستانی صنعت و حرفت اور مختلف صوبوں کے اضلاع لباس پر بھی چھپے

---

[1] سرکاری ملازمت سے پنشن لینے کے بعد انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے ترجموں پر نظرثانی کا کام لینا چاہتا تھا۔

تھے۔ میرے پاس وہ رسالے نہیں رہے نہ اب سال یاد آتا ہے۔ اگر آپ براہ کرم ان مضامین کا سراغ لگا کر نشان دہی کر سکیں اور یہ بھی مطلع فرمائیں کہ وہ قیمتاً یا مستعار کہاں سے مل سکیں گے تو نہایت ممنونیت کا باعث ہوگا۔

اور سب بحمد اللہ خیریت ہے۔ سردی چمک رہی ہے۔ یہاں کی جاڑوں میں آپ کے ہاں کی برسات کی جھلک پائی جاتی ہے۔ سردی سے زائد سمجھ لیجئے۔ بیگم صاحبہ کو بہت بہت سلام کہہ دیجئے گا اور یہ کہ آپ کے لاہور آنے کے ارادہ کا کیا ہوا۔ فقط

خاکسار

سید ہاشمی

(۸)

لاہور

۸ر جنوری ۵۹ء

مہر فرمائے مکرم دام الطافہم۔ تسلیم۔ آپ کا لطف نامہ بھی نوروز کو جلوہ افروز ہوا۔ بہت خوشی ہوئی۔ شہر جانے اور مولوی محمد شفیع صاحب سے ملاقات کرنے کا خیال تھا اس لئے جواب لکھنے میں اہمال کیا۔ ابر و باراں نے چند روز نکلنے نہ دیا۔ کل جانا ہوا تو سنا کہ مولوی صاحب موصوف دفتر کے سالانہ حسابات کی ترتیب دینے میں معروف بلکہ مستغرق ہیں۔ اپنے دماغ اور اہل دفتر کو پریشان کر دیا ہے۔ میں بے ملے واپس چلا آیا۔ چار پانچ دن بعد انشاء اللہ پھر جاؤں گا تو بات کروں گا۔

انجمن کے حالات آپ نے کچھ نہیں لکھے۔ مولوی صاحب کی طبیعت اور دماغ پر ان کا اثر مسلط رہتا ہے اور رہنا بھی چاہیئے۔ ڈاکٹر محمود حسین خاں صاحب کی بجائے ڈاکٹر رضی الدین صدیقی سکریٹری منتخب ہوئے ہیں۔ معلوم نہیں ...... رہے یا نہیں؟ ان سے جناب مولوی صاحب بہت بیزار ہو گئے تھے اور انہی نے مولوی صاحب کے کتب خانۂ خاص کو مقفل کرا دیا تھا۔ مولوی صاحب کو آزار دینے کے علاوہ یہ ان بیش قیمت کتابوں کے حق میں بڑا ظلم تھا اور خدا جانے اتنے دن بند پڑے رہنے میں ان پر کیا گزری ہوگی؟ .... صاحب مولوی صاحب کے جدید مگر نہایت عزیز دوست ...... صاحب سے فوجداری مقدمہ بھی لڑا رہے تھے۔ جنگی قانون کے دور میں خیال تھا کہ اس کا جلد فیصلہ ہو جائے گا۔ مگر کچھ سننے میں نہ آیا کہ کیا ہوا۔ زیبا صاحب[۱] پہلے کبھی کبھی مہربانی سے خط لکھتے رہتے تھے۔ اب کے ایسے انجان ہوئے ہیں گویا کبھی کی ملاقات ہی نہ تھی۔

---

[۱] شجاع احمد زیبا خاں پرنسپل اسلامیہ کالج کراچی۔

"العلم" دیر میں آتا ہے۔ فراق صاحب گھورکھپوری سے مجھے زیادہ دلچسپی نہیں۔ البتہ نعتیہ کلام پر آپ کا خطبۂ صدارت[1] کہیں مل جائے تو عقیدت و شوق سے مطالعہ کروں گا۔ بے نظیر شاہ مرحوم سے حیدرآباد میں کلام سننے کا اتفاق ہوا تھا۔ بڑی آغا روانی تھی اور گلے کے بلکہ لہرا لہرا کے سنایا کرتے تھے[2]۔ آپ ضرور قدیم اور جدید شعراء پر اپنا مطالعہ جاری رکھیں۔ مجھے واقعی بہت خوشی ہوئی کہ آپ کے ادبی مشاغل بحال ہیں۔

اپنی بیگم صاحبہ کو بہت بہت سلام دعا کہہ دیجئے گا۔ انہوں نے تو لاہور آنے کی (عرصہ ہوا) خوشخبری سنائی تھی۔ مگر "کراچی" اب واقعی لکھنؤ، حیدرآباد، پٹنہ، الہ آباد، بریلی، مرادآباد ــ سبھی شہروں کا بقیہ نقیہ رہ گیا ہے۔ اسے آپ کہاں چھوڑتے ہیں؟ والسلام والکرام۔ بحمداللہ میں اچھا ہوں۔ آپ کے مشورہ "احتیاط" کا شکریہ۔ مگر بے احتیاطی کا اب زمانہ ہی کہہ رہاں۔ مجبوراً احتیاط ہی کرنی ہوگی۔ بقول حسن ؎

اے حسن توبہ آں زماں کردی کہ ترا طاقت گناہ نہ ماند!

سالنامۂ "پاکستان" کا آپ کے خط نے مجھے منتظر بنا دیا ہے۔ وہی جو سال بہ سال چھپتا تھا، مطلوب ہے۔

خاکسار

سید ہاشمی

(۹)

لاہور

۱۰ر جنوری ۵۹ء

محب مکرم دام افضالہم۔ پرسوں نوازش نامہ ملا۔ ساتھ ساتھ کڑک، چمک، بارش، اولے...... سردی سے انگلیاں اینٹھی جاتی تھیں۔ آج ذرا دھوپ نکلی یا کہیے کہ جھانکنے لگی تو یہ چند سطریں لکھ رہا ہوں۔ آپ کے خطوط کے طول یا بدخطی سے مجھے کوئی "بدخطی" نہیں ہوتی۔ ایسے ایسے مخطوطات بے نقط اور شکستہ و ژولیدہ پڑھنے پڑتے ہیں کہ ان کے مقابلے میں آپ کی تحریر استاد شیریں رقم کی کتابت کا درجہ رکھتی ہے۔

رسالہ "پاکستان" والوں ہی نے مجھ سے ایک مضمون لکھنے کی فرمائش کی تھی اس لئے اس کے پچھلے شمارے دیکھنے کا خیال تھا۔ مضمون کسی نہ کسی طرح (یعنی کتابوں کی کم میسری کے باوجود) لکھا گیا ہے۔ اب آپ تلاش و تردد میں نہ پڑیں۔ ہندوستان کا

(باقی صفحہ ۷۲ پر)

---

[1] منظر صدیقی صاحب نے بزم سیماب کی طرف سے ایک نعتیہ مشاعرہ کراچی میں منعقد کیا تھا جس کی صدارت کے لئے انہیں میرے سوا کوئی نہ ملا۔

[2] مرحوم کا مجموعۂ کلام تازہ تازہ شائع ہوا تھا جس سے متاثر ہو کر حلقۂ ارباب ذوق کے ایک جلسہ منعقدہ علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کراچی میں آلو کی شاعری پر ایک مقالہ پڑھا تھا جو بعد میں "العلم" کراچی میں شائع ہوا تھا۔

شمیم احمد

رئیس امروہوی

"شخصیت" ایک لفظ ہے اور مجھے بڑی ہی حیرت ہوتی ہے۔ جب میں اس لفظ کو ایسے افراد کے ساتھ منسوب ہوتے دیکھتا ہوں جن کے بارے میں یہ طے کرنا بھی مشکل ہے کہ وہ قدِ آدم بھی رکھتے ہیں یا نہیں۔ لفظوں کی ایک اپنی تاریخ ہوتی ہے میں نے بڑے بڑے لفظوں کو بے عزت، حقیر اور بے وقعت ہوتے دیکھا ہے۔ مگر لفظ "شخصیت" نے اپنی عزت نہیں کھوئی ہے بلکہ اپنا اعتبار کھویا ہے۔ جس میں زبان یا زمانے کا کوئی قصور نہیں ہے قصہ یہ ہے کہ اب "شخصیت" پیدا ہونے کا امکان ہی ختم ہو چکا ہے۔ لہٰذا سب آدم زاد "شخصیات" میں ڈھل گئے ہیں۔ نتھو حلوائی بھی اور فتّو لوہار بھی۔ ہم کیا کریں تم کیا کرو۔

میں دراصل شخصیت سے مایوس ہو چکا ہوں۔ کیونکہ یہ لفظ جب کوئی معنیٰ رکھتا تھا۔ تو اس وقت وہ ایک سمندر کے مماثل تھا۔ جس میں مختلف علوم کے دریا مل کر اسے سمندر بناتے تھے۔ مختلف عقائد مختلف اصول مختلف رنگ و نسل کے عجیب عجیب رنگ اس سمندر کو زندگی کی طرح گہرا اور پُر اسرار بنا دیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ یہ شخصیتیں ہزار پہلو رکھتی تھیں۔ ہر انداز میں نمو کرتی تھیں اور ہر انداز ایک اعتبار اور اضافے کی حیثیت سے نمودار ہوتا تھا۔ مگر اب ایک رخی ایک انداز کی شخصیتوں کا بھی کال پڑ گیا ہے۔ جس کی وجہ سے میں ہمیشہ ایسے افراد سے مشکوک رہتا ہوں جو کسی انداز میں شہرت تو رکھتے ہیں مگر کسی ایک انداز میں بھی سامنے نہیں آتے۔ اتفاق سے رئیس امروہوی صاحب بھی میرے لئے ایک شک کا سبب رہے ہیں۔ کیونکہ وہ شاعر بھی ہیں اور صحافی بھی۔ نثر نگار بھی ہیں اور ماہر نفسیات بھی تھیوسوفسٹ بھی ہیں اور آزاد خیال بھی۔ ان کی یہ "شہرتیں" میرے لئے امتحان بن گئی تھیں۔ لہٰذا جب میں نے ان کا یہ شعر سنا ؎

خاموش زندگی جو بسر کر رہے ہیں ہم
گہرے سمندروں میں سفر کر رہے ہیں ہم

تو اور بھی بے اعتبار ہو گیا۔ اور بہت دنوں اس انتظار میں رہا کہ یہ تردید کہیں سے ہو جائے کہ یہ شعر ان کا نہیں ہے۔ مگر اب تو ان کا دیوان بھی چھپ گیا ہے۔ لہٰذا مجبور ہو گیا ہوں۔

اُن کی یہی گوناگوں شہرتیں تھیں کہ جب میں اُن سے قومی زبان کے لئے انٹرویو لینے پہنچا تو اندر سے خوش نہیں تھا۔ لیکن اب اس بات پر بے حد پریشان ہوں کہ تحریر کو پیشہ بنانے والے افراد خود کو کیا کیا بنا کر پیش کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہ المیہ اتفاق سے اسی زبان کا ہے جسے اردو کہتے ہیں۔ کیونکہ یہاں پیشہ ور ادیب کو پیشہ ور رنٹ بننا پڑتا ہے۔ ورنہ رئیس صاحب اپنی ان شہرتوں میں سے صرف ایک صفت کے اہل ہیں۔ اور وہ شاعر کی صفت ہے جس کو بدنصیبی ہے انھوں نے روزی کا ذریعہ بنا لیا ہے کاش اُن کے لئے زمانہ نہ بدلا ہوتا۔ اگر وہ امروہے میں کسی مسند سے وابستہ رہنے پر قادر ہوتے تو وہ آج اپنے ذی علم خاندان کے روشن چراغ ہوتے۔

رئیس امروہوی صاحب ۱۲ر ستمبر سنہ ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوئے سنہ ۱۹۱۴ء تاریخ کا ایک اہم سال ہے جس نے زندگی کے دھارے کو تیز تر کر دیا۔ اور اس کا رُخ بدل کر تاریخ کو قوموں کی تہذیبی تاریخ سے ہٹا کر وحشت اور ہولناکی کی تاریخ میں بدل دیا۔ اسی سال مولانا حالی کا انتقال ہوا تھا۔

رئیس صاحب ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جو اپنی ایک روایت رکھتا تھا۔ وہی روایت جس سے مولانا حالی نے جنم لیا تھا۔ مذاہب اور شعر و ادب کی روایات۔ مگر جب مولانا حالی کا انتقال ہوا اور رئیس امروہوی پیدا ہوئے تو تاریخ ایک نئے راستے پر چل رہی تھی چنانچہ مذہب سے اثر قبول کرنے کے بجائے اس سے ردِ عمل پیدا ہوا اور وہ الحاد کی طرف مائل ہو گئے۔ کم و بیش رئیس امروہوی صاحب کے با شعور ہونے تک ہندوستان کیمونزم کی طرف مائل ہو چکا تھا۔ لہٰذا صرف رئیس صاحب ہی نہیں بلکہ اُن کے دو اور بھائی بھی زمانے کے اسی جبر سے ہو کر گزرے۔ سید محمد تقی اور کمال امروہوی۔

البتہ شعر و ادب کا ورثہ اتنا بے وقعت نہیں ہو پایا تھا جتنا مذہب۔ کیونکہ شعر و ادب کی ضرورت کیمونزم کو بھی تھی۔ چنانچہ ان تینوں بھائیوں نے اس کو پیشہ بنانے میں مسرت محسوس کی۔ لیکن شعر و ادب اس وقت بھی شاعر اور ادیب کو دو راہوں کے علاوہ کچھ اور نہیں دے سکتا تھا۔ چنانچہ کمال امروہوی صاحب فلم میں جا کر چھپے۔ اور سید محمد تقی اور رئیس امروہوی نے صحافت کو انتخاب کیا۔ یہ نا ممکن تھا کہ یہ تینوں بھائی اپنی ذہانت اور ادبی پس منظر کی وجہ سے وہ شہرت حاصل نہ کر سکتے جو انھوں نے بالآخر حاصل کی۔

رئیس صاحب نے صحافت کا آغاز امروہے کے ایک پرچے کی ادارت سے کیا۔ "حیات" نے انھیں اس وقت کی سیاست سے بہت جلد وابستہ کر دیا۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں انھوں نے صحافت کو باقاعدہ پیشہ بنانے کے لئے امروہہ چھوڑ دیا اور روزنامہ جدت مرادآباد کے ایڈیٹر ہو گئے۔ سنہ ۱۹۳۵ء میں روزنامہ استقلال دہلی سے منسلک ہوئے۔ سنہ ۱۹۴۷ء میں ترک وطن کے ساتھ روزنامہ جنگ (کراچی) سے وابستہ ہونے کے بعد آج تک اُن کی ساری صلاحیتیں صحافت میں اسی اخبار کے ذریعے بروئے کار آئی ہیں۔ ادبی ذوق کی تسکین جو بہرصورت

آخر تک پہلی اور آخری مجبوری ہے جو غالب "شیراز" اور انتشار جیسے جرائد سے پوری ہوتی رہی۔

رئیس امروہوی کا شعور اُن ساری راہوں سے گزر کر پختہ ہوا ہے جس کو بیسویں صدی کا طربیہ بھی کہا جا سکتا ہے اور المیہ بھی۔ اقبال نے اسے اپنے انداز میں یوں کہا ہے۔

طلب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری

جس وقت انھوں نے آنکھیں کھول کر دنیا کو دیکھا اس وقت ہندوستان عالمی اور ملکی تحریکوں کا محور بنا ہوا تھا انھوں نے کمیونزم کا اثر بہت قریب سے قبول کیا اور اپنے عہد کی سیاسی تحریکوں کو اُن دیوزاد شخصیتوں میں چلتے پھرتے دیکھا جنھوں نے ہندوستان کو ایک نیا جنم بخشا۔ گاندھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت نہرو، مولانا محمد علی جوہر مولانا شوکت علی۔ مولانا حسرت موہانی۔ قائداعظم اور ڈاکٹر اشرف۔ رئیس صاحب پر جن شخصیتوں کا سب سے گہرا اور ذاتی اثر رہا ہے۔ وہ پنڈت نہرو۔ مولانا شوکت علی۔ مولانا حسرت موہانی اور ڈاکٹر اشرف ہیں بیسویں صدی کی اعلےٰ ترین حقیقت پسندی اور مادی شعور کی حامل تحریکوں نے انھیں آزاد خیال بنا دیا۔ مگر اس کا کیا علاج کہ یہ مادی تربیت بھی اس پس منظر کو نہ دھندلا سکی۔ جس سے اُن کا وجود بعد کی نسلوں کے مقابلے میں زیادہ قربت رکھتا تھا۔ وہ ذہنی طور پر جتنے عملی اور سیاسی ہوتے چلے گئے داخلی طور پر ان کا خاندان فقر اور تصوف کا روپ دھار کے انھیں غیر سیاسی بناتا گیا۔ یہی وجہ ہے ان کی ذات دنیاؤں میں بٹ گئی۔ جو اُن کے روحانی کرب کا واحد نہیں تو بہت بڑا سبب کہا جا سکتا ہے۔ اُن کا ادبی شعور طلسم ہوش ربا کی پرچھائیوں میں انقلاب روس تلاش کرتا ہوا۔ انکار مذہب تک پہنچا اور پھر بھی اس سے آزاد نہ ہو سکا۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ تضاد کتنی بڑی شاعری کا سبب ہو سکتا تھا۔ مگر رئیس صاحب نے اس سے بڑا کام لینے کی کوشش بھی نہیں کی۔ اور نہ روزی رسانی کے بھنور سے وہ اس طرح نکل سکے کہ اسے اپنی ذات کا مسئلہ بنا سکتے۔

رئیس امروہوی نے اردو کو خواہ کچھ دیا ہو یا نہ دیا ہو۔ مگر انھوں نے ۲۵ سال صرف اردو لکھی ہے وہ مولوی عبدالحق سے متاثر تو بہت رہے مگر اس پہاڑ کی طرح جو دور سے ہی اپنی عظمت ثابت کر دیتا ہے۔ ان کے تعلقات مولوی صاحب سے نہ ہونے کے برابر رہے ہیں۔ مولوی صاحب سے ان کی پہلی ملاقات ۱۹۳۶ء میں عربک کالج دہلی کے جلسہ میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد ۱۹۴۸ء میں اس وقت دو ملاقاتیں ہوئیں۔ جب پنڈت دتاتریہ کیفی پاکستان آئے تھے پھر یوم اقبال کے مشاعرے میں اس وقت اُن سے کچھ باتیں ہوئی تھیں جب کسی نے کہہ دیا تھا کہ اسلامی قومیت کا تصور سب سے پہلے اقبال نے پیش کیا تھا۔ مولوی صاحب نے اسی وقت اس کی تردید کی اور کہا کہ یہ اولیت سر سید احمد خاں کو حاصل ہے۔ ان ملاقاتوں کو رئیس صاحب کسی طرح بھی ذاتی تعلقات قرار دینے کے حق میں نہیں ہیں۔ البتہ ۱۹۵۵ء تک بڑی حد تک شناسائی ہو چکی تھی۔ اور وہ مولوی صاحب کی قیامت ہیں اس جلوس میں بھی شریک

تھے جو اردو کے لیے اسمبلی تک گیا تھا۔ مولوی صاحب نے رئیس صاحب سے ہمیشہ ایک خواہش کا اظہار کیا اور وہ یہ تھی کہ وہ چاہتے تھے کہ رئیس صاحب ایلیٹ کا منظوم ترجمہ کر دیں۔ جس کے لیے رئیس صاحب تیار رہتے۔ مگر انھیں شبہ ہے کہ مولوی صاحب کے جانشین مولوی صاحب کی اس خواہش سے اتفاق کریں گے۔

رئیس امروہوی صاحب کو یقین ہے کہ مولوی صاحب کی یہ خواہش ایک روز پوری ہو کر رہے گی پورے پاکستان کی مشترک زبان صرف اردو ہی ہو گی۔ اور اردو ہی ہو سکتی ہے۔

چھ ستمبر کو جب بھارت نے پاکستان پر جارحانہ حملہ کیا تو رئیس امروہوی ایک نئے انداز سے سامنے آئے، وہ پوری قوم کی آواز بن گئے اور انھوں نے اپنے فن سے وطن کی محبت کے جذبے کو بیدار کرنے میں بڑا حصہ لیا۔ ان کے بعض نغمے وقت کی آواز بن کر نمایاں ہوئے۔

خطۂ لاہور تیرے جاں نثاروں کو سلام
سیالکوٹ کے میدانِ کارزار کو دیکھ
اپنے فضائیہ کے یہ انداز دیکھئے
اللہ کے وعدے پہ مجاہد کو یقین ہے

اور ان نغموں کی وجہ سے آج رئیس کو ایک قومی شاعر کا درجہ حاصل ہو چکا ہے۔

رئیس نے قطعہ نگاری کو بھی ایک باقاعدہ فن بنا دیا ہے، وہ گزشتہ سترہ اٹھارہ سال سے مختلف سیاسی و سماجی موضوعات پر ہر روز ایک قطعہ لکھتے ہیں جس سے ان کی زود گوئی کے ساتھ ساتھ اُن کی سیاسی و سماجی بصیرت کا بھی اظہار ہوتا ہے ان کے قطعات کا ایک انتخاب "قطعات" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ان کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ "الف" کے نام سے دو سال پہلے منظرِ عام پر آیا تھا۔ جسے اردو کے بہترین شعری مجموعوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

جب میں رئیس صاحب سے رخصت ہوا تو مجھے یہ احساس برابر ستاتا رہا کہ وہ ایسے افراد میں قابلِ ذکر ہیں جن میں "شخصیت" بننے کے پورے امکانات موجود تھے مگر جن کو بیسویں صدی کی "مغربی طب" نے بیمار کر دیا۔ اور یہ بیماری صحافت کے نام سے موسوم ہے۔ جس کی قربان گاہ پر دنیا کے تمام علوم و فنون بالآخر قربان ہو کر رہیں گے۔

منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی

گرد و پیش

تصویر کا ایک رُخ

رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اُڑتا جائے ہے

مغربی پاکستان اسمبلی میں وقفۂ سوالات کے دوران پارلیمانی سکریٹری نے اس بات کو دہرایا ہے کہ صدر مملکت ۱۹۷۲ء میں ایک کمیشن قائم کریں گے جو انگریزی زبان کو سرکاری طور پر ختم کرنے کے بارے میں اپنی رپورٹ پیش کرے گا - وزیر قانون جناب غلام نبی میمن نے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ مجھے اس سوال کا جواب دینے کے لئے علیحدہ نوٹس کی ضرورت ہے کہ اب تک کسی سرکاری دفتر میں اردو کو سرکاری زبان قرار دیا گیا ہے یا نہیں -

ایک طرف حکام بالا دست اور عمال حکومت اردو اختیار کرنے کے سلسلے میں بڑھ چڑھ کے بیان دیتے ہیں اور دوسری طرف ان کی مساعی کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے پرانے موقف سے ایک انچ پیچھے نہیں ہٹے ہیں - یہ ذہنیت سربراہ مملکت کی حالیہ اردو نوازی کی روشنی میں اور بھی محلِّ نظر ہے - صوبائی اسمبلی میں اردو کے سلسلے میں مسودہ قانون پر جو لیت و لعل سرکاری بنچوں کی طرف سے اختیار کیا جاتا ہے وہ بھی بہت افسوسناک ہے -

پچھلے دنوں لاہور میں مختلف انجمنوں اور علمی و ادبی حلقوں کی جانب سے صوبائی اسمبلی کے ارکان سے اپیل کی گئی ہے کہ قومی زبان اردو سے متعلق اسمبلی کی مجلس قائمہ کی رپورٹ منظور کر لی جائے تاکہ ملک میں قومی زبان کو پروان چڑھنے کا موقع مل سکے - ادارہ ملت اسلامیہ پاکستان کی مجلس عاملہ کی ایک قرارداد میں ارکان اسمبلی پر زور دیا گیا ہے کہ اردو سے متعلق مجلس قائمہ کی رپورٹ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے منظور کی جائے - تاکہ اردو کو اس کا اصل مقام مل سکے - اسی قسم کی دوسری قرارداد انجمن ترقی اردو لاہور کی مجلس عاملہ نے منظور کی ہے جس کی حمایت ملت پارٹی نے بھی کی ہے -

تصویر کا دوسرا رخ

۷۵ سال کے بعد

۱۳ دسمبر ۱۹۶۶ء کو لاہور میں مغربی پاکستان کے وزیر تعلیمات جناب ملک خدا بخش بُچا نے پنجاب یونیورسٹی کی ۷۵ سالہ روایت کا خاتمہ کر کے قوم اور ملک کی خواہشات کو عملی جامہ پہنا دیا۔ ملک صاحب نے یونیورسٹی کے تقسیم اسناد کے جلسے میں اپنا خطبہ اردو میں پڑھا۔ اس غلامانہ روایت کے خاتمے کے ساتھ ہی تقسیم اسناد کی تقریب نے ایک نیا اور مقدس رنگ اختیار کر لیا۔ جلسے کی پوری کارروائی اردو میں کی گئی اور کامیاب طلبہ کو اسناد بھی دونوں زبانوں میں پیش کی گئیں یعنی ایک طرف اردو میں اور دوسری طرف انگریزی میں کوائف درج تھے۔ وزیر تعلیمات نے اپنے اس تاریخی خطبے میں ارشاد کیا کہ رزق حلال کے لئے جدوجہد عبادت کا درجہ رکھتی ہے۔ ہمیں اپنے نظام تعلیم کو میکالے کے نظریے سے جلد از جلد نجات دلا دینی چاہیے۔ پنجاب یونیورسٹی پاکستان میں سب سے قدیم درسگاہ ہے۔ اور ہمیں امید ہے کہ اس کی تقلید ملک کی دیگر یونیورسٹیاں بھی کریں گی اور خود کو ایک آزاد ملک و قوم کی قومی درسگاہ ہونے کی اہل ثابت کریں گی۔

قومی زبان کا مسودۂ قانون

پارلیمانی امور کی اسٹینڈنگ کمیٹی کے چیرمین جناب خواجہ محمد صفدر نے ۱۳ دسمبر کو قومی زبان کے بارے میں مسودۂ قانون سے متعلق رپورٹ مغربی پاکستان اسمبلی کے ایوان میں پیش کر دی جس میں سفارش کی گئی ہے کہ تمام سرکاری دفاتر میں دفتری زبان کے طور پر انگریزی کی بجائے اردو کو رائج کیا جائے۔ اس کے علاوہ تمام تعلیمی اور دوسرے اداروں میں ذریعۂ اظہار اردو کو قرار دیا جائے۔ یہ سفارشات اس مجلس قائمہ کے فیصلوں کے مطابق ہیں جس میں خواجہ محمد منصور وزیر قانون غلام نبی میمن، منظور حسین گھلو، محمد یوسف خاں، ملک معراج خالد، چودھری منظور حسین، ملک اورنگ زیب خاں اعوان، چودھری انور عزیز اور سید ناصر ارکانِ اسمبلی شامل تھے۔ اس بل کا نام "قانون قومی زبان مغربی پاکستان مجریہ ۱۹۶۵ء" ہوگا اور یکم جولائی ۱۹۶۸ء تک نافذ ہوگا۔

ساتویں سائنس کانفرنس

ساتویں سالانہ سائنس کانفرنس نے اپنے اختتامیہ اجلاس میں ایک قرارداد کے ذریعے مطالبہ کیا ہے کہ ملک میں اردو کو ہر درجے میں ذریعۂ تعلیم قرار دیا جائے اور حکومت سے اپیل کی ہے کہ انگریزی کے ساتھ اردو کو بھی تمام محکموں اور مقابلے کے امتحانوں میں متبادل زبان کے طور پر رائج کیا جائے۔ کانفرنس نے ثانوی درجے تک تعلیم کو اور زیادہ بہتر بنانے پر زور دیا ہے۔ سائنس کانفرنس نے پنجاب یونیورسٹی کے منتظمین کو مبارکباد دی ہے کہ انہوں نے سائنس کے تمام شعبوں میں اردو ذریعۂ تعلیم رائج کر دیا ہے اور امید ظاہر کی ہے کہ ملک کی دوسری دانش گاہوں میں بھی قومی زبان کو رائج کر دیا جائے گا۔ سائنس کانفرنس نے صدر ایوب کو ان کی ماہانہ نشری تقریریں اردو میں کرنے پر اور ریڈیو پاکستان کو اردو خبروں کا وقت زیادہ بڑھا دینے پر مبارکباد دی ہے۔ اس کانفرنس میں ملک کے تمام ممتاز سائنسدانوں نے شرکت کی تھی۔

تہذیبی - ادبی - علمی اور تعلیمی خبریں

قلم اور قومی کردار صوبائی وزیر سماجی بہبود میاں محمد حسین وٹو نے ۱۲ دسمبر کو لاہور میں کہا ہے کہ ادیبوں اور شاعروں کو اپنے قلم کی تمام توانائیاں قومی کردار کے لئے وقف کر دینی چاہئیں ۔ جناب وٹو ادارۂ مصنفین پاکستان مغربی شاخ کے زیر اہتمام ایک جلسے میں تقریر کر رہے تھے ۔ انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں ادبا اور شعرا کی خدمات کو زبردست خراج تحسین پیش کیا ۔ جلسے میں لاہور کے تقریباً تمام ادبا اور شعرا موجود تھے ۔ بعض شعرا نے اپنا کلام بھی سنایا ۔

جاگ اٹھا ہے وطن صوبائی وزیر تعلیم ملک خدا بخش نے تمام ڈرامانگاروں ، شاعروں ، ادیبوں ، صحافیوں اور ریڈیو کے عملے سے اپیل کی ہے کہ وہ عوام میں جہاد ، حب الوطنی ، اسلام دوستی اور ایثار کے جذبات برقرار رکھنے کے سلسلے میں اپنے فرائض کما حقہ انجام دیتے رہیں ۔ جناب ملک خدا بخش لاہور میں ایک ڈرامے " جاگ اٹھا ہے وطن " کا افتتاح کر رہے تھے ۔ انہوں نے ڈرامے کے فنکاروں کی بہترین کارکردگی پر انعام بھی دیا ۔ اس ڈرامے کا اہتمام بچوں کے ادارے نے کیا تھا جس کے مصنف و پیش کار عزیز اثری ہیں ۔

ثقافت اور اسلامی اقدار لاہور کے ایک مذاکرے میں تقریر کرتے ہوئے سپریم کورٹ کے جج جناب ایس ۔ اے رحمان نے کہا ہے کہ سترہ روز جنگ سے ہماری قوم کو سب سے بڑا مثبت فائدہ یہ ہوا کہ ہم نے اسلامی اقدار کو دوبارہ اپنی ثقافت کے سرچشمے کی حیثیت سے پہچان لیا ہے ۔ ہمارے فن کاروں اور ادیبوں کو اس نعمت کی قدر کرنی چاہیے اور فکر و نظر کی ان گمراہیوں کی طرف رجوع نہیں کرنا چاہیے جو ہمیں انتشار کی طرف لے جا رہی تھیں اور قومی سالمیت کو مجروح کر رہی تھیں جسٹس رحمان پاکستان آرٹس کونسل کے زیر اہتمام دو روزہ مذاکرے کی پہلی نشست میں تقریر کر رہے تھے ۔ مذاکرے کا موضوع تھا " فن کار اور دفاع وطن " ۔ مذاکرے میں حصہ لیتے ہوئے انتظار حسین نے اپنے مقالے میں کہا کہ حالیہ جنگ نے پوری قوم میں (جس میں ادیب اور فن کار بھی شامل ہیں) اس طرز احساس کو پھر اجاگر کر دیا جو مغربی تصورات کے باعث ہمارے ذہنوں سے اتر چکا تھا ۔ اشفاق احمد نے کہا کہ معیاری اور اعلیٰ ادب اسی صورت میں پیدا ہو سکتا ہے جب ہم ابھی سے اچھا ادب پیدا کرنے کی کوشش کریں گے ۔

نوجوان فنکاروں کی مساعی سپریم کورٹ کے چیف جسٹس جناب اے آر کارنیلیس نے ۱۴ دسمبر کو لاہور میں نوجوان پاکستانی مصور جمیل اکبر جاوید کی تصاویر کی نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا کہ پاکستان میں فنون لطیفہ کی نشوونما کا انحصار نوجوان فنکاروں کی مساعی اور محنتوں پر ہے ۔ نمائش کا اہتمام پاکستان کی قومی سالمیت کے ادارے نے کیا تھا ۔

بہترین نظموں پر انعام کراچی میونسپل کارپوریشن کے وائس چیرمین خان بہادر حافظ حبیب اللہ نے ۸ دسمبر کو یہ اعلان کیا ہے کہ جن شاعروں

نے مقبول قومی نغمے لکھے ہیں انہیں سونے کے تمغے اور نقد روپے انعام میں دیے جائیں گے ۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ جن موسیقاروں نے یہ نغمے گائے ہیں ان کو بھی انعامات دیے جائیں گے ۔ یہ انعامات عید الفطر کے بعد ایک خاص تقریب میں تقسیم کئے جائیں گے ۔

چینی کتابوں کا تحفہ

ڈھاکے میں چین کے قونصل جنرل جناب وانگ نے ادبی رشتوں کے ذریعے پاکستان اور چین کے تعلقات کو مستحکم بنانے پر زور دیا ہے ۔ جناب وانگ نے یہ بات ۳۰ دسمبر کو چین کی طرف سے بنگلہ اکادمی کو (۱۳۲۲) کتابوں کا تحفہ پیش کرتے ہوئے کہی ۔ ان کتابوں کا تعلق ادب ۔ سائنس ۔ ٹیکنالوجی ، زبان اور کلاسیکی ادب سے ہے ۔

قرآن مجید کے تراجم

صوبائی وزیر اوقاف وحبلی خانہ جات میر غلام قادر خاں نے کہا ہے کہ محکمۂ اوقاف دنیا کی مختلف زبانوں میں قرآن مجید کے تراجم شائع کرنے پر غور کر رہا ہے ۔ انہوں نے ۱۷ دسمبر کو لاہور میں کہا کہ محکمہ اوقاف نے علاقائی زبانوں میں قرآن مجید کے ترجمے کا کام پہلے ہی شروع کر رکھا ہے اور یہ کام تسلی بخش طور پر انجام پا رہا ہے انہوں نے کہا کہ ان کا محکمہ عوام میں اسلامی نظریات کے فروغ کے لئے مسلسل کام کرتا رہے گا ۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ حضرت داتا گنج بخشؒ کی سیرت نگاری پر بھی کام ہو رہا ہے ۔

قومی زبان ایک حقیقت

ڈھاکا یونیورسٹی نے بھی طلبہ کی سہولت کے لئے ۱۹ دسمبر کو ایک اعلان کے ذریعے فیصلہ کیا ہے کہ تمام شعبوں کے امتحانات میں امیدوار اپنے پرچے بنگالی زبان میں حل کر سکتے ہیں یونیورسٹی کی اکیڈمک کونسل نے حال ہی میں یہ فیصلہ کیا ہے اور اس کو ۱۹۶۶ء سے نافذ قرار دیا ہے ۔

مختصر کہانی پر انعام

ادارۂ مصنفین پاکستان نے بچوں کے لئے بچت اور بنکنگ کے موضوع پر مختصر کہانی کے انعام کا اعلان کر دیا ہے ۔ یہ مقابلہ بنکنگ پبلسٹی بورڈ ادارۂ مصنفین پاکستان کے زیر اہتمام اسی سال جولائی میں ہوا تھا ۔ ایک ہزار روپے کا پہلا انعام ماہ طلعت عابدہ کو ان کی کتاب "اچھے بچے" پر اور دوسرا انعام پانچ سو روپے کا سیدہ خاتون کو ان کی کتاب "پری" پر دیا جائے گا ۔ یہ فیصلہ مختلف مصنفین نے شاہد احمد دہلوی صاحب کی سربراہی میں کیا ۔ انعام کی تقسیم کی تاریخ اور جگہ کا اعلان بعد میں کیا جائیگا ۔

دینیات کی تعلیم

اسلامی مشاورتی کونسل نے اپنے اجلاس ڈھاکا میں یہ سفارش کی ہے کہ مسلمان طلبہ کو ابتدائی جماعتوں سے ڈگری کلاسوں تک دینیات کی تعلیم لازمی طور پر دی جانی چاہیے تاکہ مسلمان طالب علم مذہبی امور اور اسلامی روایات سے واقفیت حاصل کر سکیں ۔ کونسل نے کورسوں میں شامل کتابوں پر بھی نظر ثانی کی ہدایت کی ہے ۔

کارٹون کی نمائش

وزیر اطلاعات ونشریات خواجہ شہاب الدین نے ۲۹ نومبر کو راولپنڈی میں مشہور کارٹونسٹ عزیز کے بنائے ہوئے کارٹونوں کی نمائش کا افتتاح کیا ۔ اس موقع پر آپ نے کہا کہ مزاح

، صحافت کا ایک اہم جزو ہے جس کے تمام تقاضوں کا اظہار ایک اچھا کارٹونسٹ جس پیرائے میں کر سکتا ہے وہ دوسری
مکن نہیں ۔ انہوں نے عزیز کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے ان کی ذہانت اور روشن مستقبل کی طرف وضاحت سے اشارے
ن سے پہلے معتمد وزارت اطلاعات جناب الطاف گوہر نے عزیز اور اس کے فن کو سراہا ۔

اس آئینہ خانے میں

ب ایم ۔ وی دانیلوف

روس کے محکمۂ جنوب مشرق ایشیا کی ثقافت اور دوستی کے غیر ملکی تعلقات کی یونین کے ڈائرکٹر جناب ایم ۔ وی ۔ دانیلوف نے پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر
احمد خاں سے ملاقات کی اور کہا کہ روس اور پاکستان کے درمیان اردو اور روسی پروفیسروں کا تبادلہ کیا جائے جو دونوں
یں اپنی اپنی زبانوں کی تعلیم دیں ۔ انہوں نے پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری کو روسی کتابوں اور رسالوں کی پیشکس
۔(

ٹس رحمان کا خطاب

سپریم کورٹ کے جج جناب جسٹس ایس اے رحمان نے اردو ترقی بورڈ پشاور شاخ کے قیام پر ایک اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ باوجود اس کے
ملک کے کسی حصّے کی زبان نہیں وہ ہر پاکستانی کی زبان ہے ۔ انہوں نے کہا کہ اردو نے قومی اتحاد کے سلسلے میں اہم کردار
ہے اور اسی وجہ سے اس کی نشر و اشاعت ہونی چاہیے ۔ انہوں نے امید ظاہر کی کہ بہت جلد وہ دن آرہا ہے جب
بانیں ملک اور حکومت کا کاروبار چلا رہی ہوں گی ۔ انہوں نے کہا کہ اردو کی ترقی کبھی علاقائی زبانوں کی ترقی میں حائل نہیں
اور نہ ہو سکتی ہے ۔

ٹس سجاد احمد جان

مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے جج جناب جسٹس سجاد احمد جان نے اورینٹل کالج لاہور کی اردو انجمن کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا کہ اردو کی بے قدری کی اصل وجہ ہمارے تعلیمیافتہ طبقے
ماس کمتری ہے کہ وہ صرف غیر ملکی زبان ہی سے خود کو مہذب کہلا سکتے ہیں انہوں نے کہا کہ محض تعلیمیافتہ طبقہ ہی ہماری
ندگی کے مختلف شعبوں میں مرکزی کردار ادا کر رہا ہے ۔ اور یہ لوگ غیر ملکی زبان سے مرعوب ہیں ۔ اسی لئے ہمیشہ غیر ملکی
و ذریعۂ اظہار بنانے پر ترجیح دیتے رہیں گے ۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ اردو ایک ترقی پذیر معاشرے کی ترجمانی نہیں کر سکتی
، کہا کہ حقیقت اس کے برعکس ہے یعنی جب تک ہم قومی زبان کو ذریعۂ اظہار نہیں بنائیں گے ۔ ترقی نہیں کر سکتے ۔ انہوں نے یہ
مایا کہ اردو کو قومی زبان کی حیثیت سے ابھی وہ مقام نہیں ملا ہے جس کی وہ مستحق ہے ۔ اور ہمیں اسے یہ رتبہ دلانے کے لئے اپنی
ہد جاری رکھنی چاہیے ۔

یادوں کے چراغ

یوم پطرس

بزم ثقافت پاکستان کے زیر اہتمام منعقدہ ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے گورنمنٹ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر نذیر احمد نے نوجوانوں کو تلقین کی ہے کہ وہ اپنی قوم کے ان مشاہیر کی سوانح کا مطالعہ کریں۔ جنہوں نے مختلف میدانوں میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ آپ نے کہا کہ احمد شاہ بخاری پطرس مرحوم ایک ایسے جلیل القدر فرزند تھے جو اردو اور انگریزی کے صاحب طرز ادیب، ممتاز عالم، منفرد مزاح نگار، بلند پایہ سیاستداں اور اردو کے شیدائی تھے۔ اس جلسے میں لاہور کے ممتاز ادیبوں اور صحافیوں نے شرکت کی۔

اقبال اکیڈمی

اقبال اکیڈمی شاعر مشرق حضرت علامہ اقبال کی یاد میں قائم کی گئی تھی۔ اس کو حکومت پاکستان کی سرپرستی بھی حاصل ہے۔ اور اب تک اس ادارے نے اقبال فہمی کے سلسلے میں کئی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ اس کا دائرہ صرف ادب و شعر تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ فلسفہ، تاریخ، سماجیات اور اسلامیات کے وسیع میدانوں سے ملتا ہے۔ اقبال اکیڈمی کی لائبریری بیش قیمت کتابوں اور قلمی نسخوں پر مشتمل ہے اس کی طرف سے ایک رسالہ "اقبال ریویو" کے نام سے سہ ماہی شائع ہوتا ہے۔ اقبال اکیڈمی نے اعلان کیا ہے کہ کلام اقبال کو دنیا کی اہم زبانوں میں منتقل کرنے کے پروگرام پر عمل شروع ہو گیا ہے۔

ماتم میں ہم شریک

سمرسٹ ماہم کا انتقال

عظیم ناول نگار اور افسانہ نویس ولیم سمرسٹ ماہم (۹۱) سال کی عمر میں نائس (فرانس) میں ۱۶ دسمبر کو انتقال کر گئے۔ یہ عظیم برطانوی ادیب ایک ہفتے تک اسپتال میں بیہوشی کے عالم میں موت سے نبرد آزما رہا مگر آخر موت کو فتح ہوئی تھی۔ سمرسٹ ماہم کے ناولوں، افسانوں اور ڈراموں نے دنیا بھر میں جو مقبولیت حاصل کی تھی اس کی بنا پر انہیں اس صدی کے عظیم لکھنے والوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ انہیں متعدد خطابات اور اعزازات سے نوازا گیا ہے۔ ماہم نے ۲۲ ناولوں اور ۳۰ ڈراموں کے علاوہ بے شمار مختصر افسانے اور مضامین اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ انہیں کینٹربری کیتھڈرل کے قبرستان میں اعزاز کے ساتھ دفن کیا گیا۔

ممتاز ماہر تعلیم کی رحلت

پاکستان بھر کے علمی و تحقیقی حلقوں میں یہ اطلاع بہت رنج و افسوس کے ساتھ سنی جائیگی کہ پاکستان کے مشہور فلسفی اور ماہر تعلیمات پروفیسر ایم۔ ایم شریف کا انتقال لاہور میں ۱۷ دسمبر کو ہو گیا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم کی عمر (۷۲) سال تھی۔ انہیں باغبانپورہ کے قبرستان میں دفن کیا گیا اور ان کے جنازے میں اعلیٰ سول اور فوجی حکام اساتذہ اور طلبہ نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ پروفیسر شریف ۲۴ سال تک علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ فلسفہ کے صدر رہے ہیں۔ لاہور میں وہ ادارۂ اسلامی تحقیقات کے ڈائرکٹر تھے۔ آپ نے ساری

عمر مختلف تعلیمی اور علمی اداروں کی خدمات میں گزاری - فلسفے پر اُن کی گہری نظر تھی ۔خصوصاً عرب فلسفے پر تو وہ درجۂ استناد رکھتے تھے - پروفیسر شریف قوم اور ملک کی ایسی شخصیات میں سے تھے جن کا نہ رہنا ملک کا بھاری نقصان ہے ادارۂ قومی زبان مرحوم کے پسماندگان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

نوجوان ڈرامانگار حادثے کا شکار

لاہور ٹیلی ویژن کے اسٹیشن پر ڈیوٹی سرا در اردو کے نوجوان ڈرامانگار ذکا درّانی کا انتقال ایک افسوسناک حادثے میں ہوگیا- ذکا درّانی لاہور ٹیلی ویژن کی خدمات سے پہلے ریڈیو پاکستان کراچی میں اور آرٹس کونسل میں بھی اہم خدمات انجام دے چکے ہیں۔ ان کی المناک موت پر ہر طبقے کے افراد نے غم کا اظہار کیا ہے - اُن کے جنازے میں لاتعداد لوگوں نے شرکت کی ۔

ذکا درّانی ایک ذہین اور باصلاحیت فنکار تھے اور اُن کی ناوقت موت نے مستقبل کا ایک ہونہار فنکار ہم سے چھین لیا - وہ علامہ تاجور نجیب آبادی کے بھتیجے تھے اور انہوں نے علم و ادب کا ذوق ورثے میں پایا تھا - مرحوم نے اپنے پیچھے ایک بیوہ ، ایک نوماہ کا لڑکا اور ساڑھے چار سال کی بچی چھوڑی ہے - صوبائی وزیر خزانہ شیخ مسعود صادق اور وزیر سماجی بہبود محمد یسین وٹو نے اُن کی وفات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے اور کہا ہے کہ انہوں نے ٹیلی ویژن پروگرام کو مقبول بنانے میں شاندار خدمات انجام دی تھیں - ادارہ قومی زبان اس المناک حادثے پر انتہائی افسوس کا اظہار کرتے ہوئے ذکا درّانی مرحوم کے پسماندگان کے غم میں برابر کا شریک ہے -

اے-ٹی - ایم مصطفیٰ کا انتقال

قومی زبان کا یہ شمارہ مکمل ہوچکا تھا کہ پاکستان کے سابق وزیر تعلیم جناب اے ٹی ایم مصطفیٰ کے انتقال پر ملال کی خبر موصول ہوئی - مرحوم ہوانا میں ایک بین الاقوامی کانفرنس میں پاکستان کی نمائندگی کے لیے تشریف لے گئے تھے موصوف اس کانفرنس کے ایک اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال فرماگئے - آخری لفظ جو آپ کی زبان پر آیا " پاکستان " تھا- مرحوم علی گڑھ کے نمایاں طالب علموں میں سے تھے اور انہیں ملک کی تعلیمی و علمی سرگرمیوں میں سے گہری دلچسپی تھی - ان کا انتقال صحیح معنوں میں قومی نقصان ہے -

ڈاکٹر اسلم فرخی

متفرقات آزاد

آزاد کی متفرق کتابیں۔ بیاض آزاد۔ سیر ایران اور مکتوبات آزاد ہیں۔ بیاض آزاد مختلف اردو شعرا کے متفرق اشعار اور غزلیات کا ایک مختصر سا انتخاب ہے جس میں ردیف دار اشعار درج کئے گئے ہیں۔ اسے ۱۹۲۳ء میں آغا محمد طاہر نے شائع کیا تھا۔ انتخاب میں کوئی نظم۔ ضبط یا ترتیب نہیں ملتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آزاد نے اپنی یادداشت کے لئے مختلف اوقات میں اشعار قلم بند کر لئے تھے۔ کہیں کہیں انہوں نے اپنے اشعار بھی لکھے ہیں۔ منتخب اشعار میں ذاتی پسند اور ناپسند کا دخل بھی نہیں معلوم ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میر۔ سودا۔ غالب اور ذوق کے اشعار کے ساتھ ساتھ آزاد نے بعض بڑے پھس پھسے اشعار بھی لکھ لئے ہیں جن کی پسند کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

بیاض آزاد محض ایک تبرک کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ اس میں کوئی اور خصوصیت نہیں۔

سیر ایران جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے آزاد کے سفر ایران کی روداد ہے۔ یہ ایک لیکچر اور ایک ناتمام روزنامچے پر مشتمل ہے۔ اسے بھی آغا محمد طاہر نے شائع کیا تھا۔ ابتدا میں وہ لیکچر ہے جو آزاد نے ایران سے واپس آ کر ۲۴ر جولائی ۱۸۸۶ء کو انجمن ہال لاہور میں دیا تھا۔ سیر ایران کے ضمن میں ہم نے عبدالرزاق کانپوری کا ایک بیان نقل کیا ہے جس سے اس لیکچر کے بارے میں سامعین کے ذوق و شوق کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ لیکچر آزاد کے اسلوب بیان کا شاہکار ہے۔ وہ جسمانی اعتبار سے ایران سے واپس آ گئے تھے۔ لیکن اپنے دل و دماغ وہیں چھوڑ آئے تھے۔ اس لیکچر کے لفظ لفظ سے آزاد کی ذہنی کیفیت کی صحیح نشان دہی ہوتی ہے۔ لذیذ بود حکایت دراز گفتم۔ کے بمصداق آزاد نے اپنے مشاہدات اور تجربات کو رنگین انداز میں بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ آزاد اگر اپنا سفرنامہ مرتب کرتے تو اس میں بھی یہی شان پائی جاتی لیکن ذہن ان کا ساتھ چھوڑ گیا اور ایک لیکچر اور ایک ناتمام روزنامچہ ان کے سفر کی یادگار رہ گیا۔

آزاد کا لیکچر ایجاز و بلاغت کے اعتبار سے بھی قابل ذکر ہے۔ انہوں نے ایک لیکچر میں اپنے سارے مشاہدات

یٹنے کی کامیاب کوشش کی ہے ۔ موضوع کی محبت نے یہ کام ان کے لئے خاصا مشکل بنا دیا تھا ۔ لیکن وہ پوری طرح
باب ہوئے ہیں ۔ کوئی ضروری نکتہ چھوٹنے نہیں پایا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کا رجحان طبع بھی پوری طرح
کار ہو گیا ۔ سننے والے بھی مسحور ہو گئے اور مقصد بھی حاصل ہو گیا ۔ خلوص و محبت رنگا رنگی ۔ مشاہدے کی تیزی اور
ز اسلوب کی وجہ سے آزاد کا یہ لیکچر اردو کا گراں قدر سرمایہ ہے ۔

آزاد کا روزنامچہ نا تمام ہوتے ہوئے بھی ایک خاص حسن اور کیفیت کا حامل ہے ۔ ابتدا میں آزاد نے
تفصیل سے کام لیا ہے لیکن آہستہ آہستہ وہ اجمال کی طرف آتے گئے ہیں ۔ کہیں کہیں انہوں نے اردو کے
ے فارسی میں یادداشتیں مرتب کی ہیں ۔ غالباً ان کا ارادہ ایک مبسوط سفرنامہ مرتب کرنے کا تھا اس لئے وہ بہت
صار کے ساتھ مختلف واقعات قلمبند کرتے چلے جاتے ہیں ۔ سفرنامہ تو مرتب نہ ہو سکا لیکن روزنامچے نے بڑی حد
اس کی قائم مقامی کے فرائض انجام دیئے ہیں ۔

اس روزنامچے کی وجہ سے آزاد کی شخصیت کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں ان کا عزم و ہمت ۔ ان کی
ری طبع ۔ مصائب سے نہ گھبرانا ۔ علم دوستی ۔ کتابوں کا ذوق ۔ زباں دانی کی تکمیل کا خیال ۔ ظرافت اور شوخی ۔
ض ان کی شخصیت کے چند عناصر اس روزنامچے میں پوری طرح نمایاں ہیں ۔ آزاد عموماً اپنے آپ کو لئے دیئے رہتے
۔ ان کے لہجے میں تیزی اور طراری کے بجائے ایک طرح کا دھیما پن پایا جاتا ہے ۔ لیکن اپنے روزنامچے میں وہ اس
دار کو قائم نہیں رکھ سکتے بلکہ وہ ایسے انسان کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں ۔ جو ہنستا بھی ہے قہقہے بھی
تا ہے ۔ سفر کی صعوبتوں سے لطف اندوز بھی ہوتا ہے ۔ اور مزاروں پر جا کر عقیدت کے پھول بھی چڑھاتا ہے
یں یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ انسان عام آدمیوں سے کس قدر مختلف بھی ہے ۔ اس کے جذبات میں بڑا عمق اور شدت
ہے ۔ اس کے یہاں مقصد کی لگن ہے ۔ وہ کسی حال میں بھی اپنے مقصد سے غافل نہیں ہوتا ۔

یہ صحیح ہے کہ آزاد کے روزنامچے میں مسافران لندن ۔ یا سفرنامہ روم و شام ۔ کی سی تفصیل نہیں ۔ اس کی وجہ
زاد کے روزنامچے کا اختصار ہے ورنہ کیفیت اور کمیت کے اعتبار سے اس کا مرتبہ کچھ کم نہیں ۔ اختصار نے آزاد کے
وزنامچے کی افادیت کو بڑی حد تک مجروح کر دیا ہے ۔ پھر بھی اس کے حسن اور دلآویزی میں کوئی شبہ نہیں ۔

مکتوبات آزاد اس سلسلے کی سب سے اہم کتاب ہے ۔ ۱۹۰۹ء میں مخزن میں مکتوبات آزاد کی اشاعت کا سلسلہ
شروع ہوا اور چھ سات مہینے تک جاری رہا ۔ یہ تمام خطوط سید حسن بلگرامی کے نام تھے یہی مکتوبات بعد میں کتابی شکل
یں شائع کر دیئے گئے ۔ سید جالب دہلوی کا ایک طویل دیباچہ بھی اس ایڈیشن میں شامل تھا ۔ اس ایڈیشن میں کل اٹھائیس
مکتوبات تھے ۔ ۱۹۲۲ء میں آغا محمد طاہر نے ارسٹھ خطوں کے اضافے سے ایک نیا ایڈیشن شائع کیا ۔ اس طرح کل خطوں کی
تعداد چھیانوے ہو گئی خطوں کے علاوہ آغا صاحب نے اس مجموعے میں آزاد کی متفرق تحریریں غالب کے تین غیر مطبوعہ خط

سرسید احمد خاں ۔ خلیفہ محمد حسین ۔ حالی ۔ نواب علاؤ الدین ۔ غلام رسول ویراں ۔ سید محمد حسن اور سید احمد دہلوی کے خطوط جو آزاد کے نام تھے اس مجموعے میں شامل کر دیے ۔ غالب کے خطوط سجاد ابن حسین ۔ سجاد مرزا خاں اور میر نیندہ علی کے نام ہیں ۔

اچھا خط لکھنے کے لئے زندگی سے محبت اور زندگی گزارنے کا سلیقہ دونوں کی ضرورت پڑتی ہے ۔ اردو مکاتیب میں غالب کو جو اہمیت حاصل ہے اس کی بڑی وجہ یہی ہے ۔ غالب زندگی سے محبت بھی کرتے تھے اور زندگی گزارنے کے سلیقے سے بھی واقف تھے ۔ خطوں تو مبسوط منطقی بیان ہوتے ہیں نہ مدلل مضامین ۔ خط کی تنگ دامانی میں اس کی گنجائش کہاں ۔ اس کے دائرۂ عمل میں صرف دو شخص ہوتے ہیں ایک خط لکھنے والا اور دوسرا خط پڑھنے والا ۔ ایک باتیں کرتا جاتا ہے ۔ دوسرا ہمہ تن گوش ہو کر "حینت شنید" کی دلفریبیوں میں محو ہو جاتا ہے ۔ ذاتی تجربے ۔ مشاہدے واردات ۔ بے قصد و ارادہ خط کے دامن سے جھانکتے نظر آتے ہیں ۔ زندگی کی چھوٹی چھوٹی اور معصوم خوشیاں غیر اہم تکالیف خط کی دنیا میں پہنچ کر لازوال اثرات کی حامل ہو جاتی ہیں ۔ اچھے خط لکھنے میں قصد اور ارادے کو دخل نہیں ہوتا ۔ محبت کی حکایت بیان کرنے میں قصد اور ارادے کی ضرورت کہاں پیش آتی ہے ۔ اچھا خط اپنے لکھنے والے کو بھی لازوال بنا دیتا ہے ۔

خطوط کی دنیا بڑی دلچسپ اور بوقلموں ہے ۔ اس میں انسان اپنے صحیح رنگ روپ میں نظر آتا ہے "تکلف اور تصنع کا لبادہ اس دنیا میں کام نہیں دیتا ۔ یہاں ہر شخص پوری طرح نمایاں ہے ۔ اس کی فطرت کا کوئی گوشہ چھپا نہیں رہ سکتا ۔ لیکن وہ خطوط جو قصد اور ارادے کے ساتھ تسکین نخوت کے لئے لکھے جاتے ہیں ۔ جن کا مقصد علمیت اور انشا پردازی کی نمائش ہوتا ہے صحیح معنوں میں خطوط کے دائرے میں نہیں آتے ۔ خطوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ نجی ہوں ۔ نجی زندگی کی خوشیوں اور خواہشوں کا اظہار کرتے ہوں ۔ نجی زندگی کے معمولی واقعات میں ہمہ گیری اور دلچسپی پیدا کرنا ہی تو اصل فن ہے ۔ اس کی وجہ سے اچھے خط ادبی کارنامے کا قالب اختیار کرتے ہیں ۔ غالب نے اپنی نجی زندگی کو خطوط میں اس طرح بے نقاب کیا ہے کہ وہ صرف ان کی زندگی نہیں ہماری بھی زندگی بن گئی ہے ۔ ہم ان کی دلچسپیوں ۔ محرومیوں ۔ مسرتوں اور آلام میں ان کے شریک ہو گئے ہیں ۔

آزاد کے وہ خطوط جو دوستوں اور شاگردوں کے نام لکھے گئے ہیں ان کی نجی زندگی کا آئینہ ہیں ۔ ان میں آزاد کی شخصیت پوری طرح نمایاں ہے وہ اپنی محرومیوں اور ناکامیوں کا ماتم بھی کرتے ہیں اپنی خواہشوں کا اظہار بھی کرتے ہیں ۔ مشتعل ہوتے ہیں ۔ انسان دوستی اور شرافت نفس کا ثبوت بھی دیتے ہیں ۔ اور دلنوازی کے نئے نئے پیرائے بھی اختیار کرتے ہیں ۔ راقم الحروف کو ڈاکٹر خورشید الاسلام کی اس رائے سے اتفاق نہیں کہ "حیرت ہے کہ آزاد نے بھی تھوڑے بہت خط ترکے میں چھوڑے ہیں لیکن ان میں زندگی کی دلچسپیاں کہیں نہیں ملتیں ۔ آزاد کے

ٹائیں زندگی کی دلچسپیاں قدم قدم پر دامن دل کھینچتی ہیں اصل بات دلچسپیوں کا تصور ہے جو اضافی ہے۔ آزاد نہ مولوی
نہ رند نہ شاہد باز وہ تو ایک ایسے انسان تھے جو اپنی تخیل کی جنت میں زندہ رہتا ہے جس کی زندگی میں زنگا رنگی کے
ئے یک رنگی ملتی ہے۔ اس حساب سے آزاد کی زندگی اور ان کی دلچسپیوں دونوں کا دائرہ محدود ہو جاتا ہے۔ دائرہ
ر محدود ہو گیا لیکن اس سے دلچسپیوں کا وجود معرض خطر میں نہیں پڑتا۔ یہ انداز دیکھیے: "احمق کا قاعدہ ہے کہ اپنی تعریف
کر خوش ہوتا ہے۔ میرا یہ حمق حد سے گزر گیا ہے کہ تعریف سن کر غصہ آتا ہے۔ بات یہ ہے کہ آپ میری تصنیف کے
میں کچھ نہ کہا کریں۔ کیا کہوں فرصت تو ہے نہیں اور دل یہ چاہتا ہے کہ آپ کے ایک ایک فقرے کے جواب میں ایک
کتاب لکھ دوں[1] یہ انداز جس میں بے تکلفی اپنے عروج پر ہے زندگی کی دلچسپیوں کی طرف ہمیں متوجہ بھی کرتا ہے اور
کاتا بھی ہے۔ اس بگڑنے میں لاکھوں بناو ہیں۔ اور دیکھیے "صاحب خدا جانے تم بیہوش ہو یا میں لکھنا پڑھنا بھول
ہوں۔ شکر گزاریاں تو اتنی اور مطلب کی بات کا پتا بھی نہیں[2]" اس تہدید میں محبت کا جو جذبہ کارفرما ہے اس کی تفسیر
یک دفتر چاہیے۔ اس تہدید میں آرزو۔ حسرت۔ حکم اور تقاضا سبھی کچھ ہے۔ اس میں زندگی کا حسن اور زندہ رہنے کی
ل ہے۔ جینے کا سلیقہ ہے اور بے تکلفی اور سادگی کی معراج ہے۔ ایک خط اس طرح شروع ہوتا ہے "ہزار لعنت
مجھ پر کہ تم جیسے شخص کو ایسے اضطراب میں ڈالتا ہوں اور لاکھ لاکھ لعنت ہے میرے اعمال پر افعال پر کہ مجھے ایسے عالم میں
ں رکھا ہے کہ جو جی بھی چاہتا ہے اور واجب و فرض عینی ہے وہ کر نہیں سکتا" ان جملوں میں کتنا خلوص اور کتنا پیار
۔ یہ جملے انتہائی اعتماد کی دلیل ہیں۔ آزاد کے خطوط میں ایسے جملوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔

آزاد کے خطوط سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں جرات رندانہ کی کمی تھی۔ بعض اوقات وہ اپنے مطلب اور مقصد کی
احت نہیں کرتے بلکہ اسے چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ اظہار کی خواہش انہیں مجبور کرتی ہے لیکن وہ منفی طریقے
کام لے کر خفائی سے ظہوری کے دائرے میں آجاتے ہیں۔ آزاد عماد الملک بلگرامی کو آب حیات کا ایک نسخہ بھیجنا چاہتے
۔ توقع وہی ہے جس نے غالب کے لئے "جادہ رہ کو کشش کاف کرم بنا دیا تھا لیکن فطری جھجک مانع ہے۔ بھیجنا بھی
ہتے ہیں اور تامل بھی کرتے ہیں۔ کشمکش کی اس منزل میں پہنچکر آزاد چاہتے ہیں کہ سید صاحب ان کی ہمت بندھائیں چنانچہ انہیں
تے ہیں "اگر فرمایئے تو ایک نسخہ آپ کے بھائی صاحب قبلہ کی خدمت میں بھیج دوں مگر انہیں ایسے جزلیات کے دیکھنے کی فرصت
ل ہوتی ہوگی" مقصد یہ ہے کہ حسن بلگرامی اپنے بھائی کو آب حیات کی خوبیوں سے متعارف کرائیں لیکن آزاد براہ راست کچھ کہنے کے بجائے منفی
یقہ اختیار کرتے ہیں۔ یہ ایک طرح کا احساس کمتری ہے لیکن اس کے باوجود ہم آزاد سے نفرت نہیں کرتے بلکہ ہمیں ان کی
معصوم لغزش سے ایک طرح کی ہمدردی ہوتی ہے صرف ہمدردی نہیں بلکہ آزاد کی اس کمزوری کے ساتھ ہمارے اپنے

---

[1] مکتوبات آزاد ص ۲۹۔۳۵ - [2] مکتوبات آزاد ص ۵۹ -

دل کا چور بھی ظاہر ہو جاتا ہے یہ دلوں کا چور ظاہر ہو جائے تو زندگی کی دلچسپیوں میں اضافہ ہو سکتا ہے کمی ہونے کا کوئی امکان نہیں۔

آزاد کے خطوط میں زندگی کی دلچسپیاں بھی ہیں اور زندگی کی حرارت بھی ہے ان کی سب سے بڑی خوبی بے تکلفی ہے۔ یہ فقرے دیکھیے "اس وقت کیا جی خوش ہوا ہے اور کیا غصہ آیا ہے۔ میں تو صبر کر بیٹھا تھا۔ اب سیلی ہوئی بارود کو آگ دینی کیا ضرور تھی۔ آپ مجھے خط نہ لکھا کریں۔ تو صاحب مبارک ہو۔ نائب تحصیلداری کیجئے اور جس طرح چاہیے ہم رفیقی لوگوں کو دبا ہیے۔ ارے میاں کیوں مجھے جلاتے ہو۔ بھلا میں اور ڈر دوں گا۔ مگر کروں کیا کہ میں جانتا ہوں تم بلکہ اور کوئی بھی نہیں جانتا۔ میاں میرے تم تدبیروں کے رستم ہو جو کوئی نہیں کرتا سو تم کر گزرتے ہو۔ قسمت تمہاری کچھ زبردست ہے کچھ کمزور ہے۔ تدبر آدمی تو پوری پڑتی ہے آدھی ادھوری رہ جاتی ہے"[1] یہ بے تکلفی بعض خطوں کے القاب میں بھی نظر آتی ہے۔ آزاد عام طور پر رسمی القاب سے خط شروع کرتے ہیں۔ لیکن کہیں کہیں القاب و آداب کی رسوم و قیود سے بیزار ہو کر پوری طرح بے تکلفی کی فضا میں آنکلتے ہیں۔ ایک خط یوں شروع کرتے ہیں "اجی او صاحب آپ نے تو بڑی راہ دکھائی۔ میں نے تو جانا کہ روٹھ گئے اب دیکھیے کیونکر منیں گے"[2] ایک اور خط یوں شروع ہوتا ہے "صاحب آپ کو تو خدا جانے کیا ہو گیا ہے۔ کار سنشفن صاحب خبر پوچھتے ہیں۔ بھائی میں کہہ چکا ہوں کہ یہاں وہابیوں کی عمل داری فرعونی ہے۔ باقی تمام بندگان خدا کا رزق یونیورسٹی سے اٹھ گیا۔ عجب عالم ہے حال لکھنے کے قابل نہیں۔ تم آ دو تو زبانی کہوں دفتر کے دفتر ہیں"[3] بے تکلفی کی یہ فضا آزاد کے ہم عصر ادیبوں اور شاعروں کے خطوط میں نہیں ملتی۔ یہاں شبلی کے ان خطوط کو معرض بحث میں لانا مقصود نہیں جو عطیہ بیگم کو لکھے گئے تھے۔ وہاں بے تکلفی کی فضا "ناز دلبری اور شیوہ عاشقی" نے پیدا کی ہے۔ ورنہ شبلی کے عام خطوط میں علم کا وقار اور زندگی کا رکھ رکھاؤ زیادہ نمایاں ہے اپنی عام زندگی میں وہ بے تکلفی کی اس سطح پر نہیں آ سکتے تھے۔

آزاد کے خطوط کی دوسری نمایاں خوبی ظرافت ہے۔ یہ ظرافت کبھی تبسم زیرلب سے آگے نہیں بڑھتی۔ وہ قہقہہ لگانے کے قائل نہیں۔ ان کی ہنسی نہ کھوکھلی ہوتی ہے نہ پُر تصنّع۔ اس سلسلے میں یہ اقتباس قابل غور ہے "یہ تم کو اختیار ہے کہ جس کو چاہو پہلے بھیجو اور اتنی بات اور بھی دیکھ لیجئے گا۔ کہ وہ شخص نیک طبع ہو۔ نیک طبع کیا۔ اس سے یہ مطلب نہیں اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ مولوی متقی پرہیز گار ہو۔ پناہ بخدا ایسے سے تو میں بڑا ڈرتا ہوں اور جانتا ہوں کہ وہ ضرور دغا دے گا۔ آپ نے مجھے دیکھ لیا کہ ہنستا ہوں ہر طرح تمسخر کرتا ہوں مگر وہ خوشی اتنی ہی ہے۔ اس سے آگے نہیں بڑھنا چاہتی"[4] اس سے ظاہر ہے کہ آزاد کی ظرافت ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھتی۔ ایک صاحب ملتان جا کر مفقود الخبر ہو گئے۔ آزاد

---

[1] مکتوبات آزاد ص ۸۹ ۔ [2] مکتوبات آزاد ص ۹۸ ۔ [3] مکتوبات آزاد ص ۷۹

ان کے متعلق لکھتے ہیں۔ "بھائی وہ ملتان میں کہیں متعہ کرکے بیٹھ رہے ہے" یہ فقرہ آزاد کی ظرافت کو بخوبی ظاہر کرتا ہے۔ ایک شاگرد سے کچھ سامان منگوایا ہے اس نے کچھ عذر کیا ہے اس سلسلے میں آزاد لکھتے ہیں "جو خریدنا ہو خاطر جمع سے خریدو گھبراہٹ کیا ہے کوئی آبرو کا بیاہ تو سر پر نہیں - اب نہیں پھر پھر نہیں پھر[1]۔" آزاد کی اس ظرافت میں ایک طرح کا دھیماپن ہے۔ ان کی ظرافت میں خندہ تیغ اصل" اور گریہ ابر بہار" کا حسن اور برش نہیں۔ وہ اگر طنز بھی کرتے ہیں تو اس میں محبت اور خلوص کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔ ان کا ایک شاگرد لاہور آکر ان سے بے ملے واپس چلا گیا۔ آزاد اسے لکھتے ہیں "تم لاہور میں آئے اور مجھ سے بے ملے چلے گئے - شاباش - شاباش - خدا تمہیں ایسا بڑا کر دے کہ مجھے پہچان بھی نہ سکو۔ میں بھی اس میں خوش ہوں[2]" اس طنز میں آزاد کی پوری شخصیت کا حسن نمایاں ہے۔ اس کی بنیاد شفقت اور محبت پر ہے۔ اس میں غصے، جھنجلاہٹ اور زہر خند کا کوئی شائبہ بھی نہیں۔

آزاد کے خطوط کی اثر انگیزی بھی قابل غور ہے۔ بعض جگہ انہوں نے ایجاز و اختصار کا کمال بھی دکھایا ہے اور اثر انگیزی کی پوری شان بھی برقرار رکھی ہے۔ یہ مختصر سا خط بیان دیکھئے "صاحب کیا کروں پتھر کی چھاتی اور لوہے کا کلیجہ کرلو تو جب میرے خط کو پڑھو اور مجھ سے خط و کتابت کرو۔ خلیفہ جی (خلیفہ محمد اکبر اور ملا محمد باقر آزاد کے شیر خوار بچوں کے نام تھے جو عالم شیر خواری میں داغ مفارقت دے گئے تھے) جب پونے تین مہینے کے ہوئے تو انہیں بھی ملا صاحب کے پہلو میں جاکر سلادیا۔

رضا بہ داد بدہ از جبیں گرہ بکشا
کہ بر من و تو در اختیار نکشودند[3]

وفور جذبات میں تقریر و تحریر دونوں پر قابو نہیں رہتا لیکن آزاد نے اپنے جذبات کی شدت کا احاطہ جس طرح کیا ہے وہ قابل غور ہے۔ اثر انگیزی کی دوسری مثال آزاد کا وہ خط ہے جو انہوں نے ڈاکٹر لائٹنر کے نام لکھا ہے اس خط میں آزاد کی ذہنی کیفیات شخصیت کی یکرنگی۔ جھجک معصومیت اور سادگی پوری طرح نمایاں ہے۔ یہ اقتباسات قابل غور ہیں "ہزاروں کتے کہ شیر کی کھالیں پہنے ہوئے تھے آپ نے انہیں مارا مگر اب تک یہ آپ کو نہ معلوم ہوا کہ شیر فقط ایک ہی بات میں شکار ہو جاتا ہے" "اب شکوے کی جگہ رہی نہ شکایت کا موقع۔ اب وہ وقت آگیا کہ بموجب اپنے وعدے کے جاوں گا اور سینہ چیر کے دکھاوں گا کہ کتنے زخم لگے ہیں۔ مجھے یہ زخم بھی عزیز ہیں کہ آپ کے لگائے ہوئے ہیں[4]۔" اس عرض حال کی معصومیت میں غزل کی لطافت اور رچاو ہے۔ اس میں نرم روی اور

---

[1] مکتوبات آزاد ص ۹۳ - [2] مکتوبات آزاد ص ۵۴

[3] مکتوبات آزاد ص ۷۶ - ۷۷ - [4] مکتوبات آزاد ص ۱۰۸

بجک ہے ۔ وہ تندی اور وہ شورس جو جیر آفیلڈ کے لئے جونسن نے روا رکھا تھا ۔ جونسن کے خط میں ابتدا سے انتہا تک جلال ہی جلال ہے ۔ آزاد جمالی کیفیات کے ترجمان ہیں ۔ وہ معصوم جمالی کیفیات جو گولڈ اسمتھ کے اس خط میں نمایاں ہیں جو اس نے اپنی ماں کو لکھا تھا ۔

محکمانہ مکاتیب کی یخ بستہ فضا میں بڑوں بڑوں کی شخصیت منجمد ہو جاتی ہے ۔ آزاد نے یہاں بھی زندگی کی حرارت کا ثبوت دیا ہے وہ تعطیلات میں باہر جانا چاہتے تھے ۔ لیکن پرنسپل گورنمنٹ کالج نے اجازت نہ دی اس سلسلے میں لکھتے ہیں ۔" میری اجازت فقط آپ کے ہاتھ میں ہے ۔ آپ اگر روکیں تو کسی لیفٹیننٹ گورنر کو روکیں ۔ کسی گورنر کو روکیں ۔ محمد حسین عاجز غریب کا روکنا آپ کے لئے کچھ فخر نہیں "

مختصر طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ آزاد کے خطوں میں زندگی کا حسن اور حرارت دونوں موجود ہیں ۔ ان کے خطوں میں خانگی باتیں ہیں ۔ شکوے شکایات ہیں ۔ ناز و نیاز ہیں چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور معصومیت ہے ۔ ان خطوط میں وہ بے تکلفی ۔ محبت اور خلوص ہے جس سے آزاد کی شخصیت کی تشکیل ہوئی تھی ۔ یہ خط ایک ماضی پرست اور انتہائی جذباتی انسان کو جو اپنے جذبات کو عام طور پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا ہمارے سامنے لاتے ہیں ۔ آزاد کے مجموعہ مکاتیب کو بیرنگ اور بے کیف کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔ زندگی کی دلچسپیاں اس کے ہر ہر لفظ میں موجود ہیں ۔

(بقیہ از صـ۲۸)

تاریخ (قرون وسطیٰ) میں بارود اور آتشیں اسلحہ کے استعمال پر انگریزی میں مضمون لکھنا ممکن ہے، اگرچہ اس میں خاصی غیر علمی مشقت بھی مجھے اٹھانی پڑے گی ۔ مولوی محمد شفیع صاحب نے بھی ازرہ قدر افزائی " انسائیکلو پیڈیا آف اسلام " کے لئے دو تین مضمون اردو میں مجھ سے لکھوائے اور پسند فرمائے ۔

حلقۂ مذاکرات چند علم دوست احباب کی جماعت کا نام ہے ۔ جو چار یا پانچ سال سے ہر جمعہ کو دو تین گھنٹے کسی ایک رکن حلقہ کے مکان پر جمع ہوتے ہیں ۔ قرآن شریف کی تھوڑی سی تفسیر علوم جدیدہ اور مباحث حاضرہ کی روشنی میں کی جاتی ہے ۔ پھر کسی موضوع (دینی یا ملی) پر تقریر یا مضمون پڑھے جاتے ہیں ۔ اور قرآن و سنت کی تعلیم کے مطابق غور و بحث کی جاتی ہے ۔ بعض بہت اچھے مضمون پڑھے گئے اور شائع بھی کئے گئے ہیں ۔ باہر کے ممبر جو کبھی کبھی شریک مذاکرہ ہوئے (مثلاً جناب مودودی، پرنسپل حمید احمد خاں، میاں بشیر احمد سابق سفیر وغیرہ) بحث کا معیار دیکھ کر خاص طرح مرعوب ہوئے ۔

ریاض کا انتخاب ایک اچھی تنقید کے ساتھ ضرور مرتب فرمایئے ۔ یہ صاحب طرز ہی نہیں، اپنی رنگین بیانی میں بھی داغ کا ہم پلہ شاعر ہے ۔ لوگوں نے امیر و جلال وغیرہ کو بہت اچھالا ۔ ریاض کو جیسی چاہیئے منزلت حاصل نہیں ہوئی ۔

آپ کی بیگم صاحبہ نے (یا آپ نے) مجھے خیال ہے کراچی کا بنگلہ کرایے پر دے کر خود لاہور آ رہنے کی تجویز سنائی تھی ۔ بہرحال جہاں رہیئے خوش و خرم رہیئے ۔ عماد الملک بلگرامی مرحوم ایک ہندو فقیر کی صدا سنایا کرتے تھے ۔

کام کئے جا، رام چپنے جا / کیا کا ہو کا ڈر ہے   پردیسی کی ہاٹ لگی ہے کیا کا ہو کا گھر ہے ؟

گنج ہائے گراں مایہ

انجمن کے مخطوطات کی وضاحتی فہرست (جلد دوم)

مرتبہ آفسر صدیقی امروہوی

دوسری جلد کے مندرجہ ذیل مخطوطات پر قومی زبان میں حواشی شائع ہو چکے ہیں

مخطوطہ	مصنف
۱۔ وصیت نامہ	...
۲۔ فتح المجاہدین	مسکین
۳۔ شفاعت نامہ	عبد القادر
۴۔ قصہ شاہ جمجمہ	کمترین
۵۔ تلقین الہدیٰ	عاصی
۶۔ تنبیہ العوام	شاہ محمد بدھن احقر
۷۔ مثنوی گوہر	ابراہیم گوہر
۸۔ حملۂ حیدری	ذو الفقار علی صفا
۹-۱۰۔ محی الدین نامہ (دو نسخے)	عبد الملک عبد
۱۱۔ دیوان ہمت	خواجہ ہمت علی خاں
۱۲۔ گنج قدرت	اعز الدین خاں نامی
۱۳۔ فتح نامہ	یٰسین
۱۴۔ سپند نامہ	جعفر زٹلی
۱۵۔ دیوان تمنا	اسد علی خاں تمنا
۱۶۔ تاریخ فیض عام	بہدوی
۱۷۔ حشر نامہ	......
۱۸۔ قصیدہ غوثیہ	رحمت اللہ
۱۹۔ نصائح الاطفال	
۲۰۔ نصیحت نامہ	......
۲۱۔ مذمت بے نمازاں	......
۲۲-۲۶۔ شمائل نامہ (پانچ نسخے)	عبد المحمد ترین
۲۷-۲۸۔ تنبیہ نامہ (دو نسخے)	ولی
۲۹۔ معجزہ حضرت فاطمہ	فاروقی
۳۰-۳۲۔ دیوان فراق (تین نسخے)	ثناء اللہ فراق دہلوی
۳۳۔ صبح نوبہار عشق	محمد باقر آگاہ
۳۴۔ گلزار عشق	" "
۳۵۔ ندرت عشق	" "
۳۶۔ محبوب القلوب	" "
۳۷۔ " " (نسخہ ثانی)	" "

اس شمارے میں مندرجہ ذیل مخطوطات پر حواشی دیئے جا رہے ہیں

مخطوطہ	مصنف
۱۔ آدم نامہ	دولہ قلندر
۲۔ شہادت حضرت قاسم	ولی ویلوری
۳۔ معراج نامہ	محمد بن مجتبیٰ بہدوی
۴۔ مولود سرور عالم	مختار

آدم نامہ

سائز ۸ × ۵ صفحات (۴۸) سنہ تصنیف تقریباً ۱۱۵۰ھ سنہ کتابت ۔

یہ کتاب ویدانت یعنی ہندو تصوف و فلسفے سے متعلق ہے ابتدائی ۸ صفحے دو مصراعی اس کے بعد دو صفحے سہ مصراعی لکھے گئے ہیں۔ بقیہ ۳۸ صفحات میں سے ہر صفحہ میں اوسطاً (۲۲) اشعار آڑے ترچھے درج ہیں ابیات کی کل تعداد پانچ سو کے قریب ہے ۔

مصنف : خاتمہ کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کا نام دولہ قلندر عرف عیانی رام ہے لیکن وہ کون تھا کہاں کا باشندہ تھا اور کس زمانے سے تعلق رکھتا ہے یہ تمام باتیں تحقیق طلب ہیں البتہ ایک بیت سے جسے ذیل میں درج کیا جاتا ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاہ عنایت نام کے کسی بزرگ کا عقیدتمند تھا ؎

شاہ عنایت کے مل جائے جن موں یہ راہ بتائی

شاہ عنایت نام کے ایک بزرگ دکن میں گزرے ہیں جو نورنامے کے مصنف ہیں اس نورنامے کے متعدد نسخے انجمن کے کتب خانہ میں موجود ہیں ۔ شاہ عنایت کی وفات ۱۱۵۵ھ میں واقع ہوئی اس سے دولہ قلندر کے زمانے کا کسی حد تک تعین کیا جا سکتا ہے ۔

آدم نامہ میں سناتن دھرم عقائد کی جھلک نمایاں نظر آتی ہے ۔ ستیہ جگ ۔ دواپر ۔ تریتا اور کلجگ کا بیان کافی تشریح کے ساتھ کیا گیا ہے ۔

اس مخطوطہ میں املا کی غلطیاں قدیم مخطوطوں کی طرح کافی تعداد میں ہیں ۔ مثنوی کو مسنوی اور سبا کو رباعی لکھا گیا ہے ۔ پرانے شعراء کے طرز عمل کے مطابق علم عروض اور قوانین شعر کی پابندی کا کوئی خاص لحاظ نہیں رکھا گیا ۔ رباعی کو بنائی کا اور معنی کو بالی کا قافیہ قرار دینے میں کوئی قباحت نہیں سمجھی ۔ آدم نامہ کی زبان سنسکرت آمیز بھاکا ہے اور اس میں جا بجا دوہرے شامل کئے گئے ہیں ۔

آغاز : کتاب کا آغاز اس طرح ہوتا ہے ۔

آد امورت ۲ الکھ ۱ ابھیوا نرمل نام ۲ نرمجن دیوا
ابرن برن اروپ گسائیں اجرامر اوناشت جو سائیں

دیکھو عجیب نکاتاں رب کے — منساپورن کرتے سب کے

حمد کے ان اشعار کے بعد توریت، انجیل اور زبور کا ذکر کیا ہے اور اس کے آخر میں نعت سرور کائنات اس طرح تحریر کی ہے۔

آپ احد احمد ہو آیا — میم ملا، معصف گن گایا
جو کچھ ہے سو میم معظم — صلی اللہ علیہ وسلم

اختتام:۔ آدم نامہ کا اختتام ان اشعار پر ہوتا ہے۔

مدح مناقب بہت بنائی — غزل ریختہ قطعہ رُوباعی
زردبیستاں سب ذو معنی — شعر مثنوی نِرمل بانی

ترقیمہ:۔ آخر میں یہ عبارت تحریر ہے۔

تمت تمام شد ہذا الکتاب آدم نامہ عرف سرودہ من تصنیف فقیر خواجنا ودولہ قلندر عرف عیانی رام غفراللہ ذنوبہٗ ؎

شہادت حضرت قاسم

سائز ۸ ½ × ۵ ½ صفحات ۲۰ سطور ۱۷، سنہ تصنیف ۱۲۳۷ھ سنہ کتابت ۱۷ رجمادی الاول سنہ (؟)

یہ (۳۰۸) ابیات کی مثنوی روضۃ الشہدا (دومجلس) کا ایک حصہ ہے جو اصل کتاب کی مجلس نہم میں شامل ہے۔ روضۃ الشہدا وَلی دیلوری کی مشہور تصنیف ہے جو طبع ہو چکی ہے۔ اکثر کتاب خانوں میں اس کے قلمی نسخے موجود ہیں چنانچہ انجمن کے کتب خانہ خاص میں پانچ مخطوطے ہیں۔

حالات مصنف:۔ ولی کا نام میر ولی فیاض تھا وہ دیلور (مدراس) کے باشندے تھے۔ خود چٹ پیٹھ کے جاگیردار تھے لیکن سات گڑھ کے حاکم حراست خاں صوبیدار اور سدھوٹ کے قلعدار عبدالمجید خاں کے یہاں ملازمت کرتے رہے۔ ڈاکٹر زور مرحوم نے ان کا سنہ وفات قیاساً ۱۱۵۰ھ لکھا ہے (اردو مخطوطات اول ص۶۵)

روضۃ الشہدا کو قبول عام کا شرف حاصل رہا ہے۔ اس کا دوسرا نام دہ مجلس ہے۔ سنہ تصنیف ۱۱۳۰ھ ہے۔ روضۃ الشہدا متعدد مرتبہ طبع بھی ہو چکی ہے اس کے مطبوعہ نسخے بھی کئی کتب خانوں میں ہیں۔ انجمن ترقی اردو کے کتب خانہ

خاص میں مطبوعہ نسخہ صرف ایک ہے۔

ایک اور کتاب بھی ولی ویلوری کی طرف منسوب ہے جس کا نام رتن پدم ہے یہ (۴۰۰) ابیات کی ایک مثنوی ہے جو بقول ڈاکٹر زور مرحوم ٹیپو سلطان کے کتب خانہ میں موجود تھی۔

آغاز:۔

دلی اتیچہ غم میں سٹ نکو ہوش — اگے ماتم کے دریاکوں ہی لے جوش
انکھیاں کے نیرکوں دیدے کے پانی — کر ایسے باغ غم کی باغبانی

اختتام:۔

اچھو قاسم پہ نسدن رحمت اللہ — اچھے قاتل پو اس کے لعنت اللہ

ترقیمہ:۔ تمت تمام مجلس حضرت امام قاسم علیہ الصلواۃ والسلام از خط نادرست خاکپاے صغیر و کبیر یوسف علی بن محمد مہدی علی غفراللہ تعالےٰ ذنوبہا و ستر اللہ عیوبہا بموجب فرمائش صاحب مہربان کرم فرماے دوستان عبداللطفا در جمعدار سلمہ اللہ تعالےٰ بوقت یک پہر شب گزشتہ بتاریخ دوازدہم شہر جمادی الاول باتمام رسید۔

معراج نامہ

سائز ۷½ × ۵½ صفحات ۱۵۵ سطور ۱۱/۱۳ سنہ تصنیف ۱۱۸۱ھ سنہ کتابت ۱۲۷۲ھ

یہ معراج نامہ محمد بن مجتبیٰ مہدوی کی تصنیف ہے جسے دو سو سال گزر چکے ہیں۔ کتاب کا نام دراصل "بحرالمعانی" ہے جیسا کہ ان ابیات سے ہویدا ہے ؎

سو اس کی خاک پا سرمہ بنا کر — سو خادم نے ستی انکھیاں میں لاکر
ہویاں روشن انکھیاں دل پر اُجالا — کر یو "بحرالمعانی" بھر نکالا

اس نام کی تصدیق مناجات سے بھی ہوتی ہے جو آخر میں ہے ؎

جو گیارا سو ایکاسی پر سو پورا — ہوا بحرالمعانی کا ظہورا

اس مثنوی میں غالباً پہلی مرتبہ اردو کے لیے دکنی کے ساتھ ہندوستانی کا استعمال نظر سے گزرتا ہے ؎

لکھی ہندوستانی میں عبارت ۔۔۔ سو بیجھے بول دکنی میں اشارت

مصنف کو محمد عیسیٰ مہدوی سے ارادت تھی چنانچہ خود "دربیان مدح مرشد" کہتا ہے ؎

مرا مرشد مبارک دین عیسیٰ ۔۔۔ رین جوں چودویں کا چاندو یسا

دنیا میں چاند پھرو یسا ندیسا ۔۔۔ بھلے مرشد مبارک ذات

معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن مجتبیٰ کا عاجز تخلص ہے آغاز کتاب میں دو بیتیں ایسی آئی ہیں جن میں عاجز بطور تخلص پایا جاتا ہے ؎

نپٹ کر مختصر بولا اسارا ۔۔۔ سنو اب جو کہے عاجز بچارا

یہی عاجز ز سر تا پا خطا ہے ۔۔۔ اگر کچھ ہے تو مرشد کی عطا ہے

اسی سلسلے میں وہ اپنے ماں باپ کے موجود ہونے کا اشارہ بھی کرتا ہے اور ان کے لئے دعا کرتا ہے ؎

یزاں ما باپ کو اور مومنوں کو ۔۔۔ جو مہدی کے مصدق ہیں جنوں کو

محمد مہدوی کے حالات کسی تذکرے سے دستیاب نہ ہو سکے ۔ اس سلسلے میں مخطوطے سے بھی کوئی روشنی نہیں پڑتی وہ اپنا نام اس طرح لکھتا ہے ؎

محمد جو کہ ابن المجتبیٰ ہے ۔۔۔ جو سارے مہدیوں کا خاک پا ہے

نجوم الدین کوئی بزرگ تھے جن کے عہد میں یہ کتاب تصنیف ہوئی ہے ایک بیت میں ان کی توصیف بھی ہے ؎

نجوم الدین صاحب کا ظہورا ۔۔۔ ہوا ان کے عمل میں باب پورا

آغاز:- رب یسر بسم اللہ الرحمن الرحیم وتمم بالخیر کے بعد اس طرح آغاز کیا ہے ؎

احد کو جو حمد، لائق بیاں ہے ۔۔۔ سو سب الحمد للہ میں عیاں ہے

وہی رحمٰن رب العالمین ہے ۔۔۔ جو کچھ ما فی السماوات زمیں ہے

ازل سے جو ابد تک ہے پسارا ۔۔۔ اوسی نیں کردیا موجود سارا

حمد و نعت، درمنقبت خلفاء اربعہؓ کے بعد اپنے پیر مہدی موعود کی مدح کی ہے اور انہیں دسویں ھدی کا اجالا قرار دیا ہے ۔ یہ مدح کافی طویل ہے جس کے آخر میں احیاء العلوم کا حوالہ ہے اس کے بعد مخالفین مہدی اور ان کے طریقوں پہ لے دے کی ہے جس کے ساتھ سید محمد مہدی کا کرسی نامہ (شجرہ) بھی ہے ۔ پھر اپنے مرشد مبارک دین عیسیٰ کی تعریف و توصیف کے بعد سبب تصنیف میں (۱) ابیات لکھی ہیں اور ان کے اختتام پر معراج نامہ کا آغاز ہے اکثر روایات معارج النبوت سے نقل کی گئی ہیں ؎

لکھا ہے یو جو سب معراج ناماں ۔۔۔ معارج سوں نکالا ہے سو ساماں

معراج نامہ کے آخر میں منکرین معراج یہودی اور بادشاہ کی دو مشہور روائتیں ہیں ۔

اختتام:- ختم کتاب میں مصنف نے اپنی احمد اپنے ہم مشربوں کی فلاح دارین کی دعا کی ہے - آخری پانچ ابیات یہ ہیں ؎

جمادی الآخر یں تاریخ چہارم ... بروز چہارشنبہ پر مکارم
فجر کا وقت تھا زکی کا پہرا ... بھرموتیوں سوں یودریا گہرا
درود اں اور سلاماں بے نہایت ... ہدایت سوں الی مالیس غایت
نبی مہدی پو آل اصحاب یاراں ... دگر ان کے جو سارے دوست داراں
کہو معراج والتوفیق باللہ ... بچن پورا ہوا الحمد للہ

ترقیمہ:- وصلی اللہ علی خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین برحمتک یا ارحم الرحمین -
تمت تمام شد کہ معراج نامہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم بتاریخ بیست و ششم شہر ربیع الاول ۱۲۷۲ھ بروز شنبہ تمام شد بفضل الٰہ
نوشتہ است سید زین العابدین عرف ننھے میاں کرمھدوی کنیڈ یلوال درمقام کرنول ختم شد -

مولود سرورعالم

سائز ... صفحات ۳۴ سطور ۱۳ سنہ تصنیف تقریباً ۱۰۹۰ھ سنہ کتابت

کتب خانہ خاص کی فہرست میں اس کتاب کے مصنف کا نام درج نہیں لیکن قصہ مولود نامہ محمد مصطفیٰ کی تفصیلات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا مصنف مختار ہے (فہرست سالار جنگ ص۵۵) فہرست مذکور میں یہ بیت تخلص کی صراحت کے لئے دی گئی ہے جو بہ ادنیٰ تغیر مخطوطہ زیر تبصرہ میں بھی موجود ہے ؎

خدایا تو دے اپنے سب پیارسوں ... شفاعت محمدؐ کی مختار کوں

مولود سرور عالم خط شکستہ میں ہے - عنوانات سرخ روشنائی سے لکھے گئے ہیں - ابتدا میں ماہ ربیع الاول کی بزرگی اور لیلۃ القدر کے شرف کا ذکر ہے اس کے بعد خلفائے راشدین اور ائمہ طاہرین کی منقبت کی گئی ہے - پھر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی

تعریف ہے ۔ مصنف نے بتایا ہے کہ جب خدا نے حضرت حوا کو پیدا کیا تو حضرت آدم نے خواہش ظاہر کی کہ وہ ان کی بیوی بنا دی جائیں تو اچھا ہو خدا نے حضرت آدم کی یہ درخواست اس بنیاد پر قبول کر لی کہ وہ مہر ادا کردیں اور مہر یہ تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر دس مرتبہ درود بھیجیں ۔

یہ تمہید بیان کرنے کے بعد مختلف احادیث سے فضیلت درود بیان کی ہے پھر بالترتیب فضیلت امت محمدیہ نور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم ، فضیلت عرب ، اور معجزات سرور کائنات کا مجملاً ذکر کرکے ولادت با برکات کی تفصیل پیش کی ہے ۔ آخر میں مولود کو ایمان کی نشانی بتایا ہے اور ولادت مبارک کی خوش خبری پہنچانے کے صلے میں بو لہب کے اپنی لونڈی کے آزاد کرنے کا بیان کیا ہے ۔ اس مولود نامہ کی ابیات کی تعداد (۴۴۰) ہے ۔

مصنف کے حالات :- ہاشمی صاحب نے مختار کو عادل شاہی دور کا شاعر بتایا ہے ۔ یہ شاہ عبدالصمد متوفی سنہ ۱۰۳۱ھ کا مرید تھا جو حضرت سید محمد گیسو دراز کی اولاد میں تھے ۔ تاریخیں مختار کے حالات کے بارے میں خاموش ہیں ۔ یہ معلومات بھی مختار کی دوسری تصنیف معراج نامہ سے معلوم ہوتی ہیں جس کے نسخے اکثر کتب خانوں میں ہیں ۔

آغاز :-

اول سب سرانا ہے معبود کوں　　مشرف جن دیا سب یں مولود کوں
بزرگی ربیع الاول کو دیا　　شہ انبیا اس میں ظاہر کیا
جو قدرت اسی کا ہوا ہے عیاں　　سو پیدا کیا ہے زمیں آسماں

اختتام :-

گنہگار سب گرچہ گندے ہیں سب　　کرم کر کہ تیرے چہ بندے ہیں سب
تری بخشش ان کے یو بندے کتے　　بو رحمت کے دریا میں گندے کتے
ہے بازار تیرے کرم کا گرم　　الہٰی کرم کر کرم کر کرم
ہوا ختم مولود خیر الانام　　علیہ الصلوات وعلیہ السلام

کوئی ترقیمہ درج نہیں ہے ۔

اس کا ایک مخطوطہ کتب خانہ سرسالار جنگ میں ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے ۔

اشرف علی
لیاقت نیشنل لائبریری کراچی

برّصغیر کے معدوم کتب خانے

تاریخ بتاتی ہے کہ دورِ قدیم میں برصغیر تہذیب و تمدن اور علم و فن کا ایک عظیم گہوارہ تھا۔ دنیا کی قدیم تہذیبوں نے یہیں جنم لیا۔ سندھ میں موئن جو دڑو، پنجاب میں ہڑپا اور دکن میں اجنتا ایلورا کے عجیب و غریب آثار دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ہزاروں سال قبل علم ہئیت، طب اور سنگ تراشی میں یہ برصغیر دنیا کی قیادت کر رہا تھا۔ ٹیکسلا اور نالندہ جیسی مایہ ناز یونیورسٹیاں ہزاروں طلبہ کو نئے نئے علوم سے مالا مال کر رہی تھیں۔ انہیں عظیم درسگاہوں میں وہ معیاری کتب خانے تھے جہاں اپنے وقت کے جید عالم، راجے، مہاراجے اور شہزادے مختلف علوم و فنون سے متعلق کتابوں کی ورق گردانی میں مصروف نظر آتے تھے۔

مگر اس دور میں برہمنوں کی تقسیم ذات پات نے مذہب و علم کو اپنی اجارہ داری بنا کر نیچی ذات کے لوگوں پر اس کے راستے بند کر دیئے۔ اگر کوئی شودر مقدس ویدوں کے اشلوک سن لیتا تو اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال کر سزا دی جاتی تھی۔ برہمن کی اس نسلی بالادستی کی وجہ سے علم اور ذوق مطالعہ عام نہ ہو سکا کتابوں اور کتب خانوں پر مخصوص طبقہ کی ٹھیکیداری تھی۔ مسلمان جب برصغیر میں آئے تو انہوں نے اخوت و مساوات کی اسلامی تعلیمات کے ذریعہ یہاں کے لوگوں کو چھوت چھات اور ذات پات کے فرسودہ بندھنوں سے نجات دلائی اور حصول علم کے راستے ادنیٰ و اعلیٰ فرقے پر یکساں کھول دیئے۔

برصغیر پاک و ہند میں یہ شرف سندھ کو حاصل ہے کہ اسلامی کتب خانوں کیلئے ابتدائی خاکے اس جگہ تیار ہوتے۔ مسلمان اس سرزمین پر نہ صرف بحیثیت فاتح داخل ہوتے انہوں نے علم و فن کی سرپرستی اور اس کی نشر و اشاعت کی طرف بھی خاص توجہ دی۔ انکی ادب نوازی نے برصغیر میں ایک شاندار علمی ماحول پیدا کر دیا۔ چنانچہ ایک ہندو مورخ لکھتا ہے کتابوں کو نقل کر کے تقسیم کرنے اور ان کی عام اشاعت کے رواج کیلئے ہم اسلامی اثرات کے رہین منت ہیں ورنہ پرانے ہندو مصنفین تو اپنی قلمی پرانی کتابوں کو خفیہ رکھنے کے عادی تھے۔ [1]

سلاطین اور بادشاہوں کا علم و فن سے ایسا والہانہ شغف دیکھ کر امراء اور نوابین نے علم کی خدمت پر بے دریغ روپیہ خرچ کیا۔ یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں کے دور انحطاط تک ایسے کتب خانے موجود رہے جو ناگہانی حادثوں اور لیرے حملہ آوروں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوئے مگر زمانے کی دست برد سے جو کچھ کتابیں بچ گئیں وہ آج بھی مغربی کتب خانوں اور عجائب گھروں کی زینت ہیں۔

برصغیر کے ان معدوم کتب خانوں کا اب ٹھیک طور پر نشان نہیں ملتا۔ تاہم یہ بات تسلیم کی جا چکی ہے کہ سندھ میں ٹھٹھہ، اچھ، اور ملتان جیسے

---

[1] "انڈیا تھرو دی ایجز" از جادو ناتھ سرکار ص ۵۲

مقامات جو کبھی علم و ادب کے مرکز تھے کتب خانوں اور دارالمطالعوں سے خالی نہ تھے۔ کتب خانوں کے سلسلہ میں سندھ کے بعد حیثیت پنجاب میں لاہور کو حاصل تھی۔ غزنوی دور میں لاہور علم و ادب کا گھر بن چکا تھا اور اگر یہ کہا جائے کہ اس زمانے میں پنجاب کتب خانوں سے بھرا ہوا تھا تو مبالغہ نہ ہوگا۔

برصغیر کے ان معدوم کتب خانوں کا تفصیلی ذکر انشاء اللہ آئندہ کسی اور موقع پر کیا جائیگا۔ یہاں ناظرین کی دلچسپی کیلئے صرف چند ایسے کتب خانوں کا مختصر احوال بیان کیا جاتا ہے جن کا وجود اگرچہ اب نہیں رہا مگر تاریخ کے صفحات انکی علمی و ادبی خدمات کے ذکر سے ہمیشہ روشن رہیں گے

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا کتب خانہ

غلاموں کے دور حکومت میں صوفیائے کرام کی وجہ سے کتب خانوں کے قیام میں غیر معمولی دلچسپی لی جانے لگی تھی۔ ان بزرگوں کی خانقاہوں سے جو کتب خانے ملحق تھے ان میں خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کا کتب خانہ نہایت عمدہ تھا۔[1] اس کتب خانے میں "احیاء العلوم" "کشف المحجوب" "قوۃ القلوب" اور امیر حسین کی "فوائد الفواد" اور دوسری بہت سے کتابیں شب و روز طلبہ کے مطالعے میں رہتی حضرت نظام الدین کے عزیز ترین نامور شاگرد حضرت امیر خسرو جیسے صوفی عالم نے بھی اس کتب خانہ سے فیض حاصل کیا۔ سلطان جلال الدین خلجی نے جو خود بھی شاعر تھا اور علم و ادب سے شغف رکھتا تھا۔ امیر خسرو کو اپنے شاہی کتب خانے کا مہتمم مقرر کیا تھا۔

فیروز شاہ تغلق کا کتب خانہ

عہد تغلق کتب خانوں کے اعتبار سے خاصہ اہم ہے۔ محمد تغلق کا کتب خانہ نہایت قیمتی تھا۔ دہلی جو علم و فن کا مرکز بن چکا تھا اس وقت ایک ہزار کتب خانوں سے آراستہ تھا۔ ان میں بہت سے کتب خانے علمی درسگاہوں سے ملحق تھے ان میں ریاضی ہیئت طب اور دوسرے بہت سے علوم پر ہزاروں کتابیں موجود تھیں۔ بادشاہ خود عالموں کو دعوت دیتا اور ان کی قدردانی کرتا تھا۔ دور دراز سے آنے والا اگر کوئی کتاب سلطان کی نذر کرتا تو وہ اس کا دامن زر و جواہر سے بھر دیتا تھا۔

فیروز شاہ تغلق نے کتب خانوں کی ترقی و توسیع میں اور بھی دلچسپی لی۔ اس نے اپنے کتب خانہ میں ایک اعلیٰ معیار کا دارالترجمہ قائم کیا۔ جہاں رات دن مختلف مشرقی زبانوں سے فارسی اور عربی میں تراجم کا کام ہوتا تھا۔ نگرکوٹ کی فتح کے موقع پر سلطان کو سنسکرت زبان کی جو سیکڑوں کتابیں ملیں۔ اس نے ان میں سے اکثر کتابوں کا فارسی زبان میں ترجمہ کرایا اور اپنے کتب خانہ میں جگہ دی۔ کتاب "دلائل فیروز شاہی" انہیں کتابوں میں سے ایک کتاب کا ترجمہ ہے۔ فیروز شاہ کو کتابوں سے دیوانگی کی حد تک لگاؤ تھا: وہ خود صاحب علم اور اہل قلم تھا۔ فتوحات فیروز شاہی اسکی خود نوشت ہے۔ سلطان نے ملک میں تعلیمی ترقی کے لئے جب بہت سے مدرسے کھولے تو انکے ساتھ کتب خانوں کا قیام لازمی قرار دیا۔ مدرسہ فیروز شاہی کا کتب خانہ اپنی مثال آپ تھا۔ اس میں فارسی، عربی، ہندی، ترکی زبان کی عمدہ کتابوں کا ذخیرہ جمع کیا گیا تھا۔

ہمایوں کا کتب خانہ

ہمایوں اس باپ کا بیٹا تھا جو نہ صرف عظیم فاتح تھا بلکہ کتابوں کا بھی شائق تھا۔ بابر جب برصغیر میں داخل ہوا تو وہ اپنے اجداد کے کتب خانوں کے بیش بہا نوادر بھی ساتھ لایا۔ اس کو

---

[1] مسلم ثقافت از عبدالمجید سالک ص ۱۹۲

کتابوں سے بھرا ہوا تھا اور وہ انہیں اپنا حقیقی مونس اور ہمدم سمجھتا تھا سفر میں بھی کتابیں اسکے ساتھ رہتیں۔ مہمات کے دوران بابر کتابوں کا جو ذخیرہ پاتا اس کو اپنے بیٹے ہمایوں کے پاس محفوظ کرا دیتا۔ اس طرح وہ اپنے جانشین ہمایوں کو کتاب دوستی کی تربیت بھی دے گیا۔ بابر کی وفات کے بعد ہمایوں کو اپنے والد سے جو کتب کا قیمتی ذخیرہ ورثے میں ملا اس نے اس میں مزید نوادر کا اضافہ کیا۔

ہمایوں کا اگرچہ ۹۶۳ھ میں انتقال ہو گیا مگر اس علم پرور بادشاہ نے قلیل عرصہ میں ایک نہایت عمدہ کتب خانہ فراہم کیا تھا۔ وہ بھی بابر کی طرح رزم و بزم کی مصروفیتوں کے دوران کتابوں کو اپنے سے جدا نہ کرتا تھا۔ جہانگیر اپنے دادا ہمایوں کے متعلق تزک جہانگیری میں لکھتا ہے "ہمایوں اہل علم سے مل کر بہت خوش ہوتا اور انہیں اکرام و انعام سے مالامال کر دیتا تھا کتابوں کا عاشق تھا یہاں تک کہ جب پناہ گزین کی حیثیت سے بھاگا ہے۔ اس وقت بھی اپنے مہتمم کتب خانہ اور چند منتخب کتابوں کو ساتھ لئے پھرتا تھا۔ جس وقت اس نے کھمبات میں ڈیرا ڈالا ہے۔ اس کے پاس بہت سی کتابیں تھیں جن میں تاریخ تیمور لنگ کا ایک نایاب نسخہ بھی تھا۔ رات کو جنگلی ڈاکوؤں کے ایک گروہ نے ڈیرے پر حملہ کیا اور کتابیں بھی لے گئے لیکن وہ نسخہ کسی طرح واپس مل گیا۔ لال بیگ کا باپ نظام جس کو باز بہادر کا لقب حاصل تھا بادشاہ کا مہتمم کتب خانہ تھا۔"[1]

ہمایوں کو علم ہیئت اور جغرافیہ کے مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ اس نے عناصر کی نوعیت پر مقالے بھی لکھے تھے اور اپنے استعمال کیلئے زمینی اور آسمانی کرے (گلوب) بھی تیار کئے تھے۔[2]

واقعہ یہ ہے کہ ہمایوں کتب کا سچا پرستار تھا اور اسی عشق میں اس نے کتب خانے کی سیڑھیوں پر جان دیدی شاید اسلئے علم و کتب کے اس پروانے کے مقبرے کو ایک حسین کتب خانے سے مرصع کیا گیا تھا۔ اسٹیفن اپنی کتاب "آثار قدیمہ دہلی" میں لکھتا ہے کہ "نئی دہلی کے قریب ہمایوں کا جو مقبرہ ہے وہ بھی ایک زمانے میں مدرسے کا کام دیتا تھا۔ اور تعلیم کا ایک اہم مرکز سمجھا جاتا تھا۔ یہ مدرسہ مقبرے کی چھت پر تھا۔ اور علم و فضل اور اثر و نفوذ رکھنے والے لوگ اس مدرسہ کی خدمت پر مامور کئے جاتے تھے لیکن گزشتہ ڈیڑھ سو سال سے یہ مقام اپنی علمی شہرت کھو چکا ہے اور اس کے وہ کمرے جو تشنگان علم سے معمور رہتے تھے۔ اب خالی اور سنسان پڑے ہیں۔"[3]

اکبر کا کتب خانہ

بقول جہانگیر "اکبر اگرچہ عالم تو نہ تھا لیکن جب وہ علمائے گفتگو کرتا تو سننے والوں کو یہی احساس ہوتا تھا کہ بادشاہ تمام علوم کا ماہر ہے۔ محمد حسین آزاد اپنی کتاب "دربار اکبری" میں اکبر کے علمی مذاق کے متعلق فرماتے ہیں "علم کا مذاق بلکہ علوم و فنون کا شوق اور قدردانی کا جوش جو اس کو تھا کوئی اور عالم بادشاہ بھی ہو تو شاید اتنا ہی ہو۔ ذرا عبادت خانہ چار دیوان کے جلسے یاد کرو۔ راتوں کو ہمیشہ کتابیں پڑھواتا تھا اور سنتا تھا۔ علمی تحقیقیں تھیں۔ علمی باتیں تھیں اور علمی چرچے تھے۔ کتب خانہ کئی جگہ تقسیم تھا۔ کچھ حرم سرا میں کچھ باہر۔ اس میں دو قسمیں تھیں کچھ قدر و قیمت، کچھ علم و فنون۔ نثر نظم، ہندی، فارسی، کشمیری۔ عربی الگ الگ"[4]

---

[1] تزک جہانگیری ص ۲۱
[2] فرشتہ جلد دوم ص ۱۰ ـ ۱۰
[3] آثار قدیمہ دہلی از اسٹیفن ص ۲۰۷ بحوالہ مسلم ثقافت ص ۲۱۳
[4] دربار اکبری از محمد حسین آزاد ص ۱۳۸

اکبر کو کتابوں سے ایسی الفت تھی کہ وہ اچھی کتابیں گراں قیمت دیکر اپنے کتب خانے کیلئے حاصل کرتا۔ جو کتابیں حاصل نہ کرپاتا انکی نقلیں اور تراجم کراتا اس کام کے لئے الگ ایک سررشتہ خاص قائم تھا۔ جہاں بڑے بڑے صاحب علم حضرات تصنیف و تالیف اور ترجمے کے کاموں میں معروف رہتے مولانا محمد حسین آزاد نے اکبری زمانے کی ستائیس[۲] ایسی کتابوں کے نام درج کئے ہیں جو دنیا کی مشہور کتابوں میں بلند مقام رکھتی ہیں کشمیر کی کے قدیم ترین تاریخ جو سنسکرت میں تھی اس کا ترجمہ شاہ محمد شاہ آبادی (کشمیری) سے کرایا۔ عبدالرحیم خانخاناں نے "تزک بابری" کا ترکی زبان سے فارسی میں ترجمہ کیا رامائن و مہابھارت کا ترجمہ ملا عبدالقادر سے کرایا اسی طرح "جامع رشیدی" کا ۹۹۳ھ میں ترجمہ کرایا اور عبدالقادر سے اس کا خلاصہ لکھوایا اور عربی میں جغرافیہ کی کتاب معجم البلدان کا ترجمہ ۹۹۹ھ میں ملا احمد ٹھٹھوی سے کرایا۔[۱] ان کے علاوہ وہ اور بھی کئی کتابیں نو مسلم برہمنوں اور دوسرے مذاہب کے لوگوں کی مدد سے کتب خانے کیلئے تیار کرائی گئیں۔ فتح گجرات کے موقع پر اعتماد خاں گجراتی کا کتب خانہ اکبر کو ملا تو اس نے تمام ذخیرہ اپنے کتب خانہ میں داخل کرایا۔ فیضی کے انتقال پر اس کا ذاتی کتب خانہ کو جو چار ہزار چھ سو[۲] کتابوں پر مشتمل تھا) بھی اپنے کتبخانہ کی زینت بنایا۔

اکبری کتب خانہ کی باقاعدہ درجہ بندی (کلاسی فی کیشن) کی گئی تھی۔ کل کتابیں تین حصوں میں تقسیم تھیں۔ پہلے میں شاعری۔ طبابت نجوم اور موسیقی دوسرے حصے میں علم اللسان۔ فلسفہ، تصوف، ہیئت و ہندسہ اور تیسرے حصے میں۔ تفسیر۔ حدیث اور فقہ کتب خانہ قلعہ آگرہ میں مثمن برج کے قریب والے حصے میں تھا اس میں کتابوں کی تعداد چوبیس ہزار تھی۔ ان میں فیضی کا ذخیرہ شامل ہوا تو تعداد ۲۸ ہزار چھ سو تک پہنچ گئی۔ اس کے علاوہ اکبری کتب خانہ میں آئے دن نایاب و نادر کتابوں کا اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ اہل قلم جو کتابیں لکھتے ان کا ایک نسخہ شاہی کتب خانہ میں جمع کرتے درباری مصنفین و مورخین کی کتابوں کے نسخے کتب خانہ کی ملکیت قرار دیئے جاتے تھے۔ فتوحات کے موقعہ پر جو کتابیں حاصل ہوتیں وہ داخل کتبخانہ کی جاتیں۔ ہندوستان سے جو قافلے حج کے لئے جاتے ان کے سپرد بھی کتابوں کی فراہمی کا کام تھا۔ اکبر کے پاس تحفہ میں عرب سے بھی کتابیں آیا کرتی تھیں[۳] یہ بات قابل ذکر ہے کہ اکبری کتب خانہ نادر و بیش بہا مخطوطات پر مشتمل تھا۔ اکبری کتب خانہ کی ان امتیازی خصوصیات کو دیکھ کر یورپی مورخ اسمتھ تسلیم کیا کہ "یہ کتب خانہ اس قدر قیمتی تھا کہ اس سے قبل اتنے قیمتی کتب خانہ کا وجود نہیں ملتا"[۴]۔

برصغیر میں کتب خانوں کی نشوونما میں نہ صرف سلاطین اور بادشاہوں نے حصہ لیا بلکہ خواتین بھی اس میں پیش پیش رہیں رضیہ سلطانہ گلبدن بیگم نورجہاں، ممتاز محل، جہاں آرا اور زیب النسا جیسی خوش ذوق خواتین نے فن لطیفہ اور علم و ادب کے میدان میں جو نقوش چھوڑے ہیں وہ آج بھی انکی زندہ یادگار ہیں۔ بابر کی بیٹی اور ہمایوں کی بہن گلبدن بیگم نہایت شستہ و شائستہ مذاق، انشا پرداز تھی۔ ہمایوں نامہ اس کی لافانی تصنیف ہے۔ اس کے پاس ایک کتبخانہ بھی تھا جو اس نے خود فراہم کیا تھا۔ مورخین زیب النسا کے کتب خانے کی بڑی تعریف کرتے ہیں۔ ماثر عالمگیری نے تو زیب النسا کے کتب خانہ کو ہر حیثیت سے نادر الوجود

کتب خانہ زیب النساء

---

[۱] دربار اکبری از محمد حسین آزاد ص ۱۴۰ — ۱۴۱

[۲] محمد زبیر صاحب نے اپنی کتاب اسلامی کتب خانہ میں فیضی کے کتب خانہ کی ان کتابوں کی تعداد چار ہزار تین سو بتائی ہے جبکہ منتخب التواریخ میں محمد عبدالقادر بدایونی نے اس تعداد کو ۴ ہزار چھ سو بیان کیا ہے۔ دیکھئے منتخب التواریخ ایلیٹ جلد ۵ ص ۵۴۹

[۳] اسلامی کتب خانے از محمد زبیر ص ۲۱۶

[۴] مسلم ثقافت ص ۱۹۲

قرار دیا ہے ۔ اس کتب خانے میں کتابوں کی زیادہ تعداد مذہب اور اخلاقیات سے متعلق تھی۔ کتب خانے میں دوسرے موضوعات پر بھی بہترین نوا تھے ۔ زیب النساء علم وفضل والی خاتون تھی وہ اچھی شاعرہ تھی اور مخفی تخلص کرتی تھی۔ اس کو کتابیں جمع کرنے اور مطالعہ کا بے شوق تھا اور تصنیف و تالیف سے دلچسپی تھی۔ اصل بات یہ ہے کہ اس کا دربار خود ایک بیت العلوم (اکاڈمی) تھا جس میں ہمہ وقت علوم وفنون کے شائق تصنیف و تراجم کام میں معروف نظر آتے تھے ۔ زیب النساء کے کتب خانہ کی افادیت اور جامعیت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ علماء وفضلاء کتابوں کی تیاری میں جن تصانیف کی ضرورت محسوس کرتے وہ تمام اسی کتب خانہ سے دستیاب ہو جاتی تھیں ۔ آج یہ بات عجیب سی لگتی ہے کہ اس زمانے میں جبکہ کتب خا سلاطین وامراء کی ملکیت سمجھے جاتے تھے ۔ زیب النساء کے کتب خانہ میں قارئین کو مطالعہ کی عام سہولتیں حاصل ہوتی تھیں وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ عظیم کتب خانہ کسی طور پر ترتیب دیا گیا تھا کتابوں کی تخصیص فن وار تھی یا مصنفین کے اعتبار سے ۔ مگر یہ بات طے شدہ ہے کہ جس کتب خانہ کا مہتمم ملا شفیعا جیسا عالم ہو ۔ کتب خانہ یقیناً باقاعدہ درجہ بندی اور مکمل فہرست سے آراستہ ہوگا۔

رحیم خانخاناں کا کتب خانہ

اکبر اعظم کے عہد میں کتب خانوں کی کثرت تھی ۔ ہر گلی اور کوچہ دار المطالعوں اور کتب خانوں سے آراستہ تھا۔ اس کی بڑی وجہ اکبر کی علم پروری اور دانشوروں کی قدر دانی تھی اس کے امراء و وزراء بھی بادشاہ وقت کی شگفتہ طبیعت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے ۔ رحیم خانخاناں ہنرمند وزراء میں ممتاز حیثیت رکھتا تھا ۔ اس کے باپ بیرم خاں نے اکبر کی تربیت کی تھی خانخاناں نے اپنے باپ سے بہت کچھ ورثہ میں حاصل کیا تھا جس کی وجہ سے وہ اکبری دربار کا ایک روشن ستارہ بن کر جگمگایا ۔ مورخین نے جہاں اکبری دربار کے اس رتن کی فراست وبصیرت اور اس کی بہت سی زبانوں پر دسترس رکھنے کی اعلیٰ صلاحیتوں کی تعریف کی ہے وہاں انہوں نے مرکز علم کا بھی ذکر کیا ہے ۔ جہاں خانخاناں نے اپنی خدا داد قابلیت ۔ سخن سنجی ، علم نوازی اور بے مثل فیاضی کے جوہر کو جلا بخشی ۔ وہ اسکا بیش قیمت کتب خانہ تھا ۔ مولانا شبلیؒ اس کتب خانے کی فضیلت اور جامعیت کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں ۔

”یہ کتب خانہ اس درجہ کا تھا اور اس قدر علمی ذخیرے اس میں مہیا کئے گئے تھے کہ خود ایک اکاڈمی یا ادارۂ حکمت کا کام دیتا تھا ۔ عرفیؔ ۔ نظیریؔ ۔ ظہوریؔ ۔ شکیبیؔ غرض اکثر شعرائے اکبری نے اپنے دیوان خود اپنے ہاتھ سے لکھ کر اسی کتب خانہ میں داخل کئے تھے ۔ دربار اکبری کے اکثر باکمال اسی کتب خانے کے ترقی یافتہ ہیں ۔ اکثر شعراء ۔ خوشنویس ۔ صناع جن کو خانخاناں تربیت دینا چاہتا تھا ۔ کتب خانے کے کام پر مقرر ہوئے تھے ۔ اور ترقی کرتے کرتے نادر روزگار ماہر جاتے تھے ۔“[۱]

کتابوں کی فراہمی کے مختلف ذرائع تھے ۔ مثلاً کتب خانہ میں خود بڑے بڑے علماء ، شعراء تصنیف و تالیف کا کام کرتے اور اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے نسخے کتب خانہ میں عطیہ کے طور پر جمع کرنا باعث فخر سمجھتے ۔ باسلیقہ لوگ نایاب کتب کی تلاش وجستجو میں سرگرداں رہتے اور جو نسخہ ملتا اس کو کتب خانے کے لئے حاصل کر لیتے ۔ کتب خانہ کی نگرانی کا کام وقت کے بلند پایہ عالم کے سپرد ہوتا ۔ چنانچہ شیخ عبدالسلام اور شیماء جیسے باکمال حضرات عرصہ دراز تک اس کتب خانے کے نگراں رہے ان حضرات نے اپنی قابلیت و ذکاوت سے کتب خانے کو عجیب وغریب جواہرات سے مزین کیا تھا ۔ مآثر رحیمی کا مصنف مدت تک کتب خانے کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رہا ۔ سترھویں صدی عیسوی میں جب اہل یورپ کتب خانوں سے

---

[۱] مسلم ثقافت ص ۱۹۲ [۲] مقالات شبلیؒ جلد چہارم ص ۲۷

زیادہ مانوس نہ تھے۔ اس وقت برصغیر میں متعدد کتب خانے موجود تھے۔

کتب خانۂ سلطان ٹیپو

میسور ریاست کا حکمران سلطان ٹیپو ایک بہادر سپاہی اور سچا وطن پرست تھا وہ ایک بڑا علم دوست اور کتابوں کا شیدائی تھا۔ وہ ایسے پر آشوب دور میں علم وادب کی خدمت کر رہا تھا جب کہ اسے فرنگی سے سخت مقابلہ تھا۔ اس نے ۱۷ سال حکومت کی (۱۷۸۲ء - ۱۷۹۹ء) مگر سچ یہ ہے کہ اس کی شجاعت اور علم نوازی نے اس کو جو شہرت وناموری بخشی وہ بہت کم حکمرانوں کو نصیب ہوئی۔ اس مختصر عرصہ میں جتنا شاندار کتب خانہ اس نے بنایا اس کی نظیر نہیں ملتی۔

ٹیپو سلطان کی علمی دلچسپی سے یوں تو سلطنت خداداد میسور کے گرد نواح میں بھی بہت سے کتب خانے قائم ہو چکے سرنگاپٹم میں "جامع مسجد الامور" کا کتب خانہ مذہبی کتابوں کے علاوہ دیگر علوم کی کتابوں سے بھی بھرا ہوا تھا دوسرا مشہور کتب خانہ ایک فوجی دیگر سے منسلک تھا جو فن حرب پر گراں قدر کتابیں رکھتا تھا۔ اس طرح سلطنت میں اور بھی بہت سے کتب خانوں کا وجود تھا۔ مگر سلطان ٹیپو کا کتب خانہ ان تمام کتب خانوں میں امتیازی حیثیت رکھتا تھا۔ اور بہت سے علوم وفنون کے لئے مخطوطات کا خزینہ تھا۔ اس منفرد علمی مرکز میں سلطان ٹیپو اور سلطنت کی پریشانیوں اور جنگی پیچیدگیوں سے نجات حاصل کرتا تھا

انڈیا آفس لائبریری کی فہرست مرتبہ ۱۹۰۹ء سے پتہ چلتا ہے کہ جس وقت کمپنی نے اس کتب خانہ پر قبضہ کیا تو کتابوں کی تعداد دو ہزار تھی۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلطان کے کتب خانہ میں کتابوں کی تعداد مندرجہ بالا تعداد سے کہیں زیادہ تھی۔ اس کتب خانہ میں شاہان بیجاپور و گول کنڈہ کے کتب خانوں کے کچھ ذخائر بھی محفوظ تھے۔ اس کے علاوہ کتب خانہ میں آئے دن اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ سلطان اپنی سرپرستی میں بہت سے مصنفین سے کتابوں کی تصنیف وتالیف اور تراجم کراتا تھا "مفرح القلوب" "تحفۃ المجاہدین" "فوجی قواعد وضوابط" اور ایسی ہی بہت سی کتابیں سلطان کے حکم سے تیار ہوئی تھیں۔ سلطان دور دراز کے ملکوں سے بھی کتابیں حاصل کرتا تھا۔ حتیٰ کہ بعض کتابیں سمندر پار کے ملکوں سے منگوا کر ان کے تراجم کتب خانہ کئے گئے تھے۔

کتابوں کی حفاظت اور دیکھ بھال کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ کتابوں کی جلد بندی کے لئے ماہر جلد ساز۔ کاتب اور نقاش رکھے گئے تھے۔ ان کو حکم تھا کہ کتابوں کی جلدوں اور ان کے نقش ونگار میں خاص حسن کارکردگی کا مظاہرہ کیا جائے۔ ایک حکم میں سلطان نے تحریر کیا "حکم دیا جاتا ہے کہ کتاب مفرح القلوب کی دس نقلیں روانہ کی جائیں۔ ان میں پانچ نقلیں مفصل ہوں ان کی جلد بندی کرتے ہوئے ان کے اوپر نقرئی قفل لگائے جائیں اور باقی پانچ نقلوں میں اس کتاب کا صرف اقتباس ہو ان پر قفل لگانے کی ضرورت نہیں ہے سلطان جس کتاب کا مطالعہ کرتا اُس پر مہر سلطانی بھی ثبت کر دی جاتی تھی۔ تاریخ سلطنت خداداد کا مصنف لکھتا ہے کہ سلطان کی شہادت کے بعد جب شاہی محلات کی تلاشی لی گئی تو بعض کتابیں ایسی نکلیں جن کی جلدیں ہیرے اور جواہرات سے مرصّع تھیں۔

سلطان ٹیپو نے کتب خانہ کی ترتیب وتنظیم کے لئے ایک مہتمم مقرر کیا تھا جو اپنے سامنے کتابوں کی درجہ بندی اور فہرست

کتب پر خاص توجہ دیتا تھا۔ اس کے فرائض میں قارئین کو مطلوبہ کتابوں کی فراہمی اور مطلوبہ مواد کے حصول میں مدد دینا بھی شامل تھا ذخیرہ کتب کی باقاعدہ فن وار درجہ بندی کی گئی تھی۔ مثلاً قرآن۔ تفسیر، فقہ، کتب احادیث، الہیات، تصوف، نجوم، ریاضی، طب، نظم، فلسفہ اور فرہنگ ولغات وغیرہ وغیرہ۔ کل علوم بیس درجوں میں منقسم تھے اس طرح کتابوں کی درجہ بندی نے ایک موضوع کی تمام کتابوں کو یکجا کر کے رکھا گیا تھا[1]

ٹیپو سلطان جنگ آزادی کا مضبوط ستون جب یورپی جارحیت اور استعمار پسند قوت کے ہاتھوں مسمار ہوا تو اس علمی خزینہ کا حشر بھی انگریزوں کی لوٹ مار اور غارت گری کا نشانہ بنا۔ ہزاروں نادر قلمی نسخے صفحۂ ہستی سے نابود ہو گئے۔ بچی کھچی کتابیں ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ کافی عرصہ بعد کرنل کرک پیاٹرک کو کتابوں کی فہرست مرتب کرنے کا کام سپرد ہوا۔ بعد میں میجر اسٹورٹ نے عربی، فارسی، ترکی، ہندی اور اردو مخطوطات کا فہرست مرتب کی۔ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کی بنیاد رکھی گئی تو یہ کتب کالج میں منتقل کر دی گئیں اس ذخیرے سے تقریباً نصف کتابیں آکسفورڈ اور کیمبرج کی یونیورسٹیوں کو دیدی گئیں۔ اور باقی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کو ملیں۔ جگہ اسٹورٹ نے ان کتابوں کی فہرست تیار کی جو ۱۸۰۹ء میں کیمبرج سے شائع ہوئی۔[2]

اب برصغیر میں نہ یہ کتب خانے ہیں اور نہ ان کے سرپرست۔ البتہ چند کھنڈر ہیں۔ اور چند کتابیں جو دنیا کے مختلف کتب خانوں میں پائی جاتی ہیں۔

---

[1] بصائر ٹیپو سلطان نمبر ص ۲۲۷ — [2] بصائر ٹیپو سلطان نمبر ص ۲۱۸

(بقیہ از صفحہ)

اور اس کے ابھار کو جنم دن کہتے آئے ہیں۔ اس سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ اردو کسی خاص زمانے میں خاص وقت پر اس طرح پیدا ہوئی جیسے بطن مادر سے بچہ پیدا ہوتا ہے۔ زبان یک بیک وجود میں نہیں آتی اس میں ارتقا ہوتا ہے۔ زبان کا آغاز اس کا ارتقا ہے۔ اس کا جنم اس کے خط وخال یعنی امتیازی خصوصیات کا ابھار یا نکھار ہے۔ اس ابھار یا نکھار کی کوئی خاص تاریخ مقرر نہیں کی جا سکتی۔ لیکن زبان کی زندگی میں ایک دور ایسا آتا ہے جب اس کے خط وخال نمایاں ہو کر اور اس کی امتیازی خصوصیات ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ ہم اس دور کو زبان کا یوم میلاد قرار دے سکتے ہیں اور یہ کہہ سکتے ہیں کہ زبان کا آغاز اس دور کے لگ بھگ ہوا۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ زبان کا آغاز نہیں ارتقا ہے۔ اردو زبان کی ابتدا کا سوال اس کے ارتقا سے وابستہ ہے جس پر میں آئندہ فرصت میں بحث کروں گا۔

نئے خزانے

یہ اشاریہ مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت ترتیب دیا گیا ہے

اس اشاریہ کی ترتیب میں اگست ۱۹۶۵ء کے مندرجہ ذیل رسائل سے مدد لی گئی ہے۔
بعض رسائل پچھلے مہینوں کے بھی شامل ہیں جو بعد میں دستیاب ہوئے

رسالہ	مقام	شمارہ	رسالہ	مقام	شمارہ	رسالہ	مقام	شمارہ
ماہنامہ اردو ڈائجسٹ	لاہور	اگست ۱۹۶۵ء	ماہنامہ جوار بھاٹا	دہلی	اگست ستمبر ۱۹۶۵ء	ماہنامہ کتابی دنیا	کراچی	اگست ۱۹۶۵ء
〃 ادب لطیف	〃	〃	〃 چراغ راہ	کراچی	اگست ۱۹۶۵ء	〃 ماہ نو	〃	〃
〃 افکار	کراچی	〃	〃 خاتون دکن	حیدرآباد	〃	〃 معارف	اعظم گڑھ	〃
〃 اورینٹل کالج میگزین	لاہور	〃	〃 رہنمائے تعلیم	دہلی	〃	〃 نیرنگ خیال	لاہور	〃
ماہنامہ الرحیم	حیدرآباد	〃	〃 زندگی	رام پور	〃	〃 ہمدرد صحت	کراچی	〃
〃 البلاغ	بمبئی	〃	〃 ساقی	کراچی	نذر الاسلام نمبر	〃 ہندوستانی ادب	حیدرآباد	جولائی اگست ۱۹۶۵ء
〃 برہان	دہلی	〃	〃 سب رس	حیدرآباد	اگست ۱۹۶۵ء	ہفت روزہ المنبر	لائل پور	۲۰ اگست ۱۹۶۵ء
〃 بینات	کراچی	〃	〃 سیارہ	لاہور	〃	〃 آئینہ	بمبئی	۸ جولائی کا نمبر
〃 پونم	حیدرآباد	〃	〃 صبح امید	بمبئی	〃	〃 چٹان	لاہور	اگست ۱۹۶۵ء
〃 پیام عمل	لاہور	〃	〃 طلوع اسلام	لاہور	〃	〃 دور حیات	بمبئی	جون جولائی ۱۹۶۵ء
〃 تحریک	دہلی	〃	〃 عارف	〃	〃	〃 صدق جدید	لکھنؤ	اگست ۱۹۶۵ء
〃 ترجمان القرآن	لاہور	〃	〃 عصمت	کراچی	جولائی و اگست ۱۹۶۵ء	〃 لاہور	لاہور	〃
〃 تجلی	دیوبند	〃	〃 فاران	〃	اگست ۱۹۶۵ء	〃 ملاپ	حیدرآباد	〃
〃 تہذیب الاخلاق	لاہور	〃	〃 فکر و نظر	〃	〃	〃 ہماری زبان	علی گڑھ	〃
〃 ثقافت	〃	〃	〃 قومی زبان	〃	〃			
〃 جامعہ	دہلی	〃	〃 کامران	سرگودھا	جلد ۱ شمارہ ۴			

اردو ادب

تحقیق و تنقید

نشا	کتابیں، فلمیں اور جوتے [1]	افکار/ ص ۸۹ تا ۹۱/ اگست
بریلوی، سید عبداللطیف	روہیل کھنڈ میں اردو شاعری کا فروغ	معارف/ ص ۱۳۵ تا ۱۵۱/
، ڈاکٹر لطیف حسین	محبت خاں محبت اور ان کا کلام	ہندوستانی ادب/ ص ۹ تا ۱۳/ جولائی اگست
یل پانی پتی، شیخ محمد	سرسید کی ادبی حیثیت	تہذیب الاخلاق/ ص ۳۳ تا ۴۸/ اگست
تسین	چکبست کا جذبۂ وطن پرستی	دور حیات/ ص ۴۴ تا ۴۷/ جون
خاں	رشید حسن خاں کی تحقیقی غلطیاں (۱)	ہماری زبان/ ص ۳ تا ۴+۶/ ۱۵ اگست
"	" " " (۲)	" " ۳ تا ۴+۶-۷+۹/ ۲۲ اگست
بر	ایک ادبی اور تہذیبی مسئلہ	ماہ نو/ ص ۱۲ تا ۴۲+۵۱/ اگست
جگن ناتھ	یادوں کے چراغ	ہماری زبان/ ص ۶ تا ۷/ یکم اگست
ر، محمد	تبادلہ خیال - مرزا ادیب سے	ادب لطیف/ ص ۹ تا ۱۶/ اگست
سروری	اردو ادب کے غیر ادبی مآخذ	قومی زبان/ ص ۲۳ تا ۳۸/ "
ن قادری مرحوم	اردو شاعری کی روایات اور ہم	" " ۱۲ تا ۲۶/ "
الاکرام، سید	شفیق [2] کی غزل گوئی	معارف/ ص ۱۱۹ تا ۱۳۴/ "
، سید خواجہ	فانی کا فلسفۂ غم	پونم/ ص ۱۱ تا ۱۴/ اگست
احمد جعفری	اظہر اور ان کی شاعری	چٹان/ ص ۱۲ تا ۱۳/ ۱۶ اگست
حسین	حسرت کی رومانیت	دور حیات/ ص ۲۰ تا ۳۲/ جون
بی، قطب الدین احمد	فارقلیط میری نظر میں	صبح امید/ ص ۹ تا ۱۰/ اگست
نظیم آبادی	کہانی کی کہانی	ادب لطیف/ ص ۳۷ تا ۴۰/ "
علی سندیلوی	ظفر کی شاعری میں وطنیت	دور حیات/ ص ۴ تا ۸/ جون
پروفیسر امین چند	مومن اپنی شاعری کے آئینے میں	سب رس/ ص ۲۹ تا ۳۲/ اگست

---

[1] ...حسین کے مضمون "کتابوں کے نام پر فلموں کے نام" کے جواب میں [2] شفیق جونپوری کے بارے میں

ذاکر حسین	کتابوں کے نام پر فلموں کے نام[1]	افکار/ص ۷۸ تا ۸۸ / اگست
شفقت حسین	رومانیت اور یلدرم	کامران / ص ۶ تا ۱۵/
شکیل الرحمٰن	اردو ناول	دور حیات/ص ۱۰ تا ۱۵ + ۲۶
شمیم احمد	پوناز کی قسمیں	پونم/ص ۱۱ تا ۱۴/ اگست
طارق، غلام رسول	جنس گراں (غلام کا مجموعہ کلام)	نیرنگ خیال/ص ۵۶ تا ۵۷ + ۶۰/ اگست
ظہور، سید یوسف علی	ادب کیا ہے اور کیا نہیں ہے	ملاپ/ص ۱ + ۷/ ۲۵ اگست
عبادت بریلوی	دیوان آبرو	افکار/ص ۲۰ تا ۲۶/ اگست
عبداللہ، ڈاکٹر سید	بہار کی امید	اردو ڈائجسٹ/ص ۲۵ تا ۲۸/ اگست
عطا ندوی، محمد شبیہ	تبصرہ بر ترجمہ نزہۃ الخواطر	برہان/ص ۱۲۲ تا ۱۲۶/ اگست
فارغ بخاری	خوشحال خاں خٹک کی غزل	ماہ نو/ص ۴۷ تا ۵۲/ اگست
فراق گورکھپوری	زندگی کے واقعات	آئینہ بمبی/ص ۱۸ تا ۱۹/ جولائی
فیوض الرحمٰن، پروفیسر	خیال امروہوی کا ایک مطالعہ	نیرنگ خیال/ص اگست
ماہر القادری	پاکستانی ادب کیا ہے؟	عارف/ص ۲۹ تا ۳۷/ "
محمد رئیس	الغائی کتابیں	چراغ راہ/ص ۴۲ تا ۴۴/ اگست ستمبر
محمد عمر/ ڈاکٹر	میر کا سیاسی اور سماجی ماحول	ہندوستانی ادب/ص ۷ تا ۱۲/ جولائی اگست
" "	" " "	برہان/ص ۱۰۰ تا ۱۰۸/ اگست
مسیح الزماں، ڈاکٹر	خطۂ دکن اور کلام وجہی	سب رس/ص ۳۲ تا ۳۸/ "
نیاز فتح پوری/ علامہ	فن تمثیل کی ابتدا	جوار بھاٹا/ص ۵۰۶ تا ۵۰۷/ "
———	حسرت ـ ایک تاثر	ہماری زبان/ص یکم اگست
———	اردو ادب میں یورپین اور اینگلو انڈین اقوام کا حصہ	کامران/ص ۱۶ تا ۳۲/

مشاعرے

علی افسر	حیدرآباد کی شعری محفلیں	ملاپ/ص ۸ + ۷/ ۲۵ اگست

۱؎ اس مضمون کے سلسلے میں ابن انشا کا مضمون "کتابیں، فلمیں اور جوتے" ملاحظہ فرمایئے۔

محمد عاقل — نعتیہ مشاعرہ — نیرنگ خیال، ص ۵۱ تا ۵۲، اگست

دیگر زبانوں کا ادب

احمد علی، مولوی — قصر عارفاں (فارسی) — اورینٹل کالج میگزین، ص ۱۴۲ تا ۱۴۸، اگست

اسار، محمد سمیع — عربی تحریر کی ابتدا و ترقی — معارف، ص ۸۵ تا ۱۰۵، اگست

پرویز شاہدی — بنگالی ادب میں نئے رجحانات — ملاپ، ص ۸ + ۲۲، ۱۱ اگست

اردو زبان اور اس کے مسائل

اگروال، ڈاکٹر ڈی ایس — رسم خط کی کہانی (۲) — مورچہ، ص ۸ تا ۹، ۸۰۹ اگست

سوزدکی تاکیشی، پروفیسر — اردو کی ترقی میں رکاوٹیں — قومی زبان، ص ۳ تا ۱۰، اگست

شبیر علی کاظمی — اردو اور بنگلہ — ماہ نو، ص ۲۶ تا ۲۹، "

عارف، فضل الٰہی — عجائب الفاظ و معنی — اردو ڈائجسٹ، ص ۱۲۴ تا ۱۲۶، اگست

ممتاز حسین — اردو کی پہلی کتاب — خاتون دکن، ص ۶ تا ۸، اگست

ممتاز لیاقت — قومی زبان کی ضرورت و اہمیت — چٹان، ص ۱۵ تا ۱۶، ۳۰ اگست

وزیر آغا — اردو کا مستقبل — ہماری زبان، ص ۳ تا ۴، ۸ اگست

یامین خاں، نواب سر محمد — میکڈانل کی مسلم دشمنی اور ہندی کا اجرا — عصمت، ص ۶۸ تا ۷۰، جولائی اگست

——— — اردو کے مسائل — نیرنگ خیال، ص ۵ تا ۷، اگست

آپ بیتی

حسینی، علی عباس — میری کہانی خود میری زبانی — ہندوستانی ادب، ص ۵۴ تا ۵۱، جولائی اگست

تاریخ

احمد انس — تحریک پاکستان — چراغ راہ، ص ۱۸ تا ۲۵، اگست ستمبر

اختر، مسعود — عہد معاویہ کا ایک دلچسپ واقعہ — چٹان، ص ۱۰ + ۲۱، ۳۰ اگست

اسکندر احمد (انظر) — ترقی پسند ترک — نیرنگ خیال، ص ۵۳ تا ۵۵، اگست

امام اکبرآبادی	عورت ہر ملک کی رہنما	عصمت، ص ۱۷ / جولائی اگست
آباد شاہ پوری	۱۱۰ قیدیوں کا فرار	اردو ڈائجسٹ، ص ۱۴۴ تا ۱۵۲ / اگست
بیگم اخلاق احمد خاں	اگست ۱۸۵۷ء میں	عصمت، ص ۷۴ تا ۸۴ / جولائی اگست
پنڈت، بشیرالدین	اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے[1]	برہان، ص ۶۹ تا ۸۴ / اگست
راجپوت، اللہ بخش	مغل بیگموں کا ذوق تعمیر	ہندوستانی ادب، ص ۳۰ تا ۳۱ / جولائی اگست
رحمت علی، سید	چارمینار	آئینہ، ص ۲ تا ۴ / جولائی
شمیم احمد، سید	عہد تغلق میں خانقاہی نظام	ثقافت، ص ۴۹ تا ۵۴ / اگست
" "	دینور اور مشائخ دینور	معارف، ص ۱۰۶ تا ۱۱۸ / "
عارف دہلوی	شمشیر سے طاؤس تک	سیارہ، ص ۵۳ تا ۵۹ / "
عبدالرشید، حکیم	دور عباسیہ کے چند طبیب اور شفا خانے	چٹان، ص ۱۶ / ۳۰ اگست
عمر فاروق خاں	پاکستان — تاریخی محرکات	فکرونظر، ص ۱۲۱ تا ۱۲۸ / "
محمد ظہیر، پروفیسر	مغلیہ حرم	عصمت، ص ۴۱ تا ۴۴ / جولائی اگست
نسیم احمد، مولانا	حضرت سید ابوسعید حسنی رائے پوری کے روابط حضرت شاہ ولی اللہ کے خاندان سے	الرحیم، ص ۲۰۷ تا ۲۶۵ / اگست
نیاز فتح پوری، علامہ	گھڑی سازی کی تاریخ	جواربھاٹا، ص ۲۰۸ تا ۲۱۱ / "
ہری رام گپتا	پنجاب میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی	ہندوستانی ادب، ص ۳۲ تا ۴۲ / جولائی اگست
یداللہی، موسیٰ کلیم	گولکنڈہ کا سورما — عبدالرزاق لاری	ملاپ، ص ۱ + ۲ / ۵ اگست
	ایک علمی استفسار — تاریخ کلام الملوک کے چند اوراق	برہان، ص ۹۷ تا ۹۹ / اگست
	میسور اور سلطنت روما کا تعلق	آئینہ، ص ۱۰ / جولائی

تعلیم اور تعلیمی ادارے

احمد انس	مخلوط تعلیم (۳)	چراغ راہ، ص ۵۳ تا ۸۴ / اگست ستمبر

---

[1] سلطان ٹیپو شہید کے متعلق

اطہر مبارک پوری، قاضی	دینی تعلیم کے عمومی مرکز، جوامع ومساجد (۲)	البلاغ، ص ۲۳ تا ۲۹، اگست
افتخار حسین، آغا	مشرقی اور افریقی علوم کا مدرسہ	افکار، ص ۲۷ تا ۳۰، "
راشد نعمانی	جمہوری ہندوستان میں تعلیم کے مقاصد	جامعہ، ص ۸۹ تا ۹۳، "
رئیس احمد جعفری	ہمارے ہوسٹل اور ان کا نظام	ثقافت، ص ۳ تا ۶، "

نیاز، نیاز محمد	اخلاقی تعلیم	رہنمائے تعلیم، ص ۳ تا ۱۷، "

تمدن ومعاشرت

تبسم، البشیر	اصلاح اخلاق	ماہ نو، ص ۵۳ تا ۵۵، اگست
جعفری، سید لبشیر حسین	قتل — خوف خدا کا فقدان	المنبر، ص ۲ تا ۱۵، ۲۰ر "
سعید احمد صدیقی	سلام	آئینہ، ص ۴ تا ۵، جولائی
فاطمہ، عالم علی	مرد ہم پر کیوں ہنستے ہیں	اردو ڈائجسٹ، ص ۱۳۹ تا ۱۴۰، اگست
ممتاز لیاقت	فلم اور معاشرہ	چٹان، ص ۱۲ تا ۱۳، ۳۰ر اگست

سائنس

زیدی، علی ناصر	انگلیوں کے نشانات کا جادو	ہمدرد صحت، ص ۹۶ تا ۱۰۲، اگست
ع۔ ر	سورج کیسے پیدا ہوا؟	" " " ۱۰۶ تا ۱۱۳، "

سیر وسیاحت

اطہر مبارک پوری، قاضی	مبارک پور سے جونپور تک	البلاغ، ص ۳۳ تا ۴۰، اگست
خالد کمالی، مولانا	حبیب کے در سے رقیب کے گھر تک	" " ۱۸ تا ۲۲، "
ظفر ندوی، محمد	حبشہ	اردو ڈائجسٹ، ص ۱۲۹ تا ۱۳۰، اگست
یوسف حسن	مشرقی پاکستان	نیرنگ خیال، ص ۷ تا ۱۷، "
	مشرقی پاکستان کا دوسرا سفر	عظمت، ص ۱۲۳ تا ۱۲۶، جولائی اگست

سیاست

شخصیات

آزاد، مولانا ابوالکلام

اقبال، علامہ

مصنف	عنوان	رسالہ / صفحہ / تاریخ
۔۔۔للہ، پروفیسر محمد	اقبال، ٹیگور اور نذر الاسلام	عارف، ص ۹۳ تا ۹۴، اگست

بخاری، مولانا عطاء اللہ شاہ

مصنف	عنوان	رسالہ / صفحہ / تاریخ
۔۔۔الدین، ماسٹر	امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری	چٹان، ص ۲۳، اگست
۔۔۔، حمید اصغر	شاہ جی اور ان کا مشن	″ ″ ۹ تا ۱۰، ۲۳ ″

تاجور نجیب آبادی

مصنف	عنوان	رسالہ / صفحہ / تاریخ
چودھری محمد اکبر خاں	علامہ تاجور اور اصلاحِ سخن	تحریک، ص ۲۷ تا ۲۸، اگست
۔۔۔، جگن ناتھ	کچھ یادیں کچھ تاثرات (علامہ تاجور نجیب آبادی)	جامعہ، ص ۷۷ تا ۸۵، ″
۔۔۔ل متل	گوشہ تاجور (نجیب آبادی)	تحریک، ص ۲۵ تا ۲۷، ″
	مولانا (تاجور) کی نثری تحریروں کے اقتباسات	″ ″ ۲۹ تا ۴۴، ″

عبد الحق، بابائے اردو

مصنف	عنوان	رسالہ / صفحہ / تاریخ
۔۔۔لمان شاہجہانپوری	بابائے اردو کے مذہبی تصورات	چٹان، ص ۱۲ تا ۱۴، ۲۳ اگست
۔۔۔سین سروری	مولوی عبد الحق (اردو کا چھٹا عنصر)	ماہِ نو، ص ۷ تا ۱۲، اگست

غالب

مصنف	عنوان	رسالہ / صفحہ / تاریخ
۔۔۔لح عابد حسین	میں نے یہ جانا کہ گویا۔۔۔۔	جامعہ، ص ۶۲ تا ۷۵، اگست
۔۔۔رحزیں، صلاح الدین	غالب کا ایک شعر	سیارہ، ص ۴۷ تا ۶۷، ″

نذر الاسلام

مصنف	عنوان	رسالہ / صفحہ / تاریخ
۔۔۔بداللہ، پروفیسر محمد	قومی بیداری میں نذر الاسلام کا حصہ	ساقی، ص ۶۱ تا ۷۰، نذر الاسلام نمبر
″ ″	باغی شاعر — نذر الاسلام	″ ″ ۴۵ تا ۶۰، ″ ″
″ ″	نذر الاسلام کی شاعری کا ایک مختصر جائزہ	″ ″ ۳۴ تا ۴۳، ″ ″
″ ″	نذر الاسلام کے حالاتِ زندگی	″ ″ ۵ تا ۳۳، ″ ″

دیگر شخصیات

رازق الخیری	(ماہنامہ عصمت کے) ستاونویں سال کے مضمون نگار	عصمت، ص ۱۰ تا ۱۱، جولائی اگست
ضیا	سید جمال الدین افغانی	الرحیم، ص ۱۷۹ تا ۱۹۱، اگست
ضیاء الدین اصلاحی، مولوی	امام ابو یوسف	تہذیب الاخلاق، ص ۲۱ تا ۳۲، "
ظہوری، حکیم عبدالوہاب	ابوریحان البیرونی	ہمدرد صحت، ص ۵ تا ۱۲، "
عارف ادیب، لطیف احمد	حضرت عبداللہ بن زبیرؓ	لاہور، ص ۱۲، ۲۲ر اگست
عبداللہ، پروفیسر	اسلام اور ٹیگور	سیارہ، ص ۳۴ تا ۵۲، "
قاسم محمود، سید	ٹالسٹائی	ادب لطیف، ص ۴۱ تا ۴۶، "
مجاہد الحسینی	مولانا عبدالمعبود سے ایک ملاقات	چٹان، ص ۱۵ تا ۱۶ + ۲۰، ۱۶ر اگست
مجیب، پروفیسر محمد	اختر حسن فاروقی	جامعہ، ص ۵۹ تا ۶۱، اگست
مفتوں، دیوان سنگھ	بھگت سنگھ کے ساتھی ۔ بی کے دت	چٹان، ص ۱۱ تا ۲۲، ۹ر "
نوید بٹ	علامہ عنایت اللہ خاں المشرقی	" " ۸ + ۱۸، ۳۰ر "
نیر اقبال	ڈاکٹر ہنری ہیے رس	ہماری زبان، ص ۸ تا ۹، ۲۲ر "
ــــــــ	نعیم صدیقی	چراغ راہ، ص ۹۴ تا ۱۰۲، اگست ستمبر
ــــــــ	الجزائر کا بوڑھا مجاہد ــ بشیر الابراہیمی	" " ۱۲ تا ۱۷، " "
ــــــــ	امام احمد بن حنبل مسند تدریس پر	العبیر، ص ۱۰ تا ۱۱، ۲۰ر اگست
مترجم سید محمد طاہر	انگریز شعرائے اردو	لاہور، ص ۱۲ تا ۱۴، ۲ر "

صحافت

نصیر الدین ہاشمی مرحوم	نیرنگ نظر اور پیام کربلا پر ایک نظر	قومی زبان، ص ۳۹ تا ۵۰، اگست
	اخبارات کا ضابطۂ اخلاق	چٹان، ص ۱۱ تا ۱۳، ۹ر "
	اردو صحافت سو سال پہلے	ثقافت، ص ۳۲ تا ۴۲، "

فلسفہ و فنون لطیفہ

ذکیہ احمد	تان سین اور اس کی فنی عظمت	ملاپ، ص ۱، ۱۱ر اگست
عمیق حنفی	وجودیت کا پس منظر	آئینہ، ص ۵ تا ۳۸ جولائی

قانون

پرونیہ　　جرم اور سزا　　طلوع اسلام، ص ۱۰ تا ۱۴، اگست

کتابیات

ابوسلمان شاہجہانپوری　　نئے خزانے (مارچ ۱۹۶۵ء کے رسائل و اخبارات کا اشاریہ)　　فکر و نظر، ص ۱۵ تا ۱۷، اگست

اشک، پریم پال　　سرشار کی چند تصانیف　　ثقافت، ص ۶۵ تا ۶۸، "

اطہر مبارکپوری، قاضی　　کتاب الحجہ علی اہل المدینۃ　　صدق جدید، ص ۶ / ۲۰ ر "

برنی، ضیاء الدین احمد　　رسالوں پر طائرانہ نظر (منتخب مضامین کا معارف)　　کتابی دنیا، ص ۳ تا ۹ + ۱۱، "

محمد طاہر فاروقی　　کتاب اور ہم　　قومی زبان، ص ۷ تا ۲۳، "

مناظر عاشق ہرگانوی　　چند نایاب کتابیں　　ہماری زبان، ص ۷ / ۱۵ ر "

―――　　مضمون نگاران عصمت اور ان کے مضامین (جولائی ۱۹۶۴ء تا جون ۱۹۶۵ء)　　عصمت، ص ۱۴۹ تا ۱۵۲، جولائی اگست

مذہبیات

قرآن و تفسیر

جلال الدین عمری، مولانا　　امر بالمعروف و نہی عن المنکر　　زندگی، ص ۳۳ تا ۵۱، اگست

سالم قدوائی، محمد　　ایک نادر تفسیر　　جامعہ، ص ۸۴ تا ۸۸، "

عبد الباری　　حضرت یوسفؑ نے اپنا رب کس کو کہا تھا؟　　زندگی، ص ۱۶ تا ۲۴، "

عبد الماجد دریا بادی، مولانا　　سورۃ القدر (۲)　　صدق جدید، ص ۵ / ۶ ر "

" " "　　سورہ بینۃ　　" " " ۴ تا ۵ / ۱۳ ر "

" " "　　سورہ بینہ (۲)　　" " " ۴ تا ۵ / ۲۷ ر "

علی نقی النقوی، علامہ سید　　تفسیر القرآن　　پیام عمل، ص ۹، اگست

محمد یوسف اصلاحی، مولانا　　اللہ　　زندگی، ص ۵ تا ۱۴، "

مصنف	عنوان	رسالہ
اطہر مبارکپوری محمد	تاج التراجم فی تفسیر القرآن الاعاجم (لابی بکر بن محمد بن عبید اللہ الخراسانی)	صدق جدید/ ص ۷/ ۱۳/ اگست
مودودی/ مولانا ابوالاعلیٰ	الجاثیہ	ترجمان القرآن/ ص ۷ تا ۴۰/ "
نور الحق/ مولانا ابو المنیر	اصول تفسیر	لاہور/ ص ۱۰ تا ۱۲/ ۱۴/ اگست

سنت و احادیث نبوی صلعم

مصنف	عنوان	رسالہ
ادریس/ مولانا محمد	سنت جاریہ اور ائمہ مجتہدین (۲)	بینات/ ص ۷ تا ۸/ ۴/ اگست
السباعی/ ڈاکٹر مصطفیٰ الحسنی	مستشرقین کا تصور سنت (۲)	" " ۵۵ تا ۶۰/ "
مودودی/ مولانا ابوالاعلیٰ	بعض احادیث کی تشریح	ترجمان القرآن/ ص ۲۰ تا ۳۰/ اگست
	قادیانیت اور حدیث نبوی	صدق جدید/ ص ۷/ ۲۷/ اگست

سیرت نبوی صلعم

مصنف	عنوان	رسالہ
حسن علی جامعی/ ملک	قرآن اور صاحب قرآن — بائبل کا اعتراف	چٹان/ ص ۱۲/ ۲/ اگست
" "	" " " — " " "	" " ۵ تا ۱۶+۱۸/ ۲۳/ اگست
" "	خاتم النبیین صلعم — انجیل کی نظر میں	" " ۹ تا ۱۰/ ۳۰/ "
محمد تقی عثمانی	بائبل کی تضاد بیانیاں	فاران/ ص ۸ تا ۲۵/ اگست
مترجم مولوی محمد احمد	اخلاق النبی صلی اللہ علیہ وسلم	بینات/ ص ۹ تا ۱۴/ "
حسن علی جامعی	قرآن اور صاحب قرآن — بائبل کا اعتراف	چٹان/ ص ۱۸/ ۹/ "

اخلاق و تصوف

مصنف	عنوان	رسالہ
طفیل احمد قریشی	شاہ ولی اللہ کا تصور اخلاقیات	الرحیم/ ص ۲۳۲ تا ۲۴۶/ اگست
فضل الرحمٰن/ ڈاکٹر	ہماری اخلاقی پستی کے اسباب اور ان کا علاج	فکر و نظر/ ص ۹۹ تا ۱۳۱/ "
مودودی/ مولانا ابوالاعلیٰ	کچھ سلاسل تصوف کے بارے میں	ترجمان القرآن/ ص ۶۲ تا ۶۴/ اگست

مسائل و مباحث

مصنف	عنوان	رسالہ
ابو طالب محمد مصطفےٰ	موجودہ مادی تلاطم اور اسلام	سیارہ/ ص ۸۳ تا ۸۹/ اگست

مکاتیب

۱

وفیات

عبداللطیف اعظمی — اختر حسن فاروقی صاحب کا انتقال — جامعہ/ص ۱۰۷ تا ۱۱۲/ اگست

مطبوعات جدیدہ (نئی کتابوں پر تبصرے)

نام کتاب یا رسالہ	مصنف	تبصرہ نگار	حوالہ
اجماع اور باب اجتہاد	کمال فاروقی	م - ج	معارف/ص ۱۵۷ تا ۱۵۸/ اگست
اخلاق محسنی مترجم (فارسی اردو)	مولانا سجاد حسین	—	صدق جدید/ص ۶/ ۲۷ر ،
ادبی دنیا لاہور	ایڈیٹر محمد عبداللہ قریشی	ا - ط - ف	لاہور/ص ۱۵/ ۲ر اگست
اردو شاعر کا مزاج	وزیر آغا	سجاد نقوی	کامران/ص ۸۲ تا ۸۷/
اصح السیر فی ہدی خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم	حکیم ابو برکات عبدالرؤف	—	ترجمان القرآن/ص ۸۶ تا ۹۷/ اگست
افکار - فیض نمبر	—	ا - ص	سبارس/ص ۵۴ تا ۶۴/ ،
، ،	—	—	فاران/ص ۶۳ تا ۶۴/ ،
، ،	—	عبداللطیف اعظمی	جامعہ/ص ۹۴ تا ۹۸/ ،
التحریر فی اصول التفسیر	مولانا محمد مالک	—	ترجمان القرآن/ص ۶۹ تا ۷۰/ ،
الرسالۃ المستطرفہ (عربی)	—	عامر عثمانی	تجلی/ص ۶۲ تا ۶۳/ اگست
المعجم الاعظم (عربی اردو لغات)	—	ضیاء الدین احمد برنی	کتابی دنیا/ص ۳۱/ ،
انجمن آرزو	اختر اورینوی	عبداللطیف اعظمی	جامعہ/ص ۹۸ تا ۱۰۳/ ،
۱۹۶۴ء کے منتخب افسانے	مرتبہ ا - احراز نقوی	—	ادب لطیف/ص ۷/ ،
انوار الباری شرح اردو صحیح البخاری	مولانا سید احمد رضا خان صاحب		

نام کتاب یا رسالہ	مصنف	تبصرہ نگار	حوالہ
اوتار اور عقیدہ رسالت	حافظ ابو محمد امام الدین رام نگری	عامر عثمانی	تجلی، ص ۷۰ تا ۷۱، اگست
اے ببلیوگرافی آف اقبال	خواجہ عبد الوحید	ابو سلمان شاہجہانپوری	فکر و نظر، ص ۷۵ تا ۷۷، "
آئینہ فکر	علامہ محسن اعظم گڑھی	—	پیام عمل، ص ۲۷، اگست
آدمی کتاب	م۔ نسیم	عامر عثمانی	تجلی، ص ۶۵ تا ۶۶، "
آیات بینات	محسن الملک سید محمد مہدی علیخاں	"	" " ۶۵، "
برگ نوخیز	عزیز تمنائی	م۔ ج	معارف، ص ۱۶۰، "
بڑھاپا اور اس کا سدباب	حکیم اقبال حسین	حمس	ہمدرد صحت، ص ۱۵۸ تا ۱۵۹، اگست
بلوچی دنیا کا عنور نمبر	ایڈیٹر۔ چاکر خاں	ص۔ ح۔ ن	لاہور، ص ۱۵، ۲ر اگست
بہار آرزو (مجموعہ کلام)	نسیم چغتائی	—	ادب لطیف، ص
پاکستانی کلچر	جمیل جالبی	ع۔ ح	ترجمان القرآن، ص ۶۵ تا ۶۸، اگست
" "	" "	م۔ ج	معارف، ص ۱۵۵ تا ۱۵۶، "
تاریخ فقہ	شیخ محمد خضری	—	ترجمان القرآن، ص ۷۰، اگست
تذکرہ اولیائے لاہور	محمد وارث کامل	ح۔ ا۔ ن	چٹان، ص ۱۷، ۱۹ر اگست
ترجمان القرآن	مولانا ابو الکلام آزاد	عبد الماجد دریا بادی	صدق جدید، ص ۶، ۱۳ر"
تنقیدی نقوش	ڈاکٹر عبد القیوم	م۔ ج	معارف، ص ۱۵۸ تا ۱۵۹، اگست
" "	" "	پیر حسن	سب رس، ص ۴۳، اگست
جریدہ (۴)	(کراچی یونیورسٹی)	ص۔ ا۔ ب	کتابی دنیا، ص ۱۴ تا ۱۵، "
جگراتے	شریف کنجاہی	ط۔ ج۔ ا	سیارہ، ص ۹۱، اگست
جگر کی غزلیہ شاعری	اشفاق علی خاں	—	ادب لطیف، ص ۱۰۸، "
جواہر علوم قرآن	طنطاوی جوہری	—	ترجمان القرآن، ص ۷۱، اگست
حدیث دوست (رباعیات)	حکیم ہلال اکبری	عامر عثمانی	تجلی، ص ۷۶ تا ۷۸، اگست
حیات اقبال کا ایک جذباتی دور	محمد عثمان	حمس	ہمدرد صحت، ص ۱۵۵ تا ۱۵۸، اگست

نام کتاب یا رسالہ	مصنف	تبصرہ نگار	حوالہ
خاتون پاکستان ۔ قرآن مجید نمبر ۲	شفیق بریلوی	حمس	ہمدرد صحت/ص ۹۵ تا ۱۰۱/ اگست
خلافت بنی امیہ	سید رشید الوحیدی	م ۔ ج	معارف/ص ۱۵۶ تا ۱۵۷/ ،،
خوشحالی کی تلاش	برائن کروزیر		
	مترجم :۔ جلیس عابدی	عامر عثمانی	تجلی/ص ۶۶ تا ۶۷/ اگست
خیالات	یونس ندوی نگرامی	م ۔ ج	معارف/ص ۱۶۰/ ،،
دامن شب (شعری مجموعہ)	اقتدار احمد اکبر حیدرآبادی	ـ	خاتون دکن/ص ۴۳/ ،،
دیوان فائز	مرتب :۔ ڈاکٹر خواجہ فضل امام	ـ	ادیب لطیف/ص ۱۰۸/ ،،
،، ،،	شاہ نذیر الحق فائز پھلواروی	م ۔ س	فکر و نظر/ص ۱۷۷ تا ۱۸۸/ ،،
ذکر حبیب	مولانا عبد الشکور فاروقی	ـ	صدق جدید/ص ۶/ ۲۶ ،،
رشید ابن رشید امیر المومنین			
سیدنا یزید رضی اللہ عنہ	ابو یزید محمد دین بٹ	عامر عثمانی	تجلی/ص ۸۶ تا ۹۹/ اگست
رنگ بہار	غلام کبریا راحل	ح ۔ ا ۔ ن	چٹان/ص ۱۵/ ۱۹ ،،
زمیں پیاسی ہے	یش مرد ج	رفعت صدیقی	پونم/ص ۶۳/ اگست
سنہرا دیس	دفا راشدی	ن ۔ ا ۔ ب	کتابی دنیا/ص ۱۴/ ،،
سیل اشک	اشک امرتسری	شہریار	ہماری زبان/ص ۱۲/ یکم اگست
شام اور سائے	وزیر آغا	غ ۔ ج ۔ ا	سیارہ/ص ۹۰/ اگست
شر دعا نجلی	کاوش بدری	شاد تمکنت	پونم/ص ۴۳/ ،،
شہریت کی ابتدائی تعلیم	مولانا ابراہیم عمادی ندوی	م ۔ ج	معارف/ص ۱۵۰/ اگست
عورت اسلامی معاشرے میں	سید جلال الدین	ـ	ترجمان القرآن/ص ۶۹/ ،،
غزل معلی	سید آل رضا	و ۔ ح	تہذیب الاخلاق/ص ۵۸/ اگست
فارقلیط	عبد العزیز خالد	ـ	تحریک/ص ۳۲ تا ۳۳/ ،،
مانی اور ان کی شاعری	محمد احسن فاروقی	ت ۔ ا ۔ ن	چٹان/ص ۱۵/ ۹ اگست
فتاوی عبد الحی اردو (کامل مبوب)	ابو الحسنات محمد عبد الحی لکھنوی	ـ	فاران/ص ۳۳ تا ۳۵/ ،،

نام کتاب یا رسالہ	مصنف	تبصرہ نگار	حوالہ
ذکر مومن (حصہ دوم)	محشر رسول نگری	عامر عثمانی	تجلی، ص ۳۶ تا ۴۶، اگست
گرش نظر (شعری مجموعہ)	رتن پنڈوروی	ــ	خاتون دکن، ص ۸۴، "
"	" "	شہریار	ہماری زبان، ص ۱۲، یکم "
قومی جھنڈے کی کہانی	محمد ابراہیم فکری	عبد اللطیف اعظمی	جامعہ، ص ۱۰۳، اگست
گوہر ریزے	گوہر جعفری	ــ	پیام عمل، ص ۶۷ تا ۶۸، اگست
گنج الاسرار	نوشہ گنج بخش قادری	م - ا - ب	لاہور، ص ۱۵، ۲ر "
مائکرو فونی نمازنہ	محمد جلال الدین خسامی	عامر عثمانی	تجلی، ص ۱۷ تا ۴۷، "
متاع ادب	اظہر زیدی	ا ـ ص	سب رس، ص ۷۴ تا ۸۴، "
مثنوی زہر عشق اور اسکے نقاد	محمد حسن	م ـ س	فکر و نظر، ص ۱۷۹ تا ۱۸۰، "
مخدوم جہانیاں جہاں گشت	محمد ایوب قادری	ــ	ترجمان القرآن، ص ۷۱، "
مرقع کلام اقبال	مرتب: عصمت عارف علوی	م ـ ج	معارف، ص ۱۵۹، "
نقد اقبال	میکش اکبرآبادی	میر حسن	سب رس، ص ۴۳ تا ۴۴، "
نقش جاوداں (مجموعہ کلام)	پرنس نقی علی خاں ثاقب	ــ	خاتون دکن، ص ۷۴، "
نگارشات جگر	محمد اسلام	ــ	صدق جدید، ص ۶، ۲۷ر "
نوائے دل (شعری مجموعہ)	محمد منشاء الرحمن خاں منشا	ــ	خاتون دکن، ص ۸۴، اگست
ہر شاخ گل صلیب	حسن بخت	غ ـ ج الف	سیارہ، ص ۹۱، اگست
یاد جگر	شاد سلطانپوری	ــ	ادب لطیف، ص ۱۰۸، "

اس اشاریئے میں اگر آپ کو کسی مضمون یا جریدے کا حوالہ نہ ملے تو ازراہ کرم ادارۂ قومی زبان کو مطلع فرمایئے تاکہ آئندہ اشاریئے میں اسے شامل کیا جاسکے۔

سہ ماہی "اردو"

ایک جریدہ — ایک تحریک

اس علمی و ادبی جریدے نے تقریباً نصف صدی تک اردو زبان و ادب کی خدمت کی ہے اور اب یہ اپنی سابقہ روایات کے مطابق از سر نو باقاعدگی سے شائع ہونے لگا ہے
دورِ نو کا پہلا شمارہ (جنوری ۱۹۶۶ء) شائع ہو چکا ہے

اس شمارے کے مضامین

۱۔ ترادفی مرکبات	ڈاکٹر شوکت سبزواری
۲۔ اقبال کی بعض نظموں کے مآخذ	ڈاکٹر اکبر حسین قریشی
۳۔ حالی کے سماجی نظریات	ڈاکٹر فاطمہ شجاعت
۴۔ رباعیات نصرتی (غیر مطبوعہ)	مرتبہ افسر صدیقی
۵۔ خود نوشت سوانح عمری (؍؍)	صفیر بلگرامی
۶۔ حواشی بر خود نوشت	سید وصی احمد بلگرامی
۷۔ فورٹ ولیم کالج	سید سبط حسن
۸۔ مثنوی بہارستان عشق (از سرور)	سخاوت میرزا
۹۔ مثنوی ابر گہر بار	مرزا اسد اللہ خان غالب

ابتدائیہ : تحسین سروری
ترتیب و مقدمہ : مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی

یہ شمارہ ۱۶۰ صفحات پر، ٹائپ میں، نہایت عمدہ کاغذ پر چھاپا گیا ہے
قیمت فی پرچہ :۔ تین روپے پچاس پیسے ۔ سالانہ قیمت :۔ بارہ روپے

شائع کردہ

انجمن ترقی اردو۔ اردو روڈ۔ کراچی

مشہورِ عالم کیپسٹن

جسے صاحبِ ذوق حضرات ساری دُنیا میں پسند کرتے ہیں۔ جس کا ہر کش
لطیف اور تسکین بخش ہے۔ اپنی اعلیٰ کوالٹی کی بدولت پچاس سے زائد ملکوں میں مقبول۔
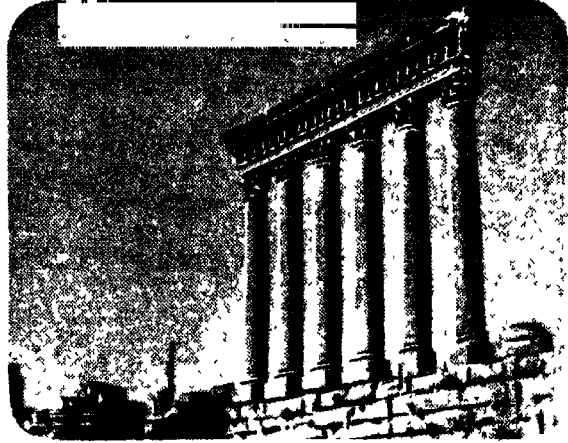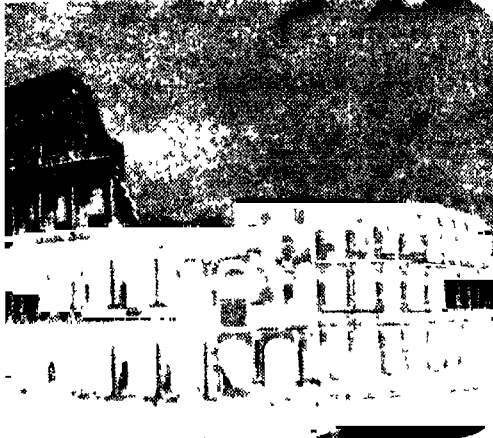
کیپسٹن تاریخی بیروت میں، ابدی روم میں اور یقی
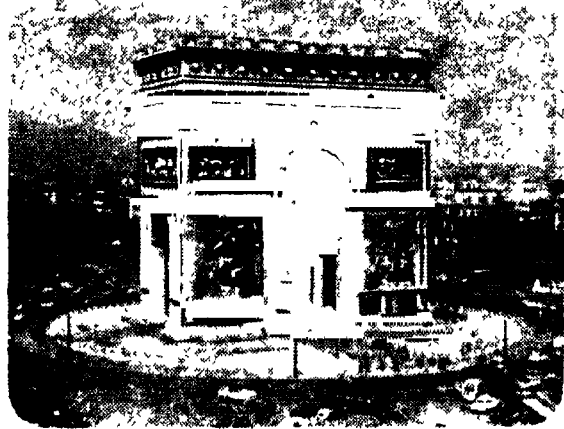
پیرس جیسے رنگین شہر میں بآسانی دستیاب ہے۔ آپ دُنیا کے ہر حصے میں کیپس
سے لُطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

TAN TOBACCO COMPANY LIMITED. SUCCESSORS TO W D &H.O WILLS, BRISTOL & LONDON

PTC-230 R

پی آئی اے کی انجینئرنگ کا اعلیٰ معیار

دنیا کی ہر ائرلائن اپنے ہوائی جہازوں کی اچھی طرح دیکھ بھال کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ موجودہ دور میں ہوائی سفر اس درجہ بے خطر ہے۔ پی آئی اے کے ورکشاپوں میں سائنسدانوں اور انجینیروں کو ہوائی ساز و سامان جانچنے پرکھنے کی بہترین مشق دی جاتی ہے۔ اس کی بدولت پی آئی اے نے پچھلے پانچ سال میں اپنی پروازوں کی تاخیر کی شرح کو ۳۰۱ فیصد سے مزید گھٹا کر ۲۰۱ فیصد تک پہنچا دیا ہے۔ غرضیکہ نہ صرف پی آئی اے نے دیکھ بھال اور پابندیٔ اوقات کے بلند معیار قائم کئے ہیں بلکہ دنیا بھر کے مسافر بے ساختہ کہہ اٹھتے ہیں کہ پی آئی اے باکمال لوگ ہیں اور ان کی پرواز لاجواب ہے۔

چین - پاکستان - افغانستان - مشرق وسطیٰ - روس - یورپ - برطانیہ

جلد ۲۸ شمارہ ۳

مارچ ۱۹۶۶ء

سالانہ قیمت
دس روپے

فی پرچہ
ایک روپیہ

انجمن ترقی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ
کراچی

فہرست مضامین

ملک خدا بخش بچا
وزیر تعلیم حکومت پاکستان

واجب الاحترام وائس چانسلر صاحب، فاضل اساتذہ اور فارغ التحصیل نوجوانو!

السلام علیکم

جامعہ زراعت کے اس اولین جلسۂ تقسیم اسناد میں شرکت کر کے میں ایک طرح کی روحانی مسرت محسوس کر رہا ہوں حسن اتفاق دیکھئے کہ وزارت تعلیم کی ذمے داری قبول کرنے کے بعد خود میرا بھی یہ پہلا موقع ہے کہ کسی جامعہ کے جلسۂ تقسیم اسناد سے خطاب کروں، پھر میرے لئے اس تقریب کا ایک خوشگوار پہلو یہ بھی ہے کہ یہ جامعہ، علوم و فنون زرعی کی تعلیم و تربیت اور ترقی کے لئے وقف ہے اور زراعت سے جیسا کہ آپ کو معلوم ہے مجھے بھی عمر بھر خصوصی تعلق رہا ہے۔ ایک آبائی پیشہ کی حیثیت سے زراعت مجھے ورثے میں ملی تھی لیکن دوران ملازمت مختلف سرکاری حیثیتوں میں بھی کسی نہ کسی طرح میں اس سے منسلک ہی رہا اور اب اس جامعہ کی وساطت سے ایک گونہ خصوصی تعلق آج بھی قائم ہے۔

تقسیم اسناد کا ہر جامعی جلسہ (Convocation) میرے نزدیک ایک قومی تہوار کی حیثیت رکھتا ہے بلکہ ہماری عیدوں سے کئی طرح کی مماثلت و مشابہت بھی رکھتا ہے جس طرح عید الفطر ایک خاص اخلاقی تربیتی کورس اور عید الضحیٰ ایک بہت بڑے امتحان میں کامیابی کی علامت کے طور پر منائی جاتی ہے اسی طرح تقسیم اسناد کا جشن بھی جامعہ کی تربیتی کورسوں کی تکمیل اور امتحانات میں کامیابی حاصل کرنے کی خوشی میں منایا جاتا ہے اور پھر اس جشن جامعہ میں اول تا آخر ایک خاص سنجیدگی، ایک خاص وقار اور ایک خاص قسم کی دوراندیشانہ مسرت کی جو فضا طاری رہتی ہے اور اختتام پر جب ہر کامیاب امیدوار اپنی تعلیمی زندگی کا دفتر عمل ایک سند کی صورت میں اپنے ہاتھ میں دیکھ کر [illegible] ایک عجب دلکشی، ایک خاص معنویت اور ایک مسرت بخش پیام امید پاتا ہے [illegible] کی

---

[1] مغربی پاکستان زرعی یونیورسٹی کے پہلے جلسۂ تقسیم اسناد میں ۲۰ [illegible] کو یہ خطبہ پڑھا گیا۔

...ے سے ہر سال ملک بھر میں تربیت یافتہ افراد کی شکل میں تخلیقی اور پیداواری قوتوں اور توانائیوں کے فوارے چھوڑے جا رہے ہیں تاکہ ملک کو ترقی کی راہوں پر گامزن رکھا جا سکے۔ اور پھر جب میری چشم تصور مجھے ان دل آویز مناظر میں ملکی مستقبل کی تصویر دیکھنے کے لئے اکساتی ہے تو مجھے شہرہ آفاق ماہر تعلیمات مسٹر وائٹ ہیڈ کا یہ قول بے اختیار یاد آ جاتا ہے کہ یونیورسٹی کا کام اپنے بطن سے مستقبل کو جنم دینا ہے۔

لنکن نے ایک بار کاشتکاروں کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا "مجھے رہ رہ کر یہ خیال آتا ہے کہ تعلیم ــــ یعنی مزروعہ فکر (Cultivated Thought) کا بہترین امتزاج زرعی محنت یا کسی اور محنت سے کیا جا سکتا ہے گھاس کا ہر تنکا مطالعے کی ایک کتاب ہے۔ جہاں گھاس کا ایک تنکا پیدا ہوتا ہو وہاں دو تنکے پیدا کر لینا نفع بخش بھی ہے اور مسرت زا بھی" امریکہ میں مزروعہ زمینوں کے لئے "مزروعہ فکر" کا فلسفہ اتنا مقبول ہوا کہ لنکن کا یہ قول کہ "جہاں گھاس کا ایک تنکا پیدا ہوتا ہو وہاں دو تنکے پیدا کر لینا نفع بخش بھی ہے اور مسرت زا بھی" امریکہ کے زرعی لٹریچر میں ضرب المثل کے طور پر ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گیا ہے۔ لنکن نے اپنے ملک کی مزروعہ زمینوں کے لئے مزروعہ فکر کی ضرورت کا احساس کرتے ہوئے ۱۸۶۲ء میں لینڈ گرانٹ ایکٹ پر دستخط ثبت کر کے ملک میں زرعی تعلیم کا جو نظام رائج کیا تھا اس کے پھل سے امریکی کسان آج بھی اپنی جھولیاں بھر رہے ہیں۔ چنانچہ ایک بار والیس (Wallace) نے اپنے جریدہ "کسان" میں تعلّی کا یہ جملہ، جو غلط بھی نہیں تھا، تحریر کیا تھا کہ "امریکہ کی صرف ایک فصل سے بلجیم کی بادشاہت ــــ بادشاہ اور رعایا سمیت، دو فصلوں سے اٹلی کا ملک، تین فصلوں سے آسٹریا اور ہنگری کے دونوں ممالک اور پانچ فصلوں کی نقد قیمت پر زار روس کی پوری سلطنت خریدی جا سکتی ہے"

کسی ملک کی زرعی ترقی کے لئے "مزروعہ فکر" یعنی تعلیم کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، بلکہ سچ پوچھئے تو ہر ہر قسم کے طبعی وسائل کو پیداوار بنانے کے لئے انسان کی پیداواری صلاحیتیں ہی کلیدی اہمیت رکھتی ہیں۔ زمین کو زرخیز بنانے کے لئے اس میں کھاد ڈالنا اور اس کی آبپاشی کرنا ضروری سہی لیکن ایسا کرنے سے پہلے خود کسان کے ذہن کی آبیاری اور اس کے دماغ کے لئے کھاد کی ضرورت اس سے کہیں زیادہ لابدی ہے، یہ ایک عالمگیر صداقت ہے کہ دنیا میں کہیں بھی کھیت کی پیداواری سطح وہاں کے کسان کی اپنی ذہنی سطح سے کبھی بلند نہیں ہو پائی۔ زمین کی پیداواری صلاحیتوں کی سطح کو بلند کرنے کے لئے زرعی سائنسدانوں کی ایک معقول تعداد مہیا کرنا اور ان زرعی سائنسدانوں کے وسعت پذیر ذہنی افقوں کے ساتھ ساتھ خود کسانوں کی ذہنی سطح کو بلند اور بلند سے بلند تر کرتے رہنا بنیادی اہمیت رکھتا ہے، بلکہ زرعی ترقی کا یہ ایک ایسا یقینی، قطعی اور حکمی اصول ہے جسے کسی طرح بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک میں "مزروعہ فکر" کو ترقی دینے اور اسے عام کرنے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا جاتا۔ زرعی ترقی کے اعتبار سے امریکہ دنیا کے تمام ممالک میں سرفہرست ہے اور وہاں کی دلچسپ صورت حال یہ ہے کہ کاشتکاروں کی تعداد کم ہوتے ہوتے وہاں کی کل آبادی کے دس فیصد سے بھی کم رہ گئی ہے، لیکن زرعی سائنسدانوں، زرعی

توں اور سندھی معلموں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ۱۹۶۲ء میں ایک لطیفہ یہ ہوا کہ وہاں ایوان
ئیندگان میں ایک ممبر نے ازراہِ تفنن ایوان کے اجلاس میں ایک ترمیمی قرارداد پیش کر دی جس کا مقصد ایوان کو اس
یا یقین دلانا تھا کہ وہاں محکمہ زراعت کے ملازمین کی کل تعداد ملک کے کسانوں کی مجموعی تعداد سے کبھی بڑھنے نہ
گی۔ قرارداد پر رائے شماری ہوئی تو اس قرارداد کے حق میں ۲۳۰ ووٹوں کے مقابلے میں صرف ۱۸۱ ووٹ ڈالے گئے،
کا صاف مطلب یہ تھا کہ ممبروں کی اکثریت مزروعہ زمینوں پر کام کرنے والوں کے مقابلے میں مزروعہ فکر، کے لئے کام
نے والوں کو زیادہ اہم اور قابلِ ترجیح خیال کرتی ہے۔ مزروعہ زمینوں، اور مزروعہ فکر، کے نازک رشتے کی معنویت کو
دلڈ (Leopold) نے ایک نہایت بلیغ جملے میں یوں ادا کیا ہے کہ زمین کی اس سے زیادہ تضحیک کیا ہوگی کہ اسے ایک جنس
ریا جائے حالانکہ زمین کو محبت و احترام کے ساتھ صرف اسی صورت میں استعمال کیا جا سکتا ہے کہ ہم اسے ایک برادری خیال
یا، جس میں انسان ایک فرد کی حیثیت سے شریک ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ زمین کے مزاج کو اس وقت تک سمجھنا ممکن ہی نہیں ہے
ب تک اس میں انسانی عنصر کو شامل نہ کیا جائے۔ اگر زمین پر بارش، ہوا اور موسم جیسے فطری عوامل اثر انداز ہو سکتے ہیں تو
ہکار فطرت، انسان کے جو عامل فطرت ہی نہیں بلکہ فاتح فطرت بھی ہے، اثرات کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ قرونِ وسطیٰ میں زرعی علوم کی تحقیق و تفتیش اور ترتیب و تدوین میں مسلمانوں نے بڑا حصہ
۔ شیخ ابو عمر بن حجاج، رازی، اسحاق بن سلیمان، ثابت بن قرۃ، ابو حنیفہ دینوری، ابو عبداللہ بن محمد ابراہیم اندلسی، ابوالخیر
یلی، ابن ابی الجواد، غریب بن سعد اور ابو ذکریا یحییٰ بن محمد اشبیلی نے علوم زراعت پر متعدد قابلِ قدر کتب تصنیف کیں۔
زراعت پر سب سے زیادہ کام اسپین میں ہوا۔ پنجاب پبلک لائبریری لاہور میں ایک ہسپانوی ماہر زراعت علامہ ابو ذکریا
بن محمد اشبیلی کی تصنیف کتاب الفلاحت کا ایک پرانا نسخہ آج بھی موجود ہے جس میں زراعت کی ایک ایسی جامع تعریف
ہے کہ دورِ حاضر کے تصورِ زراعت کے مطابق بھی زراعت کی اس سے بہتر تعریف ممکن نہیں۔ اس کتاب میں زراعت
تمام موضوعات پر اتنی تفصیلی بحث ملتی ہے کہ حیرت ہوتی ہے اور زراعت کے علوم میں اپنے آباد اجداد کی بے مثل
تحقیقاتی کاوشوں اور شاندار کارناموں پر ہمارا سر فخر و مسرت کے جذبات سے اونچا ہو جاتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ جامعہ
عت مغربی پاکستان، زرعی تعلیم اور تحقیق و تفتیش کے میدان میں اپنی ان شاندار ملی روایات کو ہمیشہ پیشِ نظر
ے گی۔

صوبہ مغربی پاکستان میں ہماری تعلیمی روایت کا آغاز مغلوں کے عہد سے ہوتا ہے۔ مغل بادشاہوں نے مکتب
سکول) اور مدرسہ (یونیورسٹی) کے باقاعدہ تعلیمی ادارے قائم کئے۔ اکبر کے زمانے میں جب ان تعلیمی اداروں میں
رجحانات کے بجائے لادینیت غالب آگئی تو عملی مضامین یعنی سیکولر علوم، کی اہمیت پر زور دیا جانے لگا۔ اکبر اگرچہ
ان پڑھ تھا۔ لیکن بہت علم دوست تھا۔ اس نے اپنے جدت پسند ذہن اور مخصوص سیاسی مصلحتوں کے تحت نظامِ تعلیم

میں بعض بنیادی تبدیلیاں کیں اور پہلی مرتبہ عملی مضامین کو مدرسوں کے نصاب میں داخل کیا ۔ ان مضامین میں علم زراعت بھی تھا لیکن اس کے عہد میں جن خطوط پر زراعت کی تعلیم دی جاتی تھی اس کے متعلق ہماری معلومات نہایت محدود ہیں ۔

انگریزوں کے عہد میں سائنسی بنیادوں پر زراعت کی تعلیم دینے کی اس خطے میں پہلی کوشش ۱۹۰۸ء میں کی گئی اور اسی شہر لائل پور میں پنجاب ایگریکلچرل کالج اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا قیام عمل میں لایا گیا ۔ اس ادارے نے زرعی تحقیق و تعلیم کے میدان میں گزشتہ نصف صدی میں قابل قدر کارہائے نمایاں انجام دیئے ۔ ۱۹۲۸ء میں رائل کمیشن نے زرعی تحقیق پر زور دیا، اور کالج میں کئی نئے تحقیقی شعبوں کا اضافہ ہوا اور رفتہ رفتہ یہ کالج دنیا کی ایک عظیم زرعی درس گاہ میں شمار ہونے لگا ۔ قیام پاکستان کے بعد اس ادارے کو مزید مضبوط بنانے کے اقدامات کئے گئے لیکن ملکی ضروریات ایک مکمل زرعی یونیورسٹی کی متقاضی تھیں ۔ سرکاری حلقوں میں اگرچہ زرعی یونیورسٹی کے قیام کا منصوبہ ۱۹۵۸ء کے انقلاب سے پہلے ہی زیر غور تھا لیکن اس منصوبے کو فوڈ اینڈ زراعت کمیشن کی رپورٹ اور سفارش پر عملی جامہ پہنایا گیا جس کے لئے ہم اپنے بیدار مغز گورنر ملک امیر محمد خاں بالقابہ کے ہمیشہ مرہون منت ہوں گے ۔

بعض ماہرین تعلیم اس یک فنی اور یک علمی جامعہ کے تصور کے سرے سے ہی مخالف تھے ۔ ان کے نزدیک یہ چیز یونیورسٹی کے صحیح نظریے کے منافی ہے کیونکہ اس سے ایک قسم کی علمی حجرہ نشینی کی ایسی فضا پیدا ہو جاتی ہے جس میں مکمل ذہنی تربیت اور صحیح علمی ترقی ممکن نہیں رہتی ۔ میں اس اعتراض پر بحث کئے بغیر یہ عرض کرنے کی جسارت کروں گا کہ زراعت کو ایک علم خیال کرنا سخت غلطی ہے ۔ زراعت محض ایک فن یا ایک علم کا نام نہیں بلکہ یہ ہماری اسی فی صد آبادی کا طرز حیات (Way of Life) ہے ۔ اس طرز حیات میں انقلاب لانے کے لئے ہمیں بے شمار علوم درکار ہیں اور انہیں ترقی دینے اور دیہی نظام حیات پر منطبق کرنے کی ضرورت ہے اور اس مقصد کے پیش نظر زرعی علوم میں وسعت، گہرائی اور تخصص پیدا کرنے کے لئے زرعی جامعہ کا قیام نہایت ضروری تھا ۔ اس کے علاوہ تعلیم کی برکات سے صحیح طور پر کوئی قوم اس صورت میں بہرہ ور ہو سکتی ہے کہ اس وسکان دونوں جہتوں میں تعلیم کا رقبہ بڑھایا جائے ۔ اور یہ بات زراعت پر بالخصوص صادق آتی ہے کیونکہ ہمیں اپنی اسی فیصد دیہی آبادی کی زندگی کا معیار بلند کرنے کے لئے زرعی تعلیم کے ہر سطح کے تربیت یافتہ افراد کی سال بسال ایک بہت بڑی تعداد درکار ہو گی ۔ ہمیں زرعی تعلیم کا ایک ایسا نظام چاہیئے جس کی بلند ترین مسند پر ایسے لوگ متمکن ہوں جنہیں دانش و بینش کا جوہر شمار کیا جا سکے اور اس کے بعد دوسرے تیسرے اور چوتھے درجے کے اعلیٰ تربیت یافتہ کارکن زینہ بزینہ موجود ہوں ۔ جامعہ اگرچہ اعلیٰ ترین تعلیم کا مقام ہوتی ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو اس کی جڑیں تعلیم کے اعلیٰ ترین اداروں سے لے کر نچلے درجوں تک پھیلتی چلی جاتی ہیں اور جامعہ کا نور ظہور تمام درجات کے تعلیمی اداروں میں بھی جاری و ساری رہتا ہے ۔ ان تمام وجوہ کے باعث ایک زرعی یونیورسٹی کا قیام ناگزیر تھا اور ملک کی زرعی ترقی کی تمام امنگیں ایک زرعی یونیورسٹی کے قیام سے ہی پوری کی جا سکتی ہیں ۔ چنانچہ ۱۹۶۱ء میں جامعہ زراعت مغربی پاکستان کا قیام عمل میں

لایا گیا - اور میری خوش نصیبی کہ میں اس کی تاسیس کے ابتدائی مراحل سے لے کر اب تک کسی نہ کسی حیثیت سے اس یونیورسٹی کے ساتھ منسلک رہا - اب چونکہ زرعی یونیورسٹی مغربی پاکستان کا یہ پہلا جلسہ تقسیم اسناد ہے اس لئے اس یونیورسٹی کی تصویر میں میرا ذہن جن حسین رنگوں کا امتزاج دیکھنا چاہتا ہے اس کی ایک جھلک آپ کے سامنے پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

یہاں مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت دیجئے کہ یونیورسٹی محض بی ایس سی یا ایم ایس سی، کے نصابات پڑھانے کا نام نہیں ہے یہ کام تو زراعتی کالج کی تحویل میں بھی بطریق احسن انجام پا رہا تھا - جامعہ تجربے اور تحقیق کی ایک گہری علمی فضا پیدا کرنے کو کہتے ہیں - یہ ایک روایت کا نام ہے جو ماہر اساتذہ کی "یک جائی" انجمن، شب و روز کی تحقیق و تدریس اور علوم کے باہمی ارتباط کے ذریعے بڑی مدت کے بعد ظہور میں آتی ہے - یہ تسلیم کہ جامعہ زراعت، مغربی پاکستان لائل پور میں شہاب ثاقب کی مانند کہیں باہر خلا سے اچانک نہیں آ ٹپکی بلکہ اسے ایک شہرۂ آفاق پچاس سالہ قدیم کالج کا گراں قدر علمی و تحقیقی سرمایہ ورثہ میں ملا ہے - اس کے اساتذہ و محققین کی ایک بہت بڑی تعداد بیرونی ممالک کی یونیورسٹیوں کی تربیت یافتہ بھی ہے - تاہم بطور ایک یونیورسٹی کے اس نے ابھی اپنی روایت کو قایم اور اپنے تشخص کو حاصل کرنا ہے اور اس کے لئے سالہا سال تک سخت محنت اور ریاضت کی ضرورت ہوگی -

اس ضمن میں مجھے چند باتیں یونیورسٹی کے معلمین اور محققین سے بھی کہنی ہیں - فارغ التحصیل طلبہ کی بجائے روئے سخن کا معلمین کی جانب پھر جانا ممکن ہے کہ عجیب سا لگے، لیکن چونکہ زرعی یونیورسٹی کا یہ پہلا جلسہ تقسیم اسناد ہے اس لئے میں طلبہ سے پہلے اساتذہ سے خطاب کرنے میں مضائقہ نہیں سمجھتا - طلبہ آخر اساتذہ کا عکس ہی تو ہوتے ہیں -

۱- کسی جامعہ کی روایت اور ساکھ بنانے میں اس کی علمی اور تربیتی فضا کو بڑا دخل ہوتا ہے - میرا عقیدہ ہے کہ ہر شخص کو اللہ تعالیٰ نے کافی عقل اور سوجھ بوجھ دے رکھی ہے اور انفرادی طور پر ان میں جو فرق پایا جاتا ہے وہ بڑی حد تک ان کا اپنا پیدا کردہ ہوتا ہے - ہوتا یہ ہے کہ بعض لوگ خود بخود ہی بڑھنے پھولنے سے رک جاتے ہیں یا انہیں بڑھنے پھولنے سے روک دیا جاتا ہے اس زمانے میں جب کہ انسانی ذہن خلائی فضا کی بے کنار وسعتوں میں ہر لحظہ برگ و بار نکال رہا ہے - کسی شخص کو بیج پیدا کرنے کی فکر میں جلد پکنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے - کتنی ہی ایسی فصلیں ہیں جو جلد ہی پک کر بیج پیدا کر لیتی ہیں اور انہیں کاٹ لیا جاتا ہے - بہتر ہوگا کہ ہم زیادہ سے زیادہ مدت تک سبز حالت ہی میں رہیں اور پکنے کے عمل کو ملتوی کئے رکھیں - زیادہ سے زیادہ ذہنی نشوونما صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ علمی جستجو کو کسی بھی مرحلے پر ماندہ نہ پڑنے دیا جائے -

۲- زرعی سائنسدانوں اور محققین کو چاہیئے کہ بصیرت کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیں - ہر سائنسدان کو فن کار کا تخیل بھی پیدا کرنا چاہیئے - برٹیلے نے ایک بات بڑے کام کی کہی ہے - وہ کہتا ہے کہ اگر اس کی ٹریننگ ایک کیمیادان کی

سی ہوتی تو وہ کبھی آکسیجن دریافت نہ کر پاتا - میں تو یہ کہوں گا کہ سائنسدانوں کو اپنے تخیلاتی مشاہدات کو بھی صفحہ قرطاس پھیلانا چاہیئے - بالعموم ہوتا یہ ہے کہ ہمارا سائنسداں صرف اپنی نتائج کو شائع کرتا ہے جو تجربے کی کسوٹی پر پرکھے جانے کے بعد ثابت شدہ شمار ہوتے ہیں - اس لئے دوسرے سائنسدان اس کے ذہنی طول و عرض سے ناواقف رہتے ہیں حالانکہ اس کا پردۂ تخیل جس پر وہ سوچ بچار اور تجربات کا نقشہ تیار کرتا ہے دوسرے سائنسدانوں کی تحریک کا باعث بن سکتا ہے ان باتوں کی اشاعت سائنسی ضوابط کے منافی سہی مگر یہ چیز طلبہ کے ذہنی افق کو ضرور وسیع کر سکتی ہے - میرے خیال میں طلبہ کو سائنسی علوم کے شجر کی شاخ و نبات کا وہ اندرونی جوہر ضرور معلوم ہونا چاہیئے جو شاخ پر گل و ثمر کے ٹھوس حقائق پیش کرتا ہے -

۳ - صبر کی جتنی ضرورت ایک محقق سائنس دان کو ہے اتنی شاید کسی اور کو نہیں - اس کا کام ہیروں کی کان کنی کے مترادف ہے - ہیروں کی تلاش میں اسے بہت سی خاک چھاننی پڑتی ہے تب کہیں جاکر ہیرے کی کوئی کنی اس کے ہاتھ لگتی ہے - اگر کسی محقق یا سائنس دان میں انتظار کی تاب نہ ہو تو عین ممکن ہے کہ وہ اپنے کام کو ٹھیک اس مقام پر چھوڑ بیٹھے جہاں کدال کی مزید ایک ضرب سے اس کا گوہر مقصود اس کے ہاتھ آنے والا ہو - سائنس کی دنیا میں مایوسی اور کاہلی یقیناً بہت بڑا کفر ہے - زرعی تحقیق و تفتیش کے میدان میں معلمین کو صبر و استقامت کی زندہ مثالیں بن کر اس حقیقت کو اچھی طرح طلبہ کے ذہن نشین کرا دینا چاہیئے -

۴ - ہمارے سائنس دان کسی مسئلے کے مختلف ٹکڑوں پر کام کر رہے ہوتے ہیں اور تحقیقات کا سب سے عمدہ طریقہ یہ ہے کہ وہ ایک ٹیم کی طرح مل جل کر کام کریں - تحقیقات در تحقیقات علم کی سرحد کو مسلسل آگے سرکاتے رہنے کا دوسرا نام ہے - علیحدہ علیحدہ کام کرنے کی صورت میں ہوتا یہ ہے کہ بعض جگہوں پر تو یہ سرحد آگے سرک جاتی ہے اور بعض جگہوں پر نہ سرکنے کے باعث اس میں رخنے پڑ جاتے ہیں - اگر سائنس دان ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر کام کرنا سیکھ لیں تو متفقہ کوششوں کی بدولت مجموعی طور پر سرحد کو مسلسل آگے کی طرف سرکانا آسان ہو جاتا ہے - یونیورسٹی درحقیقت کہتے ہی ان مراکز تجلی کو ہی جہاں علم کے نئے نئے رقبے دریافت کئے جاتے ہیں -

۵ - سائنسی علوم سیکھنے یا پڑھانے والوں میں بالعموم ایک بڑی کمی یہ پائی جاتی ہے کہ سائنس میں انہماک کی وجہ سے وہ زندگی کے دوسرے حقائق اور لذتوں سے محروم رہ جاتے ہیں اسی قسم کا معاملہ ڈارون کو پیش آیا تھا - چنانچہ ایک جگہ وہ بڑی حسرت سے لکھتا ہے کہ بچپن میں اسے شعر و شاعری کا بڑا ذوق تھا اور وہ ہومر کی نظموں کو پڑھتے وقت مسحور ہو جایا کرتا تھا لیکن سائنسی علوم میں استغراق نے اس سے شاعری کا سارا لطف چھین لیا - انسانی شخصیت میں اس قسم کا یک رخا پن پیدا ہو جانا کوئی اچھی علامت نہیں، انسانی شخصیت کا ارتقا " ہمہ جہتی " ہونا چاہیئے تاکہ ایک متوازن شخصیت وجود میں آئے -

ایک اور ضروری بات جس پر میں یونیورسٹی کے ناظم اعلیٰ اور بالخصوص اساتذہ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں وہ دین و اخلاق کا مسئلہ ہے کیونکہ اگر انسان ساری دنیا کو بھی حاصل کرلے اور اپنے آپ کو ہی کھو دے تو اس کا کیا فائدہ؟ ایک مشہور شاعر نے کہا ہے ؎

باہمہ ذوق آگہی ہائے رے پستیٔ بشر
سارے جہاں سے باخبر اپنے جہاں سے بےخبر
(جگر)

انسان کے لئے خود آگہی اور خودیابی کا مسئلہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے اور انسانیت کی تکمیل کے لئے جہاں بینی کے ساتھ ساتھ خود بینی بھی بہت ضروری ہے اور خود بینی / دینی اور اخلاقی بصیرت ہی کے ذریعے ممکن ہے۔ ایمان کا مسئلہ تمام انسانی مسئلوں میں سب سے زیادہ اہم ہے / لیکن ایمان کو کبھی اوپر سے نہیں ٹھونسا جا سکتا۔ اس شجر نور کا بیج تو دلوں کے اندر سے ہی پھوٹ سکتا ہے بعض لوگوں کا یہ خیال قطعی طور پر غلط اور بے بنیاد ہے کہ سائنس کی آب و گل اور باد و فضا ایمان کی نشو و نما کے لئے سازگار نہیں ۔ خدا تو انفس و آفاق میں ہر کہیں موجود ہے اور اس کی تلاش ہر کہیں کی جا سکتی ہے بلکہ قرآن تو ہمیں بار بار آفاق میں خدا کو تلاش کرنے کی دعوت دیتا ہے ۔ ہم نے خود ہی روح اور مادے کی دوئی کا عقیدہ پیدا کیا اور پھر مادے کو روح کی ضد سمجھ بیٹھے ۔ ہماری یہ کتنی بڑی غلطی ہے کہ ہم مادے کی دنیا کو خدا کی جلوہ گری سے یکسر محروم خیال کرتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن حکیم نے اللہ تعالیٰ کی خالقیت اور بہت توحید کے حقائق دل نشین کرنے کے لئے جتنے اشارے اور تشبیہات زراعت سے لی ہیں اتنی انسانی مشاہدے کے کسی دوسرے میدان سے نہیں لیں ۔ آج تک صرف صوفی اور شاعر لوگ ہی سبزہ و گل میں خدا کے جلووں کا نظارہ کرتے رہے ہیں غالب نے بلاوجہ تو نہ پوچھا تھا ؎

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے ؟
(غالب)

کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ہمارے سائنس داں بھی ان مظاہر فطرت کا آیات الٰہی کی حیثیت سے مطالعہ کریں ہمارے فاضل سائنس داں اگر اپنے طلبہ کو ان خطوط پر سائنس کی تعلیم دینا شروع کر دیں تو کوئی وجہ نہیں کہ سائنس سے طلبہ کے دل میں ایمان اور دماغ میں خدا کا تصور مضبوطی سے جڑیں نہ جمالے ۔ حقیقت یہ ہے کہ سائنس کا صرف یہی کام نہیں کہ انسان کی خارجی دنیا کے خد و خال کے نکھار اور سنگھار میں مدد دے بلکہ اسے ایک ایمان آفریں قوت بنا کر اس سے پوری تسکین کا سامان بھی بنایا جا سکتا ہے ۔

میرا خیال ہے کہ یہ تمام باتیں پہلے ہی سے جامعہ زراعت مغربی پاکستان کے موجودہ ذہین، قابل اور محنتی وائس چانسلر کے پیش نظر ہیں۔ پچھلے چار سال میں اس جامعہ نے جو ترقی کی ہے وہ انہی کے حسن انتظام اور انتھک محنت کا نتیجہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ جامعہ ان کی نگرانی میں تعلیم و تربیت کی اعلیٰ روایات قائم کرے گی۔

اب میں چند باتیں فارغ التحصیل طلبہ سے کرنا چاہتا ہوں جو اس جلسے میں اسناد حاصل کر رہے ہیں۔ کسی مفکر نے یونیورسٹی کی سرحد کو پورے ملک کی سرحدیں قرار دیا ہے۔ اس جامعہ کے فارغ التحصیل طلبہ کی ایک بھاری تعداد زرعی توسیع کے میدان میں کھپائی جائے گی۔ ایک قلیل تعداد شاید خود اپنے کھیتوں اور فارموں پر کھیتی باڑی یا پرورش حیوانات کا کاروبار شروع کرے اور کچھ لوگ شاید حکومت کے دوسرے شعبوں میں بھی اپنے لئے جگہ بنانے کی کوشش میں کامیاب ہو جائیں اور اسی طرح یونیورسٹی کی حدود پورے ملک کی حدود تک پھیل جائیں گی۔ ان تمام عزیزان ملت سے میری یہ درخواست ہے کہ آپ جہاں کہیں بھی جائیں، وہ علم جو آپ نے یہاں سے حاصل کیا ہے، اسے ضائع نہ ہونے دیں۔ آپ کی حکومت نے آپ کی تعلیم و تربیت کے چار، چھ، نو یا اس سے بھی زیادہ سال جو آپ پر صرف کئے ہیں وہ بے مصرف نہیں جانے چاہئیں۔ ملکی تعمیر کے کاموں میں زرعی توسیع کا کام بالخصوص بہت اہمیت رکھتا ہے اور میرے ان عزیزوں کو، جو اپنے آپ کو اس نیک کام کے لئے وقف کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، اپنے اندر فکر کے ساتھ ساتھ خلوص، اخلاق اور کردار کے وہ اعلیٰ اوصاف پیدا کرنے ہوں گے جن کی مدد سے وہ ملک کے کسانوں کے دوست، ہمدرد اور مخلص رہنما بننے کے قابل ہو سکیں۔ یاد رکھئے قیادت کے لئے جس قسم کی شخصیت درکار ہے اس میں انسانی ہمدردی، خلوص، مقصد کی لگن اور تبلیغ کے بے پناہ جذبے کے اوصاف بدرجۂ اتم پائے جانے چاہئیں۔ جو شخص ان اوصاف سے عاری ہو اس کی شخصیت اس سوز دروں سے محروم ہی رہتی ہے جس کی مدد سے علم اور تجربے کو انسانی زندگی کے لئے مفید بنایا جا سکتا ہے۔ زرعی توسیع کے کارکن کو ایسا اعلیٰ کردار پیدا کرنا چاہیئے جو اسے ایک باعمل ہستی بنا دے۔ اس کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ ایمان افروز اور اثر آفریں ہوں۔ اور یہ بات یقین محکم، عمل پیہم، اور دلبرانہ گفتار کے حسین امتزاج سے پیدا کی جا سکتی ہے۔

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پر سوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لئے

(اقبال)

تشکیل کردار کے بعد عمل کرنے کا مرحلہ آتا ہے اور عمل وہی قابل قدر ہے جو جذبہ خدمت سے لبریز اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لئے فائدہ بخش ہو۔ ملک کو ایسے کارکنوں کی ضرورت ہے جو جدید نظریات کی توسیعی قندیل ہاتھ میں تھامے ایک مبلغ کے جوش و خروش کے ساتھ قریہ قریہ، نگری نگری اور بستی بستی گھومے تاکہ ان کے علم

اپاشیوں سے ایک ایک کسان کا دل و دماغ منور ہو جائے اور ان کے دل اس کی مٹھی میں آجائیں۔

اے عزیزانِ من! کسی کام کو صحیح طریقے پر انجام دینے کے لئے سب سے پہلی اور سب سے اہم بات یہ ہوتی ہے
کے سامنے اپنے کام کا واضح نقشہ ہو۔ آپ اپنے کام کی اہمیت اور اپنے منصب کے تقاضوں سے خوب
ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ پاکستان کسانوں کا ملک ہے اور اس کی معیشت زرعی بنیادوں پر قائم ہے۔ زرعی
ی کلید کسان کے ہاتھ میں ہے جو آپ کی رہنمائی کا محتاج ہے۔ لہذا آپ کا کام ایک مقدس فریضہ ہے، ایک
بڑی سعادت ہے اور ایک بہت ہی نیک اور پاکیزہ مشن ہے۔ آپ اپنے کام کو ایک ذریعۂ معاش ہی خیال
ہ بلکہ یوں سمجھئے کہ آپ کو اپنے ملک و ملت میں خوش حالی کا دور لانے کے ضمن میں ایک نہایت ہی اہم کردار ادا
ہے۔ یاد رکھیئے کہ کسی ملک میں زمینوں کا بنجر اور ناکارہ پڑے رہنا قومی جہالت کی علامت ہوتا ہے۔ زمینوں
د ہونا قومی افلاس کی دلیل ہے۔ زمینوں کا غلط استعمال قوم کے اقتصادی اور اخلاقی انحطاط کا آئینہ دار
۔ الارض للہ کے قرآنی قول کے مطابق زمین انسان کے پاس خداوند تعالیٰ کی امانت ہے۔ لہذا اپنے وطن کے
ہو اس امانت کا اہل ثابت کرنے میں مدد دیجئے۔

آپ کو دوسری بات یہ یاد رکھنی ہوگی کہ آپ کے کام کا محور کسان کی ذہنیت و شخصیت اور کردار کی جدید
، ہے اور "انسان سازی" کی طرح کسان سازی بھی ایک مشکل ہنر ہے۔ اس جامعہ نے آپ کو ایک اچھا انسان
ب اچھا کسان اور ایک اچھا زرعی انجینئر بنانے کی کوشش میں علم و ہنر کا جو سرمایہ آپ کو سونپا ہے وہ درحقیقت
ے پاس قوم و ملک کی ایک مقدس امانت ہے جسے آپ نے ملک کی زراعت پیشہ آبادی کو منتقل کرنا ہے۔ اس
ب یہ بات بنیادی اہمیت رکھتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح آپ کسانوں کا خوشدلانہ تعاون حاصل کرنے میں کامیاب
ں۔ چنانچہ آپ کو سب سے پہلے کسان کی نفسیات سے واقف ہونا پڑے گا۔ مثلاً آپ کو یہ بات معلوم ہونی چاہیئے
ن اگرچہ طبعاً خاموش اور بے زبان ہوتا ہے لیکن بے سمجھ اور ناداں نہیں ہوتا۔ وہ بامروت ضرور سہی لیکن
سی بات کا بہ دل قائل کرنا ایک کٹھن کام ہے۔ وہ گاؤں کا بیٹا ہے اور عملی قسم کا انسان ہے اور صرف زندگی کے
حقائق سے ہی دلچسپی رکھتا ہے۔ افکار و نظریات اس کے نزدیک چنداں اہمیت نہیں رکھتے۔ وہ اپنے
قصان کا شعور رکھتا ہے اور سادہ لباس اور اسلامی معاشرت سے محبت رکھتا ہے۔ اگر آپ اسے اپنے
ب لانا اور اسے اپنی باتوں کا قائل کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو اس کے ساتھ مروت و
، نرمی و دل سوزی، صبر و تحمل اور سادگی و عاجزی کے ساتھ پیش آنا چاہیئے۔ اس کے سامنے اپنی سیدھی
باتیں رکھنی ہوں گی جو آسانی کے ساتھ اس کی سمجھ میں آجائیں۔ آپ کو دیہی طرزِ زندگی اور اسلامی اخلاق کو
ہوگا۔ پھر محض باتیں بنانے سے کام نہیں چلے گا بلکہ آپ کو اس کے مقامی اور وقتی مسائل کا ٹھوس حل پیش

کرنا ہوگا اور ضرورت پڑنے پر اپنے ہاتھ سے خود کام کرکے اسے قائل کرنا پڑے گا۔

تیسری ضروری بات یہ ہے کہ آپ کو اپنی معلومات کو ہمیشہ تازہ اور مکمل کرنے کی فکر کرنی چاہیئے۔ یاد رکھیئے کہ علم و تجربہ ہی آپ کا حقیقی سرمایہ ہے اور اسی میں زیادہ سے زیادہ اضافے کی آپ کو کوشش کرتے رہنا چاہیئے آپ کے علم کی آخری حدود کتابیں اور تحقیق گاہیں نہیں بلکہ کسان اور کھیت ہیں۔ لہذا اپنی آنکھوں اور کانوں کے دریچے ہمیشہ کھلے رکھیئے اور کسانوں کی عملی دانائی سیکھنے سے کبھی گریز نہ کیجئے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ان کی ہر بات قدامت پرستی ہی کی آئینہ دار ہے۔ ممکن ہے کہ ان کے بعض طور طریقے صدیوں کے تجربات و مشاہدات کا حاصل ہوں۔ زرعی علوم کا بیشتر تحقیقاتی سرمایہ زمینداروں ہی کی سجھائی ہوئی راہوں پر کام کرنے سے حاصل ہوا ہے اور آج بھی کسان ہمارے ماہرین کو بہت سی نئی راہیں سجھا سکتے ہیں۔ خوش قسمتی سے ہمیں کہیں کہیں اعلیٰ تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ لوگ بھی عملاً کھیتی باڑی کے پیشے سے منسلک نظر آجاتے ہیں۔ ان سے باقاعدہ رابطہ قائم کرکے نئی نئی معلومات حاصل کی جا سکتی ہے۔

چوتھی اہم بات یہ ہے کہ کام شروع کرنے سے پہلے نصب العین اور منتہائے مقصود کا تصور نہایت واضح طور پر ذہن میں موجود ہونا چاہیئے۔ یہ نصب العین ایسا ہونا چاہیئے کہ ایک طرف تو یہ مقامی حالات کا کلیدی حل ہو اور دوسری طرف قومی اور ملکی منصوبے کے بھی مطابق ہو۔ دوسرے الفاظ میں اسے حکومت کے وضع کردہ ملکی منصوبے کا چھوٹے پیمانے پر ایک ننھا سا عکس قرار دے دیجئے۔ نصب العین کے تعین کے بعد اس کے حصول کا درجہ وار لائحہ عمل بنا لیجئے اور اللہ کا نام لے کر اس پر گامزن ہو جایئے۔

آخری بات جو آپ سے عرض کرنے والا ہوں وہ یہ ہے کہ آپ اس اعتبار سے بہت خوش قسمت واقع ہوئے ہیں کہ آپ کو کام کے لئے ایک نہایت ہی سازگار فضا میسر آئی ہے۔ ۶ ستمبر کے بھارتی حملے سے ملک بھر میں عمل اور جدوجہد کی ایک نئی روح دوڑ گئی ہے۔ آپ اس جذبے سے بہت کام لے سکتے ہیں بشرطیکہ آپ میں قیادت کی وہ صلاحیتیں موجود ہوں جو ایک زرعی کارکن میں پائی جانی چاہیئے۔ اس موقع پر میں آپ کو صدر مملکت کے وہ الفاظ بھی یاد دلانا چاہتا ہوں جن میں انہوں نے سادگی، کفایت شعاری اور انتھک محنت پر زور دیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس نازک وقت میں قومی ذمہ داریوں کا پورا پورا خیال رکھتے ہوئے صدر مملکت کی اس نصیحت پر دل و جان سے عمل کریں گے۔

مجھے احساس ہے کہ میری تقریر کچھ زیادہ طول پکڑ گئی ہے۔ مگر زراعت اور زراعت کے متعلق ذکر کرتے ہوئے میری معروضات طویل ہو ہی جاتی ہیں۔ رخصت ہونے سے پہلے ان عزیز نوجوانوں کو تہہ دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں جنہوں نے اس جامعہ سے اپنی تعلیم و تربیت کامیابی کے ساتھ مکمل کرلی ہے اور وہ اب زندگی کے ایک ایسے موڑ پر کھڑے ہیں جہاں سے ملک و ملت کی تعمیر کے بے شمار راستے پھوٹتے ہیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں فرداً فرداً اپنی اپنی راہیں تلاش کرنے میں ان کی رہنمائی فرمائے جن پر چل کر وہ خود بھی بڑھیں پھولیں اور ملک و ملت کی بھی زیادہ سے زیادہ خدمت بجا لائیں۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی

سائنس کی تدریس اور قومی زبان [۱]

مجھے اس امر کی بڑی خوشی ہے کہ سائنٹیفک سوسائٹی میں یہ ساتواں سالانہ اجلاس اس جامعہ میں منعقد ہو رہا ہے۔ سائنٹیفک سوسائٹی کی اہمیت کے متعلق میں ایسے مجمع میں جہاں اس ملک کے اتنے فاضل موجود ہیں کچھ زیادہ عرض نہیں کرنا چاہتا۔ اور فقط اپنے اس عقیدہ کے اظہار پر اکتفا کروں گا کہ عصرِ حاضر میں سائنس کو جب تک اس ملک کے لوگ اپنی زبان میں نہ سمجھیں اسوقت تک کسی قسم کی مادی ترقی ممکن نہیں ہے۔

گذشتہ چند سال میں ایشیا کے دو ممالک نے جو حیرت انگیز ترقی کی ہے اس کے عوامل پر غور کرنا ہمارے لئے منفعت سے خالی نہ ہوگا۔ میرا اشارہ پہلے تو جاپان کی طرف ہے جس نے نظری اور عملی علوم میں اپنا سکہ اس قدر جما دیا ہے کہ اب وہ علمی اعتبار سے اقوامِ عالم کی صفِ اوّل میں شمار ہوتا ہے۔ اس نے جو مادی ترقی کی ہے اس سے بھی دنیا باخبر ہے۔ جاپان میں ٹیکنالوجی اور سائنس کی ترقی کا اندازہ اس کی صنعتی پیداوار کی خوبی اور فراوانی سے لگایا جا سکتا ہے۔ دوسری مثال ہمارے ہمسایہ ملک چین کی ہے اشتراکی انقلاب سے قبل چین کی بدنظمی اور پستی ضرب المثل تھی۔ لیکن آج وہ شاہراہِ ترقی پر اس تیزی سے گامزن ہے کہ دنیا ششدر و حیران ہے۔ کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ ایک امریکی ماہر نے مجھے ایک خط میں لکھا تھا کہ کیمیا کے علم میں چین نے ایسی ترقی کی ہے کہ غالباً اس کا مقابلہ دوسرے ممالک نہیں کر سکتے۔ یہ تو تمام دنیا جانتی ہے کہ مرکزائی طبیعیات میں چین اب کس مقام پر پہنچ چکا ہے۔ اس نے جو ہائیڈروجن بم بنایا ہے اس کے متعلق تمام لوگوں کا خیال ہے کہ یہ ابتدائی یا بھونڈی شکل کا نہیں ہے۔ بلکہ اس نمونہ کا ہے جو اس فن میں اعلیٰ مہارت کے بعد ہی بنایا جا سکتا ہے۔

چین سائنسی ترقی کے دوسرے میدانوں میں بھی بہت آگے بڑھ چکا ہے چنانچہ اس نے قاذفہ مسائل بھی ایسا بنایا ہے کہ خیال کیا جاتا ہے کہ بہت تھوڑے عرصہ میں وہ اس قابل ہو جائے گا کہ اگر وہ چاہے تو دور دور کے علاقے اپنے جوہری اسلحہ کی زد میں لے آئے۔ عوامی سطح پر پاکستانی پوری طرح جانتے ہیں کہ چین سے جو سامان آتا ہے وہ نہایت ہی ارزاں اور عمدہ ہوتا ہے جس سے اس کی صنعتی ترقی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ نہ جاپان نے انگریزی یا کسی اور یورپی زبان کے ذریعہ سے یہ ترقی کی ہے اور نہ چین نے۔ یہ ضرور ہے کہ ابتدا میں انھوں نے یورپی زبانوں کے سرمایہ سے معلومات حاصل کی ہوں گی لیکن جہاں تک درس و تدریس کا تعلق ہے ان کا ذریعہ تعلیم ہمیشہ سے چین میں چینی اور جاپان میں جاپانی رہا ہے۔

---

[۱] سائنٹفک سوسائٹی پاکستان کے ساتویں سالانہ اجلاس کا خطبۂ صدارت

اس سلسلہ میں یہ سوال ذہن میں آتا ہے کہ کیا پاکستان میں کوئی ایسی خصوصیت ہے کہ وہ اپنی زبان کے ذریعہ ترقی نہیں کر سکتا
کیا اردو زبان ایسی ناکارہ اور بیکار ہے کہ وہ خیالات کے اظہار کی صلاحیت سے بالکل عاری ہے؟ کیا اس میں یہ اہلیت نہیں ہے
کہ وہ خیالات کے اظہار کی صلاحیت سے بالکل بے بہرہ ہے یا وہ سائنس اور دیگر علمی معلومات کو اپنے اندر منتقل کر سکے؟ کیا سائنس
کی ابتدا چین یا جاپان سے ہوئی تھی کہ انھوں نے اپنی زبان ہی میں درس و تدریس کے ذریعہ سے اتنی ترقی کر لی؟ ظاہر ہے کہ انھوں نے
ابتدا تو علوم و فنون کو ان ہی ممالک کی زبانوں سے اخذ کیا جہاں پہلے سائنس کا رواج ہو چکا تھا۔ انھوں نے شروع ہی سے ان معلومات
کو اپنی زبان ہی کے ذریعہ سے اپنے طالب علموں اور عوام تک پہنچایا اور وہ بتدریج اس قابل ہو گئے کہ ان کی اعلیٰ تحقیقات اور مادی
ترقی پر اقوام عالم رشک کرتی ہیں۔

ہمارے یہاں بعض حضرات بار بار یہ دہراتے ہیں کہ بغیر انگریزی کے کسی قسم کی ترقی ناممکن ہے میں ان سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں
کہ اس برعظیم کے لوگوں پر ڈیڑھ سو سال سے انگریزی مسلط رہی ہے، اس طویل عرصہ میں انھوں نے کتنی ترقی کی؟ آخر وہ کون سے
موانع تھے جو ہمیں ترقی سے روکے رہے؟ اس کا سبب محض یہ نہیں ہو سکتا کہ ہمیں سیاسی آزادی نصیب نہ تھی۔ اگر یہی سبب
ہوتا تو ہم آزادی کے اٹھارہ سال میں کم از کم اس کی عشر عشیر ہی ترقی کر لیتے جو چین نے اٹھارہ سال سے کم عرصہ میں کر لی ہے۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہم بڑی سخت غلط فہمیوں کا شکار ہیں میرا خیال ہے کہ ہم خود ایسے غلط مفروضات کو دہراتے دہراتے
ان پر یقین کرنے لگے ہیں اور ہم میں سے بعض ذی اثر افراد کے عقائد کا جزو بن گئے ہیں، حالانکہ یہ تمام مفروضے سراسر غلط ہیں،
اور چونکہ غلط ہیں اس وجہ سے مضرت رساں اور تباہ کن بھی ہیں۔ اگر یہ خیال ہمارے یہاں قبول کیا جاتا رہا کہ ملک بغیر انگریزی زبان
کے ترقی نہیں کر سکتا تو ہم نہ صرف ترقی بلکہ اپنی انفرادیت اور اپنے وجود کو بھی خطرہ میں ڈال دیں گے اس لئے کہ ہمارے
ملک میں انگریزی داں طبقہ کی تعداد بہت محدود ہے اور ہمیشہ محدود رہے گی۔ یہ امر مسلّم ہے کہ قومیں ترقی صرف چند لوگوں کی
مساعی سے نہیں کرتیں بلکہ اس کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ پوری قوم مختلف کاموں میں لگ جائے قوم اسی صورت میں مفید
کاموں میں لگ سکتی ہے جب اسے معلوم ہو جائے کہ فلاح کے طریقے کیا ہیں اور بہبود کے لئے کیا ذرائع اختیار کرنے چاہئیں۔
جب تک افراد کو اپنے کام کی اہمیت کا احساس نہ ہو اور وہ خود اس میں ترقی کی راہیں نہ نکال سکیں۔ وہ قوم کو آگے نہیں بڑھا سکتے۔
محض چند لوگوں کے طوطوں کی طرح سبق رٹنے سے کبھی ترقی نہیں ہو سکتی یہی تو سبب ہے کہ اٹھارہ سال پاکستان کو بنے ہوتے ہو گئے
اس کے باوجود ہماری کیفیت یہ ہے کہ ہمارے یہاں اگر کہیں سڑک پر آمد و رفت کی روشنی بھی خراب ہو جاتی ہے تو ہفتوں اسکی
مرمت کرنے والا پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ ابھی ہمارے ہاں ایسے افراد بہت کم ہیں جو سائنس اور اس کے استعمال کی بدولت
سے بھی واقف ہوں۔ اس بیسویں صدی میں جبکہ اپنی زبانوں میں سائنس سیکھنے والوں کے خلا باز ستاروں سے باتیں کرتے ہیں ہم
معمولی آلات کی مرمت بھی ٹھیک طرح نہیں کر سکتے۔ ع

یاران تیز گام نے منزل کو جا لیا ہم محو نالۂ جرس کارواں رہے

میرا مدعا صرف یہ ہے کہ جتنا لیت ولعل قومی زبانوں کو اپنے صحیح مقام پر لانے میں کیا جارہا ہے اور جس قدر قومی زبانوں کی طرف سے لاپرواہی برتی جارہی ہے اور لوگوں کو اس غلط فہمی میں مبتلا کیا جارہا ہے کہ بغیر انگریزی زبان کے ترقی نہیں ہو سکتی اسی حد تک پاکستان کی ترقی رُکی ہوئی ہے۔ اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس کانفرنس کو اس امر پر غور کرنا چاہیئے کہ آیا کوئی طریقہ اس احساسِ کمتری کی لعنت سے نجات حاصل کرنے کا ہے یا نہیں۔ اور قوم کے اس طبقہ کو جس کے ہاتھ میں اس معاملے کو آگے بڑھانے کا اختیار ہے اس راستے سے متفق کیا جا سکتا ہے یا نہیں کہ کوئی قوم کبھی کسی میدان میں ترقی نہیں کر سکتی اگر وہ دوسروں کے خیالات کی محتاج رہے اگر ہم دوسری زبانوں سے خیالات اخذ کرنے ہی پر اکتفا کرتے رہے تو ہم ہمیشہ دوسروں کے خیالات اور دوسروں کی تحقیقات کے محتاج رہیں گے اور ہم نقالی اور تقلید سے ایک قدم بھی آگے نہ بڑھا سکیں گے اس لئے کہ ہمارے دماغوں میں طبعزاد خیالات و تصورات کے لئے تمام دروازے بند ہو جائیں گے۔ اپنی زبان کے استعمال کا سب سے بڑا کرشمہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی طبیعت نقل سے ہٹ کر تخلیق، تحقیق اور ایجاد کی طرف مائل اور اس قابل ہو جاتی ہے کہ کوئی نئی بات پیدا کر سکے۔ ایجاد اور تخلیق کا تعلق اس سے بھی ہے کہ انسان اپنے ماحول سے اس درجہ ہم آہنگ ہو کہ وہ اس کے اثرات قبول کر سکے اور اس پر اثر ڈال سکے۔ اس کا اندازِ فکر اجنبی ماحول اور اثرات کا غلام نہ ہو اور آزادی کے ساتھ بروئے کار لانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ یہ ہم آہنگی کسی غیر زبان کی وساطت سے حاصل نہیں ہو سکتی اس لئے کہ وہ کسی اور ماحول کی پیداوار ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ نقال قومیں کبھی ان قوموں کی ہمسری نہیں کر سکتیں جن کی تحقیقات آزاد ہوں۔

یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ تحقیقات کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جس کا تعلق سیاست سے ہوتا ہے۔ اور دوسرا وہ جو ان اساسیات اور ملکی ضروریات کے انطباق سے کوئی نئی چیز ایجاد کرتا ہے۔ اس وقت دُنیا میں زیادہ تر تحقیقات اس دوسری قسم کی ہی ہو رہی ہے۔ کیا کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ تمام تحقیقات جو انگلستان، امریکہ یا روس کی ضروریات کو پورا کرنے کی غرض سے کی گئی ہے پاکستان کی ضروریات کو بھی من و عن پورا کر سکتی ہے؟ ہماری خام پیداوار جدا، ہماری معیشت و معاشرت دوسرے قسم کی ہمیں تو ایسے طریقے ایجاد کرنے چاہیئں جن سے ہماری خام پیداوار سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔ اور جو ہماری خصوصی ضروریات کو پورا کر سکیں۔ اسی طرح تو ہمارا ملک صحیح ترقی کرے گا ورنہ یہی ہوگا کہ ہم اوروں سے بڑے بڑے قرضے لیتے رہیں گے اور ان کا معتدبہ حصہ غیر ملکی ماہرین کی مستعار خدمات کے معاوضہ میں خرچ کرتے رہیں گے ورمزید برآں سود میں گرانقدر رقمیں برآمد کرنی پڑیں گی۔ مشکل تو یہ ہے کہ کوئی ملک اپنے بہترین ماہر مستعار نہیں دیتا اور بعموم ایسے لوگوں کو ماہر بھیجتا ہے جو اپنے ملک میں کسی وسیع شہرت کے مالک نہیں ہوتے۔ اس وقت تو خود ہمارے جو طالبعلم تحقیقات کے لئے باہر بھیجے جاتے ہیں ان کا کام بھی دوسروں ہی کے کام آتا ہے۔

مَیں یہ نہیں کہتا کہ انگریزی کو بالکل ترک کر دیا جائے قومی زبانوں کا کوئی بھی خواہ یہ نہیں کہتا۔ ہم سب یہ سمجھتے ہیں بین الاقوامی تحقیقات اور ایجادات سے رابطہ قائم رکھنے کے لئے ہم میں بہت سے افراد کو روسی بھی جاننی چاہیئے چینی بھی

جاننی چاہیئے اور جاپانی بھی جاننی چاہیئے اور ان کے علاوہ وہ تمام زبانیں جاننی چاہئیں جن میں اس وقت تحقیقات کی رفتار تیز ہے مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اگر ہم چین، جاپان، انگلستان، امریکہ یا جرمنی سے کوئی بات سیکھنا چاہتے ہیں تو اس ملک کی زبان کو اوڑھنا بچھونا بنالیں اور اپنی زبان میں نہ پڑھیں نہ سوچیں اور نہ تحقیقات کریں ورنہ ان زبانوں سے اخذ کردہ مضامین کے علاوہ کچھ اور سوچنے کی زحمت گوارا کریں۔

میرے نزدیک ترقی کی ضمانت اسی طرح ہو سکتی ہے کہ ہمارا فکر آزاد ہو، اور فکر آزاد نہیں ہو سکتا جبتک کہ ہمارے دماغ پر دوسری اقوام کے خیالات کی حکومت قائم ہے جس کا سب سے بڑا سبب ان کی زبانوں کا تسلط ہے۔ انگریزی کو نامناسب اہمیت دینے کے باعث ہمارا فکر مفلوج ہو چکا ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت تو یہی ہے کہ یہ معمولی سی بدیہی بات کہ تعلیم اور ترقی اپنی زبان کے ذریعہ ہی سے ہو سکتی ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتی، حالانکہ تمام دنیا کی ترقی یافتہ قومیں اسے ایک اساسی حقیقت کے طور پر مانتی ہیں۔

پاکستان و ہندوستان کی حالیہ جنگ نے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ پاکستان دوسروں کا دست نگر رہ کر پوری طرح اپنا دفاع نہیں کر سکتا۔ اس کی اشد ضرورت ہے کہ ہم ہر قسم کے اسلحہ خود اپنے ملک میں تیار کریں۔ اس طرح یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ پاکستان کو اپنی اقتصادی ترقی کے لئے دوسروں کا محتاج نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں جن کے لئے پاکستان میں سائنس کو ترقی دینا نہایت ضروری ہے۔ اس لئے کہ بغیر سائنس کے نہ تو دفاع کا سامان تیار ہو سکتا ہے نہ وہ اقتصادی قوت حاصل کی جا سکتی ہے۔ جس کے بغیر آج کل قومیں جنگ آزما نہیں ہو سکتیں۔ جس ترقی کے ہم خواہاں ہیں وہ اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ سائنس کو ملک میں عمومیت صرف اپنی زبان ہی کے ذریعے سے حاصل ہو سکتی ہے۔

اس جنگ کے دوران میں ہم نے یہ بھی معلوم کر لیا ہے۔ کہ ہمارے جذبات اور احساسات میں حرکت پیدا کرنے کیلئے ہماری، زبان ہی آڑے وقت کام آسکتی ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی ہم پر عیاں ہو جانی چاہیئے کہ سائنسی تحقیقات کے لئے والہانہ شوق پیدا کرنا اپنی زبان کے ہی ذریعہ سے ممکن ہے۔ اگر علوم غیر زبانوں میں ہوتے ہیں، تو ان سے مغائرت قائم رہتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہماری تعلیم کا سب سے بڑا نقص یہ رہا ہے کہ ہم اپنی معلومات کو اپنی زندگی سے بالکل علیحدہ سمجھتے رہے ہیں۔ اور ان میں ہم آہنگی پیدا کرنے سے اب تک قاصر ہیں۔ یہ بات ہمارے یہاں اسی وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ غیر زبانوں کے ذریعہ ایسے خیالات اور تصورات ہمارے دماغوں میں نشوونما پاتے ہیں جن کا ہماری زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا جس کی وجہ سے ہم حقیقتاً دو دنیاؤں میں رہتے ہیں۔ ایک دنیا ہمارے خیالات اور تصورات کی ہوتی ہے۔ اور دوسری حقائق کی اور ہم ان میں مطابقت پیدا نہیں کر سکتے۔ اگر ہمیں اپنی کوششوں اور اپنی مادی خوشحالی کو آگے بڑھانا ہے تو اپنے تصورات اور حقائق کی دنیا میں ہم آہنگی پیدا کرنی پڑے گی۔ اور میں پورے وثوق کے ساتھ یہ گذارش کروں گا کہ یہ صرف اپنی زبان سے ہی ہو سکتا ہے۔

میں نے اس تقریر کی ابتداء میں یہ بھی سوال کیا تھا کہ کیا اردو زبان حقیقتاً ایسی ناکارہ ہے کہ علمی مسائل اور خصوصاً سائنس کے

نکات کو بیان نہ کر سکے۔ اس کے جواب میں سب سے پہلے تو میں یہ عرض کروں گا کہ زبانوں کی یہ فطرت ہوتی ہے کہ جتنے عرصے تک ہم کسی زبان کو استعمال نہیں کرتے اسی حد تک وہ زبان رجعت پذیر رہتی ہے اور رفتہ رفتہ پسماندہ ہو کر بیکار ہو جاتی ہے زبانیں دنیا میں ہمیشہ اسی طرح ترقی کرتی ہیں کہ ان سے پوری طرح کام نہیں لیا جاتا تو وہ زنگ آلود ہو جاتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ فی الوقت اُردو میں ایسی صلاحیت موجود ہے کہ وہ سائنسی تصورات کو بطریق احسن پیش کر سکے۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ آزادی سے قبل جامعہ عثمانیہ میں اعلیٰ تعلیم، اُردو زبان کے ذریعہ سے دی جاتی تھی؟ جناب مہمان خصوصی اس امر کے شاہد ہوں گے، اس لئے کہ انہوں نے خود جامعہ عثمانیہ میں تعلیم پائی ہے اور اس کے بعد اس میں اُستاد اور اس کے امیر بھی رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارے ہاں آج کل بھی اُردو کالج میں بی ایس سی تک تعلیم اُردو میں دی جا رہی ہے اور خود اس جامعہ میں ہم نے جو قدم اٹھائے ہیں ان سے بھی ظاہر ہو چکا ہے کہ اُردو میں تعلیم کا دیا جانا کچھ دشوار نہیں ہے۔

بہت سے حضرات اصطلاحات کا مسئلہ اٹھاتے ہیں۔ یہ مسئلہ اتنا مشکل نہیں ہے جتنا اسے بتایا جاتا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ معلوم ہونا چاہئیے کہ مختلف علوم و فنون سے متعلق بکثرت اصطلاحات وضع کی جا چکی ہیں اور انہیں بے تکلفی کے ساتھ استعمال کیا جا رہا ہے۔ یہ بات ان کتابوں اور اسباق سے جنھیں ہم نے اس جامعہ میں تیار کیا ہے آشکارا ہو چکی ہے پھر خود اس سوسائٹی کی کانفرنسوں میں جو مقالات پڑھے جاتے ہیں اور جو مضامین سوسائٹی کے رسالہ "جدید سائنس" اور مجلس تحقیقات سائنس و صنعت کے رسالہ "کاروان سائنس" میں شائع ہوتے ہیں وہ موضوعات کی دقت کے باوجود اس امر کا بین ثبوت پیش کرتے ہیں کہ سائنسی معلومات کا اظہار اُردو کی دسترس کے باہر نہیں ہے یہ بھی ملحوظ رہے کہ کسی زبان میں اس وقت تک اصطلاحات قبول عام حاصل نہیں کرتیں جب تک کہ اس زبان کو درس و تدریس اور بحث و تمحیص کے لئے استعمال نہ کیا جائے ہم یہ نہیں دیکھتے کہ جب سے اُردو اخبارات میں اور ریڈیو پر اُردو کو خبروں کی نشر و اشاعت کے لئے وسیع پیمانے پر استعمال کیا گیا ہے، ہم نے اظہار خیال اور بیان واقعات کے لئے کتنے نئے اسلوب پیدا کر لئے ہیں۔ مجھے تو اب تک ایسا اتفاق نہیں ہوا کہ خبروں کو اُردو میں سُنا ہو اور کسی قسم کی کمی، محسوس کی ہو۔ دوسری طرف ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ عدم استعمال کے باعث ہماری زبان کے بہت سے مفید الفاظ متروک ہو کر فراموش ہوتے جا رہے ہیں۔ اور اس طرح یا تو ان خیالات سے زبان تہی دامن ہوتی چلی جاتی ہے جو ان الفاظ سے ہی ادا ہو سکتے تھے یا غیر ملکی الفاظ ان کی جگہ لے لیتے ہیں اور زبان کی لطافت پر بجلیاں گرا کر اسے کثیف بنا دیتے ہیں۔ کیا ہمیں یہ گوارا ہوگا کہ علمی مباحث میں عدم استعمال کے باعث ہماری زبان میں صرف یہی صلاحیت باقی رہ جائے کہ اس میں مائیں اپنے بچوں کو لوریاں سنایا کریں۔ اگر ہمیں اپنی زبان کو یہی مقام دینا ہے تو ہمیں چاہئیے کہ اپنی ثقافت، اپنی آزادی خیال اور اپنے قومی وجود پر ماتم کریں۔

میں آپ سب حضرات سے معافی کا خواستگار ہوں کہ میں نے اتنی دیر تک آپ کی سمع خراشی کی۔ مگر میرا عذر یہ ہے کہ یہ امور ایسے ہیں جو میرے نزدیک قابل گذارش تھے اور اسی وجہ سے میں نے انہیں پیش کیا ہے۔ مجھے اس بات کا احساس ہے کہ آپ حضرات کی خاطر مدارات اس درجہ نہیں ہو سکی جس درجہ ہم کرنا چاہتے تھے اس میں ہماری بہت سی مجبوریوں کو دخل ہے لیکن مجھے اُمید ہے کہ اس کمی سے

ہمارے خلوص کا اندازہ نہیں لگائیں گے اور یہ نہ سمجھیں گے کہ ہم آپ کی خدمت حتی المقدور نہیں کرنی چاہتے البتہ مجھے اُمید ہے کہ یہاں پر جو دلچسپ مذاکرے ہونگے اور جو فکر افروز مضامین پڑھے جائیں گے ان سے اس کوتاہی کی تلافی ہو جائے گی۔ اس لئے کہ آپ، تمام حضرات یہاں پر یقیناً ایک علمی مقصد کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ وہ معمولی صعوبتیں جو سفر یا آسائش کی کمی سے پیش آئی ہیں انہیں برداشت کرنا غالباً آپ کے لئے زیادہ دشوار نہیں ہوگا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہماری کوشش یہی ہوگی کہ جہاں تک ممکن ہے آپ کی آسائش اور آرام میں فرق نہ آئے۔

گرد و پیش

روس میں اردو کی تعلیم

۳۱ دسمبر کی ایک خبر مظہر ہے کہ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب حمید احمد صاحب سے روس کے جنوبی مشرقی ایشیا کے ثقافتی تعلقات کے ڈائرکٹر جناب ایم وینیلوف نے درخواست کی ہے کہ روس کی یونیورسٹی میں اردو پڑھانے کے لئے ایک پروفیسر بھیج دیا جائے انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ روس روسی زبان پڑھانے کے لئے پنجاب یونیورسٹی میں ایک پروفیسر بھیجنے کے لئے تیار ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری کے لئے روسی رسائل اور جرائد فراہم کرنے کا وعدہ بھی کیا ہے۔

قومی زبانوں کی ہم آہنگی

بنگالی اکادمی کے ڈائرکٹر سید علی حسن نے ڈھاکہ میں ۲۹ جنوری کو فرمایا ہے کہ بنگالی کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے سلسلے میں نصابی کتب کی تیاری کا انتظار نہ کیا جائے کیونکہ اعلیٰ سائنس، طب اور ٹیکنالوجی کے نصاب کی تیاری بڑی صبر آزما ہے اور ہمیں اس کا انتظار کئے بغیر بنگالی کو ذریعۂ تعلیم قرار دے دینا چاہیئے۔ انہوں نے کہا کہ بنگالی زبان بالخصوص ہر مضمون پر لیکچر دیئے جا سکتے ہیں اور ان ہی سے نصاب کی تیاری میں مدد لینا چاہیئے۔ علی حسن صاحب نے مزید فرمایا کہ اس طریقہ کار سے معلموں اور طالب علموں کو مضمون کی تدریس اور تعلیم میں مدد ملے گی۔ انہوں نے کہا بنگالی میں فنی اصطلاحات وضع کرنے والے اداروں کو اصطلاحات کا جائزہ لینا چاہیئے جو اردو میں اختیار کی جا چکی ہیں۔ تاکہ اگر ممکن ہو سکے تو دونوں صوبوں کے درمیان جدید اصطلاحات میں ہم آہنگی پیدا کی جا سکے۔ علی حسن کی یہ تجویز نہایت مستحسن ہے اور اگر اس پر عمل ہو گیا تو دونوں قومی زبانوں کو ایک دوسرے سے قریب آنے کا خواب بڑی حد تک پورا ہو سکتا ہے۔

بی ایس سی کے پرچے

لاہور میں بی ایس سی کا امتحان دینے والے کئی امیدواروں نے استدعا کی ہے کہ چونکہ یونیورسٹی نے اردو کو متبادل ذریعۂ امتحان کی حیثیت سے تسلیم کر لیا ہے اس لئے بی ایس سی امتحانی پرچے بھی انگریزی اور اردو دونوں میں مرتب ہونے چاہئیں۔ یونیورسٹی کے اعلان کے مطابق وائس

پنجاب یونیورسٹی نے فیصلہ کیا ہے کہ ۱۹۶۶ء میں بی ایس سی کے امتحانی پرچے اردو انگریزی دونوں زبانوں میں چھاپے جائیں گے۔

علمی۔ادبی۔تہذیبی اور تعلیمی خبریں

پندرہ سرکاری زبانوں کا ملک

سوویت روس میں پندرہ سرکاری زبانیں ہیں جو اس کی پندرہ جمہوریوں کی سرکاری اور علاقائی زبانیں ہیں۔ ویسے تو روس میں کم و بیش ۱۲۰ زبانیں اور بولیاں ہیں، مگر انقلاب روس کے بعد ان میں سے ممتاز زبانوں کو بڑی ترقی دی گئی۔ ان میں تراجم کئے گئے، اخبارات اور رسائل نکالے گئے۔ انہیں اسکولوں اور کالجوں میں ذریعہ تعلیم قرار دیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ان پندرہ جمہوریوں میں ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے جسے ناخواندہ کہا جا سکے۔

شاعر مشرق کا مزار

شاعر مشرق علامہ اقبال کا مزار بند ہوگیا ہے۔ جس کی وجہ سے غیر ملکی سیاحوں اور اقبال کے نیاز مندوں کو کافی پریشانی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ مزار کے بند ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے چوکیدار کو دس ماہ سے تنخواہ نہیں مل سکی ہے۔ جو صرف پچاس روپے ماہوار ہے۔ واضح رہے کہ مزار کا انتظام اقبال کمیٹی کے سپرد ہے۔

بزم ثقافت کی تجویز

بزم ثقافت نے یوم قائد اعظم پر ڈاکٹر وحید قریشی کی اس تجویز پر صاد کیا ہے کہ قائد اعظم کی ایک مستند سوانح عمری شائع کی جائے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنی تقریر میں اس تجویز کو پیش کیا اور کہا کہ یہ نہایت افسوسناک امر ہے کہ پچھلے سترہ سال میں قائد اعظم کی مستند سوانح حیات شائع نہ ہو سکی۔ انہوں نے کہا کہ ایسے بہت سے لوگ ابھی بقید حیات ہیں جن سے یہ مواد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ محترمہ فاطمہ جناح کے پاس قائد اعظم کا سرمایہ حیات محفوظ ہے جس کو یکجا کر کے قومی سرمایہ کی حیثیت سے شائع کرنا بے حد ضروری ہے۔

کراچی اور اردو

جماعت اسلامی کراچی کے معتمد اور صوبائی اسمبلی کے رکن جناب محمود اعظم فاروقی نے اس پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ مغربی پاکستان کے تمام صوبے گو کہ ایک وحدت میں عرصہ ہوا ضم کئے جا چکے ہیں مگر اس کے باوجود کراچی میں مقامی زبان سندھی کی پہلی حیثیت برقرار ہے۔ جب کہ کراچی اور مضافات کراچی کی اکثریت کی زبان اردو ہے۔ انہوں نے کہا کہ حیرت ہے کہ کراچی کے سرکاری ملازمین کی سالانہ ترقی کے لئے سندھی زبان جاننے کی شرط رکھی گئی ہے جب کہ سندھی زبان سیکھنے اور اس کے

ن کا سرے سے کوئی سرکاری انتظام ہی نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ بات بہت ناروا ہے کہ سندھی نہ جاننے کی
ے سرکاری ملازمین کو ترقی نہ دی جائے۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ ترقی کی اس بے معنی شرط کو فوراً ختم کیا جائے اور اردو
ں کی علاقائی زبان قرار دیا جائے۔

سندھی ادبی مرکز

سندھی ادبی جماعت کراچی نے اردو سندھی ادبی مرکز قائم کیا ہے جس کا مقصد سندھی اور سرائیکی زبان کے نادر شاہ پاروں کو اردو زبان میں منتقل کرکے شائع کرانا ہے
ادبی مرکز کی جانب سے سندھی کی کتابیں اردو میں منتقل کی جارہی ہیں۔ جن میں شاہ جو رسالو اور "دیوان سرمست" قابل ذکر ہیں۔

مجید کے موضوعات کا اشاریہ

اسلامی تحقیقاتی ادارے نے قرآن مجید کے موضوعات کو مختلف عنوانات کے تحت جمع کرنے اور ان کا اشاریہ تیار کرنے کے
لمیل پر اظہار اطمینان کیا ہے۔ اس کے علاوہ چھ اور منصوبوں پر بھی کام مکمل ہوگیا ہے۔ اور باقی منصوبوں
دآمد کرانے کے لئے فنڈ کا جائزہ لیا جارہا ہے۔ یہ ادارہ کراچی سے راولپنڈی منتقل کیا جارہا ہے۔

کے ادب پر انعام

ترقی اردو بورڈ اور ادارۂ مصنفین پاکستان کے مشترک ادبی انعامات (جو بچوں کے ادب کے سلسلے میں دیئے گئے ہیں) کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ جن
ت پر انعام دیئے گئے ہیں ان کے عنوانات یہ ہیں۔ سات رنگ (کہانی)۔ میری نظمیں۔ جغرافیائی کہانیاں۔
ں کی دنیا (فلکیات) بے زبانوں کی دنیا (حیوانیات) ایک اور ایک (ریاضی) انتخاب کرنے والی کمیٹی میں یہ
ے شامل تھے۔ میجر آفتاب حسن۔ جلیل قدوائی۔ ابن انشا۔ ہاجرہ مسرور۔

مصنفین پاکستان
ی سالگرہ

۳۱ جنوری کو ادارۂ مصنفین پاکستان کی ساتویں سالگرہ پر اپنے ایک خصوصی پیغام میں صدر مملکت نے کہا ہے۔" ادیبوں اور شاعروں کو قومی اتحاد، یکجہتی اور عزم کو پہلے سے بھی زیادہ مضبوط بنانے کی جدوجہد جاری رکھنی
۔ملک کے ادیبوں کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے صدر نے کہا کہ حالیہ بحران میں ادیبوں اور شعراء کا کردار
ہا ہے۔ انہوں نے پاکستانی ادیبوں اور شاعروں کو مشورہ دیا ہے کہ وہ افریقی ایشیائی ادب پر زیادہ
ں گے

ادارۂ مصنفین پاکستان کی ساتویں سالگرہ اپنی روایتی عظمت وشان سے ہوٹل میٹروپول میں منائی گئی۔
صدارت مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے چیف جسٹس جناب انعام اللہ خاں نے فرمائی۔ آپ نے خطبۂ صدارت
اد فرمایا۔" قلم ایک دودھاری تلوار ہے جس سے تعمیر اور تخریب دونوں کام لئے جا سکتے ہیں۔ لیکن ان کا انحصار

خود ادیب پر ہوتا ہے۔ آپ نے کہا ادیب کو سستی شہرت کو اپنا اصول یا مطمع نظر نہیں بنانا چاہیئے بلکہ آزادی اور دیانتداری سے اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہیئے۔" جناب جسٹس انعام اللہ نے پاکستانی ادیبوں کی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا۔

ادارہ کی ساتویں سالگرہ میں ملک کے تمام ممتاز دانشور شریک تھے۔ ادارہ کے قائم مقام معتمد عمومی جناب جمیل الدین عالی نے سپاسنامہ پیش کرتے ہوئے ادیبوں اور شاعروں کی خدمات پر روشنی ڈالی اور ادارے کی کارکردگی کا جائزہ پیش کیا اور محب وطن افراد کی توجہ ادارے کی خدمات کی طرف مبذول کراتے ہوئے کہا کہ صدر مملکت نے جس طرح ادیبوں کی سرپرستی کی اگر دوسرے حضرات بھی اسے مثالی بنالیں تو ادارہ مصنفین پاکستان کو اپنے منصوبوں کی تکمیل میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔

اس موقع پر جناب ظہیر الدین لال میاں، جناب ممتاز حسن اور جناب فیض احمد فیض نے بھی جلسے کو خطاب کیا اور اہم ادبی مسائل پر روشنی ڈالی۔

ادارۂ مصنفین پاکستان نے اپنی اس تقریب میں ۱۹۶۵ء کے ادبی انعامات کا اعلان بھی کیا۔ جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔ آدم جی ادبی انعام۔ مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے مرحوم چیف جسٹس محمد رستم کیانی کی کتاب "افکار پریشان" کو دیا گیا۔ یہ انعام دس ہزار روپے کا ہے۔ دس ہزار کا دوسرا انعام "داؤد ادبی انعام" کی دو کتابوں پر دیا گیا۔ پہلا انعام ڈاکٹر محمد اسلم فرخی کی کتاب محمد حسین آزاد پر اور دوسرا سید نور احمد کی تالیف "مارشل لا سے مارشل لا تک" پر دیا گیا۔ نیشنل بینک کا ادبی انعام حمید عسکری کی کتاب "مادے کے خواص" اور پروفیسر قمر الحسن صدیقی کی کتاب "زراعت اور ہماری معشیت" پر دیا گیا۔ ان کتابوں کے مصنفین کو پانچ پانچ ہزار روپے دیئے گئے۔ بنگالی اور انگریزی کتابوں پر الگ انعامات دیئے گئے۔

آئینہ خانے میں

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کا خطبہ

سائنٹفک سوسائٹی کی ساتویں سالانہ کانفرنس میں کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے اپنے خطبہ استقبالیہ میں قومی زبان کی اہمیت کے ضمن میں جاپان اور چین کی ترقی کا خصوصی طور پر ذکر کیا اور کہا "اس سلسلے میں یہ سوال ذہن میں آتا ہے کہ کیا پاکستان میں کوئی ایسی خصوصیت ہے کہ وہ اپنی زبان کے ذریعے ترقی نہیں کر سکتا یا اس کی زبان میں اتنی اہلیت نہیں ہے کہ وہ ہر قسم کی معلومات اور اظہار خیال کو اپنے دامن میں سمیٹ سکے۔ انہوں نے چین و جاپان کی مثال دی اور کہا کہ انہوں نے اپنی اپنی زبانوں میں علوم کو پڑھ کر قابل رشک ترقی کی ہے۔

قاضی انوار الحق کا خطاب

پاکستان کے وزیر تعلیم صحت اور معاشرتی بہبود، قاضی انوار الحق نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ حکومت قومی زبانوں کو ریعہ تعلیم بنانے کے سلسلے میں مناسب اقدام کر رہی ہے۔ حکومت نے نصابی کتب اور اصطلاحات کے ترجمے کے لئے اردو اور بنگالی بورڈ قائم کر دیئے ہیں۔ آپ نے مزید کہا کہ حکومت اردو کو ذریعہ تعلیم قرار دیتے ہوئے اس بات کا خیال رکھے گی کہ ترجمے کا معیار گرنے نہ پائے۔

یادوں کے چراغ

یوم حالی

شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی کو مغربی پاکستان کے طول و عرض میں خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ یوم حالی پر لاہور میں بی۔ این۔ آر سینٹر میں ایک خصوصی محفل کا انعقاد ہوا۔ جس میں مولانا حالی کو بر دست خراج عقیدت پیش کیا گیا اور کہا گیا کہ انہوں نے برصغیر پاک و ہند میں جس کام کا آغاز کیا تھا وہی تشکیل پاکستان نکمیل کو پہنچا۔ اس محفل کا اہتمام ادارہ معارف اسلامیہ نے کیا تھا اور اس کی صدارت اے ڈی اظہر فرما رہے تھے۔ جن قررین نے جلسے کو خطاب کیا ان میں شورش کاشمیری۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید۔ وارث میر اور جناب شبلی بی کام ابلِ ذکر ہیں۔

جوہر کی یاد میں

پاکستان میں مولانا محمد علی جوہر کا یوم وفات بڑی عقیدت سے منایا گیا۔ ادارۂ ملت اسلامیہ پاکستان کی جانب سے ایک جلسہ عام لاہور میں منعقد ہوا۔ جس میں مولانا محمد علی جوہر خراج تحسین پیش کیا گیا۔ جلسے کی صدارت صوبائی وزیر تعلیم ملک خدا بخش بچّا لے کی۔ مقررین نے مولانا محمد علی کو رصغیر ہند و پاکستان کا سب سے پہلا رہنما قرار دیا جس نے عوام کو منزل آزادی سے روشناس کرایا۔ جلسے میں کہا یا کہ مولانا محمد علی جوہر کو ہند و پاک کے مسلمانوں کی فکری، نظری، ذہنی، تہذیبی، تمدنی، اور سیاسی تاریخ سے سی طرح بھی خارج نہیں کیا جا سکتا۔ جلسے کو خطاب کرنے والوں میں صدر جلسہ کے علاوہ خان غلام محمد خاں لوند خور ورش کاشمیری۔ عبدالسلام خورشید اور سید مظفر علی شمسی کے نام شامل ہیں۔ اس موقع پر شعراء نے اپنا کلام بھی سنایا م جوہر پر اخبارات نے خصوصی مقالے شائع کئے۔

ے ٹی ایم مصطفےٰ کی یادگار

تحریک پاکستان کے سرگرم کارکن اور سابق مرکزی وزیر تعلیم جناب اے ٹی ایم مصطفےٰ کی اچانک موت پر سارے ملک میں سخت رنج نسوس کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ پیغام تعزیت دینے والوں میں صدر مملکت کے علاوہ وزیروں، سفیروں ادبی و سیاسی خصیتوں کے علاوہ معاشرے کے ہر طبقے کے افراد شامل ہیں۔ جناب اے ٹی ایم مصطفےٰ کی ایک یادگار قائم کرنے کی

تجویز بھی زیر غور ہے ۔

ماتم میں ہم شریک

تلوک چند محروم کا انتقال اردو دنیا میں یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ سنی جائیگی کہ اردو تحریک کے پرانے کارکن اور ممتاز شاعر جناب تلوک چند محروم کا انتقال ۶ جنوری کو دہلی میں ہوگیا ۔ مرحوم کی متعدد تصانیف ہیں ۔ انہوں نے اردو تحریروں کا ایک گراں قدر سرمایہ چھوڑا ہے ۔ جناب محروم ان محبان اردو میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے ساری زندگی اردو کی خدمت میں گزار دی ۔ ادارۂ قومی زبان اس سانحہ پر دلی افسوس کا اظہار کرتا ہے اور مرحوم صاحب کے صاحبزادے جگن ناتھ آزاد کے غم میں برابر کا شریک ہے ۔

مولانا ناصر جلالی کی رحلت ملک کی ممتاز دینی شخصیت ۔ صوفی اور شاعر مولانا ناصر جلالی کا انتقال کراچی میں ہوگیا ۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون ۔ مولانا ناصر جلالی کراچی کی ایک اہم شخصیت تھے اور گزشتہ کئی سال سے یہاں کے دینی اور ادبی حلقوں میں ان کے فیض کا چشمہ جاری تھا ۔ وہ یہاں سے ایک پرچہ بھی نکال رہے تھے ۔ جو دینی اور علمی خدمات انجام دے رہا تھا ۔

بدرالحسن صاحب کی وفات حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی کے بانی اور اردو کے پرانے خادم بدرالحسن صاحب کا انتقال دہلی میں ہوگیا ہے ۔ بدرالحسن صاحب ایک تعلیم یافتہ صاحب دل ناشر تھے ۔ انہوں نے بعض نایاب کتابیں شائع کیں ۔ مرحوم کو لکھنے لکھانے سے بھی شغف تھا ۔ اور کسی زمانے میں جامعہ میں کچھ تحریریں بھی شائع ہوئیں ۔ آپ نے شاہراہ اور فنکار جیسے پرچوں کا اجراء کیا ۔ اور ساری عمر اردو کی خدمت میں کوشاں رہے ۔

گنج ہائے گراں مایہ

انجمن کے مخطوطات کی وضاحتی فہرست (جلد دوم)

مرتبہ افسر صدیقی امروہوی

دوسری جلد کے مندرجہ ذیل مخطوطات پر قومی زبان میں حواشی شائع ہو چکے ہیں

مخطوطہ	مصنف
۱۔ وصیت نامہ	......
۲۔ فتح المجاہدین	مسکین
۳۔ شفاعت نامہ	عبدالقادر
۴۔ قصہ شاہ جمجمہ	کمترین
۵۔ تلقین الہدیٰ	عاصی
۶۔ تنبیہ العوام	شاہ محمد حسن احقر
۷۔ مثنوی گوہر	ابراہیم گوہر
۸۔ حملہ حیدری	ذوالفقار علی صفا
۹-۱۰۔ محی الدین نامہ (دو نسخے)	عبدالملک عبید
۱۱۔ دیوان ہمت	خواجہ ہمت علی خاں
۱۲۔ گنج قدرت	اعزالدین خاں نامی
۱۳۔ فتح نامہ	یٰسین
۱۴۔ پند نامہ	جعفر زٹلی
۱۵۔ دیوان تمنا	اسد علی خاں تمنا
۱۶۔ تاریخ فیض عام	مہدوی
۱۷۔ حشر نامہ	......
۱۸۔ قصیدۂ غوثیہ	رحمت اللہ
۱۹۔ نصائح الاطفال	رضا
۲۰۔ نصیحت نامہ	.....
۲۱۔ مذمت بے نمازاں	....
۲۲-۲۶۔ شمائل نامہ (پانچ نسخے)	عبدالصمد ترین
۲۷-۲۸۔ تنبیہ نامہ (دو نسخے)	ولی
۲۹۔ معجزہ حضرت فاطمہ	فاروقی
۳۰-۳۲۔ دیوان فراق (تین نسخے)	ثناء اللہ فراق دہلوی
۳۳۔ صبح نوبہار عشق	محمد باقر آگاہ
۳۴۔ گلزار عشق	" " "
۳۵۔ ندرت عشق	" " "
۳۶۔ محبوب القلوب	" " "
۳۷۔ " " (نسخہ ثانی)	" " "
۳۸۔ آدم نامہ	دولت قلندر
۳۹۔ شہادت حضرت قاسم	ولی ویلوری
۴۰۔ معراج نامہ	محمد بن مجتبیٰ مہدوی
۴۱۔ مولود سرور عالم	مختار

اس شمارے میں مندرجہ ذیل مخطوطات پر حواشی دیئے جا رہے ہیں

مخطوطہ	مصنف
۱۔ تعلیم الصلوٰۃ	محمد رفیع الدین
۲۔ خزانہ حسنات	سید امام الدین علی کامل دہلوی
۳۔ کنز المتقی	غلام علی بسمل
۴۔ مصباح الصلوٰۃ	شاہ سعید الدین کرنولی
۵۔ روضۃ الاسلام	محمد باقر آگاہ ویلوری

تعلیم الصلوٰۃ

سائز ۷ ½ × ۵ ½ صفحات ۵۲ سطور ۹ سنہ تصنیف ۱۳۲۴ھ سنہ کتابت ۱۳۲۴ھ

تعلیم الصلوٰۃ کے مرتب کا نام محمد رفیع الدین بن مولوی حاجی محمد حمید الدین ہے انہوں نے یہ رسالہ اپنے چھوٹے بچوں کو آئین عبادت سکھانے کے لئے آسان اردو میں زبانی یاد کرنے کے واسطے لکھا تھا اس کی ۱۵ فصلوں میں ایک سو تیس فرائض کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ مخطوطہ ہذا رفیع الدین صاحب کے اپنے قلم کا ہے اس میں کئی جگہ ردو بدل کیا گیا ہے۔ رفیع الدین کو شعر گوئی میں بھی مہارت تھی چنانچہ کتاب کے آخر میں دو قطعات سنہ تصنیف انہی کے کہے ہوئے موجود ہیں۔ ان میں سے ایک اردو میں ہے اور ایک فارسی میں۔ اردو کا قطعہ تاریخ یہ ہے ؎

شکر للہ یہ رسالہ پایا رنگِ اختتام اس زماں میں ہے زبان ریختہ مثل حیات
بہرِ نفعِ عام یہ نسخہ لکھا اور اس کے سنہ واہ کی روسے رفیعا اردو تعلیم الصلوٰۃ

مصنف کا بیان ہے "اور رسالہ منظومہ کو کہ جس کا نام "شرف المصلی" ہے اس کے آخر میں داخل کیا کہ تا احکام دارکان بھی تفصیلاً معلوم ہو جاوے" لیکن یہ منظومہ رسالہ مخطوطہ زیر تبصرہ کے ساتھ نظر سے نہیں گزرا۔ تعلیم الصلوٰۃ سے قبل پورے صفحہ پر لفظ مالکہٗ کے نیچے رفیع الدین کی مستطیل مہر ہے جس کی تحریر اس طرح ہے۔

اس مہر کے نیچے لکھا ہے ؎

الٰہی تو دے اس کو رنگِ قبول بحق محمد و آلِ بتول

آغاز:- ہزاروں شکر اس خدا کو کہ جس نے انسان خاکی بنیاد کو بتوفیق سجدے کے نور ایمان سے مشرف کیا اور اس کے باب میں وَمَا خلقت الجن والانس اِلّا لیعبدون کہا ؎

کیا ہے خاک سے پیدا ہمیں عبادت .... اپنی تا کریں

اختتام:- سترہ رکعت ہے نماز یعنی دو رکعت فجر کی اور چار رکعت ظہر کی اور چار رکعت عصر کی اور تین رکعت مغرب

کی اور چار رکعت عشا کی ۔

ایک سو تیس فرضاں ہے یہ سب کرے شمار

یعنی کل ایک سو تیس فرض ہے فقط تاریخ اختتام اس کی یہ زان فکر اس نمط سے تھی ۔

اس عبارت کے بعد قطعات تاریخ ہیں جن میں سے اردو قطعہ اوپر درج کیا جا چکا ہے ۔

خزانۂ حسنات

سائز ۷ ½ × ۵ ½ صفحات ۳۹۲ سطور ۱۷ سنہ تصنیف ۱۱۸۲ھ سنہ کتابت ۱۲۴۶ھ

یہ ضخیم و مبسوط کتاب سید امام الدین علی دہلوی کی مترجمہ ہے جو فقیر الہند کہلاتے تھے اور شاعری میں کامل تخلص کرتے تھے ۔ اصل کتاب کا نام مفتاح الصلوٰۃ ہے جو شیخ فتح محمد محدث برہان پوری کی گرانقدر تصنیف ہے ۔ خزانۂ حسنات اس کا تاریخی نام ہے جس سے ۱۱۸۲ھ برآمد ہوتے ہیں ۔ مترجم کا بیان ہے کہ جب وہ تفسیر محمدی ۔ فتاویٰ جہانگیری بشرح فتوح الحرمین ۔ شرح تکمیل الایمان ۔ شرح نام حق اور شرح کریما و عقائد حضرت جامی سے فارغ ہوئے تو برائے افادہ خاص و عام مفتاح الصلوٰۃ کے اردو ترجمے کی طرف توجہ کی ۔

خزانۂ حسنات میں فرائض و واجبات و سنن کی تعریفات کے بعد وضو، نماز اور اس کے متعلقات کو نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا گیا ہے ۔ جا بجا ماخذات کے حوالے بھی ہیں ۔

مترجم کا بیان ہے کہ " تمام کیا ہم نے اس رسالے کو واسطے شیخ احمد بن سلیمان کے کہ ہمشیرزادوں سے اس فقیر کے ہیں بواسطہ صلہ رحمی کے تالیف کیا گیا "

مخطوطہ زیر تبصرہ نواب محمد رحیم اللہ خاں بہادر شمشیر جنگ فرزند نواب ناصر الدولہ اعتصام جنگ بہادر محمد حبیب اللہ خاں کی فرمائش کے مطابق نقل کیا گیا ہے اور اس لحاظ سے خاص اہمیت رکھتا ہے ۔

آغاز :-

حمد حق دمبدم ہزار کروں ۔ شکر ہر لحظہ بے شمار کروں

غافل حمد حق کا بندہ نہیں ۔ مردہ دل اصل میں ہے زندہ نہیں

محمد سوں تازہ زندگانی ہے　　موجب عیش جاودانی ہے

حمد کی (۹) ابیات کے بعد نعت شریف کی (۹) ابیات لکھی ہیں آخری بیت یہ ہے سے

بخ کو کا ٓمں ملے ز کوثر آب　　ہے جو الفت بعزّت و اصحاب

پھر مناجات کی (۱۲) اور تنبیہہ بے خبراں کی (۱۴۱) ابیات لکھ کر اس طرح نثری تصنیف کی ابتدا کی ہے۔

اما بعد یہی گوید امیدوار رحمت حضرت غنی سید امام الدین علی دہلوی عرف فقیر الہند کامل تخلص

اختتام :-

نعمت حق پر واجب از ہر مو　　سجدۂ شکر ہے دوگانہ ہے

یادگاری تری سوں اے کامل　　نسخۂ چند ہر زمانہ ہے

بحمد اللہ سبحان والحمد للہ اول وآخر والصلوٰۃ علے باطناً وظاہراً وعلی آلہ وصحبہ

توقیعہ :- بتاریخ بیست ونہم شہر ربیع الثانی ۱۲۴۶ھ ہجری مقدس روز یکشنبہ تمت الکتاب بعون ملک الوہاب بحسب فرمائش نواب معلی القاب مشفق نواب محمد رحیم اللہ خاں بہادر شمشیر جنگ فرزند نواب ناصر الدولہ بہادر اعتصام جنگ محمد حبیب اللہ خاں دام اقبالہ بید عاصی پُر معاصی احمد علی خاں ابن انور علی خاں بہادر مرحوم مغفور در کنا س پیٹ متعلقہ مدراس بوقت یکپاس روز برآمدہ ۔

کنز المصلّی

سائز ۸ × ۴ صفحات ۲۰ سطور ۱۱ سنہ تصنیف ۔ سنہ کتابت ۱۲۹۰ھ

یہ (۱۹۰) ابیات کا منظوم رسالہ فقہ بسمل تخلص کے کسی شاعر کی تصنیف ہے سے

سنو مومنوں یہ بیاں دل ستی　　کہ ہے یادگاری یہ بسمل سنی

بسمل کے حالات نامعلوم ہیں لیکن قیاس ہوتا ہے کہ شاید اس مخطوطہ کے مصنف غلام علی بسمل مدراسی ہوں جو ۱۲۹۰ھ میں زندہ تھے اور جن کے کلام کا مجموعہ ادارۂ ادبیات کے کتب خانہ میں ہے (تذکرۂ مخطوطات سوم صفحہ) کنز المصلّی کا کاتب زیادہ تعلیم یافتہ نہیں ہے اس نے کتاب کا نام بھی کنزل المصلّی" لکھا ہے اور بزرگوں کا املا ذ سے ہے

کنز المصلی کا ایک مخطوطہ کتب خانہ کلیہ عثمانیہ حیدرآباد میں ہے جس کا نام پروفیسر سروری نے کنز المسائل لکھا ہے۔ (فہرست مخطوطات کلیہ ص۵۹) معلوم نہیں کہ نام کے بدلنے کی غلطی کس کاتب سے سرزد ہوئی بظاہر کنز المصلی نام زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

مخطوطہ زیر تبصرہ اور کلیہ عثمانیہ کے نسخوں میں قدرے لفظی فرق بھی ہے لیکن یہ زیادہ اہم نہیں ہے۔

آغاز:۔

الہی ثنا اور صفت کر تمام — کہوں میں نبی پر درود اور سلام

صفت پھر کروں آل و اصحاب کی — کہ تابع ہیں جن کے سبھی اُمتی

ابوبکر صدیق، عادل عمر — ہیں تس بعد عثمان علی نامور

اختتام:۔

مطالعہ کرے جو کہ یہ مختصر — دعا سیتی عاجز کے تین یاد کر

سخن میرا ہے گر سراسر خطا — بزرگوں سے ہے مجکو چشم عطا

کیا میں نے اس مختصر کو تمام — محمد نبی پر درود اور سلام

ہرکہ خواند دعا طمع دارم — زانکہ من بندۂ گنہگارم

ترقیمہ:۔ تمت تمام شد الحمد للہ کتاب کنزل المصلی ماہ ربیع الاول ۱۲۹۰ھ بدست خط فدوی عبدالغفار خاں اتمام گشت۔

مصباح الصلوٰۃ

سائز ۹½ × ۵½ صفحات ۱۹۷ سطور ۱۵ سنہ تصنیف ۱۲۱۴ھ سنہ کتابت ۱۲۴۶ھ

فتح محمد برہان پوری کی مفتاح الصلوٰۃ کا ایک ترجمہ کامل دہلوی نے کیا تھا جس کا ذکر گزر چکا ہے یہ دوسرا ترجمہ ہے جو شاہ سعیدالدین کرنولی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ مترجم نے لکھا ہے کہ "جب میں تکمیل الایمان کے ترجمے سے

فارغ ہوا تو کئی مہربان دوستوں اور کرم فرماؤں نے مفتاح الصلوٰۃ کا ترجمہ کرنے کی فرمائش کی۔ یہ ترجمہ اس فرمائش کی تکمیل ہے ؎

مترجم نے تمہید میں امیر ابن الامیر کریم ابن الکریم نواب غلام رسول خاں بہادر والی ریاست کرنول کی تعریف و توصیف کی ہے اور انہیں انواع و اقسام کی بدعت موقوف کراکر شرعی احکام جاری کرانے کا مختار ٹھہرایا ہے ۔
مصباح الصلوٰۃ میں چار باب اور چالیس فصلیں ہیں جن میں طہارت و نماز کے تمام مسائل آگئے ہیں خط نہایت پاکیزہ نستعلیق ہے ۔ عنوانات سُرخ روشنائی سے لکھے گئے ہیں ۔

مصباح الصلوٰۃ کی طباعت بھی ہو چکی ہے مطبوعہ مصباح الصلوٰۃ کا ایک نسخہ جو جمادی الاول سنہ ۱۲۷۰ھ میں مطبع اسماعیلیہ بمبئی سے شائع ہوا تھا انجمن کے کتب خانۂ خاص میں موجود ہے اس کے خاتمۃ الطبع سے پتا چلتا ہے کہ اس سے پہلے ۱۲۶۲ھ میں مطبع رحمانی نے اسے چھاپا تھا لیکن ناپید و نایاب ہو گیا تھا۔

آغاز :- درود بعید اور سلام بعید محمد مصطفیٰؐ اور ان کی آل اطہار اور اصحاب کبار پر کہ جن کی اطاعت و فرمانبرداری سے دین و ایمان حاصل ہے اور خلاف حکمی سے دونوں باطل ؎

اونو کا جسم ہماری روح سے تھا پاک — گیا لحظے میں تب تو سات افلاک
مجسم کنج مخفی کا وہ تھا نور — گمس اور سایہ تھا اس واسطے دور
کسے طاقت ہے اس کی نعت بولے — زباں جز عجز کے ہرگز نہ کھولے

اختتام :- الحمد للہ علی کل حال ۔ مصباح الصلوٰۃ کا ترجمہ تین چار مہینے کے عرصے میں خاطر خواہ تمام ہوا۔ حق سبحانہ تعالیٰ میری اولاد کو اور اہل اسلام کو اس کے مسائل یاد کرنے سے دین کی مضبوطی اور اسلام کی قائمی عطا فرمائے اگرچہ مسائل وغیرہ بہت ہیں لیکن نماز کے واسطے اس قدر ازبر ہوا تو بس ہے اللہ مدد کرنے ہارا ہے ۔

ترقیمہ :- تمت تمام شد کتاب مصباح الصلوٰۃ از دست عاصی اضعف عباد اللہ السبحان سید عثمان بن سید عبدالقادر بتاریخ یازدہم شعبان المکرم روز چہار شنبہ بوقت سہ پاس روز تحریر یافت سنہ ۱۲۴۶ھ

مصباح الصلوٰۃ کا ایک مخطوطہ سر سالار جنگ کے کتب خانے میں ہے (فہرست ص ۱۰۳) اس نام کی ایک کتاب ادارۂ ادبیات میں بھی ہے لیکن اس کے مصنف کا نام قادر علی کمتر ہے (تذکرہ مخطوطات دوم ص ۸۲)

روضۃ الاسلام

سائز ۷ ½ × ۴ ½ صفحات ۱۵۱ سطور ۱۷ سنہ تصنیف ۱۲۱۴ھ سنہ کتابت ۱۲۲۴ھ

روضۃ الاسلام فقہ شافعی کا ایک منظوم رسالہ ہے جس میں بقول مصنف ؎

ہیں سب ابیات اوسکی بے تلبیس　　دو ہزار اور چار سو چوبیس

اس کے مصنف مولوی محمد باقر آگاہ ویلوری ہیں جن کے حالات جلد اول میں درج کئے جا چکے ہیں مخطوطہ کسی بدخط کاتب کا لکھا ہوا ہے۔ قدیم طرز املا نمایاں ہے۔ گ کو ک کی طرح لکھا ہے۔ ٹ کی علامت :: ہے کے لئے نیچے اس طرح ∴ تین نقطے لگائے گئے ہیں۔ عنوانات کی تعداد (۱۱۸) ہے۔ یہ سب فارسی زبان میں ہیں انہیں سرخ روشنائی سے نمایاں کیا گیا ہے۔

روضۃ الاسلام شروع کرنے سے قبل ایک صفحے پر عربی کی دو دعائیں ہیں اسی طرح دوسرے صفحہ پر ایک اور ہے جس کے عنوان میں لکھا ہے۔

روا باشد این دعا اگر پیش او باشد ہمانوقت مہربان گردد و اگر کسے در جنگ رود از تیر و تفنگ و ہمہ سلہا (سلاح) اماں باشد فتح و نصرت باز آید و دشمن مقہور گردد ہر کہ شک آرد کافر گردد نعوذ باللہ منہا۔

اس عنوان کے بعد دس سطری دعا نقل کی گئی ہے۔

آغاز:۔ حمد سے قبل یہ عنوان ہے " این کتاب روضۃ الاسلام در فقہ مذہب حضرت شافعی رضی اللہ عنہ ونعت کے سلسلے میں اپنی چند تصنیفات کا ذکر بھی کر گئے ہیں ؎

یں عقائد میں اے خجستہ خصال	اوسکی بعثت کا سب لکھا احوال
ہور لکھا ہوں ریاض بشت بہشت	جس سے سرسبز ہے امید کی کھشت
ہور فرائد میں اے ستودہ سیر	لکھا ذکر قرآن و حال خبر
ہور ریاض الجنان میں اے یار	کیا احوال اہلبیت اظہار
ہور لکھا ہوں بہ تحفۃ الاحباب	مختصر کچھ مناقب اصحاب
ہور لکھا تحفۃ النسا میں یہاں	اوسکی ازواج و بیٹیاں کا بیاں
ہور لکھا یک کتاب خوش اسلوب	جس میں ہیں سگے مناقب محبوب
اب میں لکھتا ہوں مسائل فقہ	تا خبردار ہوئے سائل فقہ

اصل کتاب شروع کرنے سے قبل حضرت امام شافعی کے نام ونسب، آبا و اجداد اور سوانح حیات بیان ئے ہیں جیساکہ ظاہر کیا جاچکا ہے مذہب شافعی کے مطابق تمام شعائر اسلام اور مسائل فقہ کا بیان تفصیل سے کیا گیا ہے

اختتام:- روضتہ الاسلام کے آخری باب میں آگاہ نے بتایا ہے کہ میری طبیعت ناساز ہو رہی ہ اور یہ مسائل بہت طویل ہیں اس لئے ؎

ہوئے گر عونِ مصطفٰےؐ یاور — اور بیاں میں لکھوں کتاب دگر

بن اسی طرح مختصر اے یار — جو ہے لکھنا ضرور تر اے یار

روضتہ الاسلام کی تصنیف کے بعد آگاہ ۶، ۷ سال زندہ رہے تھے خدا جانے دوسری کتاب لکھنے کا قع ملا یا نہیں ملا اگر کوئی ایسی کتاب لکھی تو اس کا نام کیا تھا؟

کتاب سے ملحق تین قطعات تاریخ تصنیف ہیں جو خود آگاہ کے لکھے ہوئے ہیں - پہلے قطعہ میں (۹) یات ہیں آخری بیت یہ ہے ؎

ناگہاں از سر امداد سروش — بول اٹھا "روضہ دین و اسلام"

روضہ دین و اسلام کے نیچے ۱۲۱۴ لکھے گئے ہیں - اس مرکب کے اعداد ۱۲۱۳ ہوتے ہیں جس میں سرامداد ، الف کا ایک شامل کیا گیا ہے -

دوسرے قطعہ میں سات ابیات ہیں اس میں بھی تعمیہ سے کام لیا گیا ہے ؎

کہا ناگاہ ہاتف از سرِ جد — ہے بیشک محمدی مذہب

موجودہ صورت میں آخری مصرعہ کے عدد ۱۱۹۶ ہوتے ہیں اور سرِ جد یعنی ج کے تین عدد شامل کرکے ۱۱۹۹ ن جاتے ہیں۔ مطلوبہ سنہ ۱۲۱۴ ہے - یہ کمی یہہ کے لفظ سے پوری ہوسکتی ہے جو آخری مصرع میں لکھنے سے رہ گیا ہے۔

تیسرا قطعہ (۶) ابیات کا ہے اس کی آخری بیت یہ ہے ؎

کہا سالِ اتمام ناگہ سروش — کہ ہے یہ عجب روضۂ دلنواز

ترقیمہ:- تمام شد کتاب روضتہ الاسلام فقہ حضرت امام شافعی رضی اللہ عنہ وکاتب الحروف عاجز محمد زماں در ۱۲۲۱ھ ہجری یکہزار و دو صد و بیست دو سال است در ماہ رمضان المبارک بروز دوشنبہ بتاریخ بیست ایک بوقت اولی بہار با تمام رسید۔

اس کے بعد یہ عبارت ہے۔

درکتاب مفتاح الجناں آوردہ است ہر کہ شب بیست و ہفتم ماہ رجب ہزار بار ایں استغفار بخواند خدائے تعالیٰ جملہ ناہاں اور ابکرم خویش عفو کند۔ دعا

استغفر اللہ ذَالجَلَالِ وَالاِکرَامِ مِن جَمِیعِ الذُّنُوبِ وَالاٰثَام

اُردو کے سپاہی

شمیم احمد

شاہد احمد دہلوی

۱۹۴۳ء میں جب میرے شعور نے آنکھ کھولی تو میں نے جن ناموں کا تذکرہ اپنے گھر میں شب و روز سنا اُن میں شاہد احمد دہلوی کا نام بھی شامل تھا - اس وقت میری عمر بمشکل دس سال ہوگی - اور تیرہ چودہ سال کی عمر میں مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ شاہد احمد دہلوی نہ ہمارے خاندان سے کوئی تعلق رکھتے تھے اور نہ خاندان میں کسی شخص نے انہیں دیکھا تھا بلکہ وہ تو ایک غیر آدمی تھے اور رسالہ ساقی کے ایڈیٹر تھے - یہ رسالہ ساقی، بھی یوپی کے مسلمان گھروں کی ثقافتی زندگی کا عجیب و غریب محور بن گیا تھا - کوئی پڑھا لکھا گھرانہ ایسا نہ تھا جہاں ساقی زندگی کی ایک لازمی ضرورت نہ ہو - اور کوئی نوجوان اور بچہ نہ تھا جس نے اپنی زندگی کی مادی سطح سے جب بھی اٹھنا چاہا تو ساقی نے اسے سہارا نہ دیا ہو - وہ ایک ایسا معلم تھا جس نے درسی کتابوں، اسکول اور کالجوں کی تربیت علمی، ادبی مجلسوں اور محفلوں کے ذوقِ ادبی کی ضرورت سے ہر گھر کو بے نیاز کر دیا تھا - " ساقی" نے کئی نسلوں کے ادبی ذوق کی تربیت کی تھی اور ادب کا ایک ایسا مذاق پیدا کیا تھا جس سے درس گاہیں اور علمی محفلیں خالی تھیں - اور یہ خدمت شاہد احمد دہلوی کی شخصیت نے بغیر کسی شعوری احساس کے انجام دی تھی - لاکھوں نوجوانوں کے ادبی ذوق کی تسکین اس طرح کرنا کہ جس سے ان کو ادب کی پرکھ کی متاع بے بہا حاصل ہوئی ہو اُن کے وجدان میں ادبی اقدار، زندگی کی سب سے اہم قدروں کی طرح رچ بس گئی ہوں - اور ان کا شعور جدید زمانے کا ساتھ دینے کے لئے اور معاشرہ کو بہتر سے بہتر معیار پر پہنچانے کی خواہش کا عادی ہو گیا ہو اور فکر و شعور کی ایسی جلا حاصل کر سکا ہو جو مستقبل کی ایک امید بھی ہو یقیناً ایک ایسی جلا حاصل کر سکا ہے جس کو بڑی سے بڑی " عملی خدمت " پیدا نہیں کر سکتی -

میں سوچتا ہوں کہ اگر ہمارے گھر میں " ساقی " باقاعدگی سے نہ آتا ہوتا تو شاید ہمیں ادب کی ماہیت سے وہ آگاہی کبھی بھی نہ حاصل ہو سکتی جس نے بہت ہی اقدار اور زندگی کے بہت سے شعبوں میں ہمیں اُن اقدار کے انتخاب کا موقع دیا جس کو اور [illegible] یاد کرتے ہیں - جیسا کہ [illegible] شاہد احمد دہلوی [illegible] آخری ایڈیٹر ساقی

ایسا مقام بھی کہ ہمارے سامنے آیا کہ جہاں شاہد احمد دہلوی اور رسالہ "ساقی" کا کاروان اور قافلہ لٹ گیا اور اس کے صفحات سے وہ نام آہستہ آہستہ غائب ہوتے رہے جنہوں نے ہمارے احساس اور فکر کی تعمیر کی تھی۔

نہ زادِ راہ نہ رہبر نہ منزلِ مقصود
عجیب شان سے یاروں کا کارواں نکلا

یہ ۱۹۴۷ء تھا۔ اور مملکت خداداد پاکستان اپنی مستحکم بنیادیں تلاش کر چکی تھی پرانے رشتے ٹوٹ گئے تھے جذبۂ معصوم کی وہ شراب بہہ چکی تھی جو عہد طفولیت کی سب سے رنگین اور پُر بہار فضاؤں کی امین تھی اقدار نئے معنی تلاش کر رہی تھیں آدرش تبدیل ہو چکے تھے اور "ساقی" کے زیر سایہ کئی نسلیں ماضی کو فراموش کر کے ایک نئے سفر کی تیاری کر چکی تھیں۔ اور انہیں شاہد احمد دہلوی عہد رفتہ کا وہ نشان نظر آ رہے تھے جن کو انہوں نے تنہا اور بہت دور پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ فرلانگ میلوں میں اور میل نئی شاہراہوں میں تبدیل ہو چکے تھے، جہاں شاہد احمد دہلوی ماضی کی داستان کا ایک ورق تھے مگر وہ ورق سوکھ رہا تھا اس کی روشنائی مدھم پڑ رہی تھی اور الفاظ دھندلا رہے تھے۔

یہ ۱۹۶۶ء ہے اور میں شاہد احمد دہلوی صاحب کے پاس بیٹھا ہوا قومی زبان کے لئے ان سے انٹرویو لے رہا ہوں۔

اردو کے مشہور ادیب، مترجم اور ماہر موسیقی شاہد احمد دہلوی ۱۹۰۶ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ وہ دہلی کے مشہور خانوادۂ علم و ادب سے تعلق رکھتے ہیں اور شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد کے پوتے ہیں۔ انہوں نے اپنی تعلیم حیدرآباد دکن، علی گڑھ اور دہلی کے انگریزی اسکولوں اور ایف سی کالج لاہور اور سینٹ اسٹیفن کالج دہلی میں مکمل کی۔ دہلی یونیورسٹی میں۔ بی اے آنرز اور ایم اے فارسی کے درس کی تکمیل کی۔ ۱۹۳۰ء میں انہوں نے "ساقی" کا اجراء کیا جو شمالی ہند کے ادبی پرچوں میں ممتاز ترین پرچہ شمار کیا جاتا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد شاہد صاحب دہلی سے کراچی منتقل ہو گئے اور ان کے ساتھ "ساقی" بھی۔ ساقی کے علاوہ انہوں نے "شاہجہاں" روزنامہ "انقلاب" اور ماہنامہ "نقش" کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیئے۔ شاہد احمد دہلوی ایک ایسے ادیب ہیں جن کو ادب کی موجودہ کساد بازاری میں صاحب طرز ادیب کا مقام حاصل ہے۔ وہ جتنے اچھے ادیب ہیں۔ اس سے بہتر مترجم ہیں۔ اُن کے بعض ترجموں پر طبع زاد ہونے کا گمان گزرتا ہے۔ گوکہ ان کی کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے مگر اُن کے بعض مضامین، سوانحی خاکے اور آپ بیتی پر مبنی کئی تحریریں ادب میں ان کا نام زندہ رکھنے کے لئے کافی ہیں۔ انہوں نے بحیثیت ناشر اردو ادب کو اور خصوصاً جدید ادب کو اپنی ناشرانہ کاوش اور متنوع ذوق آرائش سے مالا مال کر دیا ہے۔ انہوں نے کم و بیش دو سو کتابیں شائع کی ہیں شاہد احمد

ہمارے گھر کے ایک ایسے فرد بن چکے تھے جن کا تذکرہ شب و روز سردیوں کی راتوں میں اور گرمیوں کی شاموں میں اس طرح کیا جاتا تھا جیسے اگر وہ نہ ہوتے تو ہم بکھر جاتے۔ ہمیں کچھ بھی نہ معلوم ہوتا اور وقت کتنا گراں گزرتا۔ اور ہم کتنی چھوٹی اور مادی سطح پر زندگی بسر کر رہے ہوتے جس کو شاہد احمد دہلوی نے دریافت کیا اُسے گویا ہم نے دریافت کیا۔ جسے شاہد احمد دہلوی نے چاہا اس سے ہم نے محبت کی۔ جسے شاہد احمد دہلوی نے انتخاب کیا وہ ہمارے ادبی معیار کی کسوٹی بن گیا۔ جس کی تعریف شاہد احمد دہلوی نے کی اس کو ہم نے اپنی زندگی میں جگہ دے لی۔ یہ کیا طلسم تھا یہ کون سی تاثیر پذیری تھی یہ کیسا اخلاص تھا جس نے عظیم بیگ چغتائی۔ سید رفیق حسین۔ کرشن چندر۔ سعادت حسن منٹو۔ عصمت چغتائی اور محمد حسن عسکری کو ہم سے اس طرح متعارف کرایا کہ جیسے وہ ہمارے خاندان کے بچھڑے ہوئے لوگ ہوں۔ اور شاہد احمد دہلوی ان کو سر راہ کہیں سے پکڑ کر ہمارے گھر لے آئے ہوں کہ دیکھو یہ بھی تمہارے عزیز ہیں۔ وہ دور ختم ہوگیا۔ وہ زمانہ بدل گیا۔ جب زندگی کے بلند ترین سنگھاسن پر صرف ادب بیٹھ سکتا تھا۔ جب رسالے آدرش بنتے تھے اور ادیب و شاعر رہنما۔ پھر وہ زمانہ آیا کہ جب گھر کی چار دیواری اور گھر کا آنگن سیاسی جلسوں سے جا کر مل گیا اور ایک نئی نوع کی ہنگامہ خیزی ایک نئی طرز کی جذباتی خلش ایک انوکھی مگر وسیع دنیائے فکر ہماری زندگیوں پر حاوی آگئی۔ ادب جو گھر کا ساتھی تھا، اس نئی زندگی میں اپنی رہنمائی سیاست دانوں کو مستعار دے چکا تھا مگر وہ ان راستوں پر بھی ہمارے آگے آگے چلتا تھا۔ کیونکہ بڑے بڑے پنڈالوں اور وسیع پارکوں میں سیاسی نعروں اور سیاسی اسٹیج پر بھی ہمیں ابوالکلام آزاد۔ جواہر لال نہرو۔ حسرت موہانی اور مولانا محمد علی جوہر کے نام ادبی رسالوں کی سطح سے اٹھا کر ذہن اور نظریہ کی ان منزلوں تک لے جاتے تھے جو ہندوستان کی اقوام اور نسلوں کی موت و زندگی کا سوال بن گئے تھے۔ پھر وہ موڑ آیا کہ جب قائداعظم محمد علی جناح نے ہمیں ان رہنماؤں اور قائدین سے ایک بلند مگر اجنبی شاہراہ کا سراغ دیا۔ جو ادب سے تہی تھا اور خالص سیاسی صورت میں ہندوستان کے تمام مسلمانوں کا آخری اور واحد آدرش بن چکا تھا۔ یہ ۱۹۴۲ء کا زمانہ تھا۔ اور وہ شام ہمارے لئے کتنی محترم کتنی پُرطمانیت اور کتنی اعتماد بخش تھی کہ جب شاہد احمد دہلوی نے کھل کر مسلم لیگ کی تحریک کو ذہنی اور جذباتی طور پر قبول کرنے کا اعلان کیا تھا یہ وہ وقت تھا جب ہندوستان کے تمام رسالے مسلم لیگ اور کانگریس کی کشمکش کو فرقہ واریت اور تنگ نظری سے تعبیر کر رہے تھے۔ ہمیں شاید شاہد احمد دہلوی پر اتنا پیار اور اتنا اعتماد کبھی نصیب نہ ہوا تھا جیسا اس نگاہ اولیں نے بخشا تھا اور ہمیں یہ احساس ہوا تھا کہ ہمارے خاندان کے اس قدیمی رفیق نے ایک بار پھر رفاقت اور قیادت کا حق ادا کیا ہے۔ اور پھر جیسے جیسے "ساقی" ادیبوں کی تنگ نظری کا نشانہ بنتا رہا ویسے ویسے ہمیں شاہد احمد دہلوی نشانِ منزل اور متاعِ آرزو نظر آتے رہے۔ پھر ۱۹۴۶ء آیا اور ۱۹۴۷ء بھی۔ جو ایک

صرف ادب ہی تک محدود نہیں رہے بلکہ انہوں نے فن موسیقی میں بھی کمال حاصل کیا ہے ۔ وہ گزشتہ ۲۹ سال سے پاک و ہند کی موسیقی میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک رہے ہیں ۔ اور کراچی ریڈیو اسٹیشن سے اسی حیثیت سے متعلق ہیں اپنی گوناگوں اور متنوع خدمت کے باعث وہ پاکستان کی بیشتر ادبی انجمنوں، موسیقی کے اداروں اور صحافتی سوسائٹیوں کے سرپرست اور ممتاز عہدوں پر متعین ہیں ۔ انہوں نے ادارۂ مصنفین پاکستان کی بنیاد رکھنے میں اہم خدمات انجام دی ہیں ۔ ۱۹۵۵ء میں سیٹو نے جب ایسے ادیبوں اور فنکاروں کی تلاش کی جو فلپائن ۔ تھائی لینڈ اور پاکستان کے درمیان افہام و تفہیم اور تعارف کا فرض انجام دیں تو مختلف ملکوں کے سفیروں نے اس اہم مشن کے لئے شاہد احمد دہلوی کا انتخاب کیا ۔ حالانکہ اس وقت پاکستان کے وزیر اعظم کو ان کے انتخاب پر اعتراض بھی تھا ۔ ۱۹۶۳ء میں شاہد احمد دہلوی کو ان کی علمی و فنی خدمات کے اعتراف میں صدر کا امتیازی اعزاز بھی پیش کیا گیا ۔

بابائے اردو کے بارے میں جب میں نے ان سے سوال کیا تو انہوں نے فرمایا کہ بابائے اردو سے میرے تعلقات نیازمندانہ اور خوردانہ تھے ۔ وہ مجھ سے عمر میں بہت بڑے تھے اور پھر ان کا شمار ہندوستان کے بڑے آدمیوں میں ہوتا تھا لہٰذا ان تک دسترس بھی آسان نہیں تھی ۔ ان کی کم گوئی اور ملنے ملانے سے اجتناب کا سبب یہ بھی تھا کہ وہ بہت اکل کھرے تھے اور ادیبوں سے خصوصاً احتراز برتتے تھے ۔ شاہد بھائی نے ان کی ادبی حیثیت کے بارے میں بہت وثوق کے ساتھ فرمایا کہ ان کی تنقیدی نگاہ درجۂ اول کی تھی انہوں نے بعض نایاب نسخوں پر جو مقدمے لکھے ہیں ان سے ان کی اہلیت تنقید کا پتہ چلتا ہے ۔ یہ مقدمے انہوں نے اتنی کثرت سے لکھے ہیں کہ ہم لوگ انہیں مقدمے باز کہتے تھے ۔ طرز تحریر کے بارے میں شاہد بھائی نے کہا کہ مولوی عبدالحق کی طرز تحریر پر مولانا حالی کی طرز تحریر کا بڑا گہرا اثر تھا ۔ ان کی تحریر سیدھی سادھی اور موثر ہوتی تھی ۔ مگر ان کو صاحب طرز اس لئے نہیں کہا جاسکتا کہ ان کی تحریروں کوئی خاص انداز یا شخصیت کی چھاپ نمایاں نہیں تھی ۔ بات کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ مہدی افادی، محمد حسین آزاد، میر ناصر علی اور ابوالکلام آزاد کا اسلوب اتنا منفرد ہے کہ اگر اُسے دیگر تحریروں میں ملا دیا جائے تو وہ چھپ نہیں سکتا مگر مولوی عبدالحق کے اسلوب میں یہ بات نہیں پائی جاتی جو ان کے استاد مولانا حالی میں بھی نہیں تھی ۔ سیدھی سادھی نثر لکھنے کی تحریک کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ادب کو تو اس سے نقصان پہنچنے کا احتمال ہے کیونکہ اس تحریک سے مختلف اسالیب کا دروازہ بند ہوجاتا ہے مگر مولوی صاحب کے لئے اس کے معنی مختلف تھے وہ صرف ادیب نہیں تھے بلکہ اردو کی تبلیغ اور اس کو پھیلانا بھی ان کا مقصد تھا ۔ اس لئے وہ سیدھی سادھی نثر کی تحریک چلارہے تھے تاکہ ایک عام آدمی بھی اور ایسے طبقے اور نسلیں بھی جن کی مادری زبان اردو نہیں تھی اس کو سمجھ اور بول سکیں ۔ یہی وجہ ہے کہ بابائے اردو کی تحریر اس درجہ پر فائز

ہے جس کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ گویا وہ نثرنگاری نہیں بالکل عام گفتگو ہے جو یقیناً ایک بڑا کمال کہا جا سکتا ہے۔ انہوں نے مولوی صاحب کی جرات، اور بے باکی کا خصوصیت سے ذکر کیا۔ اور کہا کہ وہ اردو کی محبت میں اتنے بے باک اور نڈر ہو گئے تھے کہ اپنے عہد کی بڑی سے بڑی سیاسی شخصیت سے الجھ جانے میں کوئی خوف محسوس نہ کرتے تھے۔ "اردو ہندوستانی" کی تحریک پر گاندھی جیسی شخصیت سے ان کی جنگ یقیناً بڑی ہمت کا کام تھا۔ اگر مولوی صاحب اتنی بے باکی سے اس کی مخالفت کر کے اس جنگ کو نہ جیتتے تو ہندی کو اسی زمانے میں اردو پر فوقیت حاصل ہو جاتی۔

شاہد بھائی نے مولوی صاحب کا ذکر ختم کرتے ہوئے کہا کہ میری نظر میں ہندوستان کی سرزمین پر ایسا کوئی آدمی پیدا نہیں ہوا جس نے اپنی زندگی کی ہر دلچسپی اور اپنی عمر کا ہر لمحہ اردو کے لئے اس طرح وقف کر دیا ہو جس طرح مولوی صاحب نے کر دیا تھا۔ شاہد بھائی اس موقع پر ہنسے اور کہا کہ اردو کے سپاہیوں کی اس فوج میں جس کا آغاز سرسید احمد خاں سے ہوتا ہے مولوی صاحب کو اردو کے فیلڈ مارشل کا مرتبہ حاصل ہے۔

موسیقی کے سلسلے میں میرے ایک سوال پر شاہد بھائی نے اپنی اس آرزو کا اظہار کیا کہ وہ موسیقی پر ایک مستقل کتاب لکھنا چاہتے ہیں مگر انگریزی اور فرانسیسی کی بعض نایاب کتابیں مہیا نہ ہونے کے سبب اور علم موسیقی پر اردو فارسی اور ہندی میں لکھی جانے والی تحریروں کی کمیابی اس سلسلے میں بہت بڑی رکاوٹ بن جاتی ہے۔ مگر پھر بھی انہوں نے بیس پچیس مضامین لکھے ہیں۔ موسیقی کے ذکر پر وہ کچھ خوش نہیں تھے۔ ان کے لہجے میں ایک ایسی افسردگی تھی جو یہ بتائے بغیر نہ رہ سکی کہ علم و ادب کے ایک روشن چراغ کو جب اپنا پیٹ بھرنے کے لئے گا بجا کر روزی کمانی پڑتی ہے تو اُسے اس احساس محرومی سے بھی دو چار ہونا پڑتا ہے جو ساری زندگی کی جدوجہد کے بعد "کچھ نہ ملنے" کے خیال سے پیدا ہوتا ہے۔

شاہد احمد دہلوی کی تصانیف میں تراجم کی بہت بڑی تعداد ہے جن میں۔ فاؤسٹ۔ پھانسی۔ عثمان بلور جیسے تراجم شامل ہیں مگر ان کی تصانیف گنتی کی ہیں "گنجینۂ گوہر"، "دلی کی بپتا" اور "اجڑا دیار" جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ علم و ادب کے معیار پر یہ سرمایہ بہت تہی مایہ ہے۔ شاہد بھائی بھی بابائے اردو کی طرح بہت اکل کھرے ہیں۔ مگر ان کی وضع داری انہیں ہماری تہذیب کا ایک مرقع بنا کر پیش کرتی ہے۔

شاہد احمد دہلوی جو ہمارے لئے شاہد بھائی ہیں۔ ہمارے ادب کا ایک "المیہ" ہیں جو زمانے اور حالات کے جبر کا شکار ہو کر اپنی زندگی کے آخری دنوں میں خزاں کی بے رحمی کا شکار ہو گئے ہیں اور یقیناً ان کو دیکھ کر اور ان سے مل کر اس قطعہ کے یہ مصرعے زندہ محسوس ہونے لگتے ہیں ؎

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو — ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب — رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے

مراسلات

ذوق کا ایک شعر اور اس کی کایا پلٹ

اب سے کوئی پچاس برس پہلے کی بات ہے۔ میں ۱۳-۱۴ سال کا تھا اور سکونت شہر جے پور (راجپوتانہ) کی "رزیڈنسی" میں تھی۔ وہاں ہر جمعرات کو دو جوان عمر فدائی۔ صبح کے اوقات میں ایک دفلی پر۔ بجاتے اور گاتے۔ مانگنے کو آیا کرتے تھے۔ لفظ فدائی شاید ڈفالی کا بگڑا ہوا تلفظ تھا یہ فقیروں کی ایک قوم ہے جو دفلی یعنی چھوٹے دف پر غزلیں وغیرہ گا گا کر۔ گھر گھر۔ مانگتے پھرتے تھے۔ ان لوگوں کا نکاس سنا ہے کہ ضلع بہرائچ یو پی۔ انڈیا سے ہے۔ جہاں حضرت سالار مسعود غازی رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ہے۔ یہ لوگ غازی موصوف کے جہادوں کے مناقب دف پر گا گا کر سناتے پھرتے تھے اس لئے ڈفالی کے نام سے مشہور ہو گئے۔ پھر فدائی کہے جانے لگے۔ چنانچہ حضرت اکبر الہ آبادی کا ایک شعر ہے ؎

غازی میاں کا حال ڈفالی سے پوچھئے　　سیدؒ کی سرگزشت کو حالی سے پوچھئے

اب یہ فدائی غازی موصوف کے مناقب تو گانا بھول بھال گئے۔ اُن کے بدلے سنی سنائی غزلیں یاد کرکے گانے بجانے لگے۔ یہ دونوں فقیر نوعمر گورے رنگ کے تھے۔ سر پر چھوٹا سا عمامہ اور انگرکھا پہنے دفلی پر یہ شعر گاتے آیا کرتے تھے ؎

آگر میری تلوار سے مرجائے تو اچھا　　اُس پر مری پاپوش۔ بکھر جائے تو اچھا

جب میں نے یہ شعر سنا تو مجھے ہنسی آئی کہ یہ کیا انوکھا خیال ہے کہ آگر مری تلوار سے مرجائے تو اچھا...... یہ شعر مجھے یاد رہا۔ کچھ عرصے بعد میں ایک دن اپنے گھر کے کتب خانہ میں دیوان ذوق دیکھ رہا تھا تو اس میں یہ غزل نظر پڑی جس کا مطلع یہ ہے ؎

آنکھیں مِری۔ تلوؤں سے وہ مَل جائے تو اچھا　　ہے حسرتِ پابوس۔ نکل جائے تو اچھا

تب کھلا کہ اوہو۔ استاد ذوق کے اس لطیف شعر کی یہ درگت بنائی گئی تھی۔ کہ۔ آگر مری تلوار سے مرجائے تو اچھا۔ واہ وا کیا خوب لطیفہ بنا تھا۔ لہذا۔ ناظرین قومی زبان کے لئے میں یہ لطیفہ برائے اشاعت پیش کر رہا ہوں۔

سراج احمد عثمانی (کراچی)

بابائے اُردو اور بزم سعدی

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم کی حیات اور ان کے کارناموں پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور یہ بات سب پر روشن ہے کہ اُن کی علمی و ادبی زندگی کا صحیح معنوں میں آغاز حیدر آباد دکن کے رسالہ "افسر" کی ادارت سے ہوا۔ یہ واقعہ ہے سنہ ۱۹۰ء کا۔ اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ مولوی صاحب مرحوم سکریٹریٹ میں مترجم کی حیثیت سے سرکاری سلکِ ملازمت میں منسلک ہوتے ہیں۔ پھر ترقی کر کے مہتمم تعلیمات ناظم سررشتۂ تالیف و ترجمہ اور پرنسپل اورنگ آباد کالج پھر صدر مہتمم تعلیمات صوبہ اورنگ آباد ہوتے ہیں۔ اس دوران میں وہ ملک کے اعلیٰ پایہ اہلِ قلم اور انجمن ترقیٔ اردو کے سرگرم و مستعد معتمد کی حیثیت سے بھی روشناس ہوئے۔ یہ تو سب مرحوم کی معلوم مصروفیات ہیں۔ اِن کے علاوہ اُن کا کوئی اور ابتدائی زمانے کا علمی جہاد منظرِ عام پر نہیں آیا۔

اِس وقت میرے پیش نظر مولوی علی شبتیر صاحب مرحوم کی ایک عالمانہ و ناقدانہ کتاب "محاکمہ۔ قطعات ابن یمین و سعدی مع سوانح ابن یمین" ہے جو سنہ ۱۹۲۱ء میں تاج پریس میں چھپ کر شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کے صفحہ (۲) پر ایک حاشیہ میں یہ چند سطریں درج ہیں۔

> "سنہ ۱۹۱۳ء میں چند علم دوست احباب نے جن کو زبان فارسی سے خاص دلچسپی تھی حیدر آباد دکن میں ایک انجمن موسوم بہ "انجمن یادگار سعدی" قائم کی تھی۔ اس کے مقاصد میں سعدی کے کلام کی اشاعت۔ نظم و نثر میں سعدی کا تتبع اور سعدی کے کلام کی ظاہری و معنوی خوبیوں کو پبلک میں پیش کرنا تھے۔ انجمن مذکور کے روح رواں و مدیر میرے مخدوم و مکرم مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے پرنسپل اورنگ آباد کالج تھے اور جس جلسے میں محاکمہ زیر بحث پڑھا گیا تھا وہ زیر صدارت نقادِ سخن جناب مولوی حکیم سید امتیاز الدین حسن صاحب منعقد ہوا تھا۔"

میں یہاں یہ وضاحت کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ مولوی علی شبتیر صاحب مولوی عبدالحق صاحب کے خاص احباب میں تھے۔ خوش فکر و بلند پایہ ادیب اور کئی کتابوں کے مصنف و مولف تھے۔ ان کی کتابوں میں "تاریخ حجر اسود" "تاریخ غلاف کعبہ" "حجاز کے فرنگی سیاح" وغیرہ خاص مشہور ہیں۔ مصنف نے جس صدرِ جلسہ مولوی حکیم سید امتیاز الدین حسن کا ذکر کیا ہے یہ وہی بزرگ ہیں جن کے انتقال پر بابائے اردو نے بڑے دردمندانہ انداز میں ——— مولوی سید ہاشمی فرید آبادی مرحوم کے نام خط لکھا تھا اور جسے شیخ چاند مرحوم نے بابائے اردو کی کتاب "چند ہم عصر" میں شامل کر لیا۔ یہ خط (یا مضمون) پہلی بار حیدر آباد دکن کے مدرسۂ معلمین کے ترجمان "المعلم" میں شائع ہوا۔ اور جس شمارے میں شائع ہوا تھا وہ بھی اس وقت میرے پیش نظر ہے۔

اب میں اس مراسلے کے ذریعہ باخبر حضرات سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ "انجمن یادگار سعدی" کتنے دن

قائم رہی اور اس نے کیا کیا کارنامے انجام دیئے میں یہ بھی جاننا چاہتا ہوں کہ بابائے اردو اس انجمن کے کتنے دنوں "روح و رواں و مدیر" رہے۔ تحسین سروری (کراچی)

پیاری بہو، اور شجاع الدولہ کا اردو فارسی کلام

پیاری بہو اور شجاع تخلص شاعر کا کچھ کلام فارسی و اردو ہم کو جامعہ عثمانیہ کی ایک بیاض سے ملا ہے

اب سوال یہ ہے کہ کیا نواب شجاع الدولہ۔ نواب اودھ (۱۱۸۸ھ) کا تخلص شجاع تھا اور وہ شاعر بھی تھے۔ بیان کیا جاتا ہے بہو بیگم ان کی مشہور ملکہ تھیں۔ تو کیا یہ بھی شاعرہ تھیں، اور کیا ان کا تخلص "پیاری بہو" تھا! تاریخ اودھ میں ذکر ہے کہ "شجاع الدولہ کے زمانہ میں مشاعرے ہوا کرتے تھے اور وہ مشاعروں میں شریک ہوا کرتے تھے" ملکہ بہو بیگم، نو مسلم اور کھتری ذات سے تعلق رکھتی تھیں۔ جس کا اس نے اپنے ایک شعر میں اس طرح اشارہ کیا ہے ؎

توم من کھتزانی است و نام من پیاری بہو　　میل دیدن ہر کہ دارد در سخن بیند مرا

شہزادی زیب النساء پر اس طرح چوٹ کرتی ہے

صبا پیام پیاری رساں بدختر شاہ　　کہ قتل عام مکن شرع مصطفٰے اینجا ست

نیز ناصر علی سرہندی پر چوٹ، اور تعلی اردو غزل اس مطلع کا ثانی مصرعہ" سبگا خیال تازہ۔ ناصر علی کا دیوان اس پر نثار رہیگا" غزل کا اصل مطلع یہ ہے ؎

آ دیکھ اس چمن میں کیا جوش بہار رہیگا　　گلگلوں کی فوج اوپر سبزہ سوار رہیگا

بہو بیگم نواب شجاع الدولہ کی مشہور ملکہ تھی۔ مرزا محمد تقی خاں المتخلص بہ ہوس بہو بیگم کے بھتیجے تھے۔ (گیان چند کا مضمون مرزا ہوس کی ایک نادر مثنوی ۔ نوائے ادب اپریل ۵۸ء) تواریخ اودھ مولفہ کمال الدین حیدر میں لکھا ہے کہ:-

"شجاع الدولہ کی بیاہتا بی بی کا لقب بہو بیگم اور اصل نام امۃ الزہرا تھا جو مؤتمن الدولہ کی صاحبزادی تھیں اور وہ محمد شاہ کی لے پالک نہ تھیں۔

تو کیا مؤتمن الدولہ کی کوئی اہلیہ نو مسلم کھتری تھیں۔ جب کہ بہو بیگم خود کو کھتری قوم سے ہونا بیان کرتی ہے۔ اگر اہل علم حضرات اس سلسلے میں رہنمائی فرمائیں تو ممنون ہوں گا۔

سخاوت مرزا (کراچی)

آہستہ بولو آزاد نے آب حیات میں "سرہانے میر کے آہستہ بولو" کو "سرہانے میر کے کوئی نہ بولو" لکھا ہے۔ کوئی نہ بولو کی تدغن میر کی طبیعت کو گوارا نہیں۔ آزاد کی آزادی قلم سے سرزد ہوئی۔ آزاد "آہستہ بولو" کو غلط سمجھتے ہونگے لیکن غلط العام فصیح "کوئی نہ بولو" کی تائید کرنے والے سودا کے شعر میں بھی "آہستہ بولو" ہی کا میلان پائیں گے سودا کے جو بالیں پہ ہوا۔ الخ

جلیل قدوائی

انشائے ہاشمی فرید آبادی

(گذشتہ سے پیوستہ)

(۱۰)

لاہور

۲ر فروری [illegible]ء

حبیب مہر گستر، زاد اکرام ۔ آپ کا یہ خط، حنظ کا ہم جنس ہے، تین دن میز پر سامنے رہا اور چار دفعہ میں اسے پڑھ کر لطف اندوز ہوا ۔ آپ کی عنایت و التفات کا خواہی نخواہی شکر گزار ہوں ۔ اسی ہفتے اردو لغت کے سلسلے میں مجھے اپنا نام تجویز کئے جانے کی اطلاع ملی ۔ حامد حسن صاحب قادری کا نام آپ کے خط سے معلوم ہوا ۔ اور تفصیلات سے ابھی تک واقف نہیں ہوں ۔ پہلے سنا تھا کہ یہ کام جوش صاحب کے تفویض ہوا بلکہ انہیں کے خاطر تجویز کیا گیا تھا ۔ پھر جناب مولوی صاحب کی صدارت کی خبر شائع ہوئی ..... بہرحال اس سلسلے میں کراچی آنا ہوا تو آپ کی ملاقات سے بہرہ مند ہونے کا ضرور موقع ملے گا ۔ انشاء اللہ تعالےٰ ۔

ریاض مرحوم کے کلام، انتخاب اور حالات کی شروع میں میرے ایک قدیم کرم فرما قاضی محمد حسین صاحب مرحوم اشاعت کر رہے تھے ۔ بعد میں رئیس احمد صاحب جعفری نے جو ریاض کے نواسے ہیں اپنے نانا کی سوانح اور غالباً خمریات، چھپوائیں ۔ زمانہ، نگار، ادیب (میرٹھ) اور دوسرے رسائل میں بھی کلام ریاض پر بعض متفرق مضامین نکلے تھے ۔ افسوس ہے میری کتابیں، رسالے وغیرہ بہت سی چیزیں ہندوستان میں تلف ہو گئیں ۔ دوسرے یہاں آکر وہ ادبی صحبتیں اور ماحول ہی بالکل ایسا بدل گیا کہ بہت سی دلچسپیاں ٹوٹ گئیں، چھوٹ گئیں ۔ بہرحال امید ہے کہ آپ نے جعفری صاحب سے بھی ضروری مواد حاصل کر لیا ہوگا۔[1]

---

[1] ان دنوں "ریاض رضواں" کا انتخاب کر رہا تھا ۔ معلوم ہوا اُردو اکیڈمی سندھ کراچی ریاض کے کلام کا انتخاب شائع کر رہی ہے چنانچہ وہ کام ادھورا چھوڑ دیا ۔ اکیڈمی سے انتخاب شائع ہوا مگر ریاض خیرآبادی کے کلام کے ایک اچھے انتخاب کی ضرورت آج بھی محسوس کرتا ہوں ۔

ریاض مرحوم کا بھی اخبار "فتنہ" گورکھپور سے نکلتا تھا - اس کے پرانے پرچوں کا سلسلہ کہیں سے ہاتھ آجائے تو ان کی طرز نگارش اور طبیعت کا رنگ سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے - آپ نے ان کی زمین میں جو دو شعر لکھ کر بھیجے ان میں پہلا بہت ہی خوب ہے - "شوخی سے کام لینے میں --- الخ" اس میں عجیب طرح کا تقابل اور ایسی بے ساختہ لطیف معنویت آگئی ہے جو شاذ و نادر ہی پیدا ہوا کرتی ہے - دوسرا شعر بھی نہایت چست اور معیار قدیم پر درست اُترے گا لیکن "سکون و قرار" آنے سے بھی پریشان ہونا ، مذہب "حالیہ" میں شاید ان نیچرل مبالغہ قرار پائے گا[1] -

ابوالکلام آزاد صاحب کی تفسیر دو جلدوں میں قریب نصف قرآن مجید کے ترجمے کی شکل میں چھپی تھی - باقی حصے غالباً سیاست و وزارت کی بازی کھیلنے میں لکھنے سے رہ گئے - ممکن ہے اسی مطبوعہ حصے کے کسی نے الگ الگ سپارے دوبارہ چھاپ دیئے ہوں[2] - قہر صاحب کے شائع کردہ خطوط کی نسبت آپ کی رائے درست ہے .... حضرت ابوالکلام کی ابتدائی الہلالی دور کی آتش نگاری میں کچھ کلام نہیں مگر خطیبانہ زور ہر جگہ اور زیادہ دیر تک نہیں چلا کرتا - پھر دہکتے انگارے راکھ اور آگ کی لپٹ فقط دھواں رہ جاتی ہے "غبار خاطر" گیلی لکڑیوں کو دھونک دھونک کر سلگانے کی مثال ہے اور قہر صاحب نے جو خطوط چھاپے وہ اس غبار کی بھی جھڑی ہوئی گرد معلوم ہوتے ہیں -

ادیب صاحب، خط بہت طول کھینچ گیا - میرا کھانا آگیا - آج کی ڈاک کا وقت بھی گزر گیا - چلتے چلتے یہ اور سن لیجئے کہ آپ شوق اور محنت سے "چیز" اچھی تیار کیجئے - کون/کب قدر کرے گا ؟ اس وہم میں نہ پڑیئے - دیکھئے حالی جیسے ٹھنڈے مزاج کے استاد نے شعر کی حقیقت یہ بتائی ہے کہ (قطعہ کا دوسرا شعر)

پھوٹ پڑتے ہیں چمن میں جلوہ گل کا دیکھ کر

نالۂ بے اختیار بلبل نالاں ہیں ہم

خاکسار

سید ہاشمی

مکرر - حلقۂ مذاکرات کے چند مضامین رسالہ کردار نو میں چھپے تھے مگر یہ رسالہ دو تین سال ہی جولانی دکھا کر رہ گیا تھا یہ اب بند ہو گیا - ایک دو الگ رسالے چھپے وہ آپ کے ادبی ذوق سے کچھ زیادہ مناسبت نہیں رکھتے - ورنہ بھجوا دیتا -

---

[1] یہ میرے دو شعروں پر تبصرہ ہے جو ریاض کی طرح میں اور انہیں کے رنگ میں کہی ہوئی غزل کے ہیں جو ہاشمی صاحب کو لکھ کر بھیجی گئی تھی :-

شوخی سے کام لینے میں ان کو نہیں ہے باک ۔۔۔ شوخی کا نام لینے سے شرمائے جاتے ہیں

دل کو سکون، جان کو آجائے گا قرار ۔۔۔ دھڑکے یہ تجھ سے مل کے مجھے کھائے جاتے ہیں

[2] ایک ناشر نے چند سپارے الگ الگ چھاپے اور میں نے خرید لئے تھے - ان کے بارے میں رفع شک کیا گیا تھا -

(۱۱)

لاہور

۱۰ فروری ۱۹۵۹ء

مہر فرمائے مکرم، تسلیم

پچھلا خط لکھنے کے بعد جناب مولوی صاحب[1] کا خط آیا۔ پھر ایک رکن بورڈ کی زبانی سنا اور آخر میں کپتان کاردار[2] کا حکم نامہ پہنچا کہ تمہیں اڈیٹر[3] مقرر کیا گیا ہے۔ بلا تاخیر کام پر آجاؤ۔ اگرچہ میری صحت اور عمر اب زیادہ پابندی سے محنت کے قابل نہیں مگر مولوی صاحب نے خاص طور پر تاکید فرمائی۔ اس لئے سردست تو یہ خدمت قبول ہی کرلی ہے۔ خدا انجام بخیر کرے۔ انشاءاللہ آئندہ جمعہ تک کراچی پہونچوں گا۔ آپ کے لئے دو ایک رسالے جن کی فرمائش آپ نے کی ہے لیتا آؤنگا۔

بھائی صاحب، اطمینان وسکون جس کی آرزو کی جاتی ہے اس کے مل جانے کا اتنا خطرہ ہوتا کہ دھڑکے .... یہ مجھے کھائے جاتے ہیں۔ اگر محض شاعرانہ مبالغہ نہ ہو تو نفس کی بہت ہی غیر معمولی کیفیت ہوسکتی ہے اور اسی لئے آج کل کی اصطلاح میں "حقیقت پسندانہ" نہیں کہی جاسکتی۔ مگر آپ اردو، فارسی شاعری سے اس قسم کی نظیریں یقیناً جتنی چاہیں پیش کرسکتے ہیں۔ مولانا حالی کی دور اول کی غزل گوئی بھی اسی قدیم وضع کی تھی۔ مگر دور جدید کی منتخب غزلیں دیکھئے تو بغیر اس قسم کی "مضمون آفرینی" کے بھی آپ نہایت پرمغز وپراثر کلام مطالعہ کرسکتے ہیں۔ مثلاً "ایک ایک" ردیف والی غزل:

رہا ہوں رند بھی اے شیخ، پارسا بھی میں
مری نگاہ میں ہے رند و پارسا ایک ایک

ہم آج بیٹھے ہیں ترتیب دینے دفتر کو
ورق جب اس کا اڑا لے گئی صبا ایک ایک

بس۔ انشاءاللہ باقی بات، عندالملاقات

خاکسار
سید ہاشمی

---

[1] بابائے اردو مرحوم

[2] کرکٹ کے مشہور عالم پاکستانی کھلاڑی، مرکزی حکومت کی وزارت تعلیم میں اسسٹنٹ ایجوکیشنل ایڈوائزر رہے۔ سرکاری سطح پر ترقی اردو بورڈ ابتدا میں موصوف سے متعلق تھا۔

[3] ایڈیٹر لغت، جس کا ابتدائی کام بابائے اردو کی چیف ایڈیٹری میں ہوا۔

(۱۲)

باسمہ تعالیٰ

طرحِ حسرت موہانی[1]

وہ نہ بولے، نہ سہی، بات سماعت کرکے — وعدہ اب تک ہے مری نطق کو منت کرکے

جان کا روگ ہے آدم کی، سبھے، ورنہ رہے — وہی اک تودۂ گل، ترک محبت کرکے

چھپ سکا ہوش تمہارا سرِ دامن نہ کبھی — تم چھپے کیوں مجھے شرمندۂ غفلت کرکے

منزلِ دوست کا شاید یہ پتہ ہو، راہی! — پاؤں لیتے ہیں مزہ قطع مسافت کرکے

سجدہ اس در کا ہے معراجِ جبیں، ڈر یہ ہے — عشق پندار نہ ہو جائے عبادت کرکے

ہاشمی مطربِ خاطر نے بہ ایمائے جلیل

تانِ حسرت کی اڑائی ہے جسارت کرکے

۸ جولائی ۱۹۵۹ء

(۱۳)

مکرمی جلیل صاحب باکرام

آج ڈاکٹر ریاض الحسن[2] صاحب انجمن میں آنکلے۔ ان سے بات ہوئی اور قرار پایا کہ پرسوں (۱۱ ستمبر) جمعہ کو ۵ بجے سہ پہر قیام گاہ پر وہ آجائیں گے۔ براہ کرم آپ بھی تکلیف کریں۔

زیبا صاحب کو بھی اطلاع دیتا ہوں۔ مشفق خواجہ صاحب نے وعدہ کیا ہے کہ خطوط کل، ورنہ اسی جلسے[3] میں پرسوں لاکر آپ کے حوالے کریں گے۔

چہارشنبہ — خاکسار

۹ ستمبر ۵۹ء — سید ہاشمی

---

[1] ترقی اردو بورڈ کی ملازمت میں شامل ہونے کے بعد ہاشمی صاحب لاہور سے کراچی تشریف لے آئے۔ اس زمانہ میں ایک نشست میں میں نے انہیں مولانا حسرت کی غزل سنائی جس کا مطلع ہے

ہو گئے اور بھی بیگانہ وہ غفلت کرکے — آزمایا جو انہیں ضبط محبت کرکے

اتنے متاثر ہوئے کہ اسی طرح میں مجھے اپنی یہ غزل لکھ کر مرحمت فرمائی۔

[2] مترجم "درمعرکی داستان عزم" (گوئٹے) وغیرہ، سابق ممبر پاکستان فارن سروس، حال اسسٹنٹ ایڈیٹر مارننگ نیوز، کراچی۔

[3] غالباً اسی جلسے میں عبدالحق جوبلی کمیٹی قائم ہوئی جس کی طرف سے بابائے اردو کو نوے برس کی عمر پوری کرنے پر ایک شاندار جلسہ میں دو یادگاری کتابیں پیش کرنے کی تجویز طے ہوئی۔ ہاشمی صاحب صدر کمیٹی قرار پائے۔ موصوف نے اس سلسلے میں خاص خاص اہل قلم کو جو خطوط

[illegible]

(۱۴)

۱۳ر نومبر

مہر فرمائے من

ا- زیبا صاحب نے مہربانی سے اپنا موعودہ چندہ پچیس (۲۵) روپے بخاری صاحب کے ہاتھ بھیج دیا - وہ آپ کو ارسال کرتا ہوں - بہتر ہوگا کہ ایک کارڈ پر اس کی رسید بھی آپ زیبا صاحب کو لکھ بھیجیں -

(ب) خطوط کے دینے کا مکرر وعدہ کیا ہے - وہ خود علیل ہو گئے تھے ، اس لئے نہ آسکے - ابھی تک پورے تندرست

بقیہ حاشیہ ملاحظہ) روانہ کیا تھا یہاں اس کی نقل پیش کرنا دلچسپی کا موجب ہوگا ہے

عبد الحق جوبلی کمیٹی

نمبر ۱۱۴ ، جی بلاک ۲

پی ای سی ایچ ایس کراچی

مورخہ ــــــــــ

جناب مخدومی ، تسلیم

اپریل ۱۹۷۰ء میں ڈاکٹر مولوی عبد الحق مد ظلہ کی عمر شریف کے ۹۰ سال پورے ہوتے ہیں جن کا نصف سے زیادہ حصہ برعظیم کے مسلمانوں کی ایسی خدمت کرنے میں بسر ہوا جو کہ نہ صرف علمی بلکہ اعلیٰ درجے کی ملی قدر و منزلت رکھتی ہے۔ نظر بر این ممدوح کے ارادت مند احباب نے ان کی نوویں سالگرہ بہ طریق شایان منانے کا ارادہ کیا ہے اور آنجناب سے بھی شرکت و تعاون کی درخواست کر رہے ہیں -

ا- تجویز یہ ہے کہ اس تقریب سعید پر جناب مولوی صاحب کے نیاز مندوں کی طرف سے ایک یادگار کتاب بطور تحفہ مدون کی جائے - جس میں ممدوح کے ذاتی اوصاف ، نیز علمی اور لسانی احسانات کے مختلف پہلوؤں پر معیاری مقالات شامل ہوں

ب - کسی خارجی موضوع پر شگفتہ انداز میں تحقیقی مضامین لکھ کر اس ادبی مجلد ستے کی تزئین کی جائے -

وقت محدود رہ گیا ہے لہذا گزارش ہے کہ آں مکرم افادات گرامی کا جنوری ۱۹۷۰ء تک موصول ہونا مناسب ہوگا تا کہ ترتیب و طباعت کے انتظامات بروقت تکمیل پا سکیں۔

۲- اس تقریب میں جناب مولوی صاحب قبلہ کے خطوط کا ایک مجموعہ شائع کرنے کی تجویز ہے - امید ہے کہ ہمارے اردو کی انشاء کا یہ نادر نمونہ خط نویسی کی صنعت لطیف میں شایان مقام حاصل کئے بغیر نہ رہے گا -

آں مکرم سے درخواست ہے کہ اگر آپ کے پاس بھی مولوی صاحب قبلہ کے قابل اشاعت خطوط محفوظ ہوں تو

نہیں ہیں۔

۲۔ محمد نعمان صاحب (ایڈووکیٹ) ہماری کمیٹی میں شرکت پر خوشی سے آمادہ ہوگئے۔ ان کا نام آپ درج کرلیں۔

۳۔ علیٰ ہذا حکیم اسرار احمد صاحب کو بھی شامل کر لیجئے تو مناسب ہے۔ انہوں نے سی پی میں گاندھی جی وغیرہ سے مولوی صاحب قبلہ کے ساتھ معرکہ آرائی پر مضمون لکھنے کا بھی وعدہ کیا ہے۔ ان معرکوں میں وہ خود شریک رہے ہیں۔

۴۔ کرنل صاحب صاحب کا خط موٹر کے بارے میں بھیجتا ہوں[۱]۔ اسے دیکھ کر واپس کر دیجئے۔ اور میرے نام کے جن خطوط سے کام لینا نہیں وہ[۲] نیز یادگار غالب[۳] بھجوا دیجئے گا۔

امید ہے آپ اور نمی باجی[۴] اب اچھی ہوں گی۔

خاکسار ہاشمی

بازنوشت

آمنہ بیگم اور نصر اللہ خاں صاحب سے تار نہ مل سکا۔ ان دونوں کو آپ کمیٹی میں شریک کر سکتے ہیں۔ میرے بلانے پر امید ہے ضرور آجائیں گے۔

زکن میاں کو میں نے نہیں ٹوکا۔ ہماری کمیٹی کے اب مجوزہ ارکان آٹھ دس ہوگئے۔ یہ کافی ہیں..... اخباروں کے تراشے[۵]

(بقیہ حاشیہ صفحہ)

زیر ترتیب مجموعے کے لئے مستعار عنایت فرمائیں۔ نقول لینے کے بعد انہیں احتیاط سے واپس کر دیا جائے گا۔

کاتب الحروف تصدیعہ دہی پر معافی کا خواستگار اور حسب مراد جواب کا مشتاق ہے ؎

مرا بہ سادہ دلی ہائے من توان بخشید
خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم

نیاز آگیں
سید ہاشمی فرید آبادی

مراسلت مندرجہ عنوان نشان پر بنام سکریٹری - عبدالحق جوبلی کمیٹی " فرمائی جائے -

۱؎ موٹر بیچنا چاہتے تھے۔ اس کی تفصیل خط میں درج تھی مجھے ہی کا خریدار تلاش کرنا تھا۔

۲؎ مکتوبات عبدالحق کی ترتیب کے سلسلے میں ہاشمی صاحب نے بابائے اردو کے اپنے نام بھیجے ہوئے خطوط عطا کئے تھے۔

۳؎ نسخۂ قدوائی، پر مقدمہ لکھنے کے سلسلے میں بغرض مطالعہ طلب کی تھی۔ اس کا ذکر آگے آئے گا۔

۴؎ مراد میری بچی تنزیلہ یا پاری جس سے ہاشمی صاحب بے حد مانوس تھے۔

۵؎ جوبلی کمیٹی کے قیام کے بارے میں۔

اپس بھیجتا ہوں۔

س۔ ہ
$\frac{۱۳}{۸}$

(۱۵)

کراچی یکم اپریل ۶۰ دوپہر

مہر فرمائے مکرم

آپ کا نوشتہ ۳۰ مارچ، آج دفتر انجمن میں پہلی اپریل کو ملا۔ ہمارا اندیشہ کہ آپ علیل نہ ہو گئے ہوں صحیح نکلا۔ مائل[1] صاحب اور خود میں آج ہی آپ کی مزاج پرسی کو آتے مگر واپسی کے مسئلے نے تذبذب میں ڈال دیا۔ میں گزشتہ علالت کے بعد ابھی تک کھانسی اور کمزوری کے باعث زیادہ دور پیدل چلنے کی ہمت نہ کر سکا۔ خیر خدا کرے آپ جلد تندرست ہو کر ادھر تشریف لائیں۔

آج ۔۔۔ صاحب[2] کے ہاں ٹیلیفون کیا تھا مگر غالباً ان کے ہاں چھٹی تھی۔ کوئی جواب نہیں ملا۔ کل بورڈ کے دفتر سے بھی ٹیلیفون پر دریافت کرنے کی کوشش کروں گا کہ مجوزہ اقرار نامے پر کیا رائے قائم کی۔

پطرس یا سالک کے متعلق بھی آپ کی طرف سے ایک یادداشت ملنے کا انتظار تھا۔ "آج "نقوش" کا پطرس نمبر ملا۔ جلدی جلدی دو چار نوٹ لکھ رہا ہوں۔ شیدائی صاحب منتظر ہوں گے[2]۔

کل شام زیبا صاحب آئے اور دیر تک یہاں رہے۔ اب آپ اچھے ہو جائیے تو جونئی کمیٹی کا بھی جلسہ کرنا ضروری ہے۔ ذکو میاں[3] بھی دریافت کرتے تھے۔ گھر میں سلام بچوں کو دعا کہہ دیجئے گا۔ فقط

س۔ ہ

(۱۶)

کراچی ۵ اپریل، عصر

مہر فرمائے مکرم، زاد الطافہم

آپ میں دھیان پڑا ہے، کوئی خیر خبر کئی دن سے نہیں سنی۔ خدا کرے آپ بالکل چاق ہو گئے ہوں اور آپ کی موٹر بھی شفایاب ہو چکی ہو۔ لیکن خدانخواستہ ابھی طبیعت ناساز ہو تو بھی ڈاک سے یا آدمی کے ہاتھ مطلع فرمائیے، ہم خود ڈھونڈ ڈھانکنے کی کوشش کریں گے۔ ہو سکے تو واپسی میں آپ ناظم آباد تک پہنچا دیجئے گا۔

---

[1] مولوی محمد ذکریا صاحب مائل۔ تدوینِ لغت میں ہاشمی صاحب کے مددگار تھے۔
[2] اقبال شیدائی صاحب نے آں سے اپنے تعلق کا مہ کے سلسلے میں نوٹ طلب کئے تھے۔
[3] ذکاء اللہ خاں صاحب چیف انجینئر کراچی پورٹ ٹرسٹ۔

میاں ... سے بھی تار نہیں مل سکا ۔ میں نے بخاری صاحب سے کہا ہے کہ ممکن ہو تو اسے گرفت میں لائیں اور مجوزہ لغت کے متعلق کوئی جواب شافی حاصل کریں ۔ بیگم صاحبہ کو بہت بہت سلام سب بچوں کو دعا کہہ دیجئے ۔ فقط

س ہ

(۱۷)

کراچی ۲۲ر اپریل ، ظہر

مہر گسترِ من ، تسلیم

آپ کا ۱۷ر کا خط عین انتظار میں آج دوپہر کی ڈاک سے ملا ۔ .... صاحب کی ملاقات قابلِ اطمینان رہی ۔ الحمدللہ ۔ کتاب کے نام وغیرہ کے متعلق مشورہ کرکے فیصلہ ہو سکے گا ۔ نماز کا وقت قریب ہے ۔ مختصر رسید اور شکریۂ خط پر قناعت کرتا ہوں ۔ جناب مولوی صاحب آنکھ بنوانے جناح اسپتال میں داخل ہو گئے ۔ لہٰذا دس بارہ دن تک کہیں نہ جا سکیں گے ۔

بیگم غزنوی کو بہت بہت سلام ، بچوں کو دعا ۔ فقط

س ہ

(۱۸)

ہاؤسنگ سوسائٹی ۲۷ر اپریل ، عصر

مہر فرمائے من ، زاد الطافہم

کئی دن سے نہ آپ ادھر آئے نہ کوئی خیریت آپ کی سنی ۔ برابر دھیان لگا ہوا ہے ۔ امید ہے خدا کے فضل سے آپ اور جملہ اہل و عیال بخیر ہوں گے ۔ آپنی دور جانے کے بعد آپ کو خط ضرور تحریر فرماتے رہنا چاہیے ۔

.... صاحب سے معاملے کی تکمیل ، کتاب کی کتابت کا آغاز ہو سکا یا نہیں ؟ میں نے بخاری صاحب سے آج کہا ہے کہ وہ .... صاحب سے مل کر معلوم کریں ، جو وہ حضرت مل جائیں ۔ مگر ظاہر ہے اس سے بھی آپ کی ملاقات یا مکتوب کے انتظار کی کمی نہیں آئے گی ۔

بچوں کو دعا ، بیگم صاحبہ کو بہت بہت سلام کہہ دیجئے ۔ فقط

س ہ

حاشیہ کا نوٹ

ہاں ، جناب مولوی صاحب کی آنکھ ہی ہے ۔ جناح اسپتال میں زیرِ علاج ہیں ۔

لہ بابائے اردو ۔

(۱۹)

ہاؤسنگ سوسائٹی ۳ رمئی ، سہ پہر

کراچی

مہر فرمائے گرامی قدر زاد الطافہم

جھنگ جلسے کے بعد ملاقات نہ ہوئی یعنی آپ نے زحمت تو یہ نہ فرمائی کیونکہ ہماری تو دامن غرفہ تک رسائی نہیں۔ کل رات خیبر میل سے میرا قصد لاہور غالباً آپ کو معلوم ہے۔ دس گیارہ دن کی رخصت لی ہے اور خدا کو منظور ہے تو ۱۵ رمئی تک کراچی واپس آنا ہے۔ میں تو فکر میں تھا کہ لاہور جانے سے پہلے..... صاحب سے مجوز قرارداد کی پخت و پز ہو جائے لیکن خیر اب آپ اس کام کو تو بہرحال مکمل فرما لیجئے گا۔ اصل یادگار کتاب کا مسودہ انشاءاللہ واپسی پر ان کے حوالے کیا جائے گا۔ وقت کی تنگی سے پریشانی ہوتی ہے (برعکس قول غالب) بہرحال الخیر ماوقع فیہ۔ بیگم و اطفال غرفہ کو سلام و دعا فقط

س ہ

(۲۰)

لاہور

۱۳ رمئی ۶۰ء

مہر فرمائے مکرم زاد الطافہم۔

میں خود لکھنے کی سوچ رہا تھا کہ آپ کا نوازش نامہ ۱۰ رمئی کل دوپہر ملا۔ کتابوں کی حسب دلخواہ وقت پر طباعت کا برابر خلجان رہتا ہے۔ بہت کچھ حضرت .... کے رحم و کرم پر معاملہ آپڑا ہے، خدا بہتر کرے۔

مجھے لاہور میں دو تین دن زیادہ ٹھہرنا پڑ گیا۔ اب انشاءاللہ سہ شنبہ کو تیزگام سے چل کر چہارشنبہ ۱۸ رمئی کے ساڑھے دس بجے دن کو کراچی پہنچوں گا۔ براہ کرم آپ ہی معلوم کر کے تقدیم فرمائیں تو مناسب ہے۔ میرا بسول پر بھی کچھ زیادہ بس نہیں چلتا اور چاہتا ہوں کہ آپ سے ملاقات میں دیر نہ ہو۔ آپ کی صحت کے ساتھ اب آپ کی موٹر کی تندرستی کے لئے بھی دعا کرتا ہوں۔ خدائے شافی قبول فرمائے۔ جملہ اہل غرفہ کو بہت بہت دعا سلام۔ فقط

سید ہاشمی

(۲۱)

کراچی

۱۸ رمئی ، عصر

مہر فرمائے مکرم، تسلیم۔

جیسا کہ غالباً آپ کو لاہور سے لکھا تھا آج تیزگام سے بخیریت واپس کراچی پہنچ گیا۔ امید ہے آپ جلد اور موٹر

ٹھیک ہو گئی ہو تو جلد تر مجھ سے ملنے کی تدبیر کریں گے ۔ جوبلی کی کتابوں کے بارے میں بہت فکر مند ہوں ۔ اور --- صاحب سے جس قدر جلد ممکن ہو معاملہ کرنا اور دوسری کتاب کی طباعت آغاز کرا دینا چاہتا ہوں ۔ خدا کرے آپ اور جملہ اہل غرفہ بخیر ہوں ۔

آپ کا پہلا کارڈ (دوسرے کے بعد!) لاہور میرے پاس بھیج دیا گیا تھا ۔ بچیوں کی سالگرہ پر ان کی والدہ کو مبارکباد اور سلام کہہ دیجئے ۔ فقط

خاکسار

سید ہاشمی

(۴۲)

کراچی

۲۴ مئی ، عصر

مہر فرمائے مکرم ! آپ کی موٹر رواں ہونے کی دعائیں مانگی تھیں ۔ یہ خبر نہ تھی کہ وہ آپ کو مہ رخ پری کے کل کے گھوڑے کی طرح خدا جانے کہاں کہاں لے کر اڑی پھرے گی ۔ بھائی صاحب ، کتاب (مقالات) کی طباعت کے بارے میں تشویش ہوتی جاتی ہے ۔ ایک مرتبہ آپ ضروری سمجھیں تو مجھے ..... صاحب کے دفتر یا مکان پر لے چلیں ۔ معلوم تو ہو تاخیر کا سبب کیا ہے ۔

ہمارے بخاری صاحب اب بورڈ کے دفتر میں تعینات کر دیے گئے ہیں ورنہ میں ان کو ساتھ لے کر ... صاحب سے ملنے کی کوئی راہ نکالتا ۔ ناچار آپ ہی کو تصدیعہ دیتا ہوں کہ از راہ کرم زحمت اٹھایئے اور اس معاملے کو حسب دلخواہ رو براہ کیجئے ۔ غلام ربانی صاحب جوبلی میں شرکت کرنے کے خیال سے کراچی پہنچ گئے ۔ جناب مولوی صاحب کے یہاں مقیم ہیں ۔ بہرحال آپ ملیں تو سہی ۔ برابر انتظار میں چشم براہ رہتا ہوں ۔ فقط ۔ سب اہل غرفہ کو دعا سلام کہہ دیجئے ۔

خاکسار

س ہ

(۴۳)

کراچی

۲۹ مئی ۶۰ ۔ عشاء

مہر فرمائے مکرم قدوائی صاحب ! کرمہم

امید ہے آپ کا مزاج خدا کے فضل سے بہتر ہو گا ۔ پچھلی ملاقات کے وقت آپ کی طبیعت کچھ صاف اور چاق

نہ تھی اس لئے فکر رہا۔

آمنہ[1] بیگم اور نصراللہ[1] خاں نے آئندہ جلسے میں شرکت کا وعدہ کیا ہے۔ آپ کا اطلاعی کارڈ کل ہفتے کو بخاری صاحب کے نام مل گیا تھا۔ مجھے غالباً کل دوشنبے کی صبح دفتر انجمن میں مل جائے گا۔

اس عرصے میں یہ بات بہ تواتر معلوم ہوئی کہ .... صاحب کئی ہفتے کے لئے باہر چلے گئے ہیں۔ اقرارنامے کی تکمیل اور دوسری کتاب کی طباعت کا انتظام کئے بغیر، بلکہ آپ کو یا مجھے اطلاع دیئے بغیر ہی ان کا چل دینا بڑی کبیدگی کا باعث ہوا۔ اخلاق کی شکایت کرنا تو شاید "تہذیب" جدید میں خارج از آہنگ ہو لیکن کاروباری اعتبار سے بھی ان کی یہ حرکت معاملہ شکنی ہی سمجھی جائے گی۔ وقت کی تنگی کے سبب بھی اب اصل یادگاری کتاب کی طباعت کا ان پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا آپ کی طبیعت اگر زیادہ ناساز نہ ہو تو براہ کرم آپ ان کے دفتر جا کر (ان کے بھائی یا قائم مقام کو) تحریری اطلاع دے دیں کہ پہلی کتاب "خطوط" کی قرار یافتہ رقم ایک ہزار روپے دہ بذریعہ چک یا ڈرافٹ (ڈاک یا تار سے) ایک ہفتے کے اندر ادا کرنے کا انتظام کر دیں، ورنہ اس کا مسودہ بھی واپس لے لیا جائے گا۔ جتنی کتابت ہو چکی ہے اس کی اجرت بھی (قطع معاملت کی صورت میں) ہم کو ادا کرنی ہوگی اور دوسری یا اصل کتاب کی چھپائی کا تو ظاہر ہے علیحدہ انتظام کرنا ہی پڑے گا۔

براہ کرم اب آپ .... صاحب کی مزید مروت و رعایت جائز نہ رکھیں اور ان کے دفتر کو تحریری اطلاع نیز خود ان کے نام بہتر ہے کہ تار دے کر مجھے بھی پرسوں یعنی پہلی جون تک دفتر یا گھر پر مطلع فرما دیں۔ آپ کو زحمت اور تصدیعہ دینی مجھے شاق ہے مگر مجبوراً یہ تکلیف بہ تاکید دینی پڑی۔ فقط

جملہ اہل غرفہ کو دعا و سلام کہہ دیجئے گا۔

خاکسار

سید ہاشمی

(۲۴)

کراچی ۹ جون، عصر

بہر فرمائے من۔ زیبا صاحب کو تاکیدی خط لکھ دیا ہے کہ وہ اتوار (۱۲ جون) کی سہ پہر میرے ہاں آجائیں اور پرنسپل[1] صاحب سے کوئی قطعی قرارداد کریں بلکہ لکھوا لائیں تو بہتر ہے۔ اور پھر آپ سے مل کر کوئی حتمی فیصلہ طباعت کتب کی نسبت کر لیا جائے۔ میں اس معاملے سے خاصا پریشان ہو گیا ہوں اور کوئی خاطرخواہ تصفیہ نہ ہوا تو بالکل دست بردار ہونے پر تیار ہوں۔ باقی ماندہ مسودہ اور کاپیاں (خطوط کی) بھی آپ لیتے آئیے گا۔

---

[1] علی الترتیب پرنسپل و سکریٹری بیپی ڈیل اسکول ناظم آباد۔

آپ کا یہ کہنا صحیح ہے کہ اس مجموعے کی کتابت کا کام ..... صاحب ہی کے ہاں جاری رہے تو اچھا ہے - لیکن اقرارنامہ
دوسری کتاب کا انتظام نہ کرنے کے علاوہ کہہ کم اس خطوط کے مجموعے کی قرار داد رقم ہی ان سے مل جاتی تو ہمیں دوسری
ب بطور خود چھپوانے میں آسانی ہوتی اور پرنسپل صاحب وغیرہ کے تعاون کی ضرورت یا محتاجی نہ رہتی - بحالت موجودہ تو
.نوں کتابوں ہی کا معاملہ ان سے کرنا پڑے گا ورنہ دوسری بالکل رہ جائے گی -

اگر آپ چاہیں تو ..... صاحب کو تار دے کر یا ان کے قائم مقام بھائی سے صورت حال بتا کر موجودہ رقم وصول
ینے کی سعی فرمائیں اگرچہ بظاہر اب اس کا بھی وقت نہیں رہا اور ..... صاحب کا ٹھیک پتہ ہی شاید نہ معلوم ہو گا -
بہرحال اتوار کو آ رہے - فقط

س ۰

(۲۵)

کراچی ۱۹ر جون ۶۰

مہرفرمائے مکرم، تسلیم

گزشتہ جمعہ تک آپ کے دفتر انجمن کی طرف آنے کا انتظار رہا - نہ آنے سے ایک تو یہ تشویش ہو جاتی ہے کہ معلوم نہیں
اپ کی صحت کیسی ہے ؟ اور دوسری خلش یہ کہ آپ کے سیارہ (یعنی موٹر) کا کیا حال ہے ؟

گزشتہ اتوار (۱۲ر جون) کو زیبا صاحب کے ہاں نئے مولود کی آمد آمد تھی وہ بیچارے وہاں جنا ئی کے چکر میں رہے
غالباً رات کو لڑکی پیدا ہوئی - ایک مرتبہ پرنسپل صاحب اردو کالج سے ملنے گئے تھے وہ سوئے اتفاق سے اس وقت
کالج میں نہ تھے - ادھر مجھے اپنے طور پر یہ سن گن ملی کہ ان کے مطبع کا انتظام ابھی تک پوری طرح اطمینان بخش نہیں ہوا۔
واللہ اعلم بالصواب - اسی ہفتے زیبا صاحب کو اپنے بھائی کی شادی میں امروہہ (ہندوستان) جانا پڑا - اس بلاوے
کو وہ ٹال نہیں سکتے تھے - دو ہفتے کے لئے چلے گئے - کل شام اپنی بیٹیا سانے ذرا کی ذرا میرے پاس آئے - کیٹی کی تین
تصویریں البتہ مجھے دے گئے - تصویر صاف اور اچھی اتری - خاص کر ڈاکٹر راللہ خاں، آمنہ بیگم، آپ کی بیگم صاحبہ،
بخاری اور زیبا صاحب کی مسکراتی صورتیں بہت خوب رہیں -

اب فرمایئے ..... صاحب کے بھائی کے ذریعے کوئی مزید سلسلہ جنبانی ہوئی یا ان حضرت کی واپسی کی کوئی
خبر آئی ؟ -

پرسوں منگل (۲۱ر جون) کی سہ پہر نصراللہ خاں صاحب کی لڑکی کی شادی ہے - میں انشاءاللہ شریک محفل عقد
ہوں گا - مقام ناظم آباد میں ہادی مارکیٹ کے قریب پرانا کلیمز آفس (بلاک نمبر ۲، بس اسٹاپ نمبر ۲) تحریر کیا ہے جہاں
ان کا اسکول (ہیپی ڈیل) اب منتقل ہو گیا ہے - یہ جگہ آپ کے بنگلے سے قریب ہے - اگر آپ کا میرے مکان یا انجمن کی

طرف آنا نہ ہو، اور یہ خط منگل کی صبح آپ کو مل جائے تو آپ تکلیف فرمائیں، وہیں مجھ سے آکر مل لیں۔ شرکت محفل نکاح میں بلاوے کے آنے نہ آنے کا خیال نہ فرمائیں۔ یہ ولیمے کی دعوت نہیں ہے۔

انتخاب غالب کا مقدمہ[1] پورا کر لیا، صاف لکھ رہا ہوں، منگل بدھ تک انشاء اللہ لکھ لوں گا۔ اسے لینے کے لئے بھی آپ کو پھیرا کرنا ہو گا۔

مکتوبات کے کچھ اوراق اور "کاپیاں" رہ گئی تھیں۔ امید ہے وہ آپ نے .... صاحب کے کاتب سے واپس لے لی ہوں گی۔

گھر میں سب کو بہت بہت سلام و دعا کہہ دیجئے گا۔ فقط

خاکسار

سید ہاشمی

(۲۶)

کراچی

۲۴ر جون ۰۰ء سہ پہر

مہرفرمائے مکرم۔ آپ کا عنایت نامہ نوشتہ ۱۷ر جون ۲۰ر جون کی مہر سے چلا اور ۲۱ر جون روز دوشنبہ کو مجھے ملا۔ میں ایک دن پہلے آپ کو خط لکھ چکا تھا کہ اگر ہو سکے تو آپ ۲۲ر کی شام نصر اللہ خاں صاحب کی لڑکی کی شادی میں مجھ سے مل لیں۔ تصویریں آپ کو دکھانے ساتھ لے گیا تھا مگر نہ وہاں آپ کا آنا ہوا نہ آج جمعہ کی سہ پہر تک ادھر یا دفتر انجمن میں۔ خدا کرے مزاج بخیر و صحیح ہو۔

اب ایک مطبع سے ہماری دونوں کتابیں چھپنے کی گفتگو ہوئی ہے۔ اسے حتماً طے کرنے کے لئے میں نے پیر (۲۷ر جون) کا دن دوپہر کا وقت مقرر کیا ہے کہ آپ کو اطلاع پہنچ جائے اور آپ حتی الامکان ضرور اس روز انجمن کے دفتر میں ایک بجے دوپہر کو میرے پاس تشریف لے آئیں۔ مکتوبات کے باقی ماندہ اوراق اور کاپیاں لیتے آئیے گا۔ اور مطبع سے گفتگو کے بعد پھر جوبلی کیمپ کی تصویریں، نیز انتخاب دیوان غالب پر میرا مقدمہ لینے میرے مکان تک آنے کی زحمت کیجئے گا۔ تینوں باتیں آپ کے تکلیف کرنے کی مقتضی ہیں۔ باقی عندالتلاقی۔

خاکسار

سید ہاشمی

---

[1] اپنے ادارۂ نگارش و مطبوعات کی طرف سے میں نے جو "انتخاب غالب (نسخۂ قدوائی)" بابائے اردو کی مجوزہ جوبلی کے موقع پر شائع کرنا چاہا تھا اور جو افسوس کہ جوبلی کے بغیر شائع ہوا۔ اس کی نہ صرف ترتیب و تکمیل ہاشمی صاحب کے صلاح و مشورے سے ہوئی تھی بلکہ اس کے لئے موصوف نے مقدمہ بھی تحریر فرمایا تھا۔ اس میں میرے اس خیال سے اتفاق ظاہر کیا گیا تھا کہ غالب کی جو حیثیت اردو شاعری میں ہے فارسی میں نہیں ہو سکتی۔ اس مقدمہ کا ذکر آگے کے خطوط میں بھی آئے گا۔

(۴۷)

۲ / ۱۹۱ ایچ
باؤسنگ سوسائٹی

۸ ہرجون ۶ عشا

مہرفرمائے من جناب قدوائی صاحب با کرامہم

مکتوبات عبدالحق کا باقی ماندہ مسودہ اور کاپیاں جو پیر کو آپ میرے مکان پر دے گئے تھے موصول ہوئیں۔ اتوار کو میرا پچھلا خط (کارڈ) بھی آپ کو پہنچ گیا ہوگا مگر اس کی رسید نہیں ملی اور آپ نے بظاہر دفتر میں یا میری جائے قیام پر ملاقات کی زحمت بھی نہیں فرمائی۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کچھ کبیدہ ہوگئے لیکن اگر ان "جوبلی" والی کتابوں کے چھاپنے میں کوئی اختلاف بھی ہوا یا خود "جوبلی کمیٹی" کو بے نیل مرام ختم کردینا پڑا تو بھی ہمارے ذاتی تعلقات پر اس کا اثر نہ پڑنا چاہیے۔ کم سے کم آپ اپنی کتابیں (یادگار غالب اور دیوان غالب) (اور) جو مجھ سے جو مقدمہ لکھوایا اور اپنے انتخاب کے پروف لینے کے لئے ہی تشریف لایئے۔

ے نفسیات کی راہیں پرپیچ ہیں۔ ایک طرف ہاشمی صاحب اس خط میں مجھے لکھتے ہیں دوسری طرف جوبلی کمیٹی سے میرے علیحدہ ہوجانے کے بعد جس کا تذکرہ اگلے خط میں آئے گا انہوں نے اپنے بھائی سید ابوتمیم فریدآبادی کی طرف سے بابائے اردو کے خطوط" اردو سے معنّی" کے نام سے لاہور سے شائع کئے خود مجھے اتنے کبیدہ تھے کہ نہ صرف اس مجموعہ کی کوئی جلد مجھے نہیں بھیجی بلکہ مرحوم ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے نام کے اصل خطوط جو میرے پاس تھے انہیں واپس کرنے کو مجھے براہ راست خط بھی نہ لکھا انہیں کو خط لکھا جو انہوں نے مجھے بھیجدیا۔ اس میں ڈاکٹر صدیقی موصوف کو مجھ سے رجوع کرنے کی تاکید کی گئی اور لکھا۔ میں بھی یہاں سے کوئی تدبیر کروں گا کیونکہ اسکول کے بچوں کی طرح ہماری بات چیت بند ہے۔"
وہ پورا خط درج ذیل ہے۔

بی - ۱۱۸
ماڈل ٹاؤن (لاہور) ۱۳ ہرجون ۹۱ عصر

مخدوم و مکرم مد فیوضہم - عنایت نامہ قلمی ہرجون کل موصول ہوا - خوشی ہوئی کہ کسی طرح "اردو سے معنّی" کا ایک نسخہ آپ تک پہنچ گیا - اس کی ترتیب تحشیہ کا قریباً سارا کام جلیل احمد صاحب قدوائی نے کیا تھا - بعد میں خفا ہوگئے اور "کمیٹی" والوں نے اسے میرے نام مڑھ دیا - اصل خطوط قدوائی صاحب ہی کے پاس تھے - ان سے قرار داد تھی کہ احتیاط سے رجسٹری سب صاحبوں کو واپس کردیں گے - آپ کے عنایت نامے سے یہ پڑھ کر تردد ہوا کہ آپ کے اصل خطوط واپس نہیں گئے - از راہ کرم آپ براہ راست قدوائی صاحب کو (کراچی، ناظم آباد، حسین ڈی سلوا ٹاؤن / بی ۵۸) بہ تاکید تحریر فرمائیں - میں بھی یہاں سے کوئی تدبیر کروں گا کیونکہ اسکول کے بچوں کی طرح ہماری بات چیت بند ہے -

خاکسار
سید ہاشمی

.... صاحب سے آپ گفتگو کر دیکھیئے۔ اگر بگڑا ہوا بلکہ ٹوٹا ہوا معاملہ جڑ جائے تو جوڑ لیجئے ورنہ کم سے کم اگلے ہفتے میں جمعہ یا اتوار (یعنی ۸ ریا ۱۰ رجولائی) کو ۴ بجے سہ پہر میرے مکان پر کمیٹی کا ایک جلسہ ضرور بلوا لیجئے جس میں اس کا قطعی فیصلہ کیا جا سکے۔ اس ناخوشگوار فرض کو ہمیں پورا کرنا ہی پڑے گا۔ اس بارے میں آپ کے جواب کا مجھے انتظار رہیگا۔

خاکسار

سید ہاشمی

(۲۸)

کراچی

۲۹ رجون / عصر

مہرفرمائے مکرم زاد الطافہم۔ صبح ایک لفافہ ڈاک سے آپ کو روانہ کر چکا ہوں۔ دفتر سے آیا تو دوپہر کو آپ کا کارڈ مورخہ ۲۸ رجون ملا۔ فی الجملہ اطمینان ہوا۔ یہاں سے آپ کو خط بھیجنے میں شاید کچھ زیادہ دیر ہو جاتی ہے۔ بہرحال آپ .... صاحب سے ضرور معاملہ کر لیجئے۔ روپے کی اس قدر جلدی نہیں تھی البتہ ایک یادداشت یا اقرار تحریر میں آجانا چاہیئے۔ اگر انہیں اس کے لکھنے میں حسب سابق کوئی عذر و انکار نہ ہو تو براہ کرم لکھوا کر لائیے اور مکتوبات کا مسودہ اور کاپیاں لے جائیے کہ یہ کام جاری رہے۔ دوسری کتاب کے متعلق بھی وہ بتائیں کہ سابقہ قرارداد کے مطابق ٹائپ میں چھپائیں گے یا اب وقت کم رہ جانے کی وجہ سے اسے بھی لیتھو میں چھاپا جائے گا؟۔ نام کا کیا ہے جتنے نام وہ کہیں گے تجویز کر دیئے جائیں گے مثلاً "خشات عالیہ" "مآثر عبدالحق"۔ دوسری جگہ ابھی کوئی باضابطہ قول و قرار نہیں ہوا ہے اور بظاہر بہتر یہی ہوگا کہ دونوں کتابیں ایک ہی جگہ سے چھپ کر شائع ہوں۔ اب میں آپ کی آمد کا (مع تحریر ...) منتظر رہوں گا۔ جوبلی کمیٹی کے آئندہ جلسے کی اطلاع ضرور بھیج دیجئے۔ میرے مکان پر ۱۰ رجولائی، سہ پہر کو ہونا مناسب ہے۔ فقط س ہ

(حاشیہ) بازنوشت۔ دونوں کتابوں کی طبع اول کے حقوق .... صاحب کو دیئے جائیں گے۔ آئندہ حقوق طبع و اشاعت غالباً ہماری کمیٹی اردو کالج کے نام کرنا پسند کرے گی۔ س ہ

(۲۹)

ہاؤسنگ سوسائٹی

۲ رجولائی ۶۰

کرم فرمائے من قدوائی صاحب، تسلیم

آپ کا دستی مرسلہ مورخہ یکم کل ملا۔ بخاری صاحب نے کچھ اور ہی روداد سنائی تھی۔ بہرحال نتیجہ وہی ہوا جس کا کچھ دن پہلے سے مجھے اندیشہ ہو گیا تھا۔ کمیٹی والوں کو آپ کے استعفےٰ کی اطلاع دے دوں گا۔ یہ دفتر تہہ کرتے وقت

(۱) رسالہ "نورس" اور "جوہر" کا عبدالحق نمبر جو مشفق خواجہ صاحب سے مستعار لے کر میں نے آپ کو دیئے تھے براہ کرم جلد اور ضرور واپس کر دیجئے گا۔ آپ کو معلوم ہے ان کا بہت دن سے تقاضا ہے اور اب آپ کو ان کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔

(۲) فوٹوگرافر کو (۳۰) روپے دینے ہیں۔ آپ کے پاس (پچھلے جلسے میں آپ نے سنایا تھا کہ) کمیٹی کے حساب میں اٹھارہ (۱۸) روپے باقی ہیں۔ یہ آپ یا تو زیبا صاحب کے گھر پہنچا کر اس کی رسید مجھے بھجوا دیجئے اور یا روپے کر باقی پوری کر کے ان کا حساب بے باق کر دیا جائے۔

امید ہے آپ مہربانی سے یہ دونوں کام کر دیں گے تاکہ کمیٹی کا معاملہ بالکل صاف ہو جائے۔ جلسہ بھی شاید اب خود مجھے منعقد کرنا پڑے گا۔ گھر میں بہت بہت سلام و دعا۔

اکرام　　سید ہاشمی

(۴۰)

مہر فرمائے مکرم، تسلیم[1]

مرسلہ دونوں رسالے مل گئے نہایت شکریہ۔ غالب کا مقدمہ بھی اس روز آپ کے دینے کے لئے بخاری صاحب آپ کے یہاں سے گئے تھے یعنی میں نے بھیجا تھا مگر پھر واپس نہیں دیا۔ یہ ضبطی (میرے مضمون کی) کس گناہ میں ہوئی، معلوم نہیں۔ بہرحال میں واپس لینے کی کوشش کروں گا۔ مگر کہہ نہیں سکتا کب تک ملے۔

روپے زیبا صاحب کے ہاں ضرور بھجوا دیجئے۔ باقی کا انتظام بھی کر دیا جائے گا۔ گھر میں بہت بہت سلام، بچوں کو دعا۔ فقط

خاکسار
ہاشمی　　۹ر جولائی ۶۰

(۴۱)

کراچی　　　　۱۷ر جولائی، سہ پہر

مہربان بندہ زاد اکرامہم۔ ۱۲ کا نوشتہ پرسوں ملا۔ بخاری صاحب اب ملتے بھی کم ہیں۔ آج (ہفتے کے دن) میں بورڈ کے دفتر گیا تو وہاں بھی وہ اتنی دیر میں آئے کہ میری واپسی کا وقت ہو گیا تھا۔ وہ اس مقدمے سے خود اپنی ایک مجوزہ غالب ایڈیشن میں کام لینے کا منصوبہ گانٹھ رہے ہیں! میں نے کافی سختی سے سمجھایا کہ یہ خیانت ناموزوں مہمل بات ہے۔ سچ پوچھئے تو وہ تحریر خود ہی محض خیال آرائی سی ہے۔ آپ صرف اس کی خاطر اپنے انتخاب کی اشاعت کو کیوں التوا

---

[1] یہ مراسلہ میرے ایک دستی خط کی پشت پر لکھا گیا تھا بمصداق حسرت ؎

انھوں نے پھیر دیا خط یوں ہی سلام کے بعد
بڑھا کے میرا تخلص بھی میرے نام کے بعد

تاخیر میں ڈالتے ہیں ؟ زیادہ اصرار کیجئے گا تو نقل یقیناً پھر بھیجی جا سکتی ہے اگرچہ کچھ دیر لگ جائیگی۔

زیبا صاحب کے ہاں آپ نے تصویر کے حساب میں روپے بھیج دیئے ہوں تو اس کی رسید ضرور مجھے ارسال کیجئے کیونکہ ان کے تیس پورے کرنے کے لئے گیارہ روپے اور دینے ہوں گے۔ گھر میں سب کو بہت بہت دعا سلام بفقط

خاکسار

مکرر ۷ ار جولائی   س ہ

یہ خط کل ڈاک میں نہیں پڑا۔ آج صبح آپ کے جوبلی کمیٹی سے استعفے کی خبر "ڈان" میں پڑھی۔ سنا تھا آپ نے زیادہ مفصل خط جس میں اختلافات اور شکایات درج تھیں اخباروں کو بھیجا تھا۔ بہرحال اب کمیٹی کے حسابات ضرور صاف کر دیجئے اور جو چیزیں واپس بھیجنا چاہیں تو بھیج دیجئے۔

س ہ

(۳۲)

کراچی   مورخہ ۲۷ رجولائی ۱۹۶۰ء

مکرمی جناب جلیل احمد صاحب قدوائی

میں نے آپ کا خط مورخہ یکم جولائی ۱۹۶۰ء جس میں   آپ نے عبدالحق جوبلی کمیٹی کی رکنیت اور عہدہ سکریٹری سے استعفیٰ تحریر کیا ہے، کمیٹی کو اس کے جلسے منعقدہ ۲۴ رجولائی میں پڑھ کر سنا دیا۔

کمیٹی نے آپ کا استعفیٰ منظور کیا اور صاحبزادہ نصراللہ خاں صاحب (سکریٹری ہیپ ڈیل اسکول ناظم آباد) کو آنریری سکریٹری منتخب کر لیا۔

لہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ استعفیٰ کا مضمون یہاں نقل کر دیا جائے:-

کراچی   یکم جولائی، ۱۹۶۰ء

بخدمت جناب مولوی سید ہاشمی فرید آبادی

صدر عبدالحق جوبلی کمیٹی

محترمی تسلیم

کل دوپہر کو آپ سے گفتگو کے بعد طے پایا تھا کہ آپ یوسف بخاری صاحب کے ہاتھ جوبلی کمیٹی کی طرف سے طبع ہونے والی ہر دو کتب کے مسودات مجھے واپس بھیج دیں گے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ پبلشر سے نئی گفتگو میں آپ کی او

(باقی حاشیہ ص۵۸ پر)

اب براہ کرم عبدالحق جوبلی کمیٹی سے متعلق جو کچھ کاغذات (مراسلات) حسابات وغیرہ آپ کے پاس ہیں وہ نصراللہ خاں صاحب موصوف کے حوالے کردیں۔ خصوصاً وہ خطوط جو باہر سے مستعار آئے اور ابھی واپس نہ کئے گئے ہوں ضرور واپس کردیجئے تاکہ احتیاط سے بھیجنے والے حضرات کو واپس بھیج دیئے جائیں ۔ فقط

خاکسار

سید ہاشمی فرید آبادی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۰)

کمیٹی کی خواہشات سامنے رکھی گئی ہیں اور اب بھی رکھی جائیں گی لیکن سابق میں ان کتب کی طباعت میں جو دشواریاں پیش آچکی ہیں، اور خود بعض اوقات کمیٹی کی کوششیں جس طرح رائیگاں ہوچکی ہیں انہیں سامنے رکھتے ہوئے میں اس کام کی کاروباری حیثیت کو بشرط ضرورت ضمنی سمجھوں گا تاکہ جس طرح ممکن ہو کمیٹی کا اصلی مقصد یعنی اگست ۱۹۶۰ء میں جوبلی کا منعقد ہونا اور اس موقع پر بابائے اردو کی خدمت میں ان کتب کا پیش کرنا فوت نہ ہو۔

واضح ہو کہ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ کاروباری حیثیت بالکل ختم کردی جائے مگر یہ ضرور تھا کہ اسے طے کرنے میں تاخیر گوارا کرلوں گا مگر اصل کام نہ رکنے دوں گا اور آپ نے میری یہ بات مان کر ہی مسودات بھیجنے کا وعدہ فرمایا تھا۔ مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ کل شام آپ کے فرستادے بخاری صاحب نہ صرف بغیر مسودات کے تشریف لائے بلکہ اس معاملے پر انتہائی ناگوار اور تلخ گفتگو کرنے کے بعد یہ بھی فرمایا کہ "ہم" (جس سے مجھے دودھ کی مکھی کی طرح نکال دینے کے بعد آپ اور بقیہ ارکان کمیٹی ہی مراد ہوسکتے ہیں) ہرگز ہرگز بغیر پیشگی روپے وصول کئے اور معاہدہ پر دستخط ہوئے کتابیں چھپنے کو نہیں دیں گے۔

یہ صورت حال نہ صرف میرے اور آپ کے درمیان تازہ ترین طے شدہ قرارداد کے خلاف ہے بلکہ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اب جوبلی کمیٹی کے سامنے وہ اصل مقصد جس کی خاطر کمیٹی قائم ہوئی تھی اور جسے پورا کرنے کے لئے مجھے سکریٹری منتخب کیا گیا تھا نہیں رہا ہے بلکہ اس کے بجائے اب مقصد صرف حلب منفعت اور طلب زر ہے۔

اس سے پہلے بھی آپ اس کام کو ختم کردینے کا ارادہ ظاہر فرماچکے ہیں مگر ہماری آخری گفتگو کے بعد کام میں پھر کچھ جان پڑجانے کی امید ہوچلی تھی ۔ اب کمیٹی اور آپ کے ہم خیال بخاری صاحب کی مذکورہ گفتگو کے بعد صورت حال پھر بدل گئی ہے ۔ چونکہ اس معاملے میں میرے اور ارکان کمیٹی کے درمیان بنیادی اختلاف ہے اور جس لیت ولعل، سہل انکاری، آرام طلبی کے ساتھ کمیٹی یہ کام کرتی رہی ہے اس سے کام کے کبھی ختم ہونے کی صورت نظر

(بقیہ حاشیہ ص۵۸)

نہیں آتی بلکہ مجھ پر بے اعتمادی کا اظہار بھی ہوتا ہے لہذا بصد افسوس لیکن انتہائی ادب کے ساتھ میں سکریٹری کے عہدے سے اور کمیٹی کی رکنیت ہر دو سے مستعفی ہوتا ہوں ۔ والسلام

خاکسار

جلیل قدوائی

مطبوعاتِ انجمن

مضامین سلیم (مولوی وحیدالدین سلیم) مولانا سلیم کے وہ تمام علمی، ادبی اور مذہبی مضامین جو مختلف علمی و ادبی جرائد میں شائع ہوئے تھے اور اب تک کتابی شکل میں منظر عام پر نہیں آتے تھے انہیں مولوی محمد اسمٰعیل پانی پتی نے تین جلدوں میں مرتب کر دیا ہے ۔

مکمل سیٹ کی قیمت بارہ روپے پچاس پیسے

مضامین محفوظ علی (سید محفوظ علی) اردو کے مشہور مزاح نگار سید محفوظ علی بدایونی مرحوم کے مضامین جو ہمدرد (دہلی) اور الناظر وغیرہ میں شائع ہوتے تھے انہیں پہلی بار کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے ۔ مصنف کی شخصیت اور فن کے بارے میں بابائے اردو کا مفصل مقدمہ بھی شامل ہے ۔

قیمت تین روپے پچاس پیسے

تاریخ ملتِ عربی (حتی ۔ سید ہاشمی فرید آبادی) پروفیسر فلپ حتی کی مشہور تاریخ "ہسٹری آف دی عربز" کا اردو ترجمہ مع حواشی ۔ ابھی صرف جلد اوّل طبع ہوئی ہے ۔

قیمت چھ روپے پچاس پیسے

کابل و یاغستان (مولوی محمد علی قصوری) مصنف نے کابل و یاغستان کے دلچسپ مشاہدات کو قلمبند کیا ہے ۔ اور ان مجاہدانہ کوششوں کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے یاغستان میں انجام دیں ۔

قیمت دو روپے پچیس پیسے

تذکرۂ اہل دہلی (سرسید احمد خاں) یہ تذکرہ سرسید احمد خاں کی شہرہ آفاق کتاب "آثار الصنادید" کا چوتھا باب ہے ۔ جس میں انہوں نے اپنے ہم عصر مشاہیر دہلی کے ایسے حالات قلمبند کیے ہیں جو کسی دوسری جگہ نہیں ملتے ۔ اس کتاب کو قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی مرحوم نے بڑی محنت اور کاوش سے مرتب کیا ہے ۔

قیمت پانچ روپے

پروفیسر ابن منور وزیری

اردو اور ۱۹۷۲ء

ہم نے اصولی طور پر تو قومی زبان — اردو — کی اہمیت تسلیم کر لی ہے، لیکن محض اس طرح قومی زبان کے مسائل کو حل نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک حکومت اور عوام دونوں عملی طور پر اردو کی اہمیت تسلیم نہ کریں اس وقت تک اردو کو اس کا صحیح مقام نہیں مل سکتا۔ پروفیسر وزیری نے اس مسئلے پر فکر انگیز خیالات کا اظہار کیا ہے اور بعض ایسی تجاویز پیش کی ہیں جن پر عمل کرنے سے بہت سی مشکلیں آسان ہو سکتی ہیں یہ مقالہ معاصر "کوہستان" کے شکریے سے درج کیا جاتا ہے۔

(ادارہ)

بعض اصحاب کے ذہنوں میں یہ بات نہ جانے کیسے بیٹھ گئی ہے کہ مغربی پاکستان کی دفتری زبان کا فیصلہ ۱۹۷۲ء میں ہوگا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کے موجودہ دستور کے مطابق ۱۹۷۲ء میں محض اس امر کا جائزہ لیا جائے گا کہ کیا اردو اس قابل ہو گئی ہے کہ اسے کل پاکستان کی سرکاری زبان قرار دیا جا سکے اور جہاں تک صوبوں کا تعلق ہے وہ اس سے بھی پہلے اردو یا بنگالی زبان کو دفتری زبان قرار دے سکتے ہیں۔

میں یہاں یہ بحث نہیں کروں گا کہ اردو دفتری زبان بننے کی کتنی صلاحیت رکھتی ہے۔ نہ ہی میں یہ بیان کروں گا کہ اس کے دفتری زبان بننے کی راہ میں کونسا طبقہ اور کیوں حائل ہے۔ محبان اردو ان مسائل پر متعدد بار سیر حاصل تبصرہ کر چکے ہیں۔ مجھے تو یہاں صرف یہ دیکھنا ہے کہ اردو کو جلد از جلد اپنانے کے سلسلے میں ہمیں کون کون سے اقدام کرنے چاہئیں۔

بعض اصحاب یہ دیکھ کر کہ اردو کو ایم اے اور ایم ایس سی میں ذریعہ تعلیم قرار دے دیا گیا ہے مطمئن ہو گئے ہیں کہ گویا اب یہ زبان آئندہ چند سال میں خود بخود اس صوبے کی دفتری زبان بن جائے گی۔ یہ نقطہ نظر درست نہیں۔ ہمیں اس زبان کو اس کا مقام دلانے کے لئے ابھی مزید انتھک کوشش کرنی ہے۔ مرحوم ڈاکٹر عبدالحق، مرحوم مولانا صلاح الدین، ڈاکٹر سید عبداللہ، [illegible]

اصل مقام حاصل کرنے کے لئے ہمیں بے انتہا جدوجہد کرنی ہے ۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم کن خطوط پر یہ جدوجہد کریں گے ۔ کیونکہ بغیر کسی لائحۂ عمل کے کسی جدوجہد کا نتیجہ خیز ہونا خاصا دشوار ہوتا ہے ۔ ذیل میں ایک ایسا لائحۂ عمل مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ اس کو زیرِ عمل لانے سے اردو اپنی منزلِ مقصود کے یقیناً بہت قریب آجائے گی ۔

(۱) تعلیمی ادارے

(الف) جملہ فنی اور تکنیکی اداروں (مثلاً میڈیکل کالج ۔ انجینئرنگ کالج ۔ انیمل ہسبنڈری کالج ۔ ٹیچر ٹریننگ کالج ۔ پولیٹیکنیک انسٹی ٹیوٹ ۔ کمرشل انسٹی ٹیوٹ میں سال اول میں اردو کا ایک سو نمبر کا لازمی پرچہ ہونا چاہیئے ۔ یہاں یہ عرض کردینا بے جا نہ ہوگا کہ گزشتہ ماہ کوہستان کے کسی شمارے میں ایک خط شائع ہوا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ گورنمنٹ کمرشل انسٹی ٹیوٹوں میں اردو کو لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھایا تو جاتا ہے مگر وہاں اس کی تعلیم ایسے اساتذہ دیتے ہیں جو خود یہ زبان مڈل تک پڑھے ہوئے ہیں ۔ بعض غیر سرکاری کالجوں میں بھی ایف اے کو ایسے اساتذہ اردو پڑھاتے ہیں جو ایم اے اردو نہیں ہوتے ۔ اردو کے ساتھ یہ سلوک نہایت افسوسناک ہے ۔ اور فوری اصلاح کا متقاضی ہے ۔

(ب) ان اداروں کے اساتذہ کو اجازت دی جائے کہ وہ اگر چاہیں تو اردو میں لیکچر دے سکیں ۔

(ج) ان اداروں کے طلبہ کو اجازت دی جائے کہ وہ اگر چاہیں تو اپنے جوابات اردو میں لکھیں ۔

(د) بی اے ، بی ایس سی میں ایک سو نمبر کا اردو زبان کا لازمی پرچہ ہونا چاہیئے ۔ تاکہ اردو کے سلسلے میں ان طلبہ کی استعداد میں اتنا اضافہ ہو جائے کہ دیگر مضامین کو اردو میں بطریق احسن بیان کرسکیں ۔

(ہ) ایف اے میں انگریزی کی طرح اردو کا بھی روزانہ ایک پیریڈ عملی گرائمر کا ہو تاکہ طلبہ صحیح اور معیاری اردو سیکھ سکیں ۔

(و) عموماً کالجوں کے مجلّوں کے حصہ اردو میں اول میں ادبی مضامین کے ساتھ ساتھ سائنسی مضامین بھی شائع کئے جائیں ۔

(ز) فنی اور تکنیکی اداروں میں ایسے اردو مجلّوں کا اجراء کرنا چاہیئے جو صرف فنی اور تکنیکی مضامین پر مشتمل ہوں ۔ اور بہترین مضمون لکھنے والوں کو انعامات دیئے جائیں ۔

(ح) چونکہ ایف اے تک ذریعہ تعلیم اردو ہے اس لئے مغربی پاکستان کے اعلیٰ ثانوی تعلیم کے تمام بورڈوں کو چاہیئے کہ وہ اپنی تمام دفتری کارروائی اردو زبان میں کریں ۔

(۲) صنعتی و کاروباری ادارے

(الف) صنعتکاروں کو ترغیب دی جائے کہ وہ اپنے اداروں نیز مصنوعات کے نام اردو میں رکھیں ۔

(ب) صنعتی اداروں کے نام بھی اردو میں رکھے جائیں ۔

(ج) ان اداروں میں جہاں تک ممکن ہو اردو کو دفتری زبان بنایا جائے ۔

(د) دوکانوں کے نام اردو میں رکھے جائیں ۔ اور ان کے بورڈ بھی اردو رسم الخط میں تیار کروائے جائیں ۔

(۳) سرکاری دفاتر

(الف) حافظ عبدالمجید صاحب سابق چیف سکریٹری مغربی پاکستان نے وحدت مغربی

میں اجازت دی گئی تھی کہ مختلف دفاتر میں اردو میں خط و کتابت کر سکتے ہیں۔ موجودہ ارباب اختیار اگر اس قسم کا مراسلہ دوبارہ جاری کر دیں تو اس سے اردو کے لئے دفتروں میں بار پانے میں آسانی ہو جائے گی۔

(ب) حافظ صاحب موصوف نے ہی ایک اور گشتی مراسلہ جاری کیا تھا۔ جس میں کہا گیا تھا کہ جو سٹینوگرافر اردو شارٹ ہینڈ اور جو ٹائپسٹ اردو ٹائپ سیکھیں گے۔ انہیں بالترتیب سو اور پچیس روپے فی کس بطور انعام دیئے جائیں گے نیز ان کے ذاتی مسلوں میں اس زائد قابلیت کا خاص اندراج ہو گا اگر ارباب اختیار یہ حکمنامہ بھی دوبارہ جاری کر دیں تو اس سے دفاتر میں اردو کی ترویج کے لئے راہ ہموار ہو جائے گی۔

(ج) نچلی سطح پر اردو میں نوٹ لکھنے کی اجازت دی جائے تاکہ کلرک صاحبان غلط انگریزی لکھنے کے بجائے صحیح اردو میں اپنا مافی الضمیر بیان کر سکیں۔

(د) سرکاری دفاتر میں مختلف درخواستیں اردو میں دینے کی اجازت دی جائے۔

(ح) تمام سرکاری دفتروں کے ناموں کا اردو میں ترجمہ کیا جائے اور ان کے بورڈوں پر انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی نام لکھائے جائیں۔

(و) تمام مقابلے کے امتحانات بشمول پی، سی ایس میں اردو کو اختیاری ذریعہ امتحان قرار دیا جائے۔

(۴) اشاعت کتب

(الف) ہر سرکاری دفتر میں متعلقہ کتب کے ترجمہ کا انتظام ہونا چاہیئے۔ حافظ عبدالمجید صاحب کے زمانے میں پنجاب کے ہر دفتر میں ٹرانسلیٹر متعلقہ دفتر کی کتابوں وغیرہ کے ترجمے کے لئے مقرر کیا گیا تھا مگر بعد میں نہ جانے کس بنا پر اس مفید منصوبہ کو ختم کر دیا گیا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس پر فکر و عمل کیا جائے۔

(ب) کالجوں اور یونیورسٹی کے اساتذہ کرام کو متعلقہ مضامین کی کتب اردو میں لکھنے کے سلسلے میں ہر ممکن سہولت بہم پہنچائی جائے۔

(ج) دیگر اہل علم حضرات کو بھی مختلف فنون پر اردو کتب تصنیف کرنے کی تحریک کی جائے۔

(د) علوم و فنون (خصوصاً سائنسی ٹیکنیکی) کی اعلیٰ کتب پر سرکاری و غیر سرکاری پیمانہ پر انعامات دینے کا اہتمام کیا جائے۔ اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ایک ہمہ گیر تحریک کی ضرورت ہے اگر محبان اردو اجتماعی اور انفرادی طور پر اس پروگرام کی مختلف شقوں کو عملی صورت دینے کے لئے روبہ عمل ہو جائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم کیوں اردو کو اس کا جائز مقام نہ دلا سکیں۔ جتنی جلدی اور جتنی تندہی سے ہم اس پروگرام پر عمل پیرا ہوں گے اتنی ہی جلدی ہماری منزل ہمارے قریب آجائے گی اس سلسلے میں بے جا تاخیر اردو کے حق میں (اور نتیجۃً ہمارے حق میں ہی) زہر قاتل بن سکتی ہے۔ لیکن اس عظیم تحریک کے لئے چند افراد یا چند انجمنوں کی کوششیں ہی کافی نہیں بلکہ ہر محب اردو کا فرض ہے کہ وہ اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے اپنی جملہ صلاحیتیں اور اپنے جملہ وسائل بروئے کار لائے صرف اور صرف اس صورت میں ہی ہم یہ توقع کر سکتے ہیں کہ اردو چند سال میں مغربی پاکستان کی اور ۱۹۷۲ء میں کل پاکستان کی سرکاری زبان قرار پائے۔

نئے خزانے

پیش نظر اشاریہ مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت ترتیب دیا گیا ہے

اردو ادب، تحقیق و تنقید
اردو زبان اور اس کے مسائل
آپ بیتی
تاریخ
تعلیم اور تعلیمی ادارے
تمدن و معاشرت
سائنس
سیاسیات
سیر و سیاحت
شخصیات
احمد سرہندی، شیخ
اقبال، علامہ
سرشار صدیقی
صلاح الدین احمد
غالب
دیگر شخصیات
صحافت
فنون لطیفہ
قانون
کتابیات و کتب خانے
مذہبیات
قرآن و تفسیر
سیرت نبوی
جہاد
مسائل و مباحث
مکاتیب
مطبوعات جدیدہ (نئی کتابوں پر تبصرے)

اس اشاریئے کی ترتیب میں ستمبر ۱۹۶۵ء کے مندرجہ ذیل رسائل سے مدد لی گئی ہے بعض رسائل دیگر مہینوں کے ہیں جو بعد میں دستیاب ہوئے ہیں۔

ماہنامہ	ادبی دنیا	لاہور	ستمبر ۱۹۶۵ء	سہ ماہی	سیپ	کراچی	۱۹۶۵ء نمبر ۵
"	اردو ڈائجسٹ	"	"	ماہنامہ	طلوع اسلام	لاہور	ستمبر ۱۹۶۵ء
"	افکار	کراچی	"	"	عارف	"	"
"	الرحیم	حیدرآباد	"	"	فاران	کراچی	"
"	الشجاع	کراچی	"	"	فکر و نظر	"	"
"	انجمن اسلامیہ میگزین	"	اگست	"	قومی زبان	"	"
سہ ماہی	العلم	"	جولائی تا ستمبر	"	کتاب	لکھنؤ	اگست
ماہنامہ	بھائی میگزین	لاہور	ستمبر اکتوبر	"	کتابی دنیا	کراچی	ستمبر
"	بینات	کراچی	ستمبر	"	گل خنداں	لاہور	"
"	پیام عمل	لاہور	"	—	مجلہ قانون	کراچی	جولائی
"	تحریک	دہلی	"	ماہنامہ	منشور	"	ستمبر
"	ترجمان القرآن	لاہور	"	"	نگار پاکستان	"	"
"	تہذیب الاخلاق	"	"	"	نئی قدریں	حیدرآباد	ج ۱۶ ش ۷، ۸
"	ثقافت	"	"	"	ہم قلم	کراچی	مئی
"	جوار بھاٹا	دہلی	"	ہفت روزہ	المنبر	لائل پور	ستمبر
"	خاتون پاکستان	کراچی	اگست ستمبر	"	چٹان	لاہور	"
"	خرام	چاٹگام	ج ۱ ش ۲ ۱۹۶۵ء	"	ساغر	کراچی	۱۰ ستمبر
ماہنامہ	زندگی	رام پور	ستمبر	"	لاہور	لاہور	ستمبر
"	سیارہ	لاہور	ستمبر (اشاعت خاص)	"	ہماری زبان	علی گڑھ	یکم ستمبر
سالنامہ	سیاسیات	کراچی	۱۹۶۶ء				

اردو ادب

تحقیق و تنقید

مصنف	عنوان	حوالہ
اثر فاروقی	جدید افسانوی ذہن	الشجاع[1]، ص ۵۱ تا ۵۵/ ستمبر
احسن فاروقی، ڈاکٹر محمد	اردو ادب کی ترقی کا سوال	سیپ/ ص ۱۹۰ تا ۱۹۴/
احراز نقوی، ڈاکٹر	اردو کا نیا انعامی ناول (تجزیاتی مطالعہ)	ادبی دنیا/ ص ۱۲۰ تا ۱۲۶/ ستمبر
احمد رفاعی	جگر کی شاعری کا واقعاتی پس منظر	تحریک/ ص ۵ تا ۱۴/ ستمبر
ادیب سہیل	مشرقی پاکستان اور ڈرامے کی رفتار	سیپ/ ص ۲۳۶ تا ۲۴۰/
اسلم فرخی، ڈاکٹر	شعرائے اردو کے تذکرے اور مولوی عبدالحق	سیارہ/ ص ۲۰۳ تا ۲۰۸/ ستمبر
اسمٰعیل پانی پتی، شیخ محمد	سرسید کی ادبی حیثیت (۲)	تہذیب الاخلاق/ ص ۹ تا ۲۴/ ״
اظہر، غلام حسین	ڈاکٹر وزیر آغا سے انٹرویو)	سیارہ/ ص ۸۱ تا ۸۸/ ״
انور سدید	اردو شاعری کا مزاج	نئی قدریں/ ص ۱۷ تا ۱۹/
انور سیوانی، پروفیسر	نظیر اکبر آبادی - ایک روایت	خرام/ ص ۲۵ تا ۳۷/
بدر، بشیر	وصال - اردو غزل میں	کتاب، ص ۱۳ تا ۲۴/ اگست
پریتم سینی	فیض اور اس کی شاعری	جوار بھاٹا/ ص ۶۷۸ تا ۶۸۵/ ستمبر
تحسین سروری	اردو ادب کے غیر ادبی ماخذ	قومی زبان/ ص ۱۱ تا ۱۵/ ״
جمیل جالبی	آغا حشر اور ڈرامے کی روایت	سیارہ، ص ۲۰۹ تا ۲۱۲/ ״
״ ״	حالی کی نسل کا ذہنی رویہ	سیپ، ص ۱۹۷ تا ۱۹۹/
رشید حسن خاں	قاموس الاغلاط پر ایک نظر	فاران/ ص ۲۳ تا ۳۴/ ستمبر
رئیس احمد جعفری	خالد اور زنجیر رم آہو	سیارہ/ ص ۲۱۳ تا ۲۲۰/ ״
زرینہ ثانی	میر اور مرثیہ گوئی	ادبی دنیا/ ص ۱۷ تا ۲۱/ ״
״ ״	سیماب پہلا کامیاب ہیئتی تجربہ ساز	افکار/ ص ۸۵ تا ۹۶/ ״

---

[1] رضیہ فصیح احمد کا ناول "آبلہ پا"

سعادت نظیر	حالی غزل گو کی حیثیت سے	نگار پاکستان، ص ۵۲ تا ۵۶، ستمبر
سہیل بخاری، ڈاکٹر	اردو میں داستان گوئی	سیپ، ص ۲۰۰ تا ۲۰۴،
شبنم رومانی	ادب ڈیڈی ازم	فاران، ص ۱۸ تا ۲۱، ستمبر
شرر مرحوم، مولانا عبدالحلیم	سرسید کی دینی برکتیں (۲)	العلم، ص ۶۷ تا ۷۲، جولائی تا ستمبر
شمس تبریز خاں	جگر مرادآبادی کا فارسی کلام	فاران، ص ۲۶ تا ۳۰، ستمبر
شمیم احمد	ادیبوں کا مسئلہ	سیپ کراچی، ص ۲۰۸ تا ۲۱۰،
" "	غزل کے شکوے غزل کے معاملات	کتاب، ص ۴۳ تا ۴۸، اگست
شہاب قاضی پوری	نظم جو غزل ہو کر رہ گئی	خرام، ص ۳۸ تا ۴۰،
صغیرہ نسیم	تنقید کے مسائل	سیپ، ص ۲۲۶ تا ۲۳۰،
عبادت بریلوی، ڈاکٹر	اردو ادب کے مسائل — آزادی کے بعد	افکار، ص ۱۲ تا ۲۲، ستمبر
عبدالسلام، محمد	جگر کا فن	العلم، ص ۷۳ تا ۸۲، جولائی تا ستمبر
عبدالمغنی، پروفیسر	ڈراما اور تھیٹر	سیارہ، ص ۲۲۱ تا ۲۲۶، ستمبر
غوثیہ زریں	اردو شاعری میں خواتین کا حصہ	ہم قلم، ص ۱۷ تا ۲۴، مئی
فارانی، ابوطاہر	سالک — ایک اسلامی شاعر کے روپ میں	لاہور، ص ۱۰ تا ۱۱، ۲۷، ستمبر
فراق گورکھپوری	اردو ادب میں محروم کا حصہ	سیپ، ص ۱۹۵ تا ۱۹۶،
فرمان فتح پوری، ڈاکٹر	پتھر کی لکیر اور اس کا شاعر	" " ص ۲۳۲ تا ۲۳۸،
کوٹ نیس، چندرا	نئی پود ناراض کیوں	خرام، ص ۱۵ تا ۲۴،
ماہر القادری	میری نعتیہ غزل[1]	نگار پاکستان، ص ۵۷ تا ۶۸، ستمبر
محمد نواز	جماعت اسلامی کے لٹریچر میں تضاد	فاران، ص ۱۳ تا ۴۳، "
میمونہ انصاری، ڈاکٹر	آبلہ پا ناول یا افسانوں کا مجموعہ	سیپ، ص ۲۱۳ تا ۲۱۶،
نظر، محمد انصار اللہ	میر لکھنؤ میں	نگار پاکستان، ص ۶ تا ۱۳، ستمبر
نیاز فتحپوری	تھیٹر اسٹیج اور تمثیل کے آغاز کی دلچسپ داستان	
نیشو غار، نسیم	تخلیق و تجرید	ہم قلم، ص ۱۰ تا ۱۱، مئی

---

[1] نگار پاکستان بابت ماہ فروری ۶۳ء میں سید محمد باقر شمس لکھنوی کی تنقید کا جواب

یعقوب امجد	مومن کا تغزل	لاہور، ص ۶ تا ۷ + ۱۲، ۶ر ستمبر
اسمٰعیل، شیخ محمد	مولانا حالی کی پہلی سوانح عمری[1]	ادبی دنیا، ص ۲۵ تا ۵۵، ستمبر
ماہر القادری	ماہنامہ افکار کا فیض نمبر[2]	تحریک، ص ۲۰ تا ۲۸، ستمبر
مجتبیٰ حسین	اردو شاعری نئے کرداروں کی تلاش میں	سیپ، ص ۷۵ تا ۲۰۷، ۰
بیٹی	بیٹی کا خط ماں کے نام	اردو ڈائجسٹ، ص ۵۳، ستمبر

اردو زبان اور اس کے مسائل

اظہر، اسے ڈی	غریب اردو	خاتون پاکستان، ص ۱۴ تا ۲۰، اگست ستمبر
جوہر، نر بچھے رام	ہندی، ہندو اور اردو	نئی قدریں، ص ۱۳ تا ۱۶،
حمید اللہ خاں	بھارت میں اردو الفاظ کا جھٹکا	العلم، ص ۱۱۲ تا ۱۱۴، جولائی تا ستمبر
شمس لکھنوی، محمد باقر	لکھنؤ میں اردو	نگار پاکستان، ص ۳۰ تا ۳۷، ستمبر
عارف، فضل الٰہی	زبان کی ادائیں	اردو ڈائجسٹ، ص ۶۵، ستمبر
مصطفٰے علی بریلوی، سید	اردو ہماری تعلیمی زبان	مجلہ قانون، ص ۴۰ تا ۴۴، جولائی
نعمانی ابن جلیل	پروفیسر براؤن اور اردو	ادبی دنیا، ص ۲۲ تا ۲۸، ستمبر

آپ بیتی

آغا صادق	آغا صادق[3]	خرام، ص ۱۱ تا ۱۴ + ۳۷،
بروہی، اسے کے	میرا مطالعہ	سیارہ، ص ۴۹ تا ۵۱، ستمبر
بشیر احمد، میاں	" "	" ص ۵۶ تا ۶۸، "
خورشید احمد، پروفیسر	وہ مرا پہلے پہل داخل زنداں ہونا۔	" " " ۱۸۳ تا ۱۸۹، "
عابد، عابد علی	میرا مطالعہ	" " " " ۵۷ تا ۶۰، "

---

[1] سیف الحق ادیب کی مرتبہ حالی کی سوانح انجمن مفید عام قصور کے علمی مجلہ "رسالہ" بابت ستمبر و اکتوبر ۱۸۹۶ء سے ماخوذ۔ شیخ صاحب کے ایک مفید تعارفی نوٹ کے ساتھ۔

[2] منقول از ماہنامہ فاران کراچی۔ [3] حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو۔

تاریخ

تعلیم اور تعلیمی ادارے

حاشیہ متعلق صفحۂ گزشتہ

[1] جناب نعیم صدیقی صاحب کے ایک سوالنامہ کے جواب میں علمی و ادبی زندگی کے بعض گوشے اور علمی زندگی کے تاثرات، تجربات - اس عنوان کے تحت ایک ہی سوالنامہ کے جوابات ہیں -

عبدالغفور چودھری، پروفیسر	دیسی تعلیم کی کہانی	تہذیب الاخلاق، ص ۴۳تا ۵۱، ستمبر

تمدن و معاشرت

باز احمد	فیشن	تہذیب الاخلاق، ص ۳۱تا ۳۴، ستمبر
یس احمد جعفری	انسداد جرائم	ثقافت، ص ۳ تا ۶، ستمبر
ظہر علی	ملبوسات اسلامی نقطۂ نظر سے	عارف، ص ۱۵ تا ۱۸، "
ناز لیاقت	قتل کی وارداتوں میں اضافہ	چٹان، ص ۲ تا ۱۳ + ۱۸، ۲ ستمبر

سائنس

ض صدیقی، محمد	ریڈیو آئی سوٹاپ	منشور، ص ۱۵ تا ۱۸، ستمبر

سیاسیات

لطافت حسن قریشی	نور الامین قائد حزب اختلاف قومی اسمبلی سے انٹرویو	اردو ڈائجسٹ، ص ۱۵ تا ۳۲، ستمبر
ی، مولانا محمد تقی	جدید دور میں جدید رہنمائی کی ضرورت	سیارہ میگزین، ص ۱۴ تا ۱۶، اکتوبر
م شاہجہان پوری	قائد اعظم کا عزم راسخ	گل خنداں، ص ۷ تا ۲۲، ستمبر
ذوالفقار حسین شاہ، سید	نظریۂ قومیت اور امن عالم	مجلہ قانون، ص ۸ تا ۳۰، جولائی
فاروق	افغانستان دستوری راستے پر	ثقافت، ص ۵۹ تا ۶۷، ستمبر
ز لیاقت	کشمیریوں کی کامل آزادی۔ مسئلہ کشمیر کا واحد حل	چٹان، ص ۸ تا ۱۰، ۱۳ ستمبر
"	ہم حق پر ہیں —	" " ۸ تا ۱۰ + ۱۴، ۲۰ "
"	مسئلہ کشمیر — سلامتی کونسل سے انقلابی کونسل تک	چٹان، ص ۸ تا ۹ + ۱۴، ۲۷ ستمبر
ودودی، مولانا سید ابوالاعلیٰ	خلافت اور ملوکیت کا فرق (۲)	ترجمان القرآن، ص ۲۳ تا ۵۳، ستمبر
	جب گاندھی جی نے قائد اعظم زندہ باد کا نعرہ لگایا	لاہور، ص ۲ تا ۷ + ۱۵، ۱۳ ستمبر

سیر و سیاحت

هلٹن، ایچ اے
مترجم: آبلو شاہ پوری — کردستان — حسین وادیوں اور خوفناک غاروں کی سرزمین — اردو ڈائجسٹ، ص ۱۱۲، ستمبر

شخصیات

احمد سرہندی، شیخ

حبیب الرحمٰن خاں شروانی — امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ — العلم، ص ۱۰۳ تا ۱۱۱، جولائی تا ستمبر

مسعود احمد، پروفیسر — حضرت مجددؒ مغرب میں — فکر و نظر، ص ۱۸۹ تا ۲۰۷، ستمبر

اقبال، علامہ

بشارت علی، ڈاکٹر — اقبال کا تصورِ جہاد — تہذیب الاخلاق، ص ۵۳ تا ۶۰، ستمبر

محمد حسن قریشی، شفاء الملک — علامہ اقبال کی ابتدائی شاعری اور . . . . — عارف، ص ۱۳ تا ۲۴، ستمبر

صلاح الدین احمد

رحمٰن، جسٹس ایس اے و حمید احمد خاں وغیرہ — مولانا صلاح الدین احمد — ادبی دنیا، ص ۴۱ تا ۶۴، ستمبر

سلیمہ سلطانہ، پروفیسر — منتے برقدم رہ رواں است را — ساغر، ص ۶ تا ۷، ۱۰، ۱۱ر

غالب

سلیم اختر — غالب خطوط کے آئینے میں — سیپ، ص ۲۱۷ تا ۲۲۵،

محمود شاہ بیگ، مرزا — غالب اور تصوف — نئی قدریں، ص ۲۶ تا ۳۵،

غالب اور نواب حامد علی خاں — ادبی دنیا، ص ۳۵ تا ۴۰، ستمبر

دیگر شخصیات

خیر حسین، صدر انجمن ترقی اردو	بابائے اردو کی چوتھی برسی	قومی زبان، ص ۳ تا ۵، ستمبر
رشد، ڈاکٹر اے ڈی	شیخ عبدالغفور مجذوب گوالیاری	تہذیب الاخلاق، ص ۵۲ تا ۵۶، ستمبر
بو علی	مولوی محبوب الرحمان کلیم	ہماری زبان، ص ۳+۴، یکم ستمبر
پرویز کاکوری	بچوں کا راجہ (مہدی علی خاں)	ہم قلم، ص ۱۲ تا ۱۶، مئی
تمیدزماں		
مترجم :- افسر آذر	شاہد سجاد	سیپ، ص ۲۶۹ تا ۲۷۰،
شمیم، محمد حسین	مولوی محمد شفیع مرحوم	سیارہ، ص ۸۹ تا ۹۲، ستمبر
شہابی، انتظام اللہ	مشاہیر اکبرآباد	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۶۵ تا ۸۰، اگست
طفیل احمد قریشی	امام ابن تیمیہ	لاہور، ص ۸ تا ۱۰، ۱۲ ستمبر
محمد مسلم عظیم آبادی، پروفیسر	مانی	نگار پاکستان، ص ۴۱ تا ۵۱، ستمبر
نصرت قریشی	مولانا جدت میرٹھی	نئی قدریں، ص ۷۰ تا ۷۵،
مترجم :- محمد عمر میمن	کافکا	سیپ، ص ۳۱۱ تا ۳۳۲،
ظہور احمد	خلیل مطران (جدید عربی ادب میں دبستان شعر کا ایک امام)	نگار پاکستان، ص ۱۴ تا ۲۹، ستمبر
طاہر صدیقی، اسحٰق	درد متاع عام نہیں[1]	سیپ، ص ۲۴۴ تا ۲۵۰،
کشفی، ابوالخیر	اسرار ۔ امان ۔ سرشار[2]	" " ۲۳۹ تا ۲۴۴،

صحافت

امداد صابری	اردو اخبارات کے ابتدائی عہد کے حالات و مسائل	قومی زبان، ص ۱۲ تا ۱۴، ستمبر

---

[1] سرشار صدیقی امدان کے کلام پر تبصرہ۔ [2] سرشار صدیقی کی شخصیت۔

فنون لطیفہ

بلدیو مرزا	موسیقی اور تعلیم	سیپ، ص ۳۴۳ تا ۳۴۷،
حمیدزماں	مسعود کوہاری	
مترجم :- افسرآذر		سیپ، ص ۲۶۷ تا ۲۶۸،
حمیدزماں	منصور، اے	
مترجم :- افسرآذر		سیپ، ص ۲۶۵ تا ۲۶۶،
حمیدزماں	بشیر مرزا	
مترجم :- افسرآذر		سیپ، ص ۳۲۲ تا ۴۲۲،
حمیدزماں	جمیل نقش	
مترجم :- افسرآذر		سیپ، ص ۲۶۰ تا ۲۶۲،
حمیدزماں	رالعہ زبیری	
مترجم :- افسرآذر		سیپ، ص ۲۷۱ تا ۲۷۲،
مجیب، محبوب اللہ	مغل اور موسیقی	″ ″ ۱۴۳ تا ۱۴۴،
وزیر آغا	ہندوستانی رقص	کتاب لکھنؤ، ص ۴۹ تا ۵۲، اگست

قانون

بشک کمار جین	سعودی عرب میں عبرت ناک سزائیں	الشجاع، ص ۱۸ تا ۲۳ + ۳۹، ستمبر
حنیف اقبال	پاکستان میں قانون سازی	مجلۂ قانون، ص ۷ تا ۱۹، جولائی
شمسی، محمد اکرم	بین الاقوامی قانون اور انفرادیت	″ ″ ″ ۳۱ تا ۳۳، ″
شمیم الحق عثمانی، محمد	قانون اسلام کی اہمیت	″ ″ ″ ۲۴ تا ۲۷، ″
ظہور احمد	قانون ــ علمار قانون کی نظر میں	″ ″ ″ ۳۸ تا ۳۹، ″
فضل الرحمان، ڈاکٹر	اسلامی حکومت اور قانون سازی	فکرونظر، ص ۲۰۷ تا ۲۱۶، ستمبر
کنیز بانو	اسلام میں سزا کا تصور	مجلۂ قانون، ص ۲۰ تا ۲۳، جولائی
مصطفٰے علی بریلوی، سید	پاکستان کا قانون اساسی اور ہمارے بنیادی حقوق	″ ″ ″ ۱۱ تا ۱۶، ″

کتابیات و کتب خانے

ابو سلمان شاہجہان پوری	نئے خزانے (مارچ ۱۹۷۶ء کے اخبارات و رسائل کا اشاریہ)	قومی زبان، ص ۳۳ تا ۴۴، ستمبر
برنی، ضیاء الدین احمد	رسالوں پر طائرانہ نظر	کتابی دنیا، ص ۱۲ تا ۱۵، "
بدوی، لطف اللہ	فقہ کے تین منظوم رسالے	قومی زبان، ص ۱۴ تا ۲۰، "
طاہر فاروقی، پروفیسر محمد	کتاب اور ہم	کتابی دنیا، ص ۱ تا ۶، "
غلام مصطفیٰ قاسمی	شاہ ولی اللہ کی تالیفات پر ایک نظر	الرحیم، ص ۷۰۳ تا ۷۱۳، "
نعیم الدین قریشی	پاکستان میں کتب خانوں کی ترقی	مجلہ قانون، ص ۴۳ تا ۷۲، جولائی

مذہبیات

قرآن و تفسیر

ارشد، پروفیسر رشید احمد	قرن چہارم و پنجم کی مشہور تفاسیر اور مفسرین	الرحیم، ص ۵۴۴ تا ۲۶۲، ستمبر
شمس نوید عثمانی	اللہ کی آخری کتاب	زندگی، ص ۲۴ تا ۳۴، "
عبد الحلیم چشتی، محمد	تفسیر سورہ فاتحہ از حضرت سید احمد شہید	الرحیم، ص ۳۴۴ تا ۳۶۶، "
علی نقی النقوی، علامہ سید	تفسیر القرآن	پیام عمل، ص ۱۲ تا ۱۳، "
محمد مصطفیٰ (علی گڑھ)	فوائد القرآن	فاران، ص ۲۴ تا ۲۵، "
مودودی، مولانا سید ابو الاعلیٰ	الجاثیہ (۳) دلاحقاف	ترجمان القرآن، ص ۷ تا ۵۳، ستمبر

سیرت نبوی

حسن علی جامعی، حکیم	خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم ـــ انجیل کی نظر میں (۲)	چٹان، ص ۱۹ تا ۲۰، ۷ ستمبر
شہابی، انتظام اللہ	الاخلاق محمدیہ	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۲۵ تا ۳۴، اگست
مترجم: مولوی محمد احمد	اخلاق النبی صلی اللہ علیہ وسلم	بینات، ص ۱۳ تا ۱۶، ستمبر
مسعودی، علامہ ابو الحسن علی	وقائع سرکار دو عالم	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۴۲، اگست

جہاد

اشرف، عبدالرحیم	مرحلہ جہاد اور ہمارے فرائض	المنبر، ص ۲، ۲۴ ستمبر
محمد شفیع، مفتی	اس جہاد میں ہمارے فرائض	چٹان، ص ۴، ۱۳۰، ۲۰ ستمبر
" " "	موجودہ جہاد میں ہمارے فرائض	المنبر، ص ۷، ۲۴ ستمبر
ممتاز لیاقت	جہاد فی سبیل اللہ	چٹان، ص ۶، ۱۴۰، ۲۰ ستمبر

مسائل ومباحث

ابن تیمیہ، امام	وصیت صغرا	زندگی، ص ۳۵ تا ۴۷، ستمبر
الطاف جاوید	تجدد پسندی اور قدامت پرستی	فکر ونظر، ص ۲۱۰ تا ۲۲۶، "
انیس الرحمٰن	مستقبل کا مذہب	بھائی میگزین، ص ۱۱ تا ۱۴، "
بہار اللہ	ظہور مظاہر الہیہ (ترجمہ)	" " ۲ تا ۵، اکتوبر
حنیف ندوی، مولانا محمد	خوارج کے عقاید	ثقافت، ص ۷ تا ۲۶، ستمبر
رئیس احمد جعفری	عدالت (۴)	" " ۲۷ تا ۳۹، "
سعید احمد، ڈاکٹر	پردہ اور اس سے متعلقہ مباحث	" " ۴۱ تا ۵۸، "
شہابی، انتظام اللہ	اخلاق اور اسلام	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۵۴، اگست
عباد اللہ فاروقی، حافظ	حضرت شاہ ولی اللہ کا تصور روح	الرحیم، ص ۲۷۲ تا ۲۹۲، ستمبر
محمد ادریس	سنت جاریہ	بینات، ص ۲۸ تا ۴۸، "
محمد شفیع، مفتی و محمود، مفتی	مشین ذبح کا مسئلہ [1]	فکر ونظر، ص ۲۲۷ تا ۲۳۹، ستمبر
محمد شفیع، مولانا مفتی	اسلام اور بیمہ	زندگی، ص ۹ تا ۱۲، ستمبر
ولی حسن ٹونکی، مفتی	طلاق اور ازدواجی زندگی میں اس کا مقام (۵)	بینات، ص ۱۷ تا ۲۷، "
———	مستشرقین کا تصور سنت	" ۴۹ تا ۶۴، "
———	حشر ونشر	بھائی میگزین، ص اکتوبر

---

[1] بینات کراچی سے ماخوذ

مکاتیب

باقر، آغا محمد	سرسید کے تین نایاب خط	ادبی دنیا/ص ۹ تا ۱۶/ ستمبر

مطبوعاتِ جدیدہ (نئی کتابوں پر تبصرے)

نام	مصنف	تبصرہ نگار	حوالہ
اجماع اور باب اجتہاد	کمال فاروقی	—	فاران/ص ۵۲ تا ۵۴/ ستمبر
الٹ پھیر	شوکت تھانوی	شاہد عشقی	سیپ/ص ۳۵/
اماوس	سید ارشاد علی	—	سیارہ/ص ۲۳۸/ ستمبر
اے بیلیوگرافی آف اقبال	خواجہ عبدالوحید	ابوسلمان شاہجہانپوری	الرحیم/ص ۱۸ تا ۳۰/ ،،
برگ خزاں	عبدالعزیز خالد	ص-ا-ب	کتابی دنیا/ص ۱۶ تا ۱۸/ اگست
برگ ریار	بریم ناتھ دت قاصر	—	فاران/ص ۵۸ تا ۶۰/ ستمبر
بڑھاپا اور اس کا سدِ باب	حکیم محمد اقبال حسین	—	،، ،، ۶۰ تا ۶۱/ ،،
تذکرہ طالب آملی مع انتخاب کلام	خواجہ عبدالرشید	—	فکر ونظر/ص ۲۵۰ تا ۲۵۱/ ستمبر
تذکرہ طالب آملی مع انتخاب کلام	کرنل خواجہ عبدالرشید	عبدالقدوس ہاشمی	خاتون پاکستان/ص ۱۶/ اگست ستمبر
تقویم تاریخی و قاموس تاریخی	عبدالقدوس ہاشمی ندوی	محمد احمد صدیقی	العلم/ص ۱۱۶ تا ۱۱۷+۱۲۸/ جولائی تا ستمبر
تقویم تاریخی	،،	احمد حسن	خاتون پاکستان/ص ۱۱ تا ۱۲/ اگست ستمبر
تلامذہ میر	امداد صابری	—	نگار پاکستان/ص ۷۹/ ستمبر
توحید لاہور (ہفت روزہ)	ایڈیٹر:- محمد اسحٰق بھٹی	ش-ز	لاہور/ص ۶، ۷/ ۲ ستمبر
تنقیدی نقوش	ڈاکٹر عبدالقیوم	نثار الحق صدیقی	العلم/ص ۱۲۴/ جولائی تا ستمبر
جگر کی غزلیہ شاعری	اشفاق علی خاں	مخمور سعیدی	تحریک/ص ۲۹/ ستمبر

نام	مصنف	تبصرہ نگار	حوالہ
جگنگ (مجموعہ کلام)	نور	ابو یوسف قاسمی	چٹان/ص ۲۱، ۱۷ ستمبر
چراغ دیر و حرم	صفدر حسین	اکرام احمد	سیپ/ص ۳۵۰ تا ۳۵۱/
چور سارا تیں اور جاڑا	گلزار	صبیحہ آذر	" " ۳۶۲/
حالی کی اردو نثر نگاری	ڈاکٹر عبدالقیوم	عبدالسلام	" " ۳۵۲ تا ۳۵۳/
"	"	—	نگار پاکستان/ص ۷۸/ستمبر
حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکر	وحید احمد مسعود	—	" " ۷۸/ "
حیات اقبال کا ایک جذباتی دور	پروفیسر محمد عثمان	م-س	فکرونظر/ص ۲۴۲/ستمبر
حریر سنگ	شاہ حسن عطا	ش-ب	خاتون پاکستان/ص ۲۶ تا ۳۲/اگست ستمبر
خطبات دوازدہ ماہی	—	—	گل خنداں/ص ۷۳ تا ۸۳/ستمبر
خلافت عباسیہ اور فاطمین مصر	سید معین الحق	—	فاران/ص ۵۰/ستمبر
خلش	سیفی پریمی	—	نگار پاکستان/ص ۸۰/ستمبر
دشت شام	عبدالعزیز خالد	افسر آذر	سیپ/ص ۳۵۴ تا ۳۵۶/
دعوت اسلام	سر تھامس آرنلڈ مترجم: محمد عنایت اللہ دہلوی	—	سیارہ/ص ۷۲۲/ستمبر
دلی سے دلی تک	سید ضمیر حسن دہلوی	مخمور سعیدی	تحریک/ص ۲۹/ "
دیواریں	حمید کاشمیری	افسر آذر	سیپ/ص ۳۶۱/
دیوان شیفتہ	نواب مصطفٰے خاں شیفتہ	وحید قریشی	اردو ڈائجسٹ/ص ۱۱۰ تا ۱۱۳/ستمبر
ذکر غالب	مالک رام		فاران/ص ۵۱ تا ۵۲/ "
رسالہ تہلیلیہ	مجدد الف ثانی مترجم: رشید احمد ارشد	نثار الحق صدیقی	العلم/ص ۱۱۵ تا ۱۱۶/جولائی تا ستمبر
رشتۂ دل (نظموں کا مجموعہ)	بلراج کومل	شاہد عشق	سیپ/ص ۳۴۹ تا ۳۵۰/
رنگ بہار	غلام کبریا	و-ح	تہذیب الاخلاق/ص ۵۷ تا ۵۸/ستمبر
روزگار فقیر (جلد دوم)	فقیر سید وحیدالدین	—	فاران/ص ۵۲/ستمبر

نام	مصنف	تبصرہ نگار	حوالہ
ن کا مطالعہ	خلیل صدیقی	وحید قریشی	اردو ڈائجسٹ/ص ۱۰۸/ ستمبر
ۃ البخاری	علامہ ضیاء الدین		
	مترجم:۔ آغا محمد رفیق	—	سیارہ/ص ۲۲۷ تا ۲۲۸/ ستمبر
یرم آہو	عبدالعزیز خالد	عبیداللہ علیم	سیپ/ص ۲۵۰ تا ۲۶۱/
یرم آہو، برگ خزاں/ ن شیشہ گر	عبدالعزیز خالد	—	سیارہ/ص ۲۳۰ تا ۲۳۲/ ستمبر
ت، قرآن کے آئینے میں	اسماعیل سلفی، شیخ الحدیث		
	مولانا محمد	ع ۔ ق	زندگی/ص ۶۱/ ستمبر
رۃ الخلفاء	شیخ محمد خضری بک		
	مترجم:۔ ساجد الرحمان صدیقی	—	فاران/ص ۴۹/ ستمبر
رت فریدیہ	سرسید احمد خاں		
	مقدمہ و ترتیب:۔ محمود احمد برکاتی	—	ترجمان القرآن/ص ۴۸ تا ۴۹/ ستمبر
خ زریں	جارج فریزر		
	مترجم:۔ سید اعجاز ذاکر	ڈاکٹر وحید قریشی	اردو ڈائجسٹ/ص ۱۰۷ تا ۱۰۸/ ستمبر
رح ابواب الوترمن جامع			
مذی	محمد یوسف بنوری مولانا	—	ترجمان القرآن/ص ۹۶/ ستمبر
ستِ شب	محسن بھوپالی	رشید نثار	خرام/ص ۱۲۷ تا ۱۲۹/
شہ و تیشہ	شاہد صدیقی	احمد جمال پاشا	کتاب/ص ۶۷ تا ۶۸/ اگست
یادِ وارشاد	عبدالغفار	ص ۔ ا ۔ ب	کتابی دنیا/ص ۱۸/ "
ری حکومت	قاری محمد طیب قاسمی	—	فاران/ص ۴۷ تا ۴۹/ ستمبر
، اقوال	—	—	گل خنداں/ص ۲۸/ "
ر دکھ کی	نسیم حجازی	—	سیارہ/ص ۲۲۸ تا ۲۳۰/ "
۔وال صحافت	عبدالسلام خورشید	—	اردو ڈائجسٹ/ص ۱۱۰/ "

نام	مصنف	تبصرہ نگار	حوالہ
کشمیر ہمارا ہے	میر غلام احمد کشفی	ا ۔ ط ۔ ف	لاہور، ص ۹، ۷ ستمبر
لب و رخسار	منظر سلیم	رام لعل	کتاب، ص ۵۶ تا ۶۷، اگست
لہر لہر ندیا گہری	زبیر رضوی	خلیل الرحمٰن اعظمی	ہماری زبان، ص ۱۲، یکم ستمبر
مجموعہ وصایا اربعہ	مترجم:۔ محمد ایوب قادری	—	نگار پاکستان، ص ۷۹، ستمبر
مجموعہ وظائف چشتیہ	—	م ۔ ی	گل خنداں، ص ۷۳، "
محدب شیشہ (افسانے)	مسعود مفتی	وحید قریشی	اردو ڈائجسٹ، ص ۱۰۹، "
محمد حسین آزاد	محمد اسلم فرخی	محمد احسن فاروقی	سیپ، ص ۵۶۳ تا ۵۷۳، ستمبر
مغرب میں مذہب	سعید احمد اکبرآبادی	—	فاران، ص ۵۰، ستمبر
میرے گزشتہ شب و روز	آزاد، جگن ناتھ	ایڈیٹر:۔ (تاجور سامری)	
		—	جوار بھاٹا، ص ۷۹، ستمبر
نقطۂ نظر	پروفیسر عبدالمغنی	—	سیارہ، ص ۷۳، "
" "	" "	—	فاران، ص ۴۵ تا ۵۷، "
یادِ جگر	درگا پرشاد سلطانپوری	مخمور سعیدی	تحریک، ص ۲۹ + ۴۰، "

رومیو جولیٹ -(شیکسپیئر - عزیز احمد) شیکسپیر کے اس شہرۂ آفاق ڈرامے کو اردو کے بلند پایہ نقاد، ناول نگار اور مترجم عزیز احمد نے ترجمہ کیا ہے یہ ترجمہ منظوم ہے - ابتدا میں ۷۰ صفحات کا دیباچہ ہے - جس میں مترجم نے شیکسپیر کے حالات زندگی، اس کی ڈرامہ نگاری اور رومیو جولیٹ کی ادبی و فنی خصوصیات پر مفصل بحث کی ہے - قیمت پانچ روپے

فاؤسٹ (گوئٹے - عبدالقیوم باقی) فاؤسٹ کو عالمی ادب میں جو بلند مقام حاصل ہے - وہ محتاج تعارف نہیں - اس سے پہلے انجمن اس کا منثور ترجمہ شائع کر چکی ہے - باقی مرحوم نے منظوم ترجمہ کیا ہے اور اصل کی فنی و ادبی خوبیوں کو برقرار رکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے - قیمت چار روپے پچاس پیسے

سہ ماہی "اردو"

ایک جریدہ —— ایک تحریک

اس علمی و ادبی جریدے نے تقریباً نصف صدی تک اردو زبان و ادب کی خدمت کی ہے اور اب یہ اپنی سابقہ روایات کے مطابق از سر نو باقاعدگی سے شائع ہونے لگا ہے۔

دور نو کا پہلا شمارہ (جنوری سنہ ۶۶ء) شائع ہو چکا ہے

اس شمارے کے مضامین

۱۔ تراد فی مرکبات	ڈاکٹر شوکت سبزواری
۲۔ اقبال کی بعض نظموں کے مآخذ	ڈاکٹر اکبر حسین قریشی
۳۔ حالی کے سماجی نظریات	ڈاکٹر فاطمہ شجاعت
۴۔ رباعیات نصرتی (غیر مطبوعہ)	مرتبہ افسر صدیقی
۵۔ خود نوشت سوانح عمری (")	صفیر بلگرامی
۶۔ حواشی بر خود نوشت	سید وصی احمد بلگرامی
۷۔ فورٹ ولیم کالج	سید سبط حسن
۸۔ مثنوی بہارستان عشق (از مسرور)	سخاوت میرزا
۹۔ مثنوی ابر گہربار	میرزا اسد اللہ خاں غالب

ابتدائیہ :- تحسین سروری
ترتیب و مقدمہ :- مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی

یہ شمارہ ۱۶۰ صفحات پر، ٹائپ میں، نہایت عمدہ کاغذ پر چھاپا گیا ہے

قیمت فی پرچہ :- تین روپے پچاس پیسے ★ سالانہ قیمت :- بارہ روپے

شائع کردہ

انجمن ترقی اردو - اردو روڈ - کراچی

انجمن ترقی اردوے پاکستان کا ماہوار ترجمان

قومی زبان

اپریل ۱۹۶۶ء

جلد ۲۸ شمارہ ۴

سالانہ قیمت
دس روپے

فی پرچہ
ایک روپیہ

انجمن ترقی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ
کراچی

فہرست

بیادِ اقبال

بیادِ مجلس اقبال

بابائے اُردو کی تین تحریریں

(۱)

علامہ اقبال کی وفات پر بابائے اردو نے سہ ماہی "اردو" کے شمارہ اپریل ۳۸ء میں مندرجہ ذیل تعزیتی شذرہ لکھا۔

اقبال مرحوم

اقبال کی موت ایک بہت بڑا قومی سانحہ ہے۔ ایسا بلند خیال اور عالی فکر شاعر صدیوں میں کہیں پیدا ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اس کے ساتھ ہی ہندوستان سے شاعری بھی اٹھ گئی۔ مولانا حالی کے بعد شاعری سے اگر کسی نے حقیقی کام لیا تو وہ اقبال تھا۔

اس کے کلام نے دلوں میں گرمی اور خیالات میں انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ اس نے قومی اور ملی مسائل میں خیال و فکر کی رَو بدل دی تھی۔ بیسیوں لفظ، خاص خاص ترکیبیں، اور بعض خاص خیال اور افکار ہندوستان کے اردو ادیبوں اور شاعروں میں محض اقبال کے کلام کی بدولت سکۂ وقت کی طرح رائج ہو گئے تھے۔

اس کے کلام نے اردو زبان کا رتبہ بڑھا دیا اور یہ ثابت کر دیا کہ اس میں کتنی وسعت و قوت اور صلاحیت ہے جب تک اردو زبان زندہ ہے اس کا کلام زندہ رہے گا۔ اور پڑھنے والوں کے دلوں میں ولولہ، فکر میں بلندی، جذبات میں درد اور تخیل میں پرواز پیدا کرتا رہے گا۔

(۲)

۲۲ر اپریل ۱۹۵۸ء کو کراچی میں بزم اقبال کے زیر اہتمام جہانگیر پارک میں ایک جلسۂ عام منعقد ہوا تھا ۔ اس میں بابائے اردو نے جو تقریر کی تھی، وہ ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

ایک ایسے نازک وقت میں جب کہ ہم شکستہ دل اور مایوس تھے اور ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رحم وکرم سے ہماری قوم میں اقبال جیسی عظیم المرتبت ہستی کو پیدا کیا جس کی نظیر نہ صرف اس برصغیر بلکہ اس عہد کی تمام دنیائے اسلام میں نہیں ملتی۔ یہاں تک کہ غیروں نے بھی اس کی عظمت کا اعتراف کیا اور انہیں کہنا پڑا کہ اقبال بہت بڑا شخص تھا۔

بڑے شخص سے کیا مطلب ہے؟ ایک صاحب جاہ و ثروت بھی بڑا شخص ہو سکتا ہے۔ ایک عالی دماغ فلسفی بھی بڑا شخص مانا جا سکتا ہے۔ ایک نازک خیال شاعر، ایک ماہر صناع، ایک عالم متبحر، ایک کامل سیاستداں یہ سب بڑے شخص ہو سکتے ہیں۔ لیکن ہم جسے بڑا شخص مانتے اور سمجھتے ہیں وہ وہ ہے جو اپنے افکار اور اپنی زندگی سے دلوں میں ولولہ، دماغوں میں جلا اور خیالات میں انقلاب پیدا کر دے اور ان کے طرز فکر ہی کو نہیں بلکہ ان کے دماغوں کی ساخت کو بھی بدل دے اور زندگی کا نیا تصور عطا کرے۔ قوم کو تاریکی سے نکال کر اجالے میں لے آئے اور پستی و ضلالت کی راہ سے موڑ کر اس رستے پر لے آئے جسے ہم صراط مستقیم کہتے ہیں۔

دنیا کے بڑے بڑے معلمین، مفکرین اور انبیا و اولیا نے یہی کیا اور خلق خدا کی یہی خدمت اقبال نے انجام دی۔

وہ بہت بڑا بت شکن بھی تھا اس نے جمود و سکون کے بت کو توڑا، فرنگی تہذیب کے بت کو گرایا۔ یونانی عجمی اور ہندی اور یونانی توہمات اور خیالات باطلہ کے بت کو توڑا۔ یہ حیرت انگیز انقلاب اس نے اپنے حیات آفریں خیالات کی قوت سے برپا کیا۔

خیال کی قوت دنیا میں سب سے بڑی قوت ہے۔ ایٹم بم کی قوت سے بھی زیادہ۔ ایک ایک خیال نے دنیا کے طبقے الٹ دیئے ہیں قوم کی کایا پلٹ دی ہے۔ ان میں نئی زندگی پیدا کر دی ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ مردوں کو زندہ کر دیا ہے۔ ہیگل نے خوب کہا ہے اور اس قدر خوب کہا ہے کہ اس کی داد نہ دینا ظلم ہوگا وہ کہتا ہے۔

Even the thoght of a criminal is more magnificient than all the wonders in heavens.

جب ایک مجرم کا خیال آسمانوں کے تمام عجائبات سے

بھی زیادہ شاندار ہے تو دیکھ مفکر اعلا کی شان کی کیا انتہا ہو سکتی ہے۔ وہ ساری کائنات کو ہلا سکتا ہے۔

اقبال کے کلام میں ایسے انقلاب انگیز اور حیات آفریں خیالات جا بجا ملتے ہیں۔ اس کے کلام میں حکمت و ہدایت کے بے بہا جواہرات بھرے ہوئے ہیں جس سے ہر شخص اپنی استعداد طبع اور مزاج کے موافق ہدایت اور روشنی حاصل کر سکتا ہے۔ میرے دل میں اقبال کی جس بات کی بڑی قدر ہے وہ یہ ہے کہ اس نے اپنے عالی خیالات اور افکار بلند سے ہماری قومی زبان اردو کا مرتبہ اس قدر بلند کر دیا کہ اس سے پہلے اسے کبھی نصیب نہیں ہوا۔ ہمیں اردو کا ممنون ہونا چاہئے کہ اس کے واسطے سے ہم نے اقبال کو پہچانا۔ اگر اقبال کسی مقامی زبان مثلاً پشتو، پنجابی، سندھی وغیرہ میں لکھتا تو کیا یہ غیر معمولی مقبولیت، یہ اثر یہ جوش اور یہ بیداری پیدا ہو سکتی تھی؟ ہرگز نہیں۔

یہ بالکل سچ ہے کہ ہمیں پاکستان اور اس کے ساتھ زندگی کا نیا تصور اقبال نے دیا لیکن اگر آپ گزشتہ اسی سال کی تاریخ پر نظر ڈالیں گے تو معلوم ہوگا کہ اس کی ابتدا بھی گو وہ کیسی بھی خفیف ہو۔ اردو سے ہوئی۔ ۱۸۶۷ء میں ہندوؤں نے اردو کو دفتروں، عدالتوں اور مدرسوں سے خارج کرنے کی زبردست کوشش کی۔ سر سید نے اس کا مقابلہ کیا اور آخر دم تک اس کی حمایت میں مردانہ وار لڑتے رہے۔ وہ اپنی تعلیمی سروے کی رپورٹ میں لکھتے ہیں کہ میں تیس سال سے ملک کی خدمت کر رہا ہوں۔ میں نے کبھی ہندو مسلمان کا امتیاز نہ کیا۔ لیکن جب ہندوؤں نے اردو کی مخالفت کی اور ہر ایسی شے سے بیزاری کا اظہار کیا جس کا تعلق اسلامی عہد سے ہے تو مجھے یقین ہو گیا ہم مل کر کام نہیں کر سکتے اور میں نے اپنی کوششوں کا رُخ مسلمانوں کی اصلاح اور تعلیم کی طرف پھیر دیا۔ اس وقت سے ہندو مسلمان الگ ہو گئے اور دو جدا قومیں بن گئیں۔

سر سید نے قوم اور قومیت کا مفہوم بدل دیا اور اس وقت سے ہمارے دلوں میں کوئی بات جو پُر اسرار سی تھی سائے کی طرح پھر رہی تھی۔ موہوم سی تھی۔ صاف نظر نہیں آتی تھی۔ اس میں شک نہیں ہم اپنے کلچر، اپنے مذہب اور اپنی زبان کے بچانے کے لئے جدوجہد کرنے لگے تھے۔ لیکن وہ اصل بات جو ان سب کی تہ میں تھی ہماری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اس کے سمجھنے اور اظہار کی سعادت علامہ اقبال کے حصے میں آئی اور اس کا اظہار اس نے ایسے مؤثر اور پرزور پیرائے میں کیا کہ دلوں میں گھر کر گئی، اور یہ نعمت اقبال کی بدولت اردو کے وسیلے سے ہمیں نصیب ہوئی۔

غرض آپ اگر واقعات کا مطالعہ اس نظریئے سے کریں اور ان کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کریں گے تو معلوم ہوگا کہ قصرِ پاکستان کی بنیاد میں جس نے پہلی اینٹ رکھی وہ اردو تھی۔ اور اس خیال کی اشاعت و پروپیگنڈے میں اردو نے جو بے نظیر کام کیا وہ کسی دوسری طرح ممکن نہ تھا اس نے پاکستان کے مبارک پیغام کو ملک کے کونے کونے اور گھر گھر پہنچایا جو کوئی دوسری زبان نہیں کر سکتی تھی۔ اردو کا پاکستان پر بڑا حق ہے اور یہی وجہ ہے کہ قائد اعظم نے صاف صاف الفاظ میں اعلان کیا کہ پاکستان کی زبان اردو ہوگی اور کوئی دوسری زبان نہیں ہو سکتی۔ اور جو اس بارے میں غلط فہمی پیدا

کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ پاکستان کا صریح دشمن ہے۔

ہم نے اس کی کیا قدر کی؟ اس کی قدر دانی کی ایک تازہ مثال سناتا ہوں کہ کل ایوان گورنر جنرل میں بزم اقبال کا جلسہ ہوا۔ یہ جلسہ اردو کے سب سے بڑے شاعر کی یادگار میں ہوا تھا اور تقریریں سب غیر زبانوں میں ہوئیں دوسری زبانوں نے ایوان گورنر جنرل اور بزم باریابی کی عزت حاصل کی اور نہیں تھی تو اردو۔

حضرات! وہ زبان جو قرآن پاک اور آسمانی صحیفوں کا ترجمہ کر سکتی ہے جو علم وفن کے موضوعات پر بحث کر سکتی ہے۔ جو غالب، سرسید، حالی اور اقبال کے خیالات وجذبات کو ادا کر سکتی ہے کیا وہ دفتروں کی معمولی مسلوں کے مطالب کو ادا نہیں کر سکتی؟ جو اس سے انکار کرتا ہے وہ قومی زبان کی توہین کرتا ہے۔ یاد رکھئے اگر ہم نے اس کی قدر نہ کی اور اس کو وہ درجہ نہ دیا جس کی وہ مستحق ہے تو پاکستان کے استحکام میں خلل واقع ہو جائے گا اور پشتونستان بنگالستان، سندستان جیسے کئی استان بن جائیں گے اور پاکستان ڈھونڈے نہ ملے گا۔ اردو مثل ایک شیرازے کے ہے جو صحیفۂ پاکستان کے متفرق اجزا کو مستحکم اور ان کو منتشر ہونے سے محفوظ رکھنے والا ہے اس لئے آپ اس جلسے کے برخاست ہونے سے پہلے صدق دل سے یہ عہد کیجئے کہ اس زبان کو ہم اپنی قومی، سرکاری، ادبی اور علمی زبان بنا کر رہیں گے۔

خدا آپ کو اس کی توفیق دے اور آپ کی ہمت میں برکت عطا کرے۔

(۳)

۲۱ر اپریل ۵۳ھ کو علامہ اقبال کی برسی
کے موقع پر بابائے اردو نے ریڈیو پاکستان سے
مندرجہ ذیل تقریر نشر کی۔

اردو کی اشاعت وترقی کے لئے جہاں اور تدبیریں کی تھیں وہاں سنہ ۱۹۳۵ء میں میں نے ایک تجویز پیش کی تھی کہ ہر صوبے اور علاقے اور دیسی ریاستوں میں اردو زبان کا جائزہ لیا جائے۔ یعنی اس قسم کی معلومات فراہم کی جائیں کہ وہاں اردو بولنے والوں اور لکھے پڑھوں کی کیا تعداد ہے۔ اردو کی تعلیمی اور دفتری حیثیت کیا ہے۔ کون کون سے ادیب اور شاعر ہوئے ہیں۔ کس قسم کی کتابیں اردو میں لکھی گئی ہیں۔ اردو مطبعوں اور اخباروں کی کیا حالت ہے۔ بول چال کی زبان کیسی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس کا ایک مقصد تو یہ تھا کہ ہمیں صحیح طور سے یہ معلوم ہو جائے کہ اس برعظیم میں اردو کی کیا حیثیت ہے اور اس کا پھیلاؤ کہاں کہاں تک ہے۔ دوسرے جب ہر مقام کے حالات ہمارے سامنے ہوں گے تو جہاں جیسی ضرورت ہو گی اس کے مطابق کام کا ڈول ڈالا جائے گا۔ اس غرض سے میں لاہور بھی گیا اور اس تجویز پر غور کرنے کے لئے ایک مشاورتی مجلس کی۔ میں اور میرے ایک دو رفیق ڈاکٹر اقبال مرحوم سے بھی

ملنے گئے ۔ہم ملنے کے کمرے میں جا بیٹھے ۔کمرے کی دیواریں سب خالی تھیں ۔صرف ایک دیوار میں ایک جانب
لوئین وکٹوریا کی تصویر لگی ہوئی تھی ۔نہ معلوم کس نے لگادی تھی ۔ ہمارے آنے کی اطلاع پرڈاکٹر صاحب فوراً
تشریف لے آئے ۔میں نے اپنی تجویز بیان کرنا شروع کی اور آخر میں کہا میں چاہتا ہوں سارے ہندوستان میں اردو
ل اشاعت کا جال پھیلا دوں ۔سن کر فرمایا ۔"صرف ہندوستان میں" یہ تین لفظوں کا انتہائی مختصر جملہ بہت پرمعنی تھا
یہ ایک حکیم شاعر کے دل کی آواز تھی ۔یعنی وہ اردو کو صرف برعظیم پاک وہند ہی کی نہیں سارے ایشیا کی ممتاز زبان
بکھنا چاہتے تھے ۔

سنہ ۱۹۳۶ء میں انجمن حمایت اسلام لاہور نے اپنے سالانہ جلسے میں یوم اُردو بھی رکھا تھا اور اُس کی صدارت
کے لئے مجھ سے فرمائش کی تھی ۔میں لاہور گیا تو علامہ اقبال مرحوم نے مجھے کھانے پر مدعو کیا ۔مرحوم دن ہی میں کھانا
کھا لیتے تھے ۔رات کو نہیں کھاتے تھے ۔میرا معمول اس کے برعکس تھا ۔ دن میں نہیں کھاتا تھا رات کو کھاتا تھا ۔مرحوم
نے میری خاطر اُس روز دن میں نہ کھایا اور شب کے وقت میرے ساتھ کھایا ۔ اس دعوت میں مولانا ظفر علی خاں
ورچودھری محمد حسین بھی شریک تھے ۔کچھ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ ہم چاہتے ہیں کہ
آپ اس مضمون کا ایک بیان شائع کریں کہ ہم اردو رسم خط کبھی نہیں چھوڑیں گے ۔دوسرے صاحبوں نے بھی
س کی تائید کی ۔میں سن کر چپ رہا ۔ ایسا معلوم ہوا کہ ان حضرات کو میرے متعلق کچھ شبہ ہے اور یہ اندیشہ ہے
کہ کہیں میں کانگریس والوں سے اتفاق کرکے دیوناگری خط کی تائید نہ کر بیٹھوں ۔کیونکہ اُس زمانے میں ہندی والوں
سے میری گفت وشنید بلکہ تنازعہ جاری تھا ۔میری خاموشی سے اُن کا یہ شبہ اور قوی ہوگیا ۔جب یہ بات پھر
چھڑی تو میں نے عرض کیا کہ میں آپ کا مطلب سمجھ گیا ۔ہمارے حریف بڑے شاطر اور عیار ہیں ۔ آپ ان سے
معاملہ کرنا جانتے ہیں نہ مقابلہ کرنا ۔میں ان کو خوب سمجھتا ہوں اور کوئی بات ایسی نہیں کرنا چاہتا جس میں پہل میری
طرف سے ہو اور قابل الزام ٹھہروں ۔ آپ چند روز صبر کیجئے اور پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے ۔ہوگا وہی جو آپ کا
منشا ہے مگر اس کا الزام اُن کے سر رہے گا ۔میری یہ بات کچھ اُن کی سمجھ میں نہ آئی ۔شبہ بدستور باقی رہا ۔

خدا کا کرنا کہ اس کے کچھ ہی دن بعد ناگپور میں اکھل بھارتیہ ساہتیہ پرشد کا سالانہ جلسہ ہوا ۔میں اس کی
مجلس عاملہ کا رکن تھا ۔ وہاں مجھ میں اور گاندھی جی میں زبان کے متعلق جو گفتگو ہوئی اُس میں قدرے گرمی پیدا
ہوگئی تھی ۔اس بحث کو اب تاریخی حیثیت حاصل ہوگئی ہے ۔جب گاندھی جی نے ذرا جھنجھلا کر یہ کہا کہ "میں ہندی
نہیں چھوڑ سکتا ۔ اُردو مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے ۔قرآن کے حرفوں میں لکھی جاتی ہے ۔مسلمان بادشاہوں نے
پھیلائی ۔ آپ اسے رکھیں چاہے نہ رکھیں ۔" اس پر میں نے کہا جب آپ ہندی نہیں چھوڑ سکتے تو ہم اردو کیوں چھوڑ
یں ۔ہم اسے انشاءاللہ زندہ وقائم رکھیں گے اور کمال تک پہنچا کے چھوڑیں گے ۔ اب علامہ اقبال میری مذکورہ بالا

گفتگو کی نوبت تک پہنچے۔

اُس زمانے میں انجمن کا صدر مقام ریاست حیدرآباد دکن میں تھا۔ وہ دور کانگریس کی قوت اور عروج کا تھا۔ ہر صوبے میں کانگریس کی حکومت تھی اور ہمیں ان سے اور ہندی کے بڑے بڑے رہنماؤں سے اُردو کے معاملے میں لڑنا جھگڑنا پڑتا تھا اس وجہ سے ہندی والے اور ان کے اخبار ریاست کو بدنام کرتے تھے۔ اس لئے میں نے انجمن کا مستقر بدلنا مناسب سمجھا۔ تبدیل مقام اور آئندہ نظام عمل کے فیصلے کے لئے ایک کل ہند اُردو کانفرنس کی تجویز کی۔ اس کا ذکر میں نے ایک خط میں علامہ اقبال سے بھی کیا۔ انہوں نے لکھا کہ "پہلے سے اچھا ہوں مگر افسوس ابھی سفر کے لائق نہیں۔ بہرحال اگر اردو کانفرنس کی تاریخوں تک میں سفر کے قابل ہوگیا تو انشاء اللہ ضرور حاضر ہوں گا۔ لیکن اگر حاضر نہ ہوسکا تو یقین جانئے کہ اس اہم معاملے میں کلیتہً آپ کے ساتھ ہوں۔ اگرچہ میں اردو زبان کی بحیثیت زبان خدمت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا، تاہم میری لسانی عصبیت دینی عصبیت سے کسی طرح کم نہیں ہے"

اس کانفرنس کا علی گڑھ یونیورسٹی میں ہونا قرار پایا۔ اس میں ہر صوبے کے اکابر شریک ہوئے علامہ اقبال نے میری دعوت کے جواب میں لکھا۔

"میں علی گڑھ حاضر ہونے کا مصمم ارادہ رکھتا تھا۔ مگر افسوس کہ کمر کے درد سے ابھی تک افاقہ نہیں ہوا۔ آپ کی تحریک اس تحریک سے کسی طرح کم نہیں جس کی ابتدا سرسید رحمۃ اللہ علیہ نے کی تھی"

کاش اقبال اس وقت زندہ ہوتے اور دیکھتے کہ پاکستان میں اردو کا کیا مقام ہے۔

مولانا ابومحمد مصلح

علامہ اقبال سے دُو ملاقاتیں

۱۹۲۸ء کے اواخر میں علامہ اقبالؒ مدراس کے علمی سفر پر روانہ ہوئے تھے۔ واپسی میں حیدرآباد دکن بھی رُکے۔ جہاں حیدرآباد کی مسلم کلچر سوسائٹی نے ۵ تا ۸ار جنوری ۱۹۲۹ء علامہ کے تین لیکچرز کا اہتمام کیا۔ علامہ نے فلسفۂ اسلام پر انہیں جلسوں میں اپنے زرّیں خیالات کا اظہار کیا تھا جو "تشکیل جدید الٰہیات" کے نام شائع ہوئے۔

اسی دورانِ قیام حیدرآباد مولانا ابومحمد مصلح صاحب اقبالؒ سے ان کی رہائش گاہ پر جاکر ملے تھے۔ دوسری بار ۱۹۳۸ء میں لاہور میں ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کے ہمراہ علامہ کے مکان پر جاکر ملے اور جس روز اقبال کا انتقال ہوا ہے ابومحمد مصلح صاحب لاہور میں موجود تھے۔

غرض علامہ اقبال سے مذکورہ بالا دُو ملاقاتوں اور ان کی میت کا آنکھوں دیکھا حال ابومحمد مصلح صاحب نے بڑے پُراثر انداز میں اپنی کتاب "قرآن اور اقبالؒ" میں تحریر کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۴۰ء میں ادارۂ عالمگیر تحریک قرآن مجید حیدرآباد دکن کی طرف سے (۱۹۲) صفحات پر شائع ہوئی تھی۔ جس کے دیباچے میں مرتب نے یہ تمام باتیں درج کردی ہیں۔

مولانا ابومحمد مصلح ایک درویش گلیم پوش بزرگ ہیں، مدت دراز سے وہ حیدرآباد میں "عالمگیر تحریک قرآن مجید" نام کے ادارے کو چلارہے ہیں، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے مولانا قرآنی تحریک کو عالمگیر حیثیت دینا چاہتے ہیں۔ انہا

ادارے کی طرف سے جو مختلف دینی و علمی کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں ایک "قرآن اور اقبال" بھی ہے جس میں قرآن کے عین مطابق علامہ اقبال کے منظوم افکار و خیالات کو جمع کیا گیا ہے ۔

(ت ۔ س)

اقبال سے میری پہلی ملاقات

مدراس کے علمی سفر سے واپسی پر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال مرحوم شاہی مہمان کی حیثیت سے چند روز حیدر آباد میں بھی ٹھہرے ۔ میں تحریک قرآن کے سلسلے میں نواب نذیر جنگ بہادر کے ہمراہ ملنے گیا ۔ تعارف کے بعد تحریک قرآن کا اولین مقصد قرآن مجید کی تعلیم معنی و مطلب کے ساتھ عام اور لازمی کرنا بیان کیا گیا ۔ اس وقت تعلیم یافتہ نوجوانوں کا اچھا خاصہ مجمع تھا ۔

اقبال نے اپنے خاص انداز میں کہا :۔

" مولوی صاحب ! آپ کی تحریک سے کس کو انکار ہوسکتا ہے ۔ مگر پہلے یہ تو بتایئے کہ قرآن پڑھائیگا کون ؟"

مجمع ہمہ تن گوش بن گیا اور مجھ کمبل بدوش کی طرف ایک خاص انداز سے دیکھنے لگا ۔ کیونکہ یہ کوئی معمولی معارضہ نہ تھا اور نہ کسی معمولی شخص کی زبان سے ادا ہوا تھا ۔

میں نے جواب دیا

" ڈاکٹر صاحب ! بے شک حقیقی معنوں میں قرآن کے پڑھانے والوں ہی کی کمی ہے ۔ جس دن یہ کمی پوری ہوئی سب کچھ ہو جائے گا ۔ مگر آپ مجھے قرآن ، قرآن کرنے دیجئے ۔ کیونکہ آپ کے حسب منشار قرآن پڑھانے والے بھی قرآن ہی سے پیدا ہوں گے ۔"

اس کے بعد کچھ اور باتیں ہوئیں اور میں نے رخصت چاہی دوسرے دن ایک طالب علم کے ہاتھ کچھ چھپی ہوئی چیزیں بھجوائیں اور تحریک کے متعلق رائے طلب کی ۔ طالب علم نے اپنی طرف سے یہ جرات کی کہ ان کو بھی قرآن مجید کی تعلیم و تبلیغ کی دعوت دی ۔ انہوں نے مزاحاً کہا

" پہلے میں آپ کے استاد سے قرآن پڑھ لوں گا پھر ایسا ضرور کروں گا ؟"

اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ اقبال کس شان کے آدمی تھے ۔ یہ کون نہیں جانتا کہ اُن کو کسی سے قرآن کے درس لینے کی ضرورت نہیں تھی وہ تو دوسروں کو " خدا کا آخری پیغام " سنانے کے لئے پیدا کئے گئے تھے ۔ اور پھر اس علم و

حکمت کے زمانے میں اپنے اس فرض کو ان سے زیادہ دل آویز پیرائے میں کس نے پورا کیا۔ جو روشن خیال تجدد پسند طبقہ
کے لئے ناقابلِ انکار حقیقت بنا ہوا ہے۔

پھر انہوں نے تحریک پر حسب ذیل رائے کا اظہار فرمایا۔

تحریکِ قرآن پر حضرت علامہ کی رائے

جناب مولوی صاحب۔ السلام علیکم

قرآنی تحریک کا پروگرام مبارک ہے۔ اس زمانہ میں قرآن کا علم ہندوستان سے مفقود
ہوتا جاتا ہے۔ ضرورت ہے کہ مسلمانوں میں نئی زندگی پیدا کی جائے۔ کیا عجب کہ آپ کی تحریک
بارآور ہو اور مسلمانوں میں قوت عمل پھر عود کر آئے۔

مخلص اقبال

اقبال راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں

اگرچہ ڈاکٹر اقبال نہ تو کالج کی پروفیسری کے لئے پیدا کئے گئے تھے نہ بیرسٹری کے لئے تخلیق کئے گئے تھے
اور نہ ہی کونسل کی ممبری کے لئے وضع ہوئے تھے تاہم ان کے معنوی پیر کا یہ مقولہ ان پر صادق آتا تھا ؎

من بہر جمعیتے نالاں شدم — جفت خوش حالاں و بدحالاں شدم
ہر کسے از ظنِّ خود شد یارِ من — وز درونِ من نجست اسرارِ من

یہ دوسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس تھی جس کے عین انعقاد کے وقت اقبال کو آل انڈیا مسلم لیگ کے
اجلاس منعقدہ الہ آباد کی صدارت کرنی پڑی۔ اس مرتبہ لیگ کی کرسی صدارت سے جو خطبہ پڑھا گیا وہ اپنی
نوعیت کے لحاظ سے ایک خاص چیز تھا۔ پاکستان کی تجویز اسی میں پیش کی گئی جس نے تاریخی مرتبہ حاصل کر لیا
ہے اور آج ہندوستان کی سیاست کا رُخ بدل کر رکھ دیا ہے۔ یہ خطبہ اخبارات میں شائع ہوا اور میری نظر سے
گزرا تو ایسا معلوم ہوا کہ مسلم سیاسیات کی دوسری دنیا سامنے آگئی ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ اصل مقصد کے قریب
سے کوئی بولا ہے۔ اس لئے میں نے فوراً ایک پمفلٹ شائع کیا اور اس میں اس بات کو واضح کرنا چاہا کہ ایک مسلم
کا اصل مطالبہ پاکستان بھی نہیں بلکہ روئے زمین پر قیامِ حکومتِ الٰہیہ ہے۔ کیونکہ قرآن اس کے سوا کسی قسم کی حکومت
کی تائید میں نہیں۔ بلکہ تائید تو کجا سرے سے وہ تمام دوسرے قسم کے نظام ہائے حکومت کو مٹانا چاہتا ہے۔ جس میں
اس طرح کا بھی شامل ہے۔

مذکورہ بالا رسالہ جو خط کی شکل میں تھا اس کا جواب اقبال نے اس وقت دیا جب کہ ہندوستان ٹائمز کے نمائندے نے ان سے دریافت کیا کہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں آپ کیا خاص بات لے کر شریک ہو رہے ہیں؟ ڈاکٹر اقبال نے کہا "میرے پاس اور کچھ نہیں۔ لیکن قرآن ہے۔ میں اسی کو پیش کروں گا"

اقبال سے میری دوسری ملاقات

میں "قرآن مجید مع بچوں کی تفسیر" کی کتابت و طباعت کے سلسلے میں کچھ مدت کے لئے لاہور گیا۔ ایک دن ڈاکٹر اقبال مرحوم سے بھی ملنے کی مسرت حاصل ہوئی۔ میرے ساتھ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی بھی تھے۔ عصر کی نماز وہیں ادا کی۔ چار لوشی کی بھی نوبت آئی۔ اقبال چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ علالت کا سلسلہ جاری تھا مگر اتنا نہیں کہ معذوری ہو چکی ہو۔ سب سے پہلے تحریک قرآن کی رفتار کے متعلق استفسار کیا پھر لاہور آنے کی غرض دریافت کی۔ اپنے بچوں کے لئے چھپے ہوئے پارے چغتائی صاحب کے ذریعے بھیج دینے کو کہا۔ حیدرآبادی سیاست کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو کے "اسلامی کلچر" پر خیال آرائی کا بھی ذکر آیا۔ اقبال نے جو اس کا جواب دیا تھا میں نے اس کی تحسین کی۔ مولوی عبدالحق صاحب انجمن ترقی اردو کا دفتر حیدرآباد سے دہلی منتقل کرنے والے تھے اقبال نے اپنا خیال ظاہر کیا کہ اس کے لئے موزوں مقام لاہور ہے۔ اسلام میں عورتوں کی حیثیت کا ذکر چھڑا تو اقبال نے کہا مجھ سے ایک دن ایک امریکن لیڈی ملنے آئی اور اس نے شکایتہً کہا کہ اسلام نے عورتوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے اس پر اس کو ایسا مسکت جواب دیا گیا کہ قائل ہو گئی۔ اقبالؒ نے یہ بھی کہا تھا کہ دنیا میں صرف ایک ہی ذات ایسی ہوئی ہے جس نے عورت کی فطرت کو کامل طور پر پہچانا اور وہ ذاتِ گرامی محمد عربی صلعم (فداہٗ ابی و امّی) کی تھی دیکھا گیا کہ حضور کا نام مبارک آتے ہی اقبال کا دل بھر آیا ہے اور آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئی ہیں۔

اقبال کی وفات

میں لاہور میں کئی برس رہا سید محسن شاہ صاحب سکریٹری انجمن اسلامیہ پنجاب اور میاں نظام الدین صاحب رئیس اعظم لاہور کی خواہش پر مدرسہ عالمگیریہ تحریک قرآن مجید کے نام سے ایک تعلیم گاہ شاہی مسجد میں قائم کی گئی یہ ایک ممنی کام تھا اصل امور انجام دینے کے لئے مجھے باہر کے دروازے سے متصل شمالی حجروں کے سامنے جھونپڑے ڈالے گئے تھے آسانی کے خیال سے بعد میں شب و روز وہاں رہنے بھی لگا تھا ایک دن دوپہر کے وقت خطیب مسجد مولوی نورالحق صاحب نے کنڈی کھٹکھٹائی۔ میں باہر آیا تو ان کی زبانی ڈاکٹر اقبال کے انتقال کی خبر ملی۔ خطیب صاحب نے یہ بھی کہا کہ دروازے کے دوسری جانب۔ (یعنی جنوبی سمت) کے حجروں کے سامنے بہ تجویز مزار

کے لئے تجویز کیا گیا ہے - ابھی ابھی میاں نظام الدین صاحب، سید محسن شاہ صاحب اور مولانا غلام مرشد صاحب اسی سلسلے میں آئے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کی علالت کا سلسلہ عرصہ سے جاری تھا - اور کبھی کبھی اخبار سے کوئی خبر مل جایا کرتی تھی مگر یہ بات گمان میں بھی نہیں تھی کہ قرآن کا مفسر، اسلام کا داعی، انسانیت کا ہمدرد، مسلمانوں کا غمخوار اور دنیا کا ایک بڑا آدمی اقبالؒ ہمیشہ کے لئے ہم سے اس قدر جلد جدا ہو جائے گا - خدا کی مرضی ایسی ہی تھی جسے بہرحال پورا ہونا تھا۔

اب شاہی مسجد کے دروازے کے ایک طرف میرا قیام تھا اور دوسری طرف اقبال کے لئے قبر تیار ہو رہی تھی شام ہوئی جنازہ آنے سے پہلے شاہی مسجد کے اندر اور باہر لوگ جمع ہونے لگے - حضوری باغ میں بھی ہر طرف آدمی ہی آدمی تھے۔ اس کے بعد جنازہ جس شان سے آیا اور جتنا عظیم الشان اجتماع نظر آیا وہ اپنی آپ نظیر تھا۔

لاہور کی شاہی مسجد ہندوستان کی سب سے زیادہ وسیع مسجد ہے اس کے صحن میں نمازِ جنازہ ادا ہوئی اور اس کے بعد تدفین عمل میں آئی -

قلعہ اور مسجد کا درمیانی صحن صدیوں سے خالی پڑا تھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہوں نے بھی اس رعایت کو مدِ نظر رکھا تھا اور خود اورنگ زیب عالمگیر علیہ الرحمہ کو بھی اپنے سوگوار اقبال کی خاطر منظور تھی۔ اور چونکہ اس کے بعد بھی میں عرصہ تک لاہور میں رہا - اس لئے وہ سب مناظر رات دن دیکھتا رہا جو اقبال کے مزار پر عقیدتمندوں کی طرف سے پیش ہوتے رہے اور آئندہ بھی ہوتے رہیں گے -

زیارت گاہِ اہلِ عزم و ہمت ہے لحد میری
کہ خاکِ راہ کو میں نے بتایا رازِ الوندی

(اقبال)

جلیل قدوائی

یادِ اقبال

یہ نہیں کہ حضرت علامہ مغفور کے ساتھ میرے اس قسم کے روابط تھے جنھیں "تعلقات" کا نام دیا جا سکتا ہے مگر ایسا بھی نہیں کہ موصوف سے بالکل ہی غیر متعارف یا بے تعلق تھا۔ ہاں شاید اس نسبت کو کسی خاص عنوان کے تحت نہیں لایا جاسکتا۔ یوں بھی جب خود "اقبالؔ بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے"[1] تو میں کس شمار و قطار میں ہوں۔

میں نے کہیں لکھا ہے کہ علامہ اقبال کو پہلے پہل میں نے اسکول کی طالب علمی کے زمانہ میں اپنے محترم بزرگ عموی خان بہادر قاضی نذیر احمد قدوائی مرحوم وکیل و اسپیشل مجسٹریٹ اناؤ کے کتب خانہ میں شیخ عبدالقادر کے رسالہ "مخزن" کی پرانی جلدوں میں دریافت کیا۔ اس وقت میرا ادبی ذوق و شعور کھر چلا تھا۔ مگر اب یاد آتا ہے کہ علامہ کے کلام سے اس احساس کے بغیر کہ نظم کو شاعر سے بھی کوئی تعلق ہوتا ہے اس سے بھی بہت پہلے کم سنی ہی میں متعارف ہو چکا تھا یوں کہ میرے ایک دوسرے بزرگ اور مندرجہ بالا خان بہادر صاحب کے برادر خورد جناب قاضی حمید احمد قدوائی مرحوم سب رجسٹرار نے جن کا سینہ تمام عمر درد اسلامی سے خاص طور پر معمور رہا اقبال کا قومی ترانہ ؎

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

ہم بچوں کو ایک خاص انداز پر زبانی یاد کرا دیا تھا جسے وہ ہمارے گھر آنے والے خصوصی مہمانوں کو بڑے اہتمام سے سنوایا کرتے تھے۔

پھر یہ نظم مولوی اسمٰعیل میرٹھی کے مشہور نصاب "کمک اردو" میں علامہ کی "پرندے کی فریاد" ؎

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ وہ جھاڑیاں چمن کی وہ میرا آشیانہ

پڑھی جس میں اس نظم کے موجودہ متن کے مقابلے میں کہیں زیادہ شعر تھے۔ شاید اسی کتاب میں یا کہیں اور نظم "نیا شوالہ" ؎

---

[1] اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے　　تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے

نظر سے گزری اور پھر "ترانۂ ہندی" ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا　　ہم بلبلیں ہیں اس کی وہ گلستاں ہمارا

بھی پڑھا غرض کہ اسی طرح چھوٹی چھوٹی کئی اور نظمیں بھی پڑھیں جو بے حد پسند آئیں۔ بڑھتی ہوئی عمر اور گرد و پیش کے حالات اور زندگی کے صرف بند ماحول کو سمجھنے کی نئی نئی ترنگ، شعر و شاعری کے نشہ کی ابتدا ان کے کلام سے دلچسپی ایسی بڑھی کہ وہ میرے خوابوں کی دنیا بننے لگا۔ ان منازل سے گزرنے کے بعد کہیں یہ ہوا کہ "مخزن" میں ان کا کلام نظر سے گزرا۔

یہ ابتدائی تجربات اور تاثرات لے کر ۱۹۲۲ء میں علی گڑھ پہنچا۔ اور اگرچہ ان کی بہت سی پسندیدہ نظمیں پہلے ہی زبانی یاد ہو چکی تھیں مگر ۱۹۲۴ء میں "بانگ درا" کے اشاعت پذیر ہونے تک مختلف رسائل مثلاً زمانہ، الناظر، صوفی، مخزن (جس کے اس زمانے میں دل شاہجہاں پوری ایڈیٹر تھے) ہزار داستان وغیرہ نیز اپنے ہم مذاق دوستوں خواجہ منظور حسین و صاحبزادہ عبدالجلیل خاں کی ذاتی بیاضوں سے بڑے شوق سے تلاش کر کر کے اُن کی زیادہ سے زیادہ نظمیں اپنی بیاضوں میں نقل کرتا رہا[1]۔ ۱۹۲۵ء میں مجھ سے اور علامہ سے بالواسطہ مخاطبت کا موقع مہیا ہو گیا۔ اس سال علی گڑھ یونیورسٹی کی شاندار اور تاریخی جوبلی منعقد ہوئی تھی۔ میں یونیورسٹی کے طلبا کے رسالہ "علی گڑھ میگزین" کا نائب مدیر تھا۔ اس موقع پر رسالہ کے خاص نمبر کے لئے علامہ کے کلام اور تصویر کی ضرورت تھی جس کے لئے میں انہیں رسمی مراسلہ بھیج چکا تھا۔ علی گڑھ کی روایات کے نامور علم بردار اور اُردو کے مشہور صاحب طرز ادیب سید سجاد حیدر یلدرم ان دنوں یونیورسٹی کے رجسٹرار تھے میرے حال پر ان کی خصوصی عنایات تھیں۔ یلدرم اور علامہ کے درمیان بے تکلف دوستی تھی بس پر وہ برملا فخر کیا کرتے تھے۔ میری عرض پر موصوف نے علامہ کو ایک تعارفی اور سفارشی خط لکھا اور بھیجنے سے پہلے مجھے پڑھ کر سنایا۔ یہ خط انگریزی میں تھا اور مائی ڈیر سر محمد[2] کے الفاظ سے شروع کیا گیا تھا۔ یہ القاب جس وقار اور افتخار کے ساتھ ادا ہوا مخصوص لہجہ میں سجاد صاحب نے پڑھ کر سنایا تھا اس کا لطف آج تک دل سے محو نہیں ہوا[3]۔

---

[1] ان بیاضوں سے پاکستان میں آکر میں نے ایک مفید کام لیا۔ بہت سی نظموں کے میرے نقل کردہ اور مروجہ متنوں میں اختلاف تھا۔ اسے میں نے مضمون کی بنیاد بنایا اور انجمن کے سہ ماہی رسالہ "اردو" میں شائع کرایا۔

[2] بر سبیل تذکرہ اسی وقت سب سے پہلے مجھے یہ معلوم ہوا کہ انگریزی میں "سر" کے لفظ کے ساتھ ہمیشہ مخاطب کا پہلا نام (جو عیسائیوں میں اصل نام ہوتا ہے) لیتے ہیں۔ چنانچہ سر محمد کے بجائے سر اقبال کہا جائے تو غلط ہوگا۔ ہاں ہمارے ہاں اصلی نام کی رعایت سے سر محمد اقبال پورا لکھا جائے تو صحیح ہوگا۔

[3] یوں بھی سجاد حیدر مرحوم کے بات کرنے کا انداز بے حد البیلا، عام لوگوں کی طرز سے بالکل جدا انوکھا اور منفرد تھا جس کا مزہ وہی شخص اٹھا

علامہ اقبال نے فوراً جواب لکھا۔ اس میں مکرمی ڈیئر سجاد کے القاب سے جس میں موصوف کا کلام اور تصویر طلب کرنے
پر میرا نام لے کر شکریہ ادا کیا گیا تھا۔ اپنی ایک چھوٹی سی تصویر بھی عطا کی تھی۔ وہی جس میں کتاب سامنے کھلی ہوئی ہے اور سوٹ
پہنے، بکھرے ہوئے بالوں کے ساتھ عینک لگائے مصروف مطالعہ ہیں۔ فارسی کی مشہور غزل بھی جس کا مطلع ہے ؎

نیابی در جہاں یارے کہ داند دل نوازی را — بخود گم شو، نگہدارا آبروئے عشق بازی را

خط کے ہمراہ اپنے دست مبارک سے لکھ کر روانہ فرمائی۔ یہ پوری غزل بھی سجاد مرحوم نے مجھے عنایت کرنے سے پہلے بلند آواز
میں اور اپنے منفرد تیوروں کے ساتھ پڑھ کر سنائی تھی اور ان اشعار پر تو جھوم جھوم گئے تھے ؎

من ایں علم و فراست با پر کاہے نمی گیرم — کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مرد غازی را
بہ ہر نرخے کہ ایں کالا بگیری سود مند افتد — بزور بازوئے حیدر بدہ ادراک رازی را!

اس خط اور اس تصویر نیز اس غزل کا عکس پورے صفحہ پر نہایت آب و تاب کے ساتھ ہم نے "میگزین" کے جوبلی نمبر
میں شائع کیا تھا۔ افسوس اس رسالہ کی کوئی نقل اب میرے پاس موجود نہیں۔ مگر اس زمانے کے علی گڑھ کے بہتیرے پڑھے لکھے
آج پاکستان میں موجود ہیں۔ کسی نہ کسی کے پاس ضرور ہو گی۔ اقبال اکادمی کو تلاش کر کے اسے محفوظ کر لینا چاہیئے۔ تصویر مجھ سے
بعد میں حکیم یوسف حسن مدیر "نیرنگ خیال" لاہور نے منگا کر اپنے رسالے میں بھی شائع کی تھی اور اب بڑے سائز پر عام
ہو گئی ہے اور آئن اسٹائن کے نظریۂ اضافیت کے مطالعے والی تصویر کہلاتی ہے۔ شاید میگزین کے پورے ہی صفحہ کا بلاک چھاپا تھا۔

کئی برس گزر گئے۔ اب میں گریجویٹ ہو کر یونیورسٹی کے دفتر رجسٹرار میں ملازم ہو چکا تھا کہ علامہ علی گڑھ تشریف لائے
اور اپنے مشہور خطبات ارشاد فرمائے۔ ایک بار مجھے بھی حاضری نصیب ہوئی۔ تقریر اعلیٰ درجے کی انگریزی میں تھی۔ یونین
کے کھچا کھچ بھرے ہوئے ہال میں رات کے وقت بجلی کی روشنی میں ایک ہمہ گیر سناٹا چھایا ہوا تھا جس میں انگریزی لباس میں مزین
ڈائیس پر کھڑے ہوئے ایک بلند و بالا انسان کی لفظی کہوں یا طلائی تنہا آواز ایک کھنکھناہٹ کے طور پر فضا میں گونج
رہی تھی۔ ٹھہر ٹھہر کر۔ رک رک کر رس گھول رہی تھی۔ یہ شاعری یا مبالغہ نہیں ہے آپ یقین مانیں جو سمجھ سکتے تھے سمجھ کر اور
جو نہیں سمجھ سکتے تھے احتراماً صرف آواز سے، اس کے پاٹ سے، اس کے زیر و بم سے اس کے لہجہ سے اس کی گونج سے
مست ہو رہے تھے۔ اگرچہ علامہ موصوف عالم جذب و مستی میں علم و عرفان کے دریا بہا رہے تھے مگر مجھے اعتراف ہے کہ

بقیہ حاشیہ صفحۂ سابق) سکتا ہے جسے ان سے شرف ہم کلامی حاصل ہوا ہو۔ ان کا لہجہ اور ان کی چال ان دو خصوصیات میں مجھے آج
تک کوئی ان کا معمولی سا ہمسر بھی نہیں ملا چال کے بارے میں تو غالب کا مصرعہ ع

چال جیسے کڑی کمان کا تیر!

کچھ کچھ مفہوم ادا کر سکتا ہے لیکن گفتگو کے انداز کو بیان کرنے کے لئے مجھے نہ اپنے نہ کسی اور کے الفاظ میسر آتے ہیں۔ مگر خیر یہ سجاد پر علیحدہ مضمون
درکار ہے۔

میرے ساتھ زیادہ تر مؤخرالذکر صورت ہی پیش آئی تھی۔ ناگہاں ایک طرف سے کسی نے خارج از آہنگ نعرہ بلند کیا یعنی اسلامی ادب و ثقافت کے تذکرہ پر علامہ سے اپنا کلام سنانے کی فرمائش کر دی!

اتنا سننا تھا کہ علامہ نے تقریر بند کر دی، چہرہ کا رنگ سرخ ہو گیا اور چند لمحہ سکوت کے بعد نہایت تند و تلخ لہجے میں نہ صرف اس فرمائش پر سرزنش کی بلکہ بتایا کہ وہ شاعروں کے شاعر نہیں ہیں نیز معاصر شعر و ادب سے اپنی مایوسی اور بیزاری کا اظہار بھی فرمایا۔ سچ یہ ہے کہ ان کی اس ادا میں بھی ان کے مشتاقوں کے لئے دلنوازی کا پہلو تھا۔ موصوف نے صاف صاف کہہ دیا کہ مسلمانوں کے مستقبل کے لئے ہماری شاعری کوئی امید افزا پہلو نہیں رکھتی اور ہمارے لئے اس سے بالکل کنارہ کش ہو جانا ہی بہتر ہے! ظاہر ہے کہ علامہ اپنی شاعری کی طرف اشارہ نہیں کر رہے تھے۔

علی گڑھ کے اس دوران قیام میں ڈاکٹر ظفر الحسن مرحوم پروفیسر فلسفہ کے ذریعے جن کے ہاں موصوف اقامت پذیر تھے اور پھر کچھ دن بعد علامہ کی علی گڑھ میں دوبارہ تشریف آوری کے موقع پر میرے محبوب اور عزیز دوست خواجہ غلام السیدین صاحب پرنسپل یونیورسٹی ٹریننگ کالج کے دولت کدہ پر مجھے موصوف کے ساتھ ملاقاتوں اور ہم نشینی کا شرف حاصل ہوا۔ کم سخنی اور متفکرانہ انداز طبیعت کے ساتھ ساتھ زندہ دلی اور شگفتہ طبعی بھی ان کے مزاج کی خصوصیت معلوم ہوئیں۔ علماء و مفکرین کے ان مجمعوں میں میری حیثیت ایک طفل مکتب کی سی تھی چنانچہ نیازمندانہ بیٹھا رہا۔ مؤخرالذکر ملاقات موسم سرما میں سیدین صاحب کی ذاتی کوٹھی کے باہری چھوٹے چبوترہ پر ہوئی تھی جہاں ہم لوگ دھوپ کھانے بیٹھے تھے۔ ان دنوں موصوف کا گلا بیٹھا ہوا تھا اور زیادہ تر گفتگو موسم اور بیماری کے بارے میں رہی۔ موصوف کی طبعی کم سخنی نے اس علالت کے سبب کم و بیش جبری خاموشی کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اس لئے بڑی مشکل سے بولتے تھے یا اشاروں سے کام لیتے تھے۔

ان سرسری ملاقاتوں سے فائدہ اٹھا کر ایک بار میں نے علامہ کو لاہور خط لکھا جس کے ساتھ اپنی تعلیم، تصانیف نثر و نظم نیز ادبی و تنقیدی کام کی تفصیل انگریزی میں ٹائپ کرا کے خدمت میں روانہ کی۔ میں ان دنوں دفتر کی ملازمت ترک کر کے تدریسی کام سنبھالنا چاہتا تھا۔ اردو اور فارسی میں پی ایچ ڈی بلکہ کہیں کہیں ایم اے کی ڈگریاں بھی اس وقت تک ہندوستانی یونیورسٹیوں نے عام نہیں کی تھیں اور کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اردو کے شعبوں میں بھی فارسی تعلیم یافتہ اصحاب لکچرر مقرر ہو جاتے تھے۔ میں صرف بی اے تھا اور اپنی سادگی سے سمجھتا تھا کہ اس چھوٹی ڈگری کے ساتھ میرا علمی و ادبی کام شامل ہو کر اردو میں ایم اے کی ڈگری کے برابر سمجھا جا سکتا ہے۔ سجاد حیدر مرحوم نے اسی پہلو کو مدنظر رکھ کر مجھے ایک سرٹیفکٹ بھی دیا تھا اور میرٹھ اور بریلی کے کالجوں میں اسی بنیاد پر میرے تقرر کی سفارشیں بھی کی تھیں مگر ان کوششوں میں کامیابی نہیں حاصل ہوئی۔ اب میں علامہ اقبال سے ایک سرٹیفکٹ حاصل کرنا چاہتا تھا جس میں اسی نقطۂ نظر کی ترجمانی ہو۔ موصوف نے ازراہ نوازشِ خاص انگریزی زبان میں اپنے ہاتھ سے لکھ کر مجھے ایک سرٹیفکٹ

بھیج دیا - افسوس کہ میری نالائقی اور زندگی میں انتشار کے سبب وہ محفوظ نہیں رہ سکا - یہ نہ کہا جائے کہ حضرت علامہ نے میری تحسین میں مبالغہ آمیز انداز میں قلم توڑ دیا تھا - ہرگز نہیں، چونکہ منتق تھے مبصر تھے : لکھنے میں پوری احتیاط ملحوظ رکھی تھی - چنانچہ سرٹیفکٹ کا مضمون کچھ یوں تھا کہ "آپ نے اپنی ادبی اور علمی کاموں کی جو تفصیلات مجھے بھیجی ہیں انھیں ملاحظہ کرنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ایسے ہیں اور ویسے ہیں اور اگر آپ نے اپنا یہ مشغلہ جاری رکھا جس کا میں آپ کو مشورہ دوں گا تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ ایسے نہ ہو جائیں اور ویسے نہ ہو جائیں" وغیرہ!

ایسا کچھ ہوا کہ کچھ دن بعد سجاد حیدر اور راس مسعود مرحومین کی امداد اور توجہات خاص سے مجھے الہ آباد یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے (بہ درجۂ اول) کرنے کا موقع نصیب ہو گیا - یہ ۱۹۳۳ء کی بات ہے - علی گڑھ میں سر راس نے اردو نصاب کی تنظیم کر کے آنرز اور ایم اے کی جماعتیں کھولیں اور ۱۹۳۴ء میں وہاں بحیثیت لیکچرر میرا تقرر ہو گیا - اس کا افسوس رہا کہ اس وقت تک سر راس علی گڑھ چھوڑ چکے تھے - میرے اس تقرر میں علامہ کا بھی ہاتھ تھا اور میں اس افتخار اعزاز نیز موصوف کے احسان اور قدر افزائی کو تا زیست فراموش نہیں کر سکتا - واضح ہو کہ اسامی کا اشتہار دیا گیا تھا اور انتخاب کے لئے باقاعدہ انٹرویو ہوا تھا - کمیٹی نے سارا معاملہ دو باہری ارکان مولانا سید سلیمان ندوی اور حضرت علامہ اقبال پر چھوڑ دیا تھا - سید صاحب نے اپنی رائے میرے حق میں دی تھی اور چونکہ بسبب علالت علامہ علی گڑھ تشریف نہیں لا سکے تھے اس لئے سارے متعلقہ کاغذات بذریعۂ ڈاک موصوف کو لاہور بھیج دیئے گئے تھے - حضرت کی رائے بھی میرے تقرر کے حق میں آئی۔[1]

علامہ سے میری آخری ملاقات غالباً ۱۹۳۵ء میں ہوئی - میں علی گڑھ کی ملازمت ترک کر کے حکومت ہند کے شعبۂ اطلاعات میں شامل ہو چکا تھا اور شملہ سے اپنے ایک عزیز کی بیماری کے سلسلے میں لاہور گیا تھا - گرمیوں کا زمانہ تھا - شام کا وقت - اپنی میو روڈ والی کوٹھی کے صحن میں داہنے ہاتھ کے برآمدہ کے نیچے صحن میں بغیر بستر کی ایک چارپائی بلکہ ایک چھوٹے کھٹولے

---

[1] اس سلسلے میں "نقوش" (شخصیات نمبر) میں وقار عظیم کے مضمون "سرور صاحب" کا حسب ذیل اقتباس غور طلب ہے :-

"یونیورسٹی کے معاملے پر بڑی سادگی اور صفائی سے گفتگو ہوئی - مصلحت اور سیاست کے تقاضوں کا ذکر آیا اور جس خاص معاملے کے سلسلے میں علی گڑھ گیا تھا اس کے ہر پہلو پر باتیں ہوئیں تو مجھے اندازہ اور یقین ہو گیا کہ اس اسامی پر کون لیا جائے گا" گویا فیصلہ پہلے ہی ہو چکا تھا، واضح ہو کہ آل احمد سرور جن سے وقار صاحب نے اپنے تقرر کے امکانات کے بارے میں رائے حاصل کی اس وقت ایک طالب علم تھے اور یونیورسٹی کے انتظامی امور اور تقرراتی پالیسی سے انھیں دور کا بھی واسطہ نہ تھا خود رشید صاحب چونکہ ریڈری کے امیدوار تھے کمیٹی پر نہ تھے - سرور صاحب تو اردو کے شعبہ میں اس اسامی پر لئے گئے جو وسط ۱۹۳۶ء میں میرے حکومت ہند میں چلے جانے سے خالی ہوئی تھی - وقار صاحب کو یہ الفاظ لکھتے وقت کم از کم یہ احساس تو ہونا چاہیئے تھا کہ مسلمانوں کی اس عظیم درس گاہ میں (جو ان کی مادر علمی بھی ہوئی) طریق تقررات کو مشکوک بنا کر اس کی خدمت کا حق نہیں ادا کر رہے ہیں! میرے بیان کی تائید کرنے والوں میں پاکستان میں پروفیسر حلیم موجود ہیں جو اس وقت علی گڑھ میں پرو وائس چانسلر اور انتخابی کمیٹی کے رکن تھے بتوابہ محمد معین خاں تھے جو یونیورسٹی کے عارضی وائس چانسلر

پر تہبند اور بنیان میں نیم دراز تھے، اس طرح کہ اپنے دونوں ہاتھوں کے پنجوں کو ایک دوسرے میں پھنسا کر ان پر اپنا سر اٹھا رکھا تھا۔ چارپائی کے ایک طرف ان کا پرانا حقہ رکھا تھا جس کے کبھی کبھی کش لگا لیتے تھے۔ بات کرتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ذہنی اعتبار سے کہیں اور ہیں یا کسی خیال میں مستغرق ہیں۔ نظریں نہیں ملاتے تھے اور جیسے فکر میں ڈوبے ہوئے کسی ایک ہی جگہ دیکھے جا رہے ہوں۔ مگر باتیں پوری حاضر دماغی اور اعتماد کے ساتھ کر رہے تھے۔ سوال کا جواب پہلے دو ٹوک "ہاں" یا "نہیں" سے دے دیتے تھے پھر دلائل کا سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ کسی اور موقع پر لکھ چکا ہوں کہ اس ملاقات میں میں نے اردو کی ترقی کے لئے رسم الخط کی تبدیلی اور فلسطین کے مسئلے پر سوالات کئے تھے۔ چنانچہ مندرجہ بالا انداز سے جواب دے کر علامہ نے یہ دلائل ثابت کیا تھا کہ دونوں مسئلوں کو اٹھانا محض بیکار تھا۔ میرے عزیز کی بیماری پر اظہار تاسف بھی کیا تھا اور دریافت فرمایا تھا کہ ان کے شہر میں مجھے کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔

میں نے شملہ میں کچھ دنوں تک غالباً ۱۹۳۷ء میں اپنے ایک دوست ضیاء الدین مرحوم کے ساتھ "بال جبریل" کی چند منتخب غزلیات کے انگریزی ترجمہ کا سلسلہ شروع کیا تھا مگر کام مشکل نظر آیا لہٰذا ترک کر دیا گیا۔ نمونے کے طور پر علامہ کی خدمت میں چند ترجمے روانہ بھی کئے تھے مگر ادھر سے کوئی خبر نہیں آئی۔ اس زمانے میں ہم دونوں علامہ کے اس مجموعۂ کلام کو سرہانے رکھ کر سوتے تھے اور علی الصباح دفتر جانے سے پہلے بعض غزلیں پاگلوں کی طرح زور دار آواز میں ترنم کے ساتھ کورس میں گاتے رہتے تھے۔

کچھ عرصے بعد علامہ کا وصال ہو گیا۔ یہ خبر وحشت اثر دل نے کیونکر سنی خدا ہی جانتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے اپنی والدہ مرحومہ کو ان دنوں کچھ اس قسم کے خطوط لکھے تھے کہ انہوں نے خاص طور پر تلقین صبر کی تھی اور لکھا تھا کہ اس عمر میں کسی کی موت سے مجھے اتنا گہرا اثر نہیں لینا چاہیئے۔ مگر وہ موت العالم کے غم سے ناواقف تھیں۔ علامہ کے انتقال پر نہ جانے کتنی نظمیں لکھی گئیں۔ شاید شدت تاثر میں شاعر کی زبان گنگ اور قلم کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں۔ میں ایک شعر میں نہ کہہ سکا مگر تمام مطبوعہ نظموں میں جن اشعار نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ مولانا ظفر علی خاں کے تھے جن سے بڑھ کر شاید اس سانحے پر اور اشعار لکھے بھی نہیں گئے۔ چند تھے مگر "بہ قامت کہتر بہ قیمت بہتر" کی سچی مثال تھے۔ وہ اشعار یہ ہیں ؎

گھر گھر یہی چرچے ہیں کہ اقبال کا مرنا	اسلام کے سر پہ ہے قیامت کا گزرنا
کلکتہ و کابل میں بچھی ہے صفِ ماتم	اس غم میں سیہ پوش ہیں بغداد و سمرنا
تھا اس کے تخیل کا فسوں جس نے سکھایا	سو سال کے سوئے ہوئے جذبوں کا ابھرنا

ہر روز یہی اس نے مسلمانوں کو دیا درس
ہرگز نہ کسی سے بجز اللہ کے ڈرنا !!

اقبال شناسی

پاکستان کے علمی اداروں میں اقبال اکادمی سے آبروئے شیوۂ اہل نظر قائم ہے۔ اقبال اکادمی جیساکہ نام سے ظاہر ہے شاعر مشرق علامہ اقبال کی یاد میں قائم کی گئی تھی۔ اور اس کا مقصد شاعر مشرق کی شخصیت اور فن پر تحقیق کے نت نئے دروازے کھولنا تھا۔ پاکستان کے قیام کے بعد اس بات کی اہمیت اور بڑھ گئی تھی کہ برصغیر کے سب سے بڑے شاعر اور تصور پاکستان کے خالق کی حیات اور اس کے کارناموں پر تحقیق کے لئے ایک ادارہ قائم کیا جائے تاکہ پاکستان اپنی تہذیبی اور ثقافتی اکائی کے لئے مستحکم بنیادیں تلاش کر سکے۔ اقبال اکادمی کا قیام اسی ضرورت کے پیش نظر عمل میں آیا تھا۔ یہ ایک آئینی ادارہ ہے جس کی منظوری ۱۹۵۱ء میں پاکستان کے آئین ساز ادارے نے دی تھی بہت سی تبدیلیوں اور ترمیمات کے بعد اب اس کو آئینی دفعہ نمبر ۷۱ × × ۱۹۶۲ء کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اقبال اکادمی ۱۹۵۳ء سے شاعر مشرق کی زندگی، شاعری اور فلسفہ پر تحقیق کا کام انجام دے رہی ہے۔ جس کی نگرانی ایک مجلس نظما اور مجلس انتظامیہ کے سپرد ہے۔ مجلس نظما میں وزیر تعلیم۔ جناب ممتاز حسن۔ جناب ایم رشید۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن۔ جناب ایم اے چیمہ۔ جناب اے عزیز۔ جناب پیر حسام الدین راشدی۔ جناب کوی غلام مصطفےٰ جناب میزان الرحمٰن۔ اور معتمد وزارت تعلیم شامل ہیں۔ اسی طرح مجلس انتظامیہ جناب ممتاز حسن۔ جناب ایم رشید جناب ایم اے چیمہ۔ جناب میزان الرحمٰن۔ جناب اے عزیز۔ اور معتمد وزارت تعلیمات پر مشتمل ہے۔ اقبال اکادمی کے موجودہ ڈائرکٹر جناب بشیر احمد ڈار ہیں۔ جن کی علمی اور ادبی خدمات محتاج تعارف نہیں۔ خصوصیت سے انہوں نے شاعر مشرق پر قابل قدر کام کیا ہے۔ ان کی تین کتابیں جو انگریزی میں لکھی گئی ہیں۔ اقبالیات کے سلسلے کی اہم کڑیاں سمجھی جاتی ہیں۔ ادارے میں ایک ریسرچ اسکالر جناب اے۔ ایچ کمالی بھی کام کر رہے ہیں جن کی تحقیق کا موضوع "اسلام کا فلسفہ سیاست" ہے۔ مجلس انتظامیہ کے فیصلے کے مطابق ایک ریسرچ اسکالر مشرقی پاکستان میں بھی مقرر کیا جائے گا۔ اقبال اکادمی کی ایک شاخ مشرقی پاکستان میں بھی قائم کردی گئی ہے جس کے نگراں کوی غلام مصطفےٰ صاحب ہیں مشرقی پاکستان کی مجلس انتظامیہ میں جناب ڈاکٹر محمد شہید اللہ۔ جناب میزان الرحمٰن۔ جناب اے ایم سلیم اللہ فہمی۔ جناب کمال الدین احمد خاں جناب اے زیڈ خاں۔ جناب ممتاز اقبال۔ جناب زین العابدین۔ جناب ابو الہاشم۔ جناب ایس علی احسان۔

جناب ایم اے حئی - جناب منیر چودھری اور جناب سعید الرحمٰن جیسے حضرات شامل ہیں -

اقبال اکادمی کا دائرہ کار اور منصوبے وسیع امکانات کے حامل ہیں - جن کا اندازہ مندرجۂ ذیل پروگرام سے کیا جا سکتا ہے - اقبال کی تصانیف کا پاکستانی اور غیر ملکی زبانوں میں ترجمہ کرنا ہے اقبالیات کا اشاریہ مرتب کرنا ، شاعر مشرق پر مختلف زبانوں میں جو کتابیں اور مضامین لکھے گئے ہیں یا لکھے جا رہے ہیں ان کو جمع کرنا ، علامہ اقبال کے اصل خطوط اور مسودات کی فراہمی ، ایک ایسی لائبریری کا قیام جس میں وہ تمام کتابیں شامل ہوں جن کا حوالہ یا تذکرہ شاعر مشرق کی تحریروں میں ہے ، علامہ اقبال پر دانشوروں سے مختلف موضوعات پر تقاریر کرانا وغیرہ - اسی طرح مشرقی پاکستان میں اقبال اکادمی کی شاخ کا دائرہ کار یہ ہوگا - شاعر مشرق کی تمام تصانیف کا بنگالی میں ترجمہ کرنا - علامہ کی شاعری کو بنگلہ حروف میں منتقل کرانا ، راجشاہی اور ڈھاکہ یونیورسٹیوں کے تحت اقبال پر تحقیقی کام کرانا ، مشرقی پاکستان کے ممتاز اہل قلم سے اقبال کی زندگی اور شاعری پر کتابچے تصنیف کرانا ، علامہ اقبال کے فلسفہ اور نظریۂ فکر کی زیادہ سے زیادہ اشاعت اور ان کی سیاسی تحریروں اور بیانات کا بنگالی میں ترجمہ کرنا ، اور لائبریری قائم کرنا وغیرہ ، اس وسیع پروگرام کے تحت اب تک اقبال اکادمی نے جو کتابیں شائع کی ہیں - ان کی تفصیل یہ ہے -

اردو	۱۳	عربی	۲
بنگالی	۶	ترکی	۳
پشتو	۵	فارسی	۱
سندھی	۴	جرمن	۱
گجراتی	۲	انگریزی	۴

اردو کی کتابوں کی تفصیل یہ ہے - (۱) اقبالیات کا تنقیدی جائزہ از قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی - (۲) اقبال کے خطوط عطیہ بیگم کے نام (ترجمہ) از زیڈ اے برنی (۳) اقبال ایرانیوں کی نظر میں از ڈاکٹر اے ایچ عرفانی (۴) مکتوبات اقبال از سید نذیر احمد نیازی (۵) اسلامی تصوف اور اقبال از ڈاکٹر اے ایس نورالدین (۶) اسرار و رموز پر ایک نظر از پروفیسر محمد عثمان (۷) اقبال کے آخری دو سال از ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی (۸) اقبال اور حیدرآباد دکن از نظر حیدرآبادی (۹) اقبال اور سیاست ملی از رئیس احمد جعفری (۱۰) علم الاقتصاد از ڈاکٹر علامہ محمد اقبال (۱۱) اقبال اور جمالیات از نصیر احمد ناصر (۱۲) صحیح فلسفۂ تاریخ کیا ہے ؟ (کتابچہ) از ڈاکٹر ایم رفیع الدین (۱۳) اسلام اور سائنس (کتابچہ) از ڈاکٹر ایم رفیع الدین - بنگالی میں جو کتابیں چھپ چکی ہیں وہ یہ ہیں (۱) کلام اقبال از کوی غلام مصطفیٰ (۲) اقبال کا فلسفۂ تعلیم از سید عبدالحنان (۳) پاکستان کا تاریخی پس منظر از ایس اے منان (۴) اقبال کے سیاسی افکار از مولانا ایم اے رحیم (۵) ارمغان حجاز از محمد علی قریشی (۶) ایرانی تصوف از کمال الدین - سندھی میں :- (۱) حیات اقبال از پروفیسر لطف اللہ بدوی (۲) جاوید نامہ از پروفیسر لطف اللہ بدوی (۳) ارمغان حجاز از پروفیسر لطف اللہ بدوی (۴) اسرار و رموز

پروفیسر لطف اللہ بدوی - گجراتی میں :- (۱) زبور عجم از سید عظیم الدین منادی (۲) پیام مشرق از عظیم الدین منادی
پشتو کتابوں کی تفصیل یہ ہے (۱) زبور عجم از سید ایم تقویم الحق (۲) بانگ درا از ایس راحت ذخیلی (۳) پیام مشرق
از شبیر محمد متوش (۴) ارمغان حجاز از امیر حمزہ شنواری (۵) جاوید نامہ از امیر حمزہ شنواری -

ضرب کلیم کا فارسی ترجمہ ڈاکٹر کے - اے - ایچ عرفانی نے کیا ہے عربی میں اسرار و رموز از ڈاکٹر اے ڈبلیو عظام
در اسلام میں مذہبی تصورات کی تعمیر نو از ڈاکٹر عباس محمود ترکی میں پیام مشرق از ڈاکٹر علی نہاد ترلان - اسرار و رموز
از ڈاکٹر نہاد ترلان اور چھ لیکچرز از جناب صوفی حوسی حالم - جرمن میں پیام مشرق از ڈاکٹر انی حری شمل -

انگریزی میں حسب ذیل کتابیں شائع کی گئی ہیں -

۱- کتابیات اقبال خواجہ عبدالوحید
۲- تعلیم کے بنیادی اصول ڈاکٹر رفیع الدین
۳- فلسفۂ اقبال میں خدا - انسان اور کائنات کا تصور - ڈاکٹر جمیلہ خاتون
۴- فکر اقبال کا تعارف ایم ڈار

علاوہ ازیں جو کتابیں مرتب کی جاچکی ہیں یا ترتیب دی جارہی ہیں ان کی تفصیل بھی خاصی دلچسپ اور اہم ہے
رقعۂ اقبال (اس میں نادر تحریریں - خطوط اور تصویریں شامل ہوں گی) ضرب کلیم (بنگالی ترجمہ) ضرب کلیم (پشتو
ترجمہ) تعارف اقبال (ترکی) پیام مشرق (ترکی ترجمہ) مومن (مکمل انسان) کا تصور اقبال کی شاعری میں (انگریزی)
اسلام کا فلسفۂ سیاست (انگریزی) فہرست اقبالیات (اردو/ فارسی) اقبال کے خطوط گرامی کے نام (اردو) خطبات اقبال
ان کے اشعار کی روشنی میں (اردو) اقبال اور بھوپال (اردو) مرقع اسرار خودی (اردو) پس چہ باید کرد (سندھی ترجمہ)
جاوید نامہ (عربی ترجمہ) سوانح اقبال (بلوچی) انتخابات اقبال (بلوچی ترجمہ) اقبال اور ان کی سیاسی زندگی (اردو)
اور ان کے علاوہ بعض ایسی کتابوں کی دوبارہ اشاعت جو بازار میں دستیاب نہیں ہیں - جو کتابیں اس وقت پریس میں ہیں ان
میں ملفوظات اقبال (اردو) از سید نذیر اے نیازی - اسرار و رموز (سندھی ترجمہ) از پروفیسر لطف اللہ بدوی -
ارمغان حجاز (بنگالی ترجمہ) از غلام صمدانی قریشی - ایران میں ارتقائے مابعد الطبیعات (بنگالی ترجمہ) از کمال الدین احمد خان
بال جبرئیل (پشتو ترجمہ) از قاضی - اے حلیم اثر افسر (شنواری) -

۱۹۶۰ء سے اکادمی ایک سہ ماہی رسالہ "اقبال ریویو" بھی شائع کر رہی ہے جو اقبال کی زندگی، شاعری،
فلسفہ اور ان کے پسندیدہ موضوعات مثلاً اسلامیات، فلسفہ، تاریخ، عمرانیات، مذہب، ادب اور فن تعمیر وغیرہ
سے متعلق مقالات کے لئے وقف ہے - اب تک اس جریدے کی چار چار شماروں پر مشتمل چھ جلدیں شائع ہو چکی ہیں
جس میں پاکستان اور بیرون پاکستان کے مشہور اہل قلم حصہ لیتے رہے ہیں -

جناب بشیر احمد ڈار ڈائرکٹر اقبال اکادمی نے اپنے ادارے کے ایک اہم کام کی طرف خصوصیت سے توجہ دلاتے ہوئے کہا کہ ہمارے دائرہ کار میں اقبال سے متعلق نادر مواد مثلاً ان کے اصل مسودات تحریریں، مضامین، تقاریر، نظمیں، خطوط اور تصاویر کے علاوہ ان کی تصانیف کے نایاب ایڈیشن خاص طور سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ حضرت علامہ اقبال کی ذاتی استعمال کی اشیاء کی فراہمی بھی کی جائے اور اس قومی سرمایہ کو بہر قیمت محفوظ کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں اپنی مساعی کا ذکر کرتے ہوئے ڈار صاحب نے مولانا غلام رسول مہر، ڈاکٹر عبد اللہ چغتائی اور خواجہ عبد الوحید صاحب کا ذکر خاص طور سے کیا جن کے پاس نوادرات اقبال کا بیش قیمت سرمایہ محفوظ ہے ڈار صاحب نے امید ظاہر کی کہ وہ بہت جلد ان حضرات کو اس پر آمادہ کرنے کی کوشش کریں گے کہ یہ قومی سرمایہ محفوظ ترین ادارے میں پہنچ جائے۔ نوادرات کے علاوہ انہوں نے شاعر مشرق کی زندگی کے اہم واقعات جمع کرنے میں خصوصیت سے دلچسپی کا اظہار کیا۔

اقبال اکادمی کی لائبریری میں اس وقت تقریباً چھ ہزار کتابیں موجود ہیں۔ اور کوشش کی جا رہی ہے کہ اس لائبریری کی یہ خصوصیت بن جائے کہ اس میں نہ صرف اقبال کی تمام تصانیف ہوں بلکہ وہ تمام کتابیں بھی ہوں جن کا حوالہ انہوں نے اپنی تحریروں میں دیا ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ ان مضامین میں اس لائبریری کو ایک امتیازی سطح تک پہنچا دیا جائے جن سے علامہ کو خصوصیت سے دلچسپی رہی ہے۔ مثلاً اسلامیات۔ تاریخ۔ فلسفہ اور مذہبیات وغیرہ۔

ابھی تھوڑا عرصہ ہوا ہے کہ اکادمی نے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لئے شاعر مشرق کی تمام تحریروں کا بغور مطالعہ کر کے ایسے عنوانات کی ایک طویل فہرست بھی مرتب کرائی ہے جن پر وہ خود تحقیقی کام کرنا چاہتے تھے یا اس بات کے خواہشمند تھے کہ اہل قلم حضرات ان عنوانات اور موضوعات پر خصوصیت سے قلم اٹھائیں۔ اکادمی اندرون ملک مشہور اہل قلم کو دعوت دے چکی ہے کہ وہ شاعر مشرق کی اس خواہش کو انجام تک پہنچائیں یہ کام جتنا اہم ہے اس کا اندازہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب ان عنوانات پر کام مکمل ہو جائے جو کہ یقیناً اردو اور پاکستان کے لئے ایک نئے دور کا آغاز ہو سکتا ہے۔

ڈار صاحب نے بتایا کہ فی الوقت اکادمی کو مرکزی حکومت سے ایک لاکھ تیس ہزار روپے امسال یہ رقم ۲۰ فی صد تخفیف کے ساتھ یعنی ایک لاکھ ۴ ہزار روپے رہ گئی محکمۂ تعلیمات پشاور سے بھی ۵ ہزار روپے سالانہ گرانٹ کے طور پر ملتے ہیں۔ اس طرح اکادمی کو اپنا دائرۂ کار بڑا محدود رکھنا پڑتا ہے تاکہ اخراجات اور منصوبے گرانٹ سے تجاوز نہ کر جائیں۔ ڈار صاحب کے بیان کے مطابق اکادمی کے وسائل محدود ہیں اور آمدنی قلیل ہے۔ جب کہ منصوبے بہت وسیع اور فوری توجہ اور عمل چاہتے ہیں۔

اِس انجمن گل میں

انجمن ترقی اردو کے لئے عطیات

جناب سید دربار علیشاہ کمشنر کراچی نے ۵ مارچ کو بلدیہ کراچی کی جانب سے انجمن ترقی اردو کے صدر جناب اختر حسین صاحب کو ایک لاکھ روپے کے عطیہ کا چیک پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ انجمن ترقی اردو اور اس کے ملحقہ اداروں نے پاکستان کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ انہوں نے ان خدمات کو سراہتے ہوئے توقع ظاہر کی کہ اردو کالج کی نئی عمارت کی تعمیر کے بعد انجمن ترقی اردو اور اردو کالج کی اصل خدمات کا حلقہ اور بھی وسیع ہو جائیگا۔

جناب اختر حسین صدر انجمن نے عطیہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ یہ رقم جلد ہی نئے اردو کالج کی تعمیر کے لئے استعمال ہوگی۔ جناب دربار علی شاہ نے جو کے ڈی اے کے چیئرمین بھی ہیں۔ اس موقع پر کے ڈی اے کی طرف سے بیس ایکڑ زمین رعایتی قیمت پر دینے کا بھی اعلان کیا۔ توقع ہے کہ بہت جلد انجمن ترقی اردو، یونیورسٹی روڈ پر اسکیم نمبر ۲۴ میں ۲ کروڑ روپیہ کی لاگت سے اردو کالج کی نئی عمارت کی تعمیر کا کام شروع کر دیگی۔

اردو کالج اور ادارہ ترقیات کراچی

ادارہ ترقیات کراچی (کے۔ ڈی۔ اے) کی گورننگ باڈی نے ۸ مارچ کو اپنے ایک اجلاس میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ، قومی زبان اردو کی ترقی اور ترویج کے لئے کے ڈی اے اسکیم نمبر ۲۴ میں روبرو بھٹی شہید پارک کے مقابل ۲۰ ایکڑ اراضی رعایتی قیمت پر انجمن ترقی اردو کو اس کے نئے اقامتی اردو کالج کی تعمیر کے لئے دی جائے گی۔ اس اجلاس کے فیصلے کے مطابق دس ایکڑ اراضی ۱۲ روپے کے بجائے صرف ۴ روپے فی مربع گز کے نرخ سے زیر تعمیر کالج کی عمارات کے لئے اور کھیلوں اور کھلی ہوئی زمین کے لئے دی جانے والی (۹) ایکڑ زمین صرف ۲ روپے فی مربع گز کے حساب سے دی جائے گی۔ اس کے علاوہ مسجد کی تعمیر کیلئے بلاقیمت زمین دی جائے گی۔ اس طرح (۲۰) ایکڑ زمین جس کی اصل قیمت ۱۱ لاکھ ۶۱ ہزار چھ سو روپیہ ہوتی ہے۔ انجمن ترقی اردو کو صرف ۲ لاکھ ۹۰ ہزار ۴ سو روپیہ میں مل جائیگی۔ اس مبارک اور قابل تحسین فیصلے کے مطابق اردو کی ترویج کے لئے ادارہ ترقیات کا عطیہ ۸ لاکھ ۷۱ ہزار ۲ سو روپیہ ہوتا ہے انجمن ترقی اردو کو مزید سہولت دینے کے لئے ادارے نے یہ بھی طے کیا ہے کہ زمین کی یہ رعایتی قیمت ۱۰ سالہ قسطوں میں وصول کی جائیگی جس پر کوئی سود نہیں لیا جائیگا۔ نیز پہلی قسط جولائی ۶۷ء میں وصول کی جائیگی۔ انجمن کو یہ سب رعایات دینے کے لئے ادارہ ترقیات کراچی نے خصوصی رعایت سے کام لیا ہے اردو کالج کی بنیاد بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم نے ۱۹۴۹ء میں رکھی تھی — اس کالج نے اردو کی قدر خدمات انجام دی ہیں۔ نئی عمارت کا سنگ بنیاد صدر مملکت نے مئی ۱۹۶۵ء

میں رکھا تھا ۔

صدر انجمن کی طرف سے پیغام تعزیت

صدر انجمن ترقی اردو جناب اختر حسین نے ملک کے مشہور اور ممتاز صحافی اور ادیب جناب فخر ماتری کی رحلت پر دلی افسوس کا اظہار کرتے ہوئے حسب ذیل بیان جاری فرمایا۔

جناب فخر ماتری کی اچانک وفات سے مجھے بے حد صدمہ ہوا ہے۔ مرحوم ہمارے ملک کے ایک ممتاز صحافی تھے اور انھوں نے بیک وقت تین زبانوں کے اخبارات شائع کر کے ملکی صحافت کا معیار بلند کر دیا تھا۔ قومی اور بین قومی مسائل پر ان کی آراء کو بڑی وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ جو کچھ لکھتے تھے خلوص دل سے لکھتے تھے۔ انھوں نے کبھی اپنے صحافیانہ کردار کو کسی قسم کی مصلحت کا تابع نہ کیا۔ انکی اچانک وفات سے پاکستانی صحافت میں زبردست خلا پیدا ہوگیا ہے۔ جسے پر کرنا ممکن نہیں ۔

مرحوم کی مادری زبان اگرچہ گجراتی تھی، لیکن "اردو" سے انہیں خاص دلچسپی تھی اور اسی دلچسپی کی بنا پر انھوں نے "حریت" جیسا منفرد اخبار شائع کر کے اردو صحافت میں ایک نیا اور کامیاب تجربہ کیا۔ انجمن ترقی اردو سے بھی انہیں گہرا تعلق تھا۔ بابائے اردو نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں اردو یونیورسٹی کے قیام کے لئے جو کمیٹی بنائی تھی ماتری صاحب اس کے سکریٹری تھے۔ اب وقت آپہنچا تھا کہ انجمن ماتری صاحب کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھاتی، مگر موت کی حکومت کے ظالم ہاتھوں نے اس کی نوبت نہ آنے دی ۔

مجھے مرحوم کے پس ماندگان سے اور ان صحافیوں سے خاص طور پر دلی ہمدردی ہے جن کی تربیت اور رہنمائی مرحوم کر رہے تھے۔ مجھے توقع ہے کہ مرحوم کے جانشین ان کے مشن کو زندہ رکھیں گے ۔

ڈاکٹر وحید قریشی

مولانا محمد علی جوہر کی شاعری

دیوان جوہر دیکھتے ہوئے دو شاعر ذہن میں ضرور آتے ہیں۔ ایک حسرت موہانی اور دوسرے اقبال۔۔ حسرت موہانی اس لئے کہ ان کا نام سیاسی شاعری کے ضمن میں لیا جاتا ہے اور اقبال اس لئے کہ فکری سطح پر اقبال اور جوہر کے درمیان مماثلت کے کچھ مرحلے آتے ہیں۔ لیکن جوہر کے ہاں انفرادی رنگ زیادہ ہے ان کے مقابلے میں حسرت موہانی کی شخصیت دو خانوں میں بٹی ہوئی ہے جس کا محور ان کی زندگی کے صرف عاشقانہ تجربات ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ حسرت کی زندگی کا بیشتر حصہ سیاسیات کی نذر ہو گیا لیکن ان کی شاعری پر اس کا اثر نہ ہونے کے برابر ہے۔ ان کی سیاسی زندگی اور عشقیہ زندگی دو الگ الگ حصوں میں منقسم ہے۔ اس تضاد کی وجہ سے ان کے شعری سرمائے میں محدودیت اور فکری لحاظ سے بعض مقامات پر گہری کمی کا احساس ہوتا ہے ایک منظم اور مرتب شخصیت کی بجائے ان کے ہاں فکر و احساس کا تصادم پایا جاتا ہے۔ ان کے مقابلے میں جوہر کی سیاسی و سماجی زندگی اور شخصی تجربات کے درمیان کوئی حد فاصل نہیں بلکہ اتحاد و ارتباط ہے۔ ان کی شخصیت کا مرکزی نقطہ شخصی اور سماجی حالات میں دونوں جگہ یکساں رہتا ہے۔ اس لئے وہ حسرت کے مقابلے میں زیادہ تنظیم یافتہ اور مرتب شخصیت کے مالک ہیں۔ اقبال کی یاد اس لئے آتی ہے کہ جوہر کے کلام کا بیشتر سرمایہ ۱۹۲۲ء کے گرد وپیش تخلیق ہوا۔ اس زمانے میں وہ اقبال سے بے حد متاثر ہوئے۔ سیاسی اور دینی مسائل کے اظہار میں ان میں اور اقبال کے طریق کار میں مماثلت ہے۔ اقبال نے قدیم علامتوں کو ایک نئی معنویت دی اور ان سے معاصر حالات کے بیان کرنے کا کام لیا۔ جوہر کے سیاسی اشارے قفس، یزید، گلچیں، مجنوں، فرہاد، حسین ابن علی بھی اسی انداز سے نئے حالات کے لئے استعمال ہوئے ہیں۔ جوہر کی ذات ان کی شاعری کا مرکز ہے دیوانہ، مجنوں، عاشق، مومن وہ اسے کئی ناموں سے یاد کرتے ہیں اس کے اوصاف اقبال کے مرد مومن یا مرد حر کے اوصاف ہیں۔ جرات رندانہ، مقاصد سے عشق، حب رسول، عشق خداوندی، اطاعت، یقین محکم، باطل سے

بزد آزمائی بھی حقائق جوہر کی شاعری میں بنیادی ہیں لیکن اقبال کے مقابلے میں ان کے ہاں ایک کمی بھی نظر آتی ہے وہ فنی پختگی اور ہمواری جو اقبال کے کلام میں ہے ان کے ہاں نہیں۔ ان کے تجربات اور احساسات کی دنیا وسیع نہیں۔ ان کی علامتوں میں تہ در تہ واردات کے لامتناہی سلسلے قائم نہیں ہوتے۔ وہ عزم و یقین، خلوص و سرشاری کی متاع سے مالا مال ضرور ہیں لیکن ان کے کوائف میں وہ گہرائی اور عمق نہیں جو ایک تجربے کو دوسرے وسیع تر تجربات سے منسلک کرتا ہے۔ یہ فرق غالباً اس لئے ہے کہ جوہر کا کارنامہ خاص ان کی سیاسی زندگی ہے جس نے انہیں شاعری کی طرف زیادہ متوجہ نہیں ہونے دیا اور شاید اس لئے بھی ان کے ہاں یہ کمی پائی جاتی ہے کہ وہ مسائل کی ظاہری شکل کے زیادہ شیدائی ہیں اور ان کی پیچیدہ صورتوں کو پیش نظر نہیں رکھتے۔ جوہر بعض مسائل کو زیادہ اہمیت دیتے وہ ۱۸۵۷ء کے بعد کی سماجی تبدیلیوں کا شعور رکھتے ہیں۔ مغلیہ تمدن کی زوال پذیر قدروں نے تصوف کی دنیا میں جن انفعالی رجحانات کو مقبول بنایا جوہر اور اقبال دونوں اس کے مخالف ہیں۔ وہ عشق رسول اور عشق خدا جزو ایمان جانتے ہیں اور روحانی و مادی اقدار میں توازن کے قائل ہیں اس لئے تقدیر کے مسئلے کی وہ تنقید جو بے علمی اور ترک دنیا پر منتج ہو انہیں پسند نہیں۔ وہ جدوجہد کو ضروری جانتے ہیں اور زندگی کو بسر کرنے کی چیز قرار دیتے ہیں اور انسان کو محض تقدیر کا کھلونا نہیں مانتے۔ سرسید اور ان کے رفقا کا یہ بڑا احسان تھا کی مادی زندگی کی قدر و قیمت سامنے آئی لیکن ان بزرگوں نے مادیت پر ضرورت سے زیادہ زور دیا۔ اقبال اور جوہر نے اس میں توازن پیدا کیا۔ جوہر اس نقطہ نظر میں اقبال سے بہت قریب ہیں۔ وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے کو مہلک جانتے ہیں اور جدوجہد پر زور دیتے ہیں۔ اس کے بعد جوہر کامیابی اور ناکامی کو رضائے دوست کے ذیل میں شمار کر کے توکل پر بھروسا کرتے ہیں۔ پستیٔ احساس اور اس کے خلاف نبرد آزمائی میں جان بھی چلی جائے تو بھی عین مقصد ہے۔ موت ان کے نزدیک فرار کا راستہ نہیں مقصد کے حصول میں قربانی کا نام ہے ؎

کہدو ان گوشہ نشینوں سے بھریں گوشۂ قبر
نہیں دنیا میں جگہ آپ سے بیکاروں کی

عشق مجنوں کے لئے ناقۂ لیلیٰ کے سوا
شرط یہ بھی ہے کہ اک وادیٔ پرخار بھی ہو

حد ہے پستی کی کہ پستی کو بلندی جانا
اب بھی احساس ہو اس کا تو ابھرنا ہے یہی

جوہر توحید کے قائل ہیں خدا اور رسولؐ پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ جدوجہد کے بعد نتائج کو خدا پر چھوڑتے

ں اور اسے رضائے الٰہی جانتے ہیں۔ مصائب کو بھی وہ صبر اور شکر سے برداشت کرنے کو عین ایمان گردانتے ہیں ؎

ہم معنی ہوس نہیں اے دل صدائے دوست
راضی ہو بس اسی میں ہو جس میں رضائے دوست

طغرائے امتیاز ہے خود ابتلائے دوست
اس کے بڑے نصیب جسے آزمائے دوست

یاں جنبش مژہ بھی گناہ عظیم ہے
چپ چاپ دیکھتے رہو جو کچھ دکھائے دوست

یہ یقین محکم جوہر کے ہاں عشق خداوندی اور حب رسول اور اسوہ حسنہ کی پیروی سے آیا ہے۔ اسی
ں مدد سے وہ خارجی زندگی اور باطنی کوائف دونوں کو بیان کرتے ہیں ؎

اس نغمۂ لطیف کی کچھ دلکشی نہ پوچھ
کانوں میں آ رہی ہے ابھی تک صدائے دوست

جو دو سخائے ساقی کوثر کی دھوم ہے
ہم کو بھی ایک جام عطا ہو تو جانئے

....

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں — اب ہونے لگیں ان سے خلوت میں ملاقاتیں
ہر آن تسلی ہے ہر لحظہ تشفی ہے — ہر وقت ہے دلجوئی ہر دم ہیں مداراتیں
کوثر کے تقاضے ہیں تسنیم کے وعدے ہیں — ہر روز یہی چرچے ہر رات یہی باتیں
معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت — اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں
بے مایہ سہی لیکن شاید وہ بلا بھیجیں — بھیجی ہیں درودوں کی کچھ ہم نے بھی سوغاتیں

ان کوائف کا رشتہ جوہر نے خارجی دنیا سے دو استعاروں کی مدد سے استوار کیا ہے۔ وہ اپنے
دیوانہ رسول قرار دیتے ہیں اور قیس و فرہاد کے پیرائے میں دنیا کے بارے میں اپنے رویے کا اظہار کرتے
ہیں وہ اپنے مقاصد کے حصول کو دیوانہ پن قرار دے کر خارجی دنیا سے تعلق قائم کرتے ہیں ؎

عقل کو ہم نے کیا نذر جنوں — عمر بھر میں یہی دانائی کی

دوسرا رشتہ واقعات کربلا کا پس منظر ہے وہ دنیا میں حق و باطل کی آویزش دیکھتے ہیں۔ مخالف
قوتیں برسر پیکار ہیں۔ جوہر اسی میں اپنی جان لٹانے کو شہادت کا درجہ دیتے ہیں ؎

پیغام ملا تھا جو حسین ابن علی کو خوش ہوں وہی پیغام قضا میرے لئے ہیں
کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف کافی ہے اگر ایک خدا میرے لئے ہے
قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

جوہر یاس و حرماں، مایوسی و ناکامی کے شاعر نہیں۔ وہ اپنی ناکامیوں کو رضائے الٰہی جان کر صبر کی تلقین کرتے ہیں اور ان کے نزدیک موت زندگی سے فرار کا نام نہیں۔ حیات بعد الموت پر انہیں کامل یقین ہے اور مقاصد کے حصول کی جدوجہد کے لئے جان دینا ان کے نزدیک زندگی کے تسلسل کے حق میں مفید اور کارآمد ہے۔ گویا ان کا رویہ زندگی کے بارے میں منفی نہیں مثبت ہے۔ اس سے ان کی غزل میں ایک نشاطیہ لے پیدا ہوئی ہے۔ یہ لے اردو غزل کے لئے ایک اجنبی چیز تھی۔ جوہر کا بچپن داغ کی شاعری سے متاثر ہے لیکن یہ رنگ ان کے مزاج کا ضروری عنصر نہیں۔ ان کی شاعری کا محور زندگی سے فرار اور قدیم کی تقلید نہیں۔ انہوں نے شعری سطح پر زبان و بیان میں بھی آزادی اختیار کی ہے۔

ہماری غزل کی شاعری میں نرم اور دھیمے انداز میں حالی نے اخلاقی لے کا اضافہ کیا تھا۔ جوہر نے اس لب و لہجے کو شوکت اور طنطنہ عطا کیا۔ اس لحاظ سے اردو غزل کی روایت میں جوہر کا کارنامہ ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ اس کا مرتبہ اقبال کے برابر نہیں لیکن دوسرے کئی شعرا سے بلند ہے۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری

عوامی ادب کی تخلیق

"عوامی ادب" خاص اصطلاح ہے۔ ہندی میں لوک ساہتیہ کہتے ہیں۔ اس ادب کا تعلق اَن پڑھ اور ان گھڑ دیہات کے عام اور شہر کے خاص باشندوں سے ہے۔ اس لئے عوامی کے ساتھ ساتھ اسے دیہاتی ادب بھی کہا جاتا ہے۔ اس کی تین خصوصیتیں ہیں۔ جو اسے عام ادب سے ممتاز بناتی ہیں۔ پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس صنفِ ادب کا تعلق سفینے سے کم سینوں سے زیادہ ہے۔ یہ سینہ بسینہ ایک زبان سے دوسری زبان پر منتقل ہوتا رہتا ہے۔ اس لئے اس ادب کے خالق کا کوئی علم نہیں ہوتا۔ اکثر و بیشتر وہ گوشہ گمنامی یا جہل و تاریکی میں رہتا ہے۔ یہ اس ادب کی دوسری خصوصیت ہے۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ زبان کے لحاظ سے آئے دن اس میں ردّ و بدل، تراش خراش، کانٹ چھانٹ ہوتی رہتی ہے اس کی زبان رلی ملی ہوتی ہے۔

عوامی ادب کی کئی قسمیں ہیں۔ جن میں سے عوامی (دیہاتی) گیت، کہانیاں، لوریاں، پہیلیاں، امثل۔ دو سخنے خاص طور سے ذکر کے قابل ہیں۔ ان میں سے گیتوں اور کہانیوں کی ادب میں یا یوں کہیئے کہ عوامی ادب میں زیادہ اہمیت ہے۔ اردو میں گیتوں کا کوئی شمار نہیں۔ اس لئے جتنی تقریبیں، رسمیں، رتیں، تیج تہوار ہیں اتنی ہی قسمیں گیتوں کی ہیں۔ کچھ گیت موسموں کے ساتھ خاص ہیں، اور ان موسموں میں بھی خاص خاص موقعوں پر گائے جاتے ہیں۔ اردو زبان کے علاقوں میں برسات کا موسم بہار کا موسم ہوتا ہے۔ جب اودی اودی گھٹائیں چاروں طرف سے گھر کر آتی ہیں۔ چھما چھم بوندیں پڑتی ہیں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں۔ کوئل کی کوک سے دلوں میں ہوک سی اٹھتی ہے تو لڑکی بالیاں آم کی ڈالیوں میں جھولا ڈال کر جھولتی ہیں۔ اس موقع پر بھی گیت گائے جاتے ہیں۔ یہ ساونی کہلاتے ہیں۔ ان کے علاوہ بیاہ شادی کے گیت ہیں جن میں رخصتی کا گیت جسے منڈھا کہتے ہیں بہت موثر اور دلکش ہے یہ لڑکی کی رخصتی کے موقع پر حزنیہ لے میں گایا جاتا ہے لڑکی کو رخصت کرنے کے لئے ڈولے میں سوار کرایا جا رہا ہے۔ باپ، بھائی، چچا، ماموں، عزیز قریب سب موجود ہیں۔ لڑکی ہر ایک سے مل مل کر رو رہی ہے۔ باہر براتی کھڑے ہیں۔ ڈیوڑھی میں

بھانڈ لٹھیالے کے کھڑا منڈھا گا رہا ہے۔ جب خاص لے میں یہ بول اس کی زبان سے ادا ہوتے ہیں۔

کاہے بیاہی بدیس لکھی بابل مورے
ہم تورے بابل جھانبے کی چڑیاں
رین بسے اڑجائیں رے
لکھی بابل مورے

تو ہر شخص اشکبار ہو جاتا ہے۔

چکی کے گیت۔ کولھو کے گیت۔ منگل کے گیت غرض یہ کہ ہر موقع کا گیت جدا۔ ہر بستی کا گیت۔ دوسری بستی کے گیت سے اور ہر طبقے کا گیت دوسرے طبقوں کے گیت سے الگ۔ ان میں ایسے گیت کم ہیں جنہیں عمومیت حاصل ہو اور جو ہر جگہ ہر بستی اور ہر طبقے کے لوگوں میں یا گھروں میں گائے جائیں۔

کچھ گیت امیر خسروؒ کی طرف منسوب ہیں۔ یہ کسی قدر عام ہیں اور انہیں ادبی حیثیت حاصل ہے۔ باقی گیتوں کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ اردو میں ان پر بہت کم علمی اور تحقیق کا کام ہوا ہے۔ بسم اللہ بیگم صاحبہ نے آج سے بیس اکیس برس پہلے ان پر علمی انداز میں چند مقالے لکھے تھے جو نگار میں شائع ہوئے تھے۔ وہ شاید اس موضوع پر مستقل تحقیقی کتاب لکھنا چاہتی تھیں۔ میری نظر سے صرف ان کے چند مقالے گزرے ہیں۔ ان گیتوں کے متعلق اردو میں ابھی بہت کچھ لکھا جانا ہے۔ ان کی زبان زمانہ تصنیف مصنف یا مصنفہ کی شخصیت اور ادبی قدر و قیمت پر مفصل بحث ہونی چاہیئے۔

ان گیتوں کو یکجا کرنے کی ایک ناتمام اور تشنہ سی کوشش البتہ بعض اصحاب نے کی ہے۔ مولوی سید احمد دہلوی نے رسوم دہلی میں اُردو کے کچھ گیت درج کئے ہیں ڈاکٹر اعظم کریوی مرحوم نے عرصہ ہوا رسالہ عصمت میں قسط وار گیتوں کا ایک مجموعہ مختلف عنوانات کے تحت شائع کیا ہے۔ جو بعد میں عصمت بک ڈپو سے "دیہاتی گیت" کے نام سے کتابی شکل میں چھپا۔ دیہاتی گیت۔ منگل کے گیت۔ ساون کے گیت۔ چکی کے گیت۔ شادی کے گیت کولھو کے گیت۔ مختلف دیہاتی گیت کے عنوان سے کم و بیش اس میں ڈیڑھ سو گیت ترجمے کے ساتھ درج ہیں۔ شروع میں چند سطریں تمہید کے طور پر ہیں۔ ڈاکٹر کریوی کا بیان ہے کہ وہ اس سلسلہ مضامین سے پیشتر "ہمایوں" اور "نیرنگ خیال" میں دیہاتی گیتوں پر اپنے خیالات کا اظہار کر چکے ہیں۔

اس کے علاوہ ادارہ "انیس اردو" سے ایک کتابچہ "لوک گیت" کے نام سے اظہر علی صاحب فاروقی نے شائع کیا ہے۔ یہ صرف گیتوں کا مجموعہ نہیں عوامی گیتوں پر تنقیدی تبصرہ ہے جس میں گیتوں کی مختلف قسموں کا ذکر کر کے اردو اور دوسری مقامی زبانوں کے گیتوں کے بول مثال میں پیش کئے گئے ہیں۔ مولف نے حسب ذیل دس قسمیں گیتوں کی قرار دی ہیں۔

بچے کی پیدائش کے گیت۔ شادی بیاہ کے گیت ختنوں کے گیت۔ چکی کے گیت۔ چرخے کے گیت میلوں اور تہواروں کے گیت۔ ساون کے گیت۔ بھکاریوں کے گیت۔ برہا کے گیت۔ اور لوریاں۔

ان گیتوں کے لکھنے والے مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی۔ لیکن عورتیں زیادہ ہیں۔ جن کی شخصیت کی طرح ان کے ناموں پر بھی پردے پڑے ہوئے ہیں بعض گیتوں کے بولوں میں ڈاکٹر گریوی نے یہ رائے قائم کی ہے کہ وہ دیہاتی عورتوں کے فکر کا نتیجہ ہیں ان میں سے چند کے نام یا مختلف تخلص بھی انہوں نے لکھے ہیں۔ جو درج ذیل ہیں۔

کویلیا۔ نارنگیا۔ سانولیا۔ چمپلیا۔ کٹڑیا۔ وغیرہ۔ لیکن مجھے اس میں شبہ ہے کہ یہ گیت لکھنے والیوں کے نام یا ان کے تخلص ہیں۔

رام نریش ترپاٹھی نے "کویتا کومدی" کے نام سے کئی جلدوں میں ہندی میں ایک کتاب لکھی تھی جس کی ایک جلد "گرام سنگیت" دیہاتی گیتوں پر مشتمل ہے۔ اردو کے افسانہ نویس دیوندر ستیارتھی بھی مدت سے عوامی گیت جمع کر رہے ہیں۔ "ہمایوں" میں ان کے چند مضامین اس سلسلے میں شائع ہو چکے ہیں۔

کہانیوں کا رواج داستانوں کی طرح اردو میں قدیم زمانے سے ہے۔ داستان مرد کہا کرتے تھے اور کہانیاں عورتیں۔ اور وہ بھی گھر کی بڑی بوڑھیاں نانیاں، دادیاں، مائیں، خالائیں۔ عموماً یہ کہانیاں اس طرح شروع ہوا کرتی تھیں۔ ایک بادشاہ تھا اس کے چار لڑکے تھے یا چار لڑکیاں تھیں۔ بادشاہ اور بادشاہزادے کے ساتھ چوروں، ڈاکوؤں، اور ٹھوروں کی کہانیاں بھی کہی جاتی تھیں۔ اردو میں ان کہانیوں کے کرداروں کا بعض نقادوں نے ذکر کیا ہے ان کے تانے بانے یعنی واقعات بھی نفسیات کی روشنی میں زیر بحث آتے ہیں۔ لیکن کہانیوں کو جمع کرنے کی کوشش نہیں ہوئی۔

جس طرح پنجاب کے مشہور و مقبول قصوں کو جمع کیا گیا تھا اس طرح اردو کہانیوں کو جمع کرنے اور ترتیب دینے کی کوشش میری نظر سے نہیں گزری۔ ضرورت ہے کہ ان تمام کہانیوں کو ترتیب دے کر شائع کیا جائے۔ اردو میں منظوم عوامی کہانیوں کی روایت بھی ملتی ہے جیسے تاجو ناصو کی کہانی جسے بھکاری۔ دو تارے پر گاتے ہیں۔

پہیلیاں اور دنمل عموماً امیر خسروؒ کی طرف منسوب ہیں۔ ان میں سے چند آب حیات میں ہیں، باقی ادھر ادھر منتشر حالت میں ہیں۔ انہیں بھی جمع کرنا چاہیئے ان کی ادبی اہمیت بھی ہے اور لسانی بھی۔

لوریاں بھی اردو میں کچھ کم نہیں۔ بعض عام اور مقبول ہیں۔ جیسے "آجا ری نندیا آ کیوں نہ جا" مورے ننھے کی انکھوں میں گھل مل جا" یہ لوری ہر ماں کی زبان پر ہے۔ کچھ ایسی بھی ہیں جو شہرت عام اور قبول عوام کے دربار میں رفعہ نہ پا سکیں ان بکھرے ہوئے اوراق کی شیرازہ بندی ہونی چاہیئے۔

مطبوعات انجمن

تلخیص الاردو:- یہ انجمن کے مشہور علمی جریدے سہ ماہی "اردو" کے سی سالہ پرچوں کے بہترین مضامین کا انتخاب ہے۔ اس میں مشاہیر اہلِ قلم کے لکھے ہوئے گیارہ علمی و ادبی مقالات شامل ہیں۔ قیمت :- پانچ روپے پچاس پیسے

سرشار کی ناول نگاری (ڈاکٹر لطیف حسین ادیب) رتن ناتھ سرشار اردو کے عظیم ناول نگار ہیں۔ ان کی حیات اور کارناموں پر گنتی کے چند مضامین لکھے گئے ہیں اور وہ بھی نہایت تشنہ۔ ڈاکٹر ادیب نے بڑی محنت سے اس کتاب میں سرشار کے حالاتِ زندگی اور تصانیف پر روشنی ڈالی ہے۔ اس تحقیقی مقالے پر مصنف کو، الہ آباد یونیورسٹی نے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی سند عطا کی تھی۔ قیمت :- چھ روپے پچاس پیسے

اردو تھیٹر (ڈاکٹر عبد العلیم نامی):- ڈاکٹر عبد العلیم نامی (پرنسپل اورنٹیل کالج بمبئی) نے اردو ڈرامے کی مکمل تاریخ مرتب کی ہے جس میں ڈراموں ڈرامہ نگاروں، اداکاروں اور ڈرامہ کمپنیوں وغیرہ کے بارے میں ایسی معلومات ہیں جو کسی دوسری جگہ نہیں ملتیں۔ یہ کتاب دراصل اردو ڈرامے کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ تین جلدیں شائع ہوچکی ہیں۔ قیمت :- فی جلد سات روپے۔

سعادت یار خاں رنگین (ڈاکٹر صابر علی خاں) یہ کتاب سعادت یار خاں رنگین کے حالاتِ زندگی اور جائزہ، تصانیف پر مشتمل ہے۔ فاضل مصنف کو اس تاریخی کارنامے پر پنجاب یونیورسٹی نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند عطا کی تھی۔

قیمت :- پانچ روپے پچھتر پیسے

محمد حسین آزاد (ڈاکٹر اسلم فرخی) یہ ایک تحقیقی مقالہ ہے جس پر مصنف کو کراچی یونیورسٹی نے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی سند عطا کی ہے۔ فاضل مصنف نے اس میں مولانا آزاد کے حالاتِ زندگی اور ان کی ادبی خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ یہ کتاب دو جلدوں میں شائع کی گئی ہے۔ قیمت جلد اول ۸ روپے۔ دوم ۱۲ روپے۔

جلال لکھنوی (ڈاکٹر محمد حسین) مصنف نے جلال لکھنوی کے سوانح حیات لکھے ہیں، ان کے کلام کی خصوصیات پر بحث کی ہے، اور ان کے کلام کا انتخاب کیا ہے۔ جلال لکھنوی، داغ اور امیر مینائی کے ہمعصر اور لکھنؤ کے بہت مقبول اور مشہور شعرا میں سے تھے۔ ان کے بارے میں یہ پہلی محققانہ تالیف ہے۔ قیمت :- تین روپے

انجمن ترقی اردو [illegible]

تصنیف :- اوکاکورا کاکوزو
ترجمہ :- صمدانی نقوی

فن سے لطف اندوزی

اوکاکورا کاکوزو، ۲۶ دسمبر ۱۸۶۲ء کو جاپان کے ایک شہر یوکوہاما میں پیدا ہوا۔

اوکاکورا مشرقی فنون لطیفہ اور مشرقی ثقافتی اقدار کا دلدادہ تھا۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں جب جاپان میں جدت پسندی کی وبا پھیلی اور یہ خطرہ بڑھ گیا کہ [illegible] قدیم فنون اور ثقافتی آثار ختم ہو جائیں گے تو ان کے تحفظ کی خاطر ایک قومی تحریک کا آغاز ہوا۔ اوکاکورا کی ذات اس تحریک کا محور تھی۔ اوکاکورا [illegible] بوسٹن میوزیم کا مشیر اور وہاں کے چینی اور جاپانی فنون کے شعبے کا کیوریٹر رہا۔ آج بوسٹن میوزیم میں چین، جاپان اور ہندوپاک کے جو گرانقدر [illegible] ہیں زیادہ اسی کی کوششوں کا حاصل ہیں۔

[illegible] کتاب "بک آف ٹی" کے نام سے لکھی اور [illegible] یہ کتاب مشرب چائے نوشی کے ساتھ ساتھ جمالیات کے موضوع پر ایک اہم دستاویز سمجھی گئی ہے اس کتاب کا ترجمہ دنیا کی سبھی زبانوں [illegible] اسی کتاب کا ایک باب ہے۔

۲ ستمبر ۱۹۱۳ء کو اوکاکورا کا انتقال ہو گیا۔

بربط کو نغموں پر اکسانے کی ایک کہانی تاؤ کے ماننے والے بیان کیا کرتے ہیں۔ کیا کبھی آپ نے سنا ہے؟

کہتے ہیں کہ دور کہیں ماضی کے دھندلکوں میں لنگ مِن کے نالے پر کیری کا ایک درخت [illegible] جو

جنگل کا بادشاہ کہلاتا ہے ۔ اس نے اپنے سر کو کچھ اس طرح اٹھا رکھا تھا جیسے وہ تاروں سے باتیں کر رہا ہے
اس کی جڑیں زمین میں اتنی گہری پیوست ہو چکی تھیں کہ ان کے کانسوی گچھے، ان نقرئی اژدہوں سے جا ملے تھے
جو تہہِ زمین آسودہ ہیں ۔ پھر ایک زمانہ ایسا آیا کہ کسی بڑے جادوگر نے اس درخت سے ایک عجیب و غریب بربط
بنا لیا ۔ بربط کی روح بڑی سرکش تھی ۔ اسے نغموں پر اکسانے کے لئے کسی عظیم موسیقار کی ضرورت تھی ۔ ایک مدت
تک تو یہ ساز چین کے شہنشاہ کے پاس پڑا رہا ۔ بہت سے موسیقار آئے اور اس کے تاروں کو جگانا چاہا لیکن نہ
جگا سکے ۔ وہ جس قدر کوشش کرتے، بربط سے اتنے ہی بھونڈے سُر نکلتے اور گیت کی نغمگی سے انہیں دور کا
بھی واسطہ نہ ہوتا ۔ لہٰذا یہ ساز ابھی تک تشنۂ مضراب ہی تھا ۔

آخر کو ایسا ہوا کہ پی وو جو بربط نوازوں کا شہزادہ تھا، وہاں پہنچا ۔ اس نے بربط پر کچھ اس نرمی سے
ہاتھ پھیرنا شروع کیا جیسے کسی منہ زور گھوڑے کو قابو میں کرنے کے لئے کوئی ہاتھ پھیرتا ہے ۔ تاروں پر اس نے
ہلکے سے ضرب لگائی اور ایسے گیت چھیڑ دیئے جو مناظرِ فطرت سے، موسموں کی الٹ پھیر سے، اونچی اونچی
پہاڑیوں اور بہتی ہوئی ندیوں سے متعلق تھے ۔ انہیں سن کر درخت کی روح بیدار ہونے لگی اور اسے بہت
سی بھولی بسری باتیں یاد آتی گئیں ۔ ایک بار پھر اس کی شاخوں میں بہار کی میٹھی ہواؤں نے سانس لینا شروع
کر دیا ۔ پُر شباب جھرنے، اچھلتے کودتے ندی کی گود میں گرتے اور مسکراتے ہوئے پھولوں پر ہنستے چلے جاتے
تھے ۔ لیکن اچانک موسم بدلا اور گرمیوں کی خوابناک صدائیں سنائی دینے لگیں ۔ حشرات الارض اپنی اپنی الاپنے
لگے ۔ برسات نے جھانجن بجانی شروع کر دی اور کوئل کی درد بھری پکار نے فضا میں رس گھول دیا ۔ پھر
شیر کے دھاڑنے کی آواز آئی ۔ وادی نے اس کا جواب دیا ۔ خزاں نے ڈیرا جمایا ۔ جنگل کی رات ۔ اوس
سے سبزہ بھیگ گیا ۔ چاند اس پر تلوار کی طرح چمکنے لگا ۔ پھر جاڑوں کا موسم آیا ۔ برف پوش فضاؤں میں
ہنسوں کی لہراتی ہوئی قطاریں دکھائی دینے لگیں اور مسرت سے سرشار ہو کر اولوں نے ڈالیوں سے سر ٹکرانا
شروع کر دیا ۔

پھر پی وو نے محبت کے سُر الاپنے شروع کئے ۔ جنگل سارا جھوم اٹھا جیسے دیہات کا رہنے والا کوئی
جوشیلا عاشق کسی کے خیال میں گم ہو کر جھوم رہا ہو ۔ دور آسمان میں، کسی گرم دوشیزہ کی طرح، چمکیلے اور حسین
بادل امنڈ آئے تھے اور ان کے لانبے لانبے سائے سطحِ ارضی پر خراماں دکھائی دینے لگے ۔ ان کی رنگت ناہید
کی طرح کالی تھی ۔ پھر راگ بدلا ۔ پی وو نے جنگ کا نغمہ چھیڑا ۔ فولاد آپس میں ٹکرانے لگا ۔ گھوڑوں کی ٹاپوں سے
فضا گونجنے لگی اور بربط کے سینے سے لنگ ہو کا طوفان امنڈ پڑا ۔ بجلی پر سوار اژدہے نکل پڑے ۔ پُرشور چٹانیں
پہاڑوں سے ٹکرا کر فنا ہونے لگیں ۔ سرزمین چین کا بادشاہ بہت خوش ہوا ۔ اس نے پی وو سے اس کی کامیابی

کا راز پوچھا ۔" حضور! پی وو نے جواب دیا" دوسروں نے جو نغمے چھیڑے تھے وہ ان کے اپنے نغمے تھے ۔ میں نے بر لبط کو آزادی دی تھی کہ وہ اپنا نغمہ آپ پسند کرے ۔ میں نہیں جانتا کہ بر لبط نے پی وو کو اپنا لیا یا پی وو نے بر لبط کو ۔"

یہی وہ کہانی ہے جس کے ذریعہ ہمیں فن سے لطف اندوز ہونے کا بھید معلوم ہوتا ہے ۔ شاہکار وہی ہے جو ہمارے لطیف ترین محسوسات کا ہمنوا ہو ۔ سچا فن پی وو ہی ہے اور ہم سب لنگ مَن کا بر لبط ہیں ۔ دستِ حسن کی ساحرانہ جنبشوں سے ہمارے وجود کے تار بولنے لگتے ہیں ۔ اک لرزشِ خفی ہمارے اندر سرایت کر جاتی ہے ۔ اور ہم استادِ فن کی آواز پر لبیک کہہ اٹھتے ہیں ۔ دل، دل سے بولنے لگتا ہے ۔ ہم ان کہی بات سنتے اور ان دیکھی صورتوں کا نظارہ کرنے لگتے ہیں ۔ استاد کے ساز سے جو سُر نکلتے ہیں وہ انجانے سُر ہیں ۔ یادیں جنہیں بولے مدت ہو گئی تھی ایک تازہ کیفیت کے ساتھ ہمارے ذہن کے افق سے جھانکنے لگتی ہیں ۔ امیدیں جو خوف سے مرجھا گئی تھیں ۔ امنگیں جنہیں زبان پر لاتے ہوئے ڈر ہوتا تھا، ایک نئے فاتحانہ جذبے کے ساتھ دل کے جلوخانے سے نکل پڑتی ہیں ۔ ہمارا دماغ ایک کینوس بن جاتا ہے جس پر فن کار اپنے رنگ بکھیرتا ہے ۔ وہی رنگ ہمارے جذبات ہیں ۔ اسی کی بنائی ہوئی سایۂ نور کی کیفیتوں میں ہمیں اپنی مسرت کی روشنی اور اپنے رنج و الم کے سائے مل جاتے ہیں ۔ شاہکار تو بس ہم ہی سے ہے کیونکہ ہم خود شاہکار ہیں ۔

فن سے لطف اندوز ہونے کے لئے جس ہمدردانہ ذہنی یگانگت کی ضرورت ہے اسے باہمی رعایتوں پر مبنی ہونا چاہیئے ۔ دیکھنے والے کو چاہیئے کہ وہ اپنے اندر مناسب رجحان پیدا کرے تاکہ پیغام وہ اسی انداز میں قبول کر سکے جس انداز میں فنکار اس تک پہنچانا چاہتا ہے ۔ کبوری انشیو جو چائے کا ماہر اور جاپان کے صاحب ثروت لوگوں میں سے تھا، ہمیں اپنی یادگار کے طور پر ان الفاظ کی سوغات دیتا ہے ۔" نقاشی کے کسی عظیم نمونے کے آگے جاؤ اس طرح جاؤ جیسے کسی بڑے شہزادہ کے آگے جا رہے ہو" کسی شاہکار کو سمجھنے کے لئے آپ کو اس کے آگے جھک جانا ہوگا اور دم سادھے اس کے خاموش نطق کا انتظار کرنا ہوگا ۔ سونگ گھرانے کا ایک مایہ ناز نقاد، اعتراف کے طور پر کہتا ہے" اپنی کم عمری میں، میں ان ماہرین کی تعریف کیا کرتا تھا جن کی تصویریں مجھے پسند آتی تھیں ۔ جیسے جیسے میری نقد و نظر پختہ ہوتی گئی میں اپنی آپ تعریف کرنے لگا کیونکہ میں وہی تصویریں پسند کرتا تھا جنہیں ماہرین مجھ سے پسند کروانا چاہتے تھے ۔" یہ بڑی افسوسناک بات ہے کہ ہم میں سے بہت کم لوگ ایسے ہیں جو ماہرین کے جذبۂ تخلیق کو سمجھنے کے لئے تھوڑی بھی تکلیف اٹھاتے ہوں ۔ ہم اپنی جاہلانہ ضد میں، ان کے ساتھ اس سادہ سے اخلاق کو بھی روا نہیں رکھتے اور اسی وجہ سے اکثر ہم حسن و جمال کی اس دعوت سے محروم رہتے ہیں جو ہماری نگاہوں کے آگے پھیلی رہتی ہے ۔ ماہر کی جھولی میں دینے کے لئے بہت کچھ ہے لیکن لطف اندوزی کی کمتر صلاحیت کے باعث

ہم اکثر تشنہ کام ہی رہتے ہیں۔

جس کا رویہ ہمدردانہ ہو، اس کے نزدیک شاہکار کی حیثیت ایک زندہ حقیقت کی ہے اور وہ اس شاہکار کے ساتھ اپنے آپ کو رشتہ محبت میں منسلک محسوس کرتا ہے۔ ماہر کو فنا نہیں ہے کیونکہ اس کی محبت اور اس کا خوف ہمارے ساتھ ہر دور میں زندہ ہے۔ جو چیز ہمیں اپنی طرف کھینچتی ہے وہ روح ہے، ہاتھ نہیں ہے۔ وہ آدمی ہے تکنیک نہیں ہے۔ چیز جس قدر انسانی ہوگی اسی قدر ہمارا ردعمل اس کے بارے میں گہرا ہوگا۔ ماہر فن اور ہمارے درمیان جو پراسرار سی مفاہمت موجود ہے، اسی کی بنا پر تو ہم کسی شاعری یا رومان کے ہیرو اور ہیروئن سے مسرور لا حاصل کرتے یا ان کی وجہ سے غمگین ہو جاتے ہیں۔ چکامتسو کو جاپانی شکسپیئر کہا جاتا ہے۔ ڈرامے کی تشکیل کے تعلق سے اس کے ہاں جس بات کو بنیادی اہمیت حاصل ہے وہ یہ ہے کہ مصنف کو چاہیئے کہ ڈرامہ دیکھنے والوں کو اپنے اعتماد میں لے۔ اس کے بہت سے شاگرد ایسے بھی تھے جنہوں نے اس کی منظوری کے لئے اپنے اپنے کھیل پیش کئے تھے لیکن ان میں سے ایک آدھا ہی کھیل ایسا پسند آسکا تھا۔ یہ کھیل "کامیڈی آف ایررز" سے ملتا جلتا تھا۔ اس میں دو توام بھائی اپنی مشابہت کی وجہ سے مصائب میں گرفتار رہتے۔ چکامتسو نے کہا "یہی وہ بات ہے جس میں ڈرامے کی مخصوص روح پائی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے ڈرامہ دیکھنے والوں کی توجہ بٹنے نہیں پاتی۔ حقیقت کیا ہے، وہ اداکاروں سے زیادہ، اس سے واقف ہوتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ غلطی کہاں ہو رہی ہے۔ اسٹیج پر معصومیت کے ساتھ اپنی تقدیر کے پیچھے بھاگنے والے غریب کردار اسی بنا پر ان سے ہمدردی حاصل کر لیتے ہیں"۔

بڑے ماہر فن کو چاہیے وہ مشرق کے رہنے والے ہوں یا مغرب کے، اس بات کو ہرگز فراموش نہیں کر سکتے کہ وہ مشابہت یہی ہے جو دیکھنے والے کو ان کے اعتماد میں لے لیتی ہے۔ کون ہوگا جو خیال کی دور لے جانے والی راہ سے متاثر ہوئے بغیر کسی شاہکار پر غور کرنے کے لئے ٹھہر جائے۔ یہ سب باتیں کتنی مانوس اور کتنی ہمدردانہ ہیں۔ ان کے برعکس عصر جدید کی باتوں میں کیسی سرد مہری اور بے اعتنائی ہے۔ ایک وہ باتیں تھیں جن میں ہم آدمی کے دل کی تہ تک پہنچ کر محسوس کرتے تھے، ایک یہ باتیں ہیں جن میں صرف تکنیکی سلیقہ ہے اور کچھ نہیں۔ تکنیک کی الجھنوں میں جکڑا ہوا جدید آدمی اپنی حد سے بلند نہیں ہو سکتا۔ لنگ فن کے بربط کو آکسانے والے ناکام موسیقاروں کی طرح وہ صرف اپنے ہی گیت گاتا ہے۔ اس کے سبھی کام سائنس کے دائرے میں تو آسکتے ہیں لیکن انسانیت سے انہیں دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ جاپان میں، پرانے زمانے سے یہ کہاوت چلی آتی ہے کہ عورت کسی اوچھے آدمی سے محبت نہیں کر سکتی کیونکہ ایسے آدمی کے دل میں کوئی جگہ ایسی نہیں ہوتی جس میں محبت داخل ہو سکے اور اسے بھر دے۔ فن کے باب میں اوچھاپن، چاہے وہ فنکار میں ہو یا عوام میں، یکساں طور پر ہمدردانہ جذبات کے لئے خطرناک ہے۔

فن میں روح کے رشتوں کے اتصال سے زیادہ کوئی چیز قابل احترام نہیں ہے۔ اتصال کے یہی لمحے ہوتے

ں جب فن کا شیدائی خود کو برگزیدہ محسوس کرتا ہے - ایک ہی وقت میں وہ ہوتا بھی ہے اور نہیں بھی ہوتا ہے
سے ابدیت کی ایک جھلک دکھائی دیتی ہے - اسے اپنی مسرت کے اظہار کے لئے الفاظ نہیں ملتے کیونکہ آنکھوں
کوئی زبان نہیں ہے ۔ مادہ کی بندشوں سے آزاد ہوکر اس کی روح اشیا کے آہنگ میں گم ہو جاتی ہے اور یہی وہ مقام
وتا ہے جہاں پہنچکر فن مذہب سے قریب تر ہو جاتا ہے اور انسانیت کو اس سے شرف حاصل ہونے لگتا ہے۔ کسی
اہکار کو مقدس بنانے والا یہی ایک جذبہ ہے - قدیم زمانے میں جاپانی لوگ بڑے فنکار کے کاموں کو غیر معمولی
زت دیتے تھے - چائے کے ماہرین اپنے خزینوں کی اس طرح حفاظت کرتے تھے جیسے کوئی مقدس راز کی حفاظت
رتا ہے - گویا وہ کوئی بے شمار ہی قلمدان ہیں جنہیں یکے بعد دیگرے کھولنا ہے تب کہیں جا کر تبرک تک رسائی ہوگی
یشمی تہوں کے اندر قدس القدس کا دیدار ہوگا - صرف عارف کی نظریں ہی اسے دیکھ سکتی ہیں - وہ عام مشاہدہ
ی شئے نہیں تھے [illegible]

اس زمانے میں جب کہ چائے نوشی کے مسلک کا عروج تھا، ٹائیکو کے فوجی عہدیدار فن کے کسی نایاب
نمونے سے زیادہ مطمئن ہو جاتے تھے بہ نسبت اس کے کہ ان کی فتوحات کے معاوضہ میں انہیں بڑی بڑی زمینات
دی جائیں۔ ہمارے بہت سے مقبول ڈرامے کسی شاہکار کے کھوئے جانے اور دوبارہ مل جانے کے واقعات پر مبنی
ہیں - مثال کے طور پر، ایک ڈرامے میں لارڈ ہسو کا وا کے محل کا ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے جہاں سیسان کی نقاشی
ں دھرو ما کی قابل قدر تصویریں محفوظ تھیں - یکایک ایسا ہوا کہ ایک سپورائی کی غفلت کی وجہ سے محل کو آگ
گئی۔ سنتری نے طے کیا کہ چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو، نقاشی کے ان قیمتی نمونوں کو تو بچانا ہی ہوگا۔ وہ شعلوں کو
یرتا ہوا محل میں داخل ہو گیا اور صرف کا کے مونو کو اٹھا سکا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اب باہر نکلنے کے سارے راستے
شعلوں نے بند کر رکھے ہیں۔ اسی شہ کار کو بچانے کے لئے اس نے اپنی تلوار سے اپنے جسم پر ضرب لگائی، اپنی پھٹی
ہوئی آستین کو سیساق کے شاہکار کے گرد لپیٹا اور زخم کے کھلے ہوئے شگاف میں رکھ دیا - بالآخر جب آگ بجھ
ئی تو دھواں دیتے ہوئے ملبے میں ایک نیم سوختہ لاش نظر پڑی جس کی آغوش میں وہ شاہکار آگ سے بالکل محفوظ تھا
کہانیاں اگرچہ بڑی خوفناک ہیں لیکن ان سے ہماری قدر دانی فن اور ہمارے قابل اعتماد سنتری کی فرض شناسی کا
ندازہ ہوتا ہے۔

ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیئے کہ فن کی قدر و قیمت کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ ہم سے کس درجہ ہمکلام
ہے - اگر ہماری ہمدردیاں عالمی اساس پر ہوتیں تو ہماری زبان بھی عالمی ہوتی - ہماری محدود فطرت، ہمارے رسم و رواج
طاقت اور ہماری موروثی خصوصیات ہی ہیں جو فن سے لطف اندوزی کے دائرے کو محدود کر دیتے ہیں - ایک
حد تک وہ ہماری انفرادیت ہی ہے جو ہمارے ادراک کی حد بندی کر دیتی ہے - ماضی کی تخلیقات میں ہم اپنی جمالیاتی

شخصیت ہی کے پرتو ڈھونڈنے لگتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ تربیت سے ہم اپنی لطف اندوزی کی صلاحیت کو فروغ دے سکتے اور حسن کے ایسے مظاہر سے لطف اٹھا سکتے ہیں۔ جن سے ہم لے آج تک بے اعتنائی برتی ہے۔ لیکن کائنات میں ہم صرف اپنی ہی تصویر دیکھتے ہیں۔ ہماری مخصوص جبلتیں ہی ہیں جو ہمارے تصورات کی راہیں معین کرتی ہیں۔ چائے کے ماہروں نے صرف انہی اشیا کا انتخاب کیا ہے جو ان کی انفرادی لطف اندوزی کے احاطے میں آتی تھیں۔

اس سلسلے میں کبوری انشیو کے تعلق سے ایک حکایت یاد آتی ہے۔ انشیو نے نوادرات کے جمع کرنے میں جس قابل قدر ذوق کا ثبوت دیا تھا اس کے شاگرد اس کی بیحد تعریف کرتے اور کہتے تھے "آپ کے پاس چیزیں ایسی ہیں کہ جس نے بھی انہیں دیکھا تعریف کے بغیر نہ رہ سکا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کا ذوق رکیو سے بھی بلند ہے۔ رکیو کی جمع کردہ چیزوں کو دیکھ کر ہزار آدمیوں میں سے ایک آدھا ہی ایسا ہوگا جو ان کی تعریف کرے گا" انشیو نے بڑے دکھ سے جواب دیا" اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ میں کس رتبہ کا عامی ہوں۔ عظیم رکیو کے پاس تو حوصلہ تھا جس کی وجہ سے وہ انہی چیزوں کو پسند کرتا تھا جن سے وہ شخصی طور پر متاثر ہوتا تھا۔ میں نے تو غیر شعوری طور پر اکثریت کے مذاق کا ساتھ دیا ہے۔ بیشک رکیو چائے کے ماہرین میں ہزاروں پر بھاری ہے"

یہ بڑی افسوسناک بات ہے کہ عصر حاضر میں فن کے تعلق سے جو جوش و خروش دکھائی دیتا ہے اس کی تہہ میں حقیقی محسوسات نہیں ہیں۔ اس جمہوری دور میں لوگ ہر اس چیز پر تالی بجاتے ہیں جسے عام طور پر، بلا لحاظ محسوسات بہتر مان لیا جاتا ہے۔ انہیں تو ایک ایسی چیز چاہیئے جو قیمتی ہو نہ کہ لطیف، فیشن کے مطابق ہو نہ کہ حسین۔ عوام ان مصور رسالوں سے زیادہ لطف اندوز ہوتے ہیں جن میں ان کے اپنے صنعتی دور کی تخلیقات چھپتی ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اطالوی یا آشی کاگا کے قدیم تصویری کارناموں کو سراہتے تو ضرور ہیں لیکن ان کی فنی مسرت کے لئے تشفی بخش مواد اگر کہیں مل سکتا ہے تو انہی مصور رسالوں سے۔ فنکار کا نام ہی ان کے لئے اہم ہے۔ کام چاہے کیسا ہی ہو۔ بہت صدیوں پہلے ایک چینی نقاد نے کہا تھا "لوگ کسی تصویر پر اپنے کانوں سے تنقید کرتے ہیں" لطف اٹھانے کی صلاحیت کا یہی فقدان ہے جو بناوٹی مرعوبیت کا سبب بنا ہوا ہے۔ آج ہم جدھر بھی دیکھتے ہیں اسی بدمذاقی سے ہمارا سامنا ہوتا ہے۔

ہم ایک اور غلطی یہ کرتے ہیں کہ فن کو آثار قدیمہ سے خلط ملط کر دیتے ہیں۔ قدامت کی وجہ سے احترام کا جذبہ تو پیدا ہوتا ہے جو انسانی کردار کی بہترین خصوصیات میں سے ایک ہے مگر ہمیں چاہیئے کہ اس جذبے کی کچھ اور بھی نگہداشت کریں اور اسے پروان چڑھائیں۔ پرانے اساتذہ یقیناً قابل عزت ہیں کہ انہوں نے مستقبل کی راہ روشن کی۔ نقد و نظر کی صدیاں گزریں مگر ان کی شہرت پر حرف نہ آیا اور وہ اپنی عظمت و بزرگی کو لئے وقت کی سیڑھیوں سے اتر کر ہم تک چلے آئے۔ ان کی عزت کے لئے محض اتنی بات بھی بہت ہے۔ لیکن یہ بھی ہماری بھول

ہی ہوگی اگر ہم ان کے کارناموں کو سو سال کی دوری سے جانچیں ۔ ہمیں آزادی ہے کہ چاہیں تو تاریخ سے اپنی ہمدردی کو اپنے ہی جمالیاتی ذوق پر ترجیح دے لیں ۔ ہم اپنی عقیدت کے پھول فنکار پر اس وقت چڑھاتے ہیں جب وہ قبر کی گود میں ہمیشہ کے لئے آسودہ ہو جاتا ہے ۔ انیسویں صدی تو ارتقا کے نظریئے سے بوجھل ہو گئی ہے ۔ اس نے ہمیں جس بات کا عادی بنا دیا ہے وہ یہ ہے کہ ہم اب عادتاً ہی نسلوں کے مقابلہ میں فرد کو نظر انداز کر جاتے ہیں ۔ نادر چیزوں کا جمع کرنے والا اس دھن میں رہتا ہے کہ بہت سے ایسے نمونے اکٹھا کر لے جن سے کسی دَور یا کسی مکتب خیال کی تصویر سامنے آ سکے ۔ وہ یہ بھول جاتا ہے کہ کسی مخصوص دور یا مکتب خیال کی متعدد تخلیقات کے مقابلہ میں جو معمولی درجہ کی ہوں، صرف ایک شاہکار بھی ہماری تربیت کے لئے کافی ہو سکتا ہے ۔ ہم درجہ بندی پر زیادہ اور لطف اٹھانے پر کم توجہ دیتے ہیں ۔ نمائش کے اصولی طور پر طریقوں کے زعم میں جمالیاتی نقطۂ نظر کی بھینٹ دینا، ہمارے بہت سے عجائب گھروں کا ایک دردناک وطیرہ بن گیا ہے ۔

زندگی کی کسی طاقتور اسکیم میں، معاصرانہ فنون کے مطالبات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔ آج کا فن ہی وہ فن ہے جو درحقیقت ہم سے وابستہ ہے ۔ وہی ہمارا اپنا انعکاس ہے ۔ اس کی مذمت کر کے دراصل ہم اپنی آپ مذمات کر بیٹھتے ہیں ۔ ہم کہتے ہیں کہ دَورِ حاضر، فن کی دولت سے محروم ہے ۔ اس کی ذمہ داری کس پر ہے ؟ قدماء کے فن کو سراہنے میں ہم نے جو بھی لنترانیاں کی ہوں، یہ بات اپنی جگہ شرمناک ہے کہ ہم اپنی صلاحیتوں کی طرف کم توجہ دیتے ہیں ۔ ہمارے فنکار محنت کے بوجھ تلے دبے جا رہے ہیں ۔ ان کی روحیں مضمحل ہو گئی ہیں اور وہ ہماری سرد مہری اور بے اعتنائی کے سائے میں دن گزار رہے ہیں ! ہماری اس خود ارتکاز صدی میں، آخر وہ کون سی سوغات ہے جو ہم انہیں دیتے ہیں ؟ ماضی کے شب و روز، ہماری تہذیب کی بدحالی پر افسوس کر رہے ہیں ۔ مستقبل کے سویرے ہمارے فن کے دیوالیہ پن پر ہنس رہے ہیں ۔ فن کی بربادی میں، ہم اپنی زندگی کے حسین لمحوں کو برباد کرتے جا رہے ہیں ۔ کیا کبھی ایسا بھی وقت آئے گا کہ افق کی وادیوں سے کوئی عظیم ساحر ابھرے گا اور سماج کے تناور درخت سے ایک مضبوط بربط تراش لے گا ۔ ایسا بربط جس کے تار "روحِ عصر" کے ایک ہی زخمہ پر بول پڑیں ۔

ابن الحسن

قومی شعور اور ادیب

ادب کے مطالعہ سے اکثر یہ شبہ ہوتا ہے کہ ادیب پر قوم، ملت، وطن اور مذہب کی عام پابندیاں عائد نہیں ہوئیں، گویا وہ قومی یا ملی ذمہ داریوں سے زیادہ بلند ہوتا ہے، اس کا درجہ اور رتبہ قومی حدود میں رہ کر متعین نہیں کیا جا سکتا۔ اس شبہ کو اس طرح اور بھی تقویت پہنچتی ہے کہ ادبی حلقوں میں آفاقیت کا نعرہ بڑے شوق سے لگایا جاتا ہے اور آفاقیت سے قبول عام کے معنی یعنی "میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے" نہیں لئے جاتے بلکہ زمان و مکان سے ماورا ایک ایسی کیفیت سے اسے تعبیر کیا جاتا ہے جس میں زندگی کی عام مقتضیات اور مانوس انسانی اقدار سے ادب اور ادیب کی ذات کو ملوث نہیں ہونے دیا جاتا، بقول غالب

عرش سے پرے ہوتا کاش کے مکاں اپنا

ادیب کی اس مافوق الملت حیثیت کو ثابت کرنے کے لئے طرح طرح کی مثالیں بطور دلیل پیش کی جاتی ہیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ سارتر فرانس جیسی بیدار قوم کا فرد ہوتے ہوئے بھی فرانس کی سیاسی ضرورت کے سامنے اپنے عقائد پر قائم رہا اور عین اس وقت جب فرانس الجیریا کی عوامی تحریکِ حریت کے خلاف بر سر پیکار تھا سارتر نے الجیریا کے مجاہدینِ آزادی کی برملا حمایت کی اور اپنی حکومت پر کڑی تنقید کی۔ اس مثال کو دلیل کے طور پر اسی حالت میں مانا جا سکتا ہے جب یہ فراموش کر دیا جائے کہ فلسفۂ حریت میں فرانس کے مفکرین کا کیا مقام رہا ہے اور فرانس ایک ملک کی حیثیت سے آزادی کی ساری ذہنی اور فلسفیانہ تحریکوں میں کیا کردار ادا کرتا رہا ہے۔ فرانس کی تاریخ، فرانس کا ادب، فرانس سے جاری ہونے والی اور دنیا میں پھیل جانے والی تمام سیاسی اور سماجی تحریکیں، فرانس کے افکار و نظریات ان سب کے پس منظر میں سارتر کے طرزِ عمل کا جائزہ لینے کے بعد یہ مسئلہ بہت صاف ہو جاتا ہے یعنی وہی بات جو صدر ڈیگال نے کہی تھی کہ "میں خود فرانس ہوں اس لئے میں جو کچھ کہہ رہا ہوں ٹھیک ہے۔ مگر سارتر بھی فرانس ہے اور جو کچھ وہ کہہ رہا ہے اسے بھی غلط نہیں قرار دیا جا سکتا۔" مطلب

یہ کہ فرانس کی قومی حیثیت محض سیاسی نہیں ہے۔ بلکہ اس کی اپنی ایک ذہنی حیثیت بھی ہے، فرانسیسی قوم اپنے تاریخی پس منظر میں دو بنیادوں پر تعمیر ہوئی ہے سیاسی اور ذہنی یا فکری۔ اس قوم کی اپنی مخصوص سیاسی اور ذہنی دونوں اقدار کی پوری آمیزش سے فرانس میں وطنیت اور قومیت کی تشکیل ہوتی ہے چنانچہ وہاں ڈیگال سارتر سے یا سارتر ڈیگال سے الگ ہو کر قومی تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ صرف الجیریا کی آزادی منظوری ہوئی بلکہ ڈیگال کی عظمت اور سارتر کی حب الوطنی دونوں برقرار رہیں۔

فرانس کی اس مثال کی روشنی میں اگر ہم پاکستانی قومیت کا تصور کریں تو ہماری اپنی تاریخ پر جو چیز باقی تمام چیزوں پر حاوی رہی ہے وہ ہے ملت۔ ہماری سیاسی حیثیت ملت سے ہٹ کر بے معنی ہو جاتی ہے۔ ملت کا تصور نہ صرف ہمیں ہمارے سیاسی قائدین سے عطا ہوا ہے بلکہ ہمارے دینی عقائد، ہماری سماجی اور معاشی تحریکوں، ہماری عوامی جدوجہد ہر چیز کی اساس ملت کے نظریہ پر رہی ہے۔ سرسید سے اقبال تک قومی سطح پر جب بھی سوچا گیا اس سے ملت کے نظریہ کو ہی تقویت حاصل ہوئی ہے، اس نظریہ کا واضح اور مکمل اعلان اقبال کے اپنے الفاظ میں اس طرح ہوا ہے۔

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں

اس نظریہ کی روشنی میں کیا ادیب اور کیا قاری ہر فرد کی قومی حیثیت جو بھی ہو اس کی افادیت اس وقت تک کچھ نہیں جب تک اس سے ربط ملت کی ضروریات پوری نہ ہوتی ہوں، یہی وجہ تھی کہ ہمارے عظیم ترین ادیبوں اور مفکروں کا سب سے اہم کام یہ رہا ہے کہ وہ عوام میں صحیح قومی شعور پیدا کریں۔ سرسید نے یہی کیا، شبلی نے یہی کیا، قاضی نذر الاسلام نے۔ مولانا ظفر علی خاں نے، حالی نے اکبر نے اقبال نے غرضیکہ ہر عظیم قومی ادیب اور مفکر کی تحریروں اور ادبی تخلیقات کا اصل مقصد قوم میں بیداری پیدا کرنا اور اپنی قومی امنگوں، اپنی روایات، اپنے حال اور اپنے مستقبل سے آشنا کرنا تھا۔ اقبال کے بعد جس ادبی زندگی سے ہم آشنا ہوئے وہ ہماری اپنی سرزمین ہماری اپنی روایات یا تصورات سے کسی قدر دور تھی اُسے مغرب سے لایا گیا تھا اور اس کا تعلق ان ابدی اور مستقل تحریکوں سے برائے نام ہی تھا۔ جنہیں ہمارا قومی ورثہ کہا جا سکتا ہے۔ اس بارے میں حال ہی میں ایک مضمون انگریزی میں عبدالرحمٰن صدیقی کا میری نظر سے گزرا ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے قومی بیداری میں ادیب کی ذمہ داریوں کا تذکرہ کرتے ہوئے مغرب زدہ ادبی تحریکوں کی افادیت اور ضرورت کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ وہ ادیب جن کی ساری کوشش یہ ہوتی ہے کہ قاری پر ہیبت طاری ہو جائے اور وہ ذرا دیر کے لئے چونک اٹھے، قومی زندگی کے لئے بے معنی بلکہ مہلک ہوتے ہیں۔ عبدالرحمٰن صدیقی نے نعرہ بازی یا ادبی دکھاوے کی بڑی مذمت کی ہے۔

ہماری قوم گزشتہ ماہ جس عظیم دور سے گزری ہے اس میں ادیب کو پاکستانی قومیت کا صحیح شعور حاصل ہوا ہے۔ یہ ضروری بھی تھا کیونکہ مغرب سے مستعار جن ادبی تحریکوں اور ذہنی و فکری تجربات سے ہم پچھلے کئی برس سے گزر رہے تھے انہوں نے ہیں یعنی بیشتر ادیبوں کو ملت کے تصور سے بے بہرہ کر دیا تھا، مگر جیسا فرانس میں الجیریا کی جنگ آزادی سے متعلق ہوا ہمارے ہاں بھی وہی کچھ ہوا۔ یعنی ستمبر ۶۵ء نے قوم کے ہر فرد کو مع ادیبوں کے از خود اپنی اصل قومی ضروریات یعنی ربطِ ملت سے آگاہ کر دیا۔ پھر ادیب کے ذہن سے جو شعر، جو فقرہ نکلا اس میں ہماری قومی روایات، ہماری قومی امنگوں کا آہنگ سب سے بلند تھا۔ یکایک ہم اصل حقیقت سے آگاہ ہو گئے۔ اور وہ یہ کہ ہمارے ادیب کی تنہا کوئی حیثیت نہیں، مگر وہ ایک فرد ہے ایک اہم فرد، بشرطیکہ اس کی ذات ربطِ ملت کے لئے کوشاں ہو۔

گردوپیش

تصویر کا ایک رُخ

مشرقی پاکستان اور قومی زبانیں دورِ غلامی کی آخری نشانی "انگریزی" آج بھی آزاد پاکستان کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ بنی ہوئی ہے اور باوجودیکہ اردو اور بنگالی کو قومی زبانیں تسلیم کرلیا گیا ہے اور آئے دن قومی زبانوں کی اہمیت پر تقریریں سننے میں آتی ہیں مگر انگریزی کا راج آج بھی اسی طرح مسلط ہے جس طرح آزادی سے پہلے تھا۔ باتیں اور تقریریں جس زور شور سے کی جاتی ہیں عمل کے وقت اسی قدر بے حسی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ گویا یہ تقریریں انگریزی کو برقرار رکھنے کے لئے ایک مغالطے، پردے اور دھوکے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ چنانچہ ابھی سے دبی زبان میں بعض طبقوں اور انگریزی کے معتقدین کا گروہ یہ کہنے لگا ہے کہ مرکز میں قومی زبانوں کا سرکاری درجہ حاصل کرنا اس لئے دشوار ہے کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کی دو الگ الگ زبانیں ہیں۔ اور ان کو اختیار کرنا ممکن نہیں ہے گویا اس طبقے کو اس دلیل کے پردے میں انگریزی قائم رکھنے کے امکانات روشن نظر آرہے ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جب تک اردو اور بنگلہ دونوں کو قریب تر لانے، اور ترقی دینے کے لئے فوری اور مخلصانہ اقدامات نہیں کئے جائیں گے۔ انگریزی کو قائم رکھنے کی فضا اور بھی سازگار ہوگی۔ اس طرح ہماری قومی زبانیں جائز مقام حاصل کرسکیں گی اور نہ ہم کبھی غلامانہ فکرو ذہنیت سے نجات مل سکے گی۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ قومی یکجہتی کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوگا۔ خیرسگالی، اخوت، محبت اور اخلاص کی تمام خواہشات اور جذبات کے باوجود مشرقی اور مغربی پاکستان ایک دوسرے سے اجنبی رہیں گے۔

تصویر کا دوسرا رُخ

تعزیرات پاکستان کا ترجمہ پارلیمانی سکریٹری برائے قانون و پارلیمانی امور نے ۸ مارچ کو قومی اسمبلی ڈھاکہ میں بتایا کہ تعزیرات پاکستان کا بنگالی اور اردو میں ترجمہ کیا جارہا ہے۔ پارلیمانی

سکریٹری، قومی اسمبلی میں سوالات کے وقفے کے دوران ایک ضمنی سوال کا جواب دے رہے تھے - انہوں نے کہا کہ پانچ مرکزی قوانین کا دونوں زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے جو یہ ہیں الیکٹورل کالج ایکٹ ۱۹۶۲ء، صدر کا انتخابی قانون ۱۹۶۲ء، قومی اور صوبائی اسمبلیوں کا انتخابی قانون ۱۹۶۵ء وکلا کا بار کونسل ایکٹ ۱۹۶۵ء اور سی کسٹم ایکٹ ۱۸۷۸ء - انہوں نے بتایا کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور کا ترجمہ بھی اردو اور بنگالی میں کیا جا چکا ہے -

اردو اخبارات کا مستقبل

صوبائی سکریٹری اطلاعات جناب مسعود الرؤف نے ۲۶ر فروری کو ملتان میں تقریر کرتے ہوئے کہا ہے کہ کچھ عرصہ قبل لوگ انگریزی اخبارات ہی پڑھنا پسند کرتے تھے - لیکن اب ملک میں اردو اخبارات کی مانگ بڑھ رہی ہے اس بنا پر یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اردو اخبارات کا مستقبل روشن ہے - اور آئندہ چند برسوں میں اُن کی اشاعت میں غیر معمولی اضافہ ہو جائے گا - سکریٹری اطلاعات روزنامہ امروز کے نئے پرنٹنگ پریس کا افتتاح کر رہے تھے - انہوں نے یقین دلایا کہ حکومت اردو اخبارات کی ترقی کے لئے ہر ممکن سہولت دے گی -

بنگالی کو رائج کیا جائے

مشرقی پاکستان کے سابق وزیر اعلیٰ جناب عطاء الرحمٰن نے ۲۱ر فروری کو ڈھاکہ کے ایک جلسے میں مطالبہ کیا ہے کہ بنگالی کو فوراً مشرقی پاکستان کی سرکاری زبان قرار دیا جائے اور دفاتر میں بنگالی کو رائج کیا جائے - عطاء الرحمٰن صاحب "یوم شہدا" کے ایک جلسے میں تقریر کر رہے تھے - انہوں نے کہا بنگالی کے لئے بہت سی قیمتی جانیں ضائع ہوئیں لیکن بنگالی زبان کو سرکاری حیثیت دینے کے سلسلے میں ابھی تک کوئی ٹھوس کام نہیں ہوا - جلسے نے ایک قرارداد کے ذریعے بنگالی کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دینے کا بھی مطالبہ کیا ہے -

علمی - تعلیمی - تہذیبی اور ادبی خبریں

زبانوں کی ادبی تاریخ

پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ ادبیات نے اردو، عربی، پشتو، سندھی، ملتانی اور سنسکرت زبانوں پر مشتمل جامع اور مبسوط ادبی تاریخ مرتب کرنے کے لئے ابتدائی خاکہ مرتب کر لیا ہے - اس تاریخ میں یہ بتایا جائے گا کہ برصغیر کے مسلمانوں نے ان زبانوں کی تاریخ ادبیات میں کیا عظیم خدمات انجام دی ہیں - یہ شعبہ بنگالی، بلوچی، پنجابی، کشمیری اور میواتی ادبیات پر پہلے ہی سے کام کر رہا ہے - شعبہ کے نگران نے عوام سے اپیل کی ہے کہ اگر کسی کے پاس بھارتی زبانوں یعنی ہندی، راجستھانی، مرہٹی، تامل، گجراتی، بنارسی اور ملیالم وغیرہ کے بارے میں مواد موجود ہو تو وہ یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ ادبیات سے رابطہ پیدا کرے - یہ تاریخ صرف ادبیات تک ہی محدود نہ ہوگی بلکہ برصغیر کے مسلمانوں کی ثقافتی اور ادبی تاریخ پر بھی روشنی ڈالے گی - اس شعبہ نے ۷۱۲ء سے ۱۹۶۰ء تک کے طویل عہد کی ادبی تاریخ مرتب کرنے کا فیصلہ کیا ہے -

ماسکو میں سعدی اور نظامی

اے ۔پی۔ این اے اے پی پی کی اطلاع کے مطابق ماسکو میں مشرقی فنون کے سرکاری عجائب گھر میں آج کل سعدی اور نظامی کے مسودات کی نمائش کی جارہی ہے ۔سعدی اور نظامی جس طرح ایران اور ہندوستان میں فارسی بولنے والوں کے دلوں کی دھڑکن ہیں اسی طرح روس میں فارسی بولنے والے علاقوں کا بھی تاریخی اور تہذیبی سرمایہ ہیں۔ اس نمائش میں برتن سازی اور زیورات کے قدیم شہ پاروں کی نمائش بھی کی جارہی ہے ۔

کویت میں اردو مشاعرہ

کویت میں پاکستانی خاصی تعداد میں رہتے ہیں اور اس ملک کی تعمیر اور ترقی میں نمایاں حصہ لے رہے ہیں۔ یہاں کی ادبی سرگرمیاں " بزم ادب اردو" کی مرہون منت ہیں۔ یہ بزم اکثر مجالس مذاکرات اور مشاعروں کا اہتمام کرتی ہے ۔جس میں پاکستانیوں کے علاوہ مقامی باشندے بھی شرکت کرتے ہیں۔اسی بزم کے زیر اہتمام ۷ار فروری کو ایک مشاعرہ ہوا جس میں پاکستانی سفیر میر محمد شفیع مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئے اور موصوف نے اپنی اردو تقریر میں بزم ادب اردو کے ان اقدامات کو سراہا ۔ اس کے بعد مشاعرہ شروع ہوا جس میں فضل کریم اختر، امین نجمی ، کلیم نعیمی ، عبدالحمید ہوش ، قمر تابش ، اقبال شرر ، ظفر اعظمی نے اپنا کلام سنایا۔

۲۷۹۶ زبانیں

ممتاز ماہر تعلیم ڈاکٹر محمد شہید اللہ نے ڈھاکہ میں ۷رفروری کو یہ فرمایا کہ اس وقت دنیا میں زبانوں کی کل تعداد ۲۷۹۶ ہے ۔ انہوں نے کولمبیا یونیورسٹی کے پروفیسر ماریو پائی کے ایک بیان کا حوالہ دیتے ہوئے یہ بات کہی ۔ انہوں نے فرمایا کہ بعض لوگوں کا یہ خیال درست نہیں ہے کہ ان زبانوں کی تعداد ۴۲۹۶ ہے ۔

شعبۂ نباتیات سندھ یونیورسٹی

شعبۂ نباتیات سندھ یونیورسٹی کی نئی عمارت مکمل ہو گئی ہے ۔جو صوبے میں ریسرچ اور ترقی کا اہم رول ادا کریگی ۔ اس موقعے پر دو دن سیمنار بھی ہوا جس میں ملک کے ممتاز سائنسدانوں اور ماہرین نباتیات نے شرکت کی ۔

نیویارک میں پاکستانی مصوری

نیویارک میں پاکستانی مصوری کی ایک نمائش کی گئی جس کا اہتمام ایشیا سوسائٹی کی پاکستان کونسل نے کیا تھا ۔ اس نمائش میں پاکستان کے ۱۲ مصوروں کے ۳۰ شہ پارے رکھے گئے تھے ۔جن میں چغتائی ، کبریا ، امین الدین اور احمل جیسے مصور شامل تھے یہ نمائش نیویارک کی بین قومی ثقافتی زندگی میں پاکستانی مصوری کی شمولیت کا سبب بنی ۔جس کا افتتاح امریکہ میں پاکستان کے سفیر سید امجد علی نے کیا۔

ادیبوں اور فنکاروں کی امداد

راولپنڈی میں امدادی فنڈ کی کمیٹی کا اجلاس ۲۲ر فروری کو ہوا ۔جس کی صدارت وزارت تعلیم کے معتمد کر رہے تھے ۔ اس اجلاس میں سال رواں کے لئے ادیبوں اور فنکاروں کے مزید بارہ بے سہارا خاندانوں کے لئے مالی امداد منظور کی گئی ۔ اس فنڈ سے

۱۳ خاندانوں کو پہلے ہی امداد دی جا رہی تھی اس طرح اب یہ تعداد ۳۰ ہوگئی ہے ۔

بچوں کے لئے صدارتی انعامات

مغربی پاکستان کونسل برائے بہبودیٔ اطفال نے بچوں کے سالا مضمون نویسی اور مصوری کے مقابلے کا اعلان کیا ہے ۔ اس مقابہ میں صوبے بھر کے بچے شرکت کرسکتے ہیں ۔ بہترین مصور اور بہترین مضمون نگار بچے کو صدارتی انعامات دیئے جائیں مضمون کا عنوان ہے "کس شخص نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا اور کیسے؟" اس مضمون کی بنیاد بچے کے ذاتی تجر پر ہونی چاہیئے ۔ گیارہ سے سولہ سال تک بچوں کے لئے مصوری کا موضوع "میری پسندیدہ جگہ" ہے اس سے چھوٹ کے بچوں کے لئے تصویروں کا کوئی موضوع مقرر نہیں کیا گیا ہے ۔ ایک اور صدارتی انعام بچوں کی اعلیٰ اور انؑ ذاتی شجاعت پر دیا جائے گا ۔

پرنسٹن یونیورسٹی اور مشرقی زبانیں

پرنسٹن یونیورسٹی اس وقت دنیا کی مقبول ترین یونیورسٹی ہے کیونکہ اس میں مشرق قریب کے مطالعے کے منصوبے کو اس طر ترقی دی ہے کہ اس کا نام تاریخ میں یادگار رہے گا ۔ جب سے یونیورسٹی میں عربی لائنوٹائپ کا اضافہ ہوا ہے اس شہرت میں اور اضافہ ہوگیا ہے ۔ مشرق قریب کی زبانوں کے سیکھنے کے لئے یہ شعبہ مشہور مورخ ڈاکٹر فلپ ہتی کے زیر نگ قائم ہوا تھا ۔ اس شعبے میں جدید عربی، ترکی اور فارسی سکھائی جاتی ہے ۔ اس کے علاوہ یہاں اسلامی قانون ثقافت اور تاریخ پر بہت اہم کام ہوا ہے ۔ جس کی وجہ سے یہ یونیورسٹی مشرق قریب کی زبانوں اور ثقافت کا مر مرکز بن چکی ہے ۔ جس میں دنیا کے بڑے بڑے ماہرین اور ممتاز دانشور تعلیم دیتے ہیں ۔ اس وقت مشرق قریب زبانوں کو سیکھنے والے طالب علموں کی تعداد تین سو کے لگ بھگ ہے ۔ اس کا کتب خانہ اور مخطوطات بھی ا نوعیت کا بہت اہم ذخیرہ خیال کئے جاتے ہیں ۔

یادوں کے چراغ

حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کا عرس

حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کا عرس کراچی میں بڑی شان وشوکت سے منایا گیا ۔ آپ عہد تغلق کے بہت بڑے بزرگ، اہل سلسلہ صو اور مصنف تھے ۔ آپ کی تصانیف کی تعداد ایک سو پانچ بتائی جاتی ہے ۔ آپ اردو کی تاریخ کا ایک اہم باب ہیں کراچی میں آپ کے عرس کے موقعے پر ایک ادبی اجلاس ہوا ۔ جس میں آپ کی ذات عالیہ اور ادبی کارناموں پر مقالے پڑھے گئے ۔ تقریریں ہوئیں ۔ شعراء نے بھی خراج عقیدت پیش کیا اور قوالی کا بھی سلیقہ سے معقول انتظام کیا گیا تھا

یوم حمید نظامی

راولپنڈی اور لاہور میں ۲۲ فروری کو مشہور صحافی اور روزنامہ "نوائے وقت" لاہور کے مدیر جناب حمید نظامی کی برسی منائی گئی ۔ مختلف انجمنوں کے تحت اس موقع پر عام جلسے

اس موقعے پر مرکزی وزرار کی جانب سے پیغامات بھی موصول ہوئے اور بعض خود بھی موجود تھے۔

ماتم میں ہم شریک

فخر ماتری رخصت ہوگئے روزنامہ حریت، لیڈر اور ملت کے مدیر اور گجراتی زبان کے بہت بڑے ادیب جناب فخر ماتری کا انتقال پر ملال ۲۰ مارچ کو اچانک دل کا دورہ پڑجانے کی وجہ سے ہوگیا۔ آپ کے انتقال سے پاکستان کی صحافی اور ادبی فضاؤں میں غم واندوہ کی لہر دوڑ گئی۔ اس سانحے کو پاکستان کے تمام حلقوں میں شدت سے محسوس کیا گیا۔ اور کوئی جگہ ایسی نہیں تھی جہاں ان کی یاد میں تعزیتی جلسے نہ ہوئے ہوں۔ فخر ماتری صاحب کی موت پر پاکستان کی تمام اہم شخصیتوں نے اپنے ذاتی غم کا اظہار کیا۔ صدر مملکت، محترمہ فاطمہ جناح، جنرل اعظم، وزرار، ممبران اسمبلی، سیاسی رہنماؤں، صحافیوں، ادیبوں، سماجی اداروں اور انجمنوں نے ان کی موت کو ایک سانحہ قرار دیا۔

جناب فخر ماتری مشہور بزرگ حضرت شیخ وجیہہ الدین علویؒ گجراتی کے خاندان سے نسبت رکھتے تھے۔ اور ان کا خاندان اس خطہ میں ہمیشہ ممتاز و نمایاں رہا۔ فخر ماتری صاحب کی ساری عمر مسلمانوں کی سیاسی اور معاشرتی خدمات کے لئے وقف رہی۔ انہوں نے مسلم لیگ کی تحریک میں نمایاں حصہ لیا۔ اور گجراتی زبان و ادب کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے چار چاند لگا دیئے۔ خصوصیت سے صحافت میں ان کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں اور گجراتی بولنے والوں میں انہوں نے تحریک پاکستان کو مقبول بنانے میں بڑا کام کیا تھا۔

انجمن کا کتب خانہ عام

انجمن ترقی اردو کے دو کتب خانے ہیں۔ کتب خانہ خاص اور کتب خانہ عام ـــــ اول الذکر کتب خانہ محققین کے لئے ہے اور دوسرا کتب خانہ عوام کیلئے کراچی جیسے بڑے شہر میں عوامی کتب خانے برائے نام ہیں، کتب خانہ عام اس کمی کو کسی حد تک پورا کرتا ہے۔ کتب خانے تک بیٹھ کر مطالعہ کرنے اور کتابیں جاری کرانے والوں کی تعداد خاصی ہے ـــ کتابیں جاری کرانیکی برائے نام فیس (ایک روپیہ ماہوار) لی جاتی ہے۔ اس کتب خانے میں کتابوں اور اخبارات و رسائل کی جلدوں کی مجموعی تعداد بارہ ہزار اڑتالیس ہے۔ ہر ماہ نئی کتابوں کا اضافہ ہوتا رہتا ہے، لیکن انتظامی اخراجات اور جلد سازی وغیرہ کے اخراجات اتنے زیادہ ہیں کہ انجمن کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اس کتب خانے کے لئے زیادہ تعداد میں کتابیں خرید سکے ناشرین سے درخواست ہے کہ وہ کتب خانہ کیلئے اگر اپنی کتابیں بطور عطیہ ارسال کرسکیں تو یہ گراں قدر علمی خدمت ہوگی اسوقت کتب خانے میں جو کتابیں موجود ہیں۔ انکی موضوع وار تعداد ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

موضوع	تعداد	موضوع	تعداد
اسلامیات	۳۸۰	ہندویات	۱۰۹
تفسیر	۸۵	سکھ قوم	۴
حدیث	۳۲	عیسائیت	۷
فقہ	۶۷	ڈرامہ	۳۲۷
سوانح عمری اسلام	۱۴۳	افسانہ	۱۳۲۸
〃 اکابر اسلام	۳۳۸	ناول	۱۴۸۴
تصوف	۶۰	نظم	۱۱۷۷
اوراد و اعمال	۲۵	مضامین و مقالات	۲۹۷
احمدیت	۱۶	ادبی تنقید	۲۶۵

مضمون	تعداد
مکاتیب	۱۴۱
ادبی سوانح	۲۰۷
تاریخ ادب	۷۴
شروحات	۵۶
قواعد	۸۵
لغت	۷۲
مزاحیہ	۱۷۳
لطائف	۳۶
لسانیات	۴۵
سوانح	۳۱۳
تاریخی سوانح	۱۳
سفرنامہ	۱۱۱
فلسفہ	۷۹
اخلاقیات	۱۳۹
نفسیات	۶۳
طب	۱۲۷
عمرانیات	۴۱
تعلیمات	۹۴
تاریخ	۴۴
تاریخ اسلام	۱۳۵
" شام و فلسطین	۷
" انگلستان و آئرلینڈ	۲
" ایران	۵
" افغانستان	۱۲
" اسپین و پرتگال	۱۵
" افریقہ	۶
" امریکہ	۱
" ترکستان	۱۸
" روما	۱۲
" حیدرآباد	۳۰
" ہند	۱۱۳
" یورپ	۹
" یونان	۳
جغرافیہ	۱۴
اطلس	۸
فلکیات	۱۳
نجوم	۱۶
انجینیری	۴۷
حیاتیات	۱۰
حیوانیات	۶۶
نباتیات	۷
زراعت	۳۵
کسان و دیہات	۱۶
ارضیات	۴
سائنس	۱۰۱
سیاسیات	۴۷۴
صنائع (مع دستکاری)	۱۵۱
جنسیات	۵۳
حفظان صحت	۶۳
عکاسی و فلمسازی	۱۱
موسیقی	۱۲
قانون	۳۵
معاشیات	۱۰۱
منطق	۳
درسیات	۲۰۳
رپورٹیں	۳۵
متفرقات	۴۸
ادب نسواں	۲۹۹
" " باورچی خانہ	۲۵
ادب اطفال کہانیاں	۱۱۱۷
" " کھیل	۲۰
" " سوانح	۷۷
" " تاریخ	۶۰
" " جغرافیہ و سفرنامہ	۶۴
" " تعلیمات و نصائح	۱۸
" " نظم	۷۴
اخبار و رسائل	۳۰۶
تاریخ پاکستان	۹
علم کتب داری و فہارس	۵
سالنامہ و جنتری	۴
میزان	۱۲۰۴۸

رفتارِ ادب

اردو میں قانون کی کتابیں

ملک کے ذی علم، ہمدردانِ تعلیم اور بہی خواہانِ اردو عرصہ سے یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ ہمارے ناشروں اور اشاعت گھروں کو ایسی مطبوعات پر زیادہ سے زیادہ توجہ دینی چاہیئے۔ جو مختلف فنون اور علوم کی درسیات اور عام معلومات کے کام آسکیں۔ کیونکہ اعلیٰ مدارج میں اردو کے ذریعہ تعلیم نہ ہونے کا سب سے بڑا سبب یہی بتایا جاتا ہے کہ اردو میں درسی اور غیر درسی جدید علوم و فنون کا سرمایہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ پاکستان میں اشاعتی ادارے نہ ہوں، بلکہ اداروں کی تعداد تو بہت زیادہ ہے مگر وہ سوائے تفریحی تحریروں اور ادبی کتابوں کے، ٹھوس علمی کتابوں کا نام بھی نہیں لینا چاہتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے ادارے زیادہ تر منافع اور حصول زر کا پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ ایسی فضا میں بک کارپوریشن کا نیا اشاعتی پروگرام قابلِ قدر ہے' اس ادارے نے ...... علمی اور فنی کتابوں کی اشاعت پر خصوصیت سے توجہ دی ہے۔ میرے پیشِ نظر اس ادارے کی جو مطبوعات ہیں وہ قانون' معیشت اور زراعت کے موضوعات پر مبنی ہیں اور غالباً اتنی کثیر تعداد میں یہ مطبوعات اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ نظام قریشی صاحب نے اگر اس سلسلہ کو جاری رکھا تو بہت جلد اردو میں ٹھوس علمی اور معیاری درسی کتابوں کا اضافہ ہو جائیگا۔ جس کو دیکھ کر شاید دیگر اداروں کو بھی ترغیب ہو۔ اور اردو پر جدید علوم کے سلسلے میں تہی مایہ ہونے کا الزام مسترد ہو جائے ——— بک کارپوریشن آرام باغ کراچی نے مختلف فنون کے ماہرین کی خدمات حاصل کر کے جن کتابوں کو شائع کیا ہے ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔ اصول قانون۔ قانون امانت اور نصفت ملک کے مشہور صاحب نظر ادیب احمد عبد اللہ المسدوسی صاحب کی تالیفات ہیں۔ جو اردو کالج میں قانون کے استاد بھی ہیں۔ قانونِ معاہدہ۔ قانونِ شراکت۔ قانون دستاویزات قابل بیع و شرئی۔ قانون بیع مال تار [illegible] قدیم قانون۔ کمپنی لاء کلیم الدین انصاری صاحب کی مرتبہ کتب ہیں۔ جو حیدر آباد دکن میں ایڈووکیٹ جنرل رہ چکے ہیں۔ زراعت اور ہماری معیشت پر قمر الحسن صدیقی ریڈر شعبۂ معاشیات کراچی یونیورسٹی کی اہم کتاب ہے۔ گو کہ

ہو۔ بعد میں فصلیں بھی لہلہانے لگیں گی۔ ہمیں امید ہے کہ تمام علمی ادارے اور بہی خواہان اردو ان کتابوں کے اس سلسلے کو پسند کریں گے اور اپنے اپنے کتب خانوں میں ایسی کتابوں کی بھی گنجائش نکالیں گے۔ جن سے اُن کی آئندہ نسلوں کو استفادہ کرنا ہے۔

(ش۔ ا)

زخمِ گل

زخمِ گل سرشار صدیقی کی ایک منظوم تمثیل ہے جسے ہمارا ادارہ، باجرہ آباد۔ کراچی نے شائع کیا ہے۔ منظوم تمثیل اب ہمارے ادب میں کوئی نئی چیز نہیں رہی ہے ــــ متعدد لوگوں نے اس پر طبع آزمائی کی ہے۔ بعض کاوشیں مقبول بھی ہوئی ہیں۔ سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، جمیل الدین عالی اور سیف الدین سیف کی ایسی تخلیقات ادب میں ایک گراں قدر اضافے کا باعث ہوئی ہیں۔ دراصل منظوم تمثیل مثنوی کا نعم البدل ہے۔ جس کو ان شعراء نے ڈرامائی عناصر سے موثر بنانے کی کوشش کی ہے۔ زخمِ گل بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے اور سرشار صدیقی نے اپنے رواں دواں قلم سے گل کاریاں بھی کی ہیں۔ مگر ہمیں یہ توقع بجا طور پر تھی کہ بعض اچھی تمثیلوں کی موجودگی میں وہ "زخمِ گل" میں بعض نئے عناصر ضرور شامل کرینگے۔ لیکن زخمِ گل سے یہ توقع پوری نہیں ہو سکی ہے۔ کیونکہ اس منظوم تمثیل کا موضوع متنوع نہیں ہے۔ ایک شہری نوجوان۔ دیہات کی غریب دوشیزہ کی عصمت سے کھیل کر اسے فراموش کر دیتا ہے اور وہ دوشیزہ مجبور ہو کر طوائف بن جاتی ہے۔ یہ وہ موضوع ہے جس پر سینکڑوں کہانیاں لکھی جا چکی ہیں اور ہزاروں فلمیں آج تک بن چکی ہیں اور بن رہی ہیں۔ اس کہانی کو پراثر بنانے کے لیئے سرشار صدیقی نے کسی بھی نفسیاتی یا انسانی قدر کو اس طرح استعمال نہیں کیا ہے جو معیاری شاعری کا تقاضہ خیال کی جاتی ہے۔ جو معیار ہماری ایسی فلموں کا عموماً ہوتا ہے بالکل وہی معیار زخمِ گل کی خصوصیت بن گیا ہے۔ دراصل یہ منظوم تمثیل بے وقت چھاپی گئی ہے اگر یہ اس زمانے میں شائع ہو جاتی جب ایسی تحریریں بازار کا سکّہ تھیں تو مقبولیت کے لحاظ سے یہ جانی پہچانی تحریر ہوتی۔ پھر بھی سرشار کے صاف ستھرے مصرعے اکثر مقامات پر اُن کی شعری صلاحیت کی داد وصول کرتے ہیں۔

(ش۔ ا)

شعلۂ جاں

اردو شاعری اس وقت سب سے منظوم صنفِ ادب ہے۔ ایک طرف شعراء کا شمار ہزاروں سے بڑھ کر لاکھوں کی طرف بڑھ رہا ہے اور دوسری طرف اہلِ نظر اردو شاعری ہی نہیں بلکہ شاعری کے مستقبل سے مایوس ہوتے جا رہے ہیں۔ شاعری کی اس مظلومیت کا تجزیہ جب تک اہلِ نظر اور اہلِ فن خلوص سے نہیں کرینگے۔ اس صنفِ ادب سے مایوسی بڑھتی جائیگی۔ شعراء کو خود بھی اپنا احتساب ایمانداری اور سچائی سے کرنا ہوگا۔

اس زمانے میں شعلۂ جاں کی اشاعت درد سعیدی کے لیئے کوئی خوشگوار واقعہ یقیناً نہیں بن سکتی۔ کیونکہ درد سعیدی کا شمار پہلے ہی سے ان مظلوم شعراء میں ہوتا ہے جنکو بیسوی صدی کے تضاد نظر اور تضاد احساس نے زندگی بھر تخلیقی طمانیت حاصل نہیں ہونے دی ہے۔ درد سعیدی قدیم اسکول کی شاعری سے متعلق ہو کر بھی روایتی شاعری کبھی نہیں کرسکے۔ اور اُن کا مجموعۂ کلام اس وقت شائع ہوا جب جدید شاعری صرف "محض تجربہ" ہو کر رہ گئی ہے۔ ان دو انتہاؤں میں وہ تنہا کھڑے ہیں۔ اور اُن کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ وہ اپنی نشست کا تعیّن کس طرح اور کہاں کریں۔ پرانے مدرسۂ فکر کے لیئے وہ نئے تھے اور نئے دور کے لیئے وہ پرانے ہیں یہی ان کا المیہ ہے شعلۂ جاں اسی تضاد کا اظہار ہے جس نے کچھ اور کیا ہو یا نہ کیا ہو مگر درد سعیدی کی شاعری میں "اعتبار احساس" پیدا کیا ہے۔ جو ان کی شاعری کا وہ وصف ہے جس سے "مظلوم اردو شاعری" کا یہ دور تہی ہوتا جا رہا ہے۔ شعلۂ جاں میں غزلیات بھی ہیں رباعیات بھی۔ منظومات بھی ہیں قطعات بھی اور ان سب میں شاعر کا خلوص .... چھلکتا نظر آتا ہے۔ میں ان کے پیش لفظ کو یہاں نقل کرکے اجازت چاہوں گا۔

کیا کہوں اے ہم نفس، دنیا کی حالت کیا کہوں
دوستوں کی دشمنی، اپنی محبت کیا کہوں
چند آہیں۔ چند آنسو، ذلّت و افلاس کے
جذبۂ انسانیت کی قدر و قیمت کیا کہوں
جیسے میں مجرم ہوں میں نے ہی کیا ہے جرم یہ
دوسروں کے جرم پر اپنی ندامت کیا کہوں
اہل عالم کا "جنونِ سنگ باری" کچھ نہ پوچھ
اور اپنے شیشۂ دل کی نزاکت کیا کہوں

رشن - ا م

مولوی احمد دین مرحوم

ادبی نوادر

راز و نیاز

اس شمارے سے ایک نیا سلسلۂ مضامین شروع کیا جا رہا ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ ایسے ادبی و علمی مضامین کو منظرِ عام پر لایا جائے جو صد درجہ مفید ہونے کے باوجود گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں۔ ایسے مضامین پرانے رسالوں اور خاص طور پر علمی اداروں کی روداد وں میں "دفن" ہیں جن تک عام پڑھنے والوں کی رسائی نہیں ہے اس سلسلے کا پہلا مضمون مولوی احمد دین کا ہے یہ وہی احمد دین ہیں جن کی کتاب "سرگزشت الفاظ" علمی و ادبی حلقوں میں خاصی شہرت رکھتی ہے مولوی صاحب نے ایک درجن سے زائد کتابیں اور بہت سے مضامین لکھے۔ وہ اقبال کے قدیم ترین اور گہرے دوستوں میں سے تھے اقبال پر سب سے پہلے تنقیدی کتاب بھی ان ہی کے قلم سے ہے۔ زیرِ نظر مضمون "راز و نیاز" انہوں نے انجمن حمایت الاسلام لاہور کے سالانہ اجلاس بابت سنہ ۱۹۰۱ء میں پڑھا تھا، جو بعد میں اس اجلاس کی روداد میں شریک کیا گیا۔ ادھر دہلی سے یہ مضمون "قومی زبان" میں نقل کیا جا رہا ہے مولوی صاحب محمد حسین آزاد کے شاگرد تھے، انہوں نے اپنے استاد کے اسلوب کو اپنانے کی جو کوشش کی ہے۔ اس کا اندازہ زیرِ نظر مضمون سے ہو سکتا ہے۔

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی — اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے
آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلحِ کل — ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے
صادق ہوں اپنے قول میں غالبؔ خدا گواہ — کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

زمانہ کا مسلمانوں کی تابع فرمان ہونا اس کی بے وفائی۔ ان کا ادبار سرسید کی قومی خدمت اور قوم کی ایک جماعت کے ہاتھوں سرسید کی گت جو بنی کون نہیں جانتا اور یہ بھی آپ خوب جانتے ہیں کہ سرسید اور اس کے مخالفین کے باہمی تنازعات کی سینہ زوریوں اور سر شوریوں نے چند دردمندان قوم کو بیس سال کے قریب گزرے ہیں اسی شہر لاہور میں خواب غفلت سے جگایا۔ انکی دوربین نگاہ نے فریقین کے بیچ حمایت اسلام کی ایک راہ نکالی جو سیدھی منزل مقصود پر پہنچاتی نظر آئی اور وہ اسی راہ پر راستے سے بھٹکی ہوئی قوم کو لے جانے پر کمربستہ ہوگئے۔ راہ تھی وہی جو اسلامیوں کے ہادی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے پیچھے پیرووں کے لئے دین و دنیا کی پگڈنڈیوں کو ملا کر قائم کی تھی لیکن بدقسمتی سے مسلمانوں کی بھولی بھالی قوم کو اس راہ سے بھی روکنے اور دور لیجانے والے دوست کے لباس میں پیدا ہو گئے ہیں۔ اور جو اس راہ کے زمین و آسمان تک کو بھی برا بھلا کہتے ہیں۔ حمایت اسلام کو اپنے کام سے کام ہے۔ اور کسی کے کہنے سننے کی کچھ

پرواہ کی نہیں مگر ڈر ہے تو اس امر کا خوش اعتقاد مسلمان کہیں ایسا نہ ہو کہ ان لوگوں کی شرع کی آڑ میں بیٹھ کر غفلت کی نیند سو جائیں اور قرآن کریم کے راستے سے الگ منزل مقصود سے کوسوں دور پڑے رہیں۔ میرا روئے سخن ان مدعیان مولویت کی طرف ہے۔ عالمان دین کی طرف نہیں کیونکہ ان کا علم و فضل نہیں ایسے بڑے گناہ کے مرتکب ہونے کی اجازت نہیں دے سکتا اور نہ دیتا ہے۔ مدعیان مولویت کی طرف جو مسلمانوں کو معاش کے حاصل کرنیکی سعیوں سے جھوٹے سچے فتوے دیکر روکنے کی جا بجا کوشش کر رہے ہیں۔ اور دنیا اور دنیا والوں پر بے بنیاد الزامات لگاکر دنیاوی وجاہت کو کوستے رہیں۔ اور اسلام کی بے رونقی کا گناہ اپنی گردن پر لئے جا رہے ہیں سمجھ نہیں سماتے اس گناہ کی اعانت میں بلاشبہ وہ لوگ بھی شامل ہیں جو نئی تعلیم کی روشنی پاکر دین کے شاندار گھنے سایہ والے درختوں کو چمن دنیا میں بے جا اور بے مطلب تصور کر کے انکی شان میں جو کچھ زبان پر آتا ہے کہہ دیتے ہیں۔

اسی سارے قصے کو میں نے آج آپکی مشہور عاشق مزاجی کی رعایت سے آپکے سامنے ایک نئے پیرایہ میں بیان کرنیکی کوشش کی ہے۔ آپ کو معشوق سمجھا ہے۔ اور انجمن حمایت اسلام کو آپ کا عاشق اور آپکے ان دوست نما دشمنوں کو رقیب ٹھہرا کر قوم کی مشکلات کا دکھڑا رو دیا ہے۔ میرا منشا سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ انجمن حمایت اسلام کے اعلیٰ اصولوں کی طرف انجمن کی زبان سے آپکی توجہ دلاؤں اور اس کی کوششوں کے کامیاب کرنے میں اسی کی زبانی آپ کی ہمت و سعی کی درخواست کروں۔

ہم بھی دیکھیں تو کہاں تک نہ توجہ ہوگی   کوئی دن تذکرۂ اہل وفا ہونے دو

رازونیاز

معرکہ ہے آج حسن و عشق کا   دیکھیے وہ کیا کریں ہم کیا کریں

آج مجھے آپ سے کچھ رازونیاز کی باتیں کرنی ہیں۔ کچھ شکوے ہونگے کچھ شکایتیں۔ کچھ آپکے دلدادے کی جان نثاریوں کے قصے ہونگے۔ کچھ اس کی تکالیف کی کہانیاں ان سب پراس کی وفا۔ آپکی بے اعتنائی۔ اس کا دم خیر خواہی اور آپکی تلون مزاجی حرف بحرف مجھے آپکی گوش گذار کرنی ہیں آپ خوش ہیں یا ناخوش۔

مجھ میں وہ تاب ضبط شکایت کہاں ہے اب
چھیڑو نہ تم کہ میرے بھی منہ میں زباں ہے اب
وہ دن گئے کہ حوصلۂ ضبط راز تھا
چہرے سے اپنے شورش پنہاں عیاں ہے اب

مانا اس کی زندگی بری یا بھلی۔ سب کچھ آپکی طفیل ہے۔ اس کی خوشیاں اس کے رنج۔ اس کی خواہشیں اس کی حسرتیں۔ اس کی مایوسیاں اس کی امیدیں اس کے ارمان اس کی مرادیں آپ سے وابستہ ہیں یہ مرے یا جئے۔ آپکے ہاتھ میں ہے لیکن یہ تو کسی مذہب میں بھی روا نہیں کہ جان نثار فراق کے تیر کھائیں داغ تمنا کے پھول چنیں۔ رشک غیر کی آگ میں جلیں اور پھر آپکی نظر ہو تو ترچھی۔ نگاہ ہو تو روکھی پھوکی۔ دل ہی تو ہے سنگ و خشت نہ نازک یہ چوٹیں اس سے کیسے اٹھ سکتی ہیں اور اگر اٹھ بھی سکیں تو کب تک۔ میں نے تو اب کچھ اور ہی ٹھانی ہے۔

بفضلہٖ آج کئے لیتے ہیں جو کچھ ہو جائے — نہ سہی ان سے خوشی رنج تو ہو جائے گا۔

ہاں۔ ہاں یہ آپ کا دلدادہ ناشکر گذار نہیں۔ آپ نے جو جو عنایتیں اس کے حال پر اب تک کی ہیں۔ جو جو قدردانیاں آپکی الفت کی راہوں میں اس کی دوڑ دھوپ کی ہوئی ہیں یہ بھول جائے۔ ممکن نہیں۔ وہ عنایتیں اور قدردانیاں اس کی جان ہیں اور انکی یاد اس کی روح رواں۔

ان کا شکریہ یہ ہمیشہ سے فرض عین سمجھتا رہا ہے اور اس فرض کے زبان سے ادا کرنے میں یہ قاصر رہا ہو تو رہا ہو لیکن طریق عمل سے تو یقیناً اور اس سے آپ بھی انکار نہیں کر سکتے۔ احسانمندی اور منت پذیری کا اظہار اس کے روشن روشن سے ہو رہا ہے۔ آپکی ایک ایک نگاہ کرم اسے آپکی ہوا خواہی میں روز بروز سرگرم کرتی ہے اور آپکے دست کرم کا ایک دفعہ بڑھنا ہی اُسے آپکی محبت کے رستے میں کشاں کشاں لئے جاتا ہے۔

مگر آپ کا بھولاپن۔ آپکی سادہ مزاجی عاشق کی وبال جان ہو رہے ہیں۔ وہ آپ پر مرے اور آپ بے خبر۔ وہ طریق وفا میں رقابت کے خار سے الجھتا ہی کرتا۔ پاؤں میں روند اچلا جائے اور آپ ابر کرم کی طرح اپنے زیر سایہ پھول کانٹے یکساں سمجھ لئے پھیلے رہیں۔ بھولاپن ہے کہ دوست دشمن میں تمیز کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ سادہ مزاجی ہے کہ ہر کس و ناکس منہ لگے چلا ہے۔ جو کوئی آتے مجلس میں عزت کی جگہ پاتا ہے۔ جس کسی نے چاہا آپکو گرویدہ کرلیا اور صرف یہاں تک ہی نہیں بلکہ سچے ہوا خواہوں کی طرف وہ توجہ ہی نہیں جو انکی جان نثاری اور آپکی ہمت کی شایاں ہے جو انکی نیک نامی اور آپ کی رونق و عزت کیلئے ضروری ہو رہی ہے۔

شکایتوں کا ایک دفتر ہے جو آپکے سامنے کبھی نہ کھلتا یہ کہانی شاید آپکو سنانے کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ پر

جانتے ہو بات ہر غماز کی آیت حدیث — جھوٹ پر ایمان لانا کوئی تم سے سیکھ جائے

آپ کو معاف کیجئے گا۔ وہ دن بھی تو یاد ہونگے کہ آپ حریفوں کے ہاتھوں بے کسی اور کسمپرسی کے جنجال میں پھنسے ہوئے تھے نرالی ادائیں اور نئی نئی چالیں یار لوگ سیکھ کر زمانہ کو اپنا اور صرف اپنا غلام بنائے ہوئے تھے۔ زمانہ کی ساری ہمت۔ ساری کوششیں۔ ساری کمائی اور سارا اندوختہ حریفوں کے کام آرہا تھا۔ آپکے محاسن۔ آپکی خوبیاں جیسی کہ تھیں زمانہ کی خدمات سے فائدہ اٹھانے میں ناکامیوں کا منہ دیکھتی تھیں۔ سچ تو یہ ہے کہ زمانہ کی وہ پہلی آنکھیں ہی نہ رہی تھیں۔ اس کا مزاج ہی بدل گیا تھا نئی نئی ادائیں۔ نئی نئی وضعیں اس کے مرغوب خاطر تھیں۔ اور پرانا وضع پرانا طریق۔ پرانی رسمیں اس کی نظروں سے گر گئی تھیں۔

اسے ہاں اسی زمانے کو آپنے طرح طرح کے حقوق جتائے۔ قسم قسم کے دعوے اس کے پیش کئے۔ پرانے تعلقات دیرینہ راہ و رسم کی طرف اس کی توجہ دلائی۔ مگر اس نے تو ایسی آنکھیں بدلیں کہ کبھی آشنا ہی نہ تھا۔

اسے ہر چند یاد دلایا گیا کہ ابھی کچھ بڑا عرصہ نہیں گذرا کہ وہ یہی زمانہ آپ کا حلقہ بگوش تھا آپ ہی اس کی آنکھوں کے تارے تھے اور اس کے دل کے پیارے۔ اس کو آپ ہی کا سہارا تھا اور اگر وہ کسی کا بندہ تھا تو آپ کا اور اگر اسے کسی کی خوشنودی منظور تھی تو آپکی۔

اسے یہ بھی جتایا گیا کہ آپ ہی نے اسے جہالت اور بے دینی کی گھٹاؤں میں سے اپنے حسن عالمتاب کی چمک دکھا کر عقل و ایمان کے رستے پر لائے تھے آپ ہی نے اسے مجوسیت کی ہمیشہ جلنے والی آگ کے شعلوں سے نکال کر فردوس بریں کے جلوے دکھلائے اور آپ ہی اسے تثلیث کی [illegible] وحدانیت کے بلند مینار پر کھڑے کر گئے۔ آپ کی دماغ سوزی سے اس کو فروغ اور آپ ہی کی عرق ریزی سے اسے سرسبزی۔ شادابی اور خرمی حاصل

ہوئی تھی آپکے دستِ کرم اور نگاہ لطف نے اسے مالامال کر دیا تھا۔ آپ ہی کی گلزار محبت کی ہواؤں نے نہال آپ ہی نے اس کے دل بہلانے کے سامان بہم پہنچائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور آپ ہی نے اسے عیش و عشرت کے انداز بتاتے۔ آپ اس کی ڈوبتی کشتی کے ناخدا بنے اور ازمنہ متوسطہ کے بحر ظلمات کی موجوں کے تھپیڑوں میں سے اسے تمدن کے آب حیات کی لہریں دکھاتے صحیح سلامت نکال لے آئے۔ علم و حکمت کے موتی قعر دریا سے اس کے لئے آپنے نکلوائے اور آپ ہی نے اسے آسمان سے آنکھیں ملانے کے ڈھنگ سکھاتے۔ آپ ہی تے الحمرا کے غازہ سے اسکی سرخروئی کی اور الزہرا سے اس کی آبرو بڑھائی۔ آپکے تاج سے ممتاز ہو کر وہ آج تک سرفرازیاں کر رہا ہے۔ اور آپ کی لاٹھ کے سبب قطب کے نام سے ابھی تک مرجع خلائق بنا ہوا۔ آپ ہی نے اس کی قدر و منزلت بڑھانے میں مدد دی اور آپ ہی نے اس قدر و منزلت کی وسعت میں دل و جان سے کوشش کی۔

پر اس نے نہ ماننا تھا اور نہ مانا

اسے یہ بھی سمجھایا اور یاد دلایا گیا کہ آپکی مہربانیوں کی شکر گزاری میں اس کی وفائیں زبان زد خاص و عام تھیں اور اس کی احسان مندی آپ کے باغ حسن کی سرسبزی کی کوششوں میں قدم قدم پر نظر آ رہی تھیں۔ آپ کے چمنوں کی رونق کے لئے شادابی کے سامان مہیا کرنے میں وہ رات دن سرگرم رہتا تھا۔ اور آپ کے میووں کی پختگی اور شیرینی کے پیدا کرنے کی فکر میں پہاڑ کاٹ کر اور میدان چیر کر چاند سورج کو وقت پر آپ کے در دولت پر کھینچ لاتا تھا۔ آپکے باغ کی چھوٹی چھوٹی کیاریاں اس کا دل لبھانے میں شہرہ آفاق تھیں اور بے مثال روشیں اسے اپنا بنانے میں طاق۔ آپکی دلجوئی آپکے ہاں کے اطفال نبات کو دایہ بہار کی گود میں دیتے ہوتے تھا۔ اور جوانان چمن کی راہ میں جا بجا حوض کی آنکھیں بچھائے ہوئے اس کی احتیاط آپکے پودوں کو گرم ہوا سے محفوظ رکھنے کی غرض سے انکے لئے شیشے کی گھر بناتی تھی اور اس کی محنت نا آشنا زمینوں میں بھی انکی تربیت کے وسائل اور راستے خوش اسلوبی سے نکالتی تھی ایک دن وہ تھا کہ کہیں لو چلی تو آپکے باغ کی اٹھتی کونپلوں کے چرمر ہو جانے کے کھٹکے سے اس کی جان گئی اور کبھی برف جمی تو وہاں کی نازک ٹہنیوں کے ٹھٹھر جانے کے اندیشے سے اس کی پریشانی بڑھی۔ اس باغ کا سبزہ بیگانہ تک بھی اس کی یگانگت کی ہوا میں لہلہاتا تھا اور شبنم کے رونے پر اس کا دل افسردہ ہو جاتا تھا۔

اسے یہ بھی یاد دلایا گیا کہ آپ کے کسی وقت کی ترش روئی بھی وہ قند سمجھتا تھا۔ آپکی زلفوں کے پیچ اس کے دل کو پھنسانے ہوئے تھے۔ اور آپ کی پلکوں کی سوئیاں اس کے جگر میں کھبی ہوئی۔ خم دار ابرو میں وہ ہلال عید دیکھتا تھا۔ اور کشادہ پیشانی کے بدر میں جشن مہتابی کی برات اور اسی وجہ سے اسے حبا پایا گیا۔ ایک دن وہ تھا۔ کہ آپکی وقعت و باعث امتیاز سمجھتا تھا اور آپ کے گھوڑوں کے قدموں کی مٹی سر پر اٹھا کر اس نے مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق ایک کر دکھایا تھا۔ آپکے ادنیٰ غلاموں کو اسی نے عروج کے تخت پر بٹھا کر شہنشاہان روم و چین کو انکا حلقہ بگوش بنا دیا تھا اور آپکے خانہ زادوں کو طبل و نشان دے کر اس نے چار دانگ دنیا میں آپ ہی کا ڈنکا بجایا تھا۔

آپ کے محاسن اس کی زبان پر اور آپ کی خوبیاں اس کے دل میں دور و نزدیک اسے آپکا بندہ بنائے ہوئے تھیں اسکی ہمتیں اسکی کوششیں رات دن آپ کے آرام اور آپکی خوشی و خرمی کے بڑھانے میں لگی ہوئیں۔ دنیا کی کل نعمتیں آپ کیلئے چین و ماچین سے لیکر اندلس کے اس کنارے تک کھچی آ رہی تھیں۔ زر و سیم۔ عزت و جاہ۔ مال و منال۔ اس کی خدمت و محنت سے آپکے پاؤں میں ہر وقت پڑے رہتے تھے۔ نہیں نہیں۔ بلکہ آپکے غلاموں کے قدموں میں دھرے ہوتے۔

اسے آپ نے یہ سب باتیں یاد دلائیں۔ مگر اس نے ایک ایسا پہلو بدلا ہوا تھا کہ خواب و خیال کی سی باتیں اسے کیا یاد آتی تھیں اور سچ پوچھو تو اسے اس سر دردی کی ضرورت بھی کیا تھی نہ یاد آنی تھیں اور نہ آئیں۔

زمانہ کا اور آپ کا وہ پرانا رابطہ اب کہاں۔ ان پرانی خاطر داریوں کا تو کیا ذکر ہے بے وفا زمانہ اب اس قدر طوطا چشم ہو گیا تھا۔ کہ آپکی رسوائیوں میں وہ خوش ہوتا تھا اور آپکی ذلتوں میں وہ آپ کا فخر سمجھتا تھا۔ اس بے دید کم بخت نے روئے زمین میں اس کی اپنی تو تھی ہی اس کے ایک کنارے سے لے کر دوسرے کنارے تک۔ دنیا بھر کے پانی بھرنے۔ بوجھ اٹھانے۔ اور مٹی کھودنے کی خدمت آپ کو دے رکھی تھی۔ دست بستہ پیچھے چلنے اور کمر بستہ ساتھ ساتھ دوڑنے کا اعزاز بھی آپکو بخشا ہوا تھا۔ وہ اگلی سی باتیں تو کہیں رہیں۔ اب تو اس کی جلسوں میں آپکو بار تک نہ ملتا تھا۔ اور اگر کہیں خوش نصیبی سے کسی۔ ذلیل خدمت کے لئے کچھ داخل ہوا بھی تو اس سے زیادہ نہیں کہ جوتوں کے پاس بیٹھنا تو کہا ذرا سی دیر کے لئے ٹھہرنے کی اجازت مل گئی اور اس پر بھی تاکید ہے کہ سر پر دو کوڑی کی ٹوپی تک نہ ہو گلے میں کرتا سوء ادبی ہوگی۔ اور ستر ڈھانکنے کے لئے بھی جہاں تک ہو سکے کپڑا اپنے ناپاک بدن سے لگا کر ہمیشہ کے لئے نجس و ناپاک نہ کر دینا ہوگا۔ جہاں گئے دور دور۔ جس کے پاس کھڑے ہوئے پھٹ پھٹ۔ جہاں یار لوگوں کی خاطر دودھ دہی لڈو، پیڑا کھلانے کو تیار رہتا تھا۔ آپکی ضیافت کے واسطے اگر آپ کی خوش طالعی سے ادھر توجہ کرنے کی کبھی فرصت ہو گئی تو سوکھی روٹی بھی نصیبوں میں کہاں۔ کھلانے کو غم و غصہ۔ پینے کو [illegible] غذا بھی تھی تھی۔ اور [illegible] پیٹ بھر تو نہیں۔ شکایت کا حرف [illegible] نہ آنے [illegible] تک نہ ہو۔

اس کا نتیجہ جو کچھ ہونا تھا اور جو کچھ ہوا۔ آپ [illegible] کیسے بھول سکتے ہیں۔ شومی بخت کی کالی گھٹائیں گھر گئیں۔ بادل کڑکتا ہے تو کہیں بجلی چمکتی ہے تو اسی طرف اور گرتی ہے تو اسی جگہ۔ لیکن باران رحمت کی ایک بوند تک نہیں پڑتی۔ آپ کا وہ لہلہاتا باغ سرسبز اجڑا ہوا۔ نوجوانان چمن شکستہ کمر اور سرنگوں۔ پودے افسردہ و پژمردہ۔ برگ و بار کا نام تک نہیں۔ پھل پھول کا کہیں پتہ نہیں۔ خار دار جھاڑیاں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے جانور عنقا۔ البتہ قمری گیرو الباس پہنے باغ کے سوگ میں جوگن بنی ہوئی کبھی کبھی نظر آجاتی ہے اور بلبل زار اسی غم میں کانٹا ہو کر اپنے دلخراش نالوں سے دم بدم بے چین کئے دیتی ہے۔

آپ کی وہ بھولی بھالی صورت ڈراؤنی بن گئی۔ ارغوانی چہرہ سے رونق کافور ہو گئی وہ پیاری پیاری سیدھی سادھی ادائیں ٹیڑھی نظر آنے لگیں بے سروسامانی کا دور دورہ ہو گیا۔ اپنے پرائے دوست دشمن بن گئے۔ نوکر آقا بنے ہوئے گھر کئے ہیں۔ اور غلام مسند پر بیٹھے دھتکارتے ہیں۔ مایوسیاں چاروں طرف سے دبائے ہوئے ناکامیاں ہیں کہ سر نہیں اٹھانے دیتیں۔

یہ وہ حالت ہے کہ ہنستوں کو رلا دیتی ہے
جو ہنسانے مجھے آئے گا وہ رو جائے گا

زمانہ کی اس بے وفائی نے آپ کی اداؤں میں ناموزونیت آپ چال میں ناہمواری اور آپکے انداز میں بھدا پن پیدا کر دیئے تھے پھر کیا تھا جو چال آپ چلے کجروی کی جو راہ آپ نے اختیار کی گمراہی کی۔ آپکی کچھ ادائیں وبال جان ہونے لگیں۔ اور آپ کے انداز خطرۂ ایمان۔ احسان فراموش زمانہ کا بدل جانا ہی کیا کم تھا کہ آپ نے بربادی کے اسباب خود بخود پیدا کر کے اپنے آپ کو حریفوں کا مضحکہ بنایا۔ اپنی ہنسی اڑوائی

بس تو پھر آپ ہی جانتے ہیں۔ آپ کے شیدائی الگ ہو گئے اور مرنے والے بے اعتنائیاں دکھلانے لگے۔ کسادبازاری نے یہاں تک رونق پائی کہ کوئی پوچھتا تک نہ تھا۔ کہ کون ہے۔

آپ کی ان رسوائیوں اور ذلتوں کے درمیان آپکے باغ کے مالی کی وہی مالی جس نے تیرہ سو سال ہوئے کہ قسم قسم کے پھل بوٹے دور دور سے لاکے کیسے کیسے خوب صورت چمنوں میں سجا دیئے تھے۔ یادگار ایک بڈھے جوان مرد نے آپ کی اس حالت کو دیکھا۔ اپنے کانٹے ہاتھ کے لگائے ہوئے پودوں کو سوکھ کر کانٹا ہوتے دیکھ کر ایک آگ سی اس کے دل میں لگ گئی اور اس نے کوشش کی کہ وہی آگ کچھ اور دلوں میں بھی جہاں کہیں ہوں لگا کر ایک تماشا دیکھے اور دکھلائے کہ آگ سے گلزار کیسے کھلتی ہے

جلا سکتی ہے شمع کشتہ کو موج نفس ان کی
الٰہی کیا چھپا ہوتا ہے اہل دل کے سینوں میں

بڈھے کی اس آگ سے ایک بھبھوکا اٹھا اور اٹھتے ہی چاروں طرف سے اس پر پانی ڈالنے کی کوشش کی گئی لیکن ان دنوں ہوا بھی کچھ ایسی چل رہی تھی کہ اس آگ کی چنگاریاں ادھر ادھر پھیل گئیں اور اس سے باغ میں عجب ہلچل سی مچ گئی ایک طرف تو وہ چنگاریاں ایسی خشک ٹہنیوں اور پتوں میں جا پڑیں کہ یک لخت آگ بھڑک اٹھی اور اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جو کچھ سامنے آیا بڈھے کی خواہشوں کے برخلاف جلا کر راکھ کر ڈالا۔ دوسری طرف آگ بجھانے والوں نے بے سمجھے بوجھے اس قدر پانی ڈالا کہ آگ تو بجھ گئی۔ مگر پانی پودوں اور بڑے بڑے درختوں کو بھی بہا کر لے گیا۔ درخت اگرچہ باغ کی چار دیواری کے اندر ہی رہے مگر دیکھا تو بے سروسامانی کی حالت میں پڑے ہاتھ پاؤں پھیلائے ہوئے چھوٹے پودوں اور گھاس کو پھولنے اور پھلنے اور سر اٹھانے سے روک رہے ہیں اور باغ کی پرورش کرنے والے مینہوں کے سدراہ بنے بیٹھے ہیں۔

باغ کی دیوار پر ایک بلبل جو اسی باغ کی ہوا خواہ تھی اور یہیں کی تربیت یافتہ باغ کے اس ویرانے پر آنسو بہا رہی تھی۔ اور اپنے نالوں سے دلوں کو ہلا رہی تھی۔ زار زار روتی تھی اور کہتی تھی۔

قدیم وضع پہ قائم رہوں اگر اکبر	تو صاف کہتے ہیں سید یہ رنگ ہے میلا
جدید طرز اگر اختیار کرتا ہوں	خود اپنی قوم مچاتی ہے شور و واویلا
جو اعتدال کی کہیے تو وہ ادھر نہ ادھر	زیادہ حد سے لیے سب نے پاؤں ہیں پھیلا
ادھر یہ ضد ہے کہ لمنڈ بھی چھو نہیں سکتے	ادھر یہ دھن ہے کہ ساقی صراحی مے لا
ادھر ہے دفتر تدبیر و مصلحت ناپاک	ادھر ہے وحی ولایت کی ڈاک کا تھیلا

غرض دوگونہ عذابست جان مجنوں را
بلائے صحبت لیلیٰ و فرقت لیلیٰ

ہوا خواہان چمن کے ان نالوں نے مجھے بھی جگایا اور ابھی آنکھیں کھولی ہی تھیں کہ بلبل کے نالوں کے ساتھ ہی اسی آگ کی ایک چنگاری میرے دل میں بھی اپنا کام کر گئی مجھے کھانا پینا بھول گیا۔ تمام کام چھوڑ آگ سے گلزار کھلی ہوئی دیکھنے کی دھن میں معمار کعبہ کے قدموں پر دل ہی دل میں بتکدہ میں کعبہ بناتا ہوا جھولی گلے میں ڈالے نئے نئے سوانگ بنتا۔ کاسہ گدائی ہاتھ میں لئے۔ فقیروں کی صدائیں دیتا۔

بنا دے کوئی مسجد بتکدے میں　　　　کہ ڈھیرا فیض ہو دو ہرے مکان سے

دربدر پھر نکلا۔ آپ کے سودا میں دوستوں کا ساتھ چھوڑا۔ دشمنوں کو دشمنی دکھانے کے موقعے ملے۔ یار لوگوں نے میری اس دھن کے کرشمے دیکھ کر میری سودائی مشہور کیا۔ بد خواہوں نے خیال خام کے پیچھے پڑا ہوا کہا۔ سمجھایا بجھایا۔ ڈرایا بھی لیکن جب کچھ فائدہ نہ دیکھا الگ ہو گئے اور میری ناکامیوں پر۔ ناکامیاں جو ان کے خیال میں میرے نصیبوں میں لکھی تھیں۔ قہقہے اڑانے لگے۔ آپکی بے اعتنائی پر مجھے چھیڑتے تھے۔ ستاتے تھے ہمدردی بھی کرتے تھے اور میری حالت زار دیکھ کر روتے بھی تھے اور رلاتے بھی تھے۔ دشمنوں کو آپ کی توجہ میرے حال پر جو کبھی خوش طالعی سے تھوڑی بہت ہو جاتی تھی۔ گوارا ہونی محال تھی رکاوٹیں ڈالتے تھے مجھے ذلیل و خوار کرنے کی تدبیریں کرتے تھے۔ جھوٹی تہمتیں لگا کر میری رسوائی کے　　درپے ہو جاتے تھے اور جہاں تک ہو سکتا تھا رسوا کرنے کرانے کو تیار رہتے تھے۔

ان سب باتوں سے میری آگ بجھنے والی تھوڑی تھی اور بھڑکی۔ میری ایک ایک گھڑی آپ کی فکر میں گذرنے لگی بڑی بڑی مشکلوں کا سامنا ہوا مصیبتیں جھیلیں۔ دقتیں اٹھائیں۔ ذلتیں ہوئیں۔ رسوائیاں ہوئیں۔ میں نے ٹھنا ٹھانا تھا۔ باغ کی خس و خاشاک سنبھالے اور باغ کو آگ اور پانی کی بلاؤں سے محفوظ کرنے کی غرض سے اس میں دوہرے مکان کی بنیاد معمار کعبہ کی آشنائی کے پرانے طریق پر آجکل کی آشنائی کے طریق پر نہیں۔ توکل بخدا رکھدی۔ میں یہ بھی دیکھتا تھا کہ آپ کبھی بت خانے میں بتوں کے قدم چوم رہے ہیں۔ اور کبھی مسجد کے گوشۂ اعتکاف میں سربسجود پڑے ہیں۔ ادھر گئے تو ادھر کی ہوش نہیں اور ادھر بیٹھے تو ادھر کی پرواہ تک نہیں۔ دراصل نہ الی الذی نہ الی الذی نہ ادھر کے نہ ادھر کے صداقت نہ یہاں نہ وہاں۔ توجہ دونوں طرف بٹی ہوئی اور دل دونوں جگہ پریشان آپ کی اس پراگندہ دلی کو دور کرنے کے لئے میری محبت نے اسی دوہرے مکان کا ایک دلکش نقشہ تجویز کیا۔ اور اسی نقشے کے مطابق عمارت شروع کردی آپ دیکھیں گے اس عمارت کی مسجد میں داخل ہونے پر سیمیں بدن بت آپکے قدموں کی خاک ہاتھوں میں اٹھا کر آنکھوں پر لگا رہے ہونگے اور درون مسجد میں بھی جابجا کھڑے ہوتے اپنے سنہری روپہلی سروں پر نور ہدایت کی شمعیں روشن کئے خدا کی راہ دکھلا رہے ہونگے ان کی پشتبانی پر منبر کا سہارا ہوگا اور انہی کے محراب ابرو میں خدائی کے جلوے نظر آئیں گے۔ کہیں وہ خود غرق خجالت سے پانی پانی ہو کر نمازیوں کی پاک دامنی قائم رکھنے پر کمربستہ ہونگے اور کہیں انہی آنکھوں کے ہیرے زاہدوں کی پارسائی کی نگہداشت میں لگے ہوتے دکھائی دینگے آپ یہ بھی دیکھیں گے کہ مغ بچے مسجد میں جھاڑو دیتے نور کی قندیلیں جابجا لٹکاتے اور ایمان کی شمع اندھیری راہوں میں روشن کر رہے ہیں۔ پیر مغاں خوف خدا کا عمامہ سر پہ رکھے اور پارسائی کی حیا زیب تن کئے بتوں کے قیام اور مسجد کے استحکام میں رات دن مصروف رہتا ہے اور اوقات مقررہ میں منبر پر جلوہ افروز ہوکر دیر و حرم کی راہوں سے سب کو ایک ہی بقعہ نور کی طرف کھینچتا نظر آتا ہے۔

یہ سب کچھ ہوتے بھی میری مجال کہا کہ آپ سے ملوں میرے پاس یہ سامان کہاں۔ کہ آپ کو بلاؤں۔ سامنے بٹھاؤں دو دو باتیں ہوں۔ کچھ اپنا حال سناؤں کچھ سنوں۔ کچھ راز کی باتیں ہوں۔ کچھ ناز و نیاز ہو۔ ایک مدت تک میرے یہ ارمان دل کے دل ہی میں رہے آپکے وصل کے لئے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے ایک پیش نہ گئی۔ اسی خیال میں شب و روز کراہتا رہا۔ کچھ بن نہ آئی۔

واں وہ غرور عز و نازیاں یہ حجاب پاس وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں

ہجر کے دنوں کی تکلیفیں خدا دشمن کے بھی نصیب نہ کرے۔ دل کی بے قراریاں غضب ڈھاتی ہیں اور حسرتیں اور مایوسیاں ہیں کہ اسے پامال کر رہی ہیں۔ آخر دلِ شیدا نے آپ سے ملنے کی سبیل نکال ہی لی۔ مگر اس میں بھی یہ دقتیں پیدا ہوئیں کہ آپکو سال میں ایک دفعہ سے زیادہ ملنے کی فرصت نہیں اور مجھ میں آپکی خاطر داری کا سامان کرنیکی۔ اگر اس سے زیادہ مل بیٹھنے کے موقعے ہوں تو طاقت بھی نہیں۔ دن بھر کے کچھ امیدیں وصل میں اور کچھ آپکی خدمت گذاری کی۔ تگ و دو میں گذرنے کو تو گذر ہی جاتے ہیں۔ پر آپ کی بے اعتنائی کا خیال۔ نئے نئے رقیبوں کی روبا بازیاں اور مجھ سے ستم شعاریاں۔ میرے پہلے ہی سے درد آشنا دل کو ایک صدمہ پہنچا دیتی ہے۔ جو بسا اوقات میری زندگی کو میدان رقابت سے محو کردینے کا کفیل نظر آتا ہے۔ مگر عاشق کی سخت جانی مشہور ہے اس کی سب مشکل وصل کی گھڑی کی آمد پر آسان ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ وہ سب تکلیفیں بھول جاتا ہے لیکن غضب تو یہ ہے کہ بعد مدت جو کوئی وصل کی گھڑی بھی آجاتی ہے۔ یہی سال بھر میں کبھی ایک دو دن کے لئے مل بیٹھنے کا اتفاق جو ہو جاتا ہے اور وہ بھی سو مصیبتوں سے دکیل بھیجے جاتے ہیں۔ خط لکھے جاتے ہیں۔ رسالے ارسال خدمت کئے جاتے ہیں مجلسیں قرار دی جاتی ہیں۔ آپکے دل بہلانے کے سامان مہیا کئے جاتے ہیں۔ آپکی مداح سرائیاں کرائی جاتی ہیں۔ بڑھے اور نوجوان آپکے گیت گاتے ہیں آپ کے باغ کے گل بوٹے گلدان میں سجائے جاتے ہیں۔ آپکے ہاں کی شمعیں اور قندیلیں جگمگاتی ہیں۔ کوئی اور رفاخت اپنی سریلی آواز سے سننے والوں کا دل بہلاتی ہیں۔ نذیر احمد آپکی دل لگی کے لئے اپنی جادو بیانی سے تسخیر قلوب کے کرشمے دکھا کر آپکی ہوائیں باندھتا ہے۔ اور عبدالقادر آپکی فضیلت [illegible] سے نئے نئے مضامین نکالتا ہے۔ اور آپکی [illegible] سلاست روانی [illegible] شہد کی نہریں بہادیتا ہے۔ ایمائی ایجاد پسند طبیعت تاریکی پہلوؤں سے نئے نئے مضامین نکالتا ہے۔ آپکے دل کی مرجھائی ہوئی کلی کو شگفتہ کرنیکی کوشش کرتی ہے اور پھلواری کی سلیمان اپنے لحن داؤدی سے دلوں کو گداز کرتا ہوا ان پر پہاڑی ترانوں کا نقش جما کر آپکی سیر کے لئے رنگ برنگ کے گل کھلاتا ہے۔ احمد حسین بھی اپنے دل سوز و دل سوختہ شور شین سے آپ کا دل لبھاتا ہے اور ارشد اپنے بے ساختہ پن سے آپکو نہال کرتا ہے۔ اقبال ہے کہ آپکا دماغ آسمان پر پہنچا کر اپنی برق طبعی سے کبھی آپکو رلاتا ہے اور کبھی ہنساتا ہے تو ان سب پر بھی وقت۔ یہی وصل کی گھڑی شکوے اور شکایتوں میں ہی کٹ جاتی ہے شکوے اور شکایتیں کچھ کام بھی دے جاتے ہیں۔ آپکی توجہ کا کچھ اظہار بھی ہوتا ہے اور میرا ارمان نصیب دل اسی تھوڑی سی توجہ کے ظاہر ہونے سے ابھرتا بھی ہے۔ لیکن وہ وقت گذرا اور میں اپنی غفلت شعاریوں کا مارا فراموشی کے کونے میں پڑا سسکتا ہوں اور آپ کو پرواہ تک نہیں ۔

ملاتے ہو اسی کو خاک میں جو دل سے ملتا ہے

میری جاں چاہنے والا بڑی مشکل سے ملتا ہے

صرف اتنا ہی نہیں۔ بلکہ رقیب کی کچھ ادائیں آپکے پسند خاطر ہیں۔ اس کا دلق ازرق فام آپ کو محو کئے دیتا ہے۔ اس کی مسمی صورت کے آپ گرویدہ ہو رہے ہیں۔ وہ اپنی پاک بازی جتاتا ہے۔ تقدس و تورع کا جال پھیلاتا ہے اور آپ بھولے بھالے ان پھندوں سے بے خبر اس کے دم میں آجاتے ہیں۔ یہ پرانا ہوس پرست عشقبازی کے کوچوں میں پھر نکلا ہوا آپ کا مزاج پاکر بات بات پر آپکے سامنے حدیث کی سند لاتا ہے اور ایمان کی آڑ میں مجھ پر کفر کے فتوے لگاتا ہے ۔

زاہد کی توبہ توبہ رہی گھونٹ گھونٹ پر سو بوتلیں اڑا کے بھی ہوشیار ہی رہا۔

آپکی بدولت یہی رقیب ہے کہ خصاب کے رنگ میں رنگی ہوئی ریشائیں چھیتیاں کرکر مجھے مجلسوں سے نکالنے اور نکلوا دینے کی دھمکیاں دیتا ہے معقول و منقول کو اپنی مدد میں نہ پاکر لڑنے جھگڑنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ یہی رقیب ہے کہ ذعظا میں جبہ و دستار میں منبر پر بیٹھ اپنی ابلہ فریب انشاپنیوں میں طرح طرح کے گل کترتا ہے اور ہمیشہ حریفوں اور ہم مشیوں کے متعلق غلط بیانیاں کرکے میری طرف سے آپکو پراگندہ خاطر کرنا ہے۔ یہی رقیب ہے کہ زاہد و شیخ کے لباس میں جابجا جھوٹ سچ کے طوفان باندھکر آپکا صاف دل بدظنیوں سے مکدر کرنے کی کوشش ہے۔ اور اگر کوئی میرا ہواخواہ کبھی اس طوفان کے سدراہ ہوتا ہے تو یہ بندۂ خدا جامے سے باہر ہو جو کچھ اس کے منہ میں آتا ہے۔ اپنی ٹکسالی نے کہ گزرتا ہے ۔

بری بلا ہے یہ داغ پرفن تم اس کو ہرگز نہ منہ لگاؤ
وگرنہ ڈھب پر لگا ہی لیگا سنی اگر اس کی چار باتیں ۔

میرے ہواخواہ یہ سب کچھ دیکھتے ہیں سنتے ہیں اور سمجھتے بھی ہیں۔ مگر لڑتے جھگڑتے نہیں اور یہ صرف اس واسطے کہ انہیں میری نئی منظور ہے۔ لڑنے اور جھگڑنے میں وہ میرا اور آپ کا نقصان دیکھتے ہیں وہ جلتے ہیں کہ اس سے مجھے اور آپ کو رنج اور رنج سے میرے آپکے کام میں ہرج ہوگا ورنہ وہ ان گل افشانیوں سے دبنے والے اور گیدڑ بھپکیوں سے ڈرنے والے نہیں وہ بھی اپنی دھن کے پکے اور خیال کے جانبازہ ہیں۔ لیکن

رونا ہے یہ کہ آپ بھی ہنستے تھے ورنہ یاں
طعن رقیب دل پہ کچھ ایسا گراں نہ تھا

کیا آپ رقیب کو ایسے ہی سرچڑھانے دکھنا پسند کریں گے کیا آپ اسے یونہی منہ لگائے رکھیں گے آخر کچھ انصاف بھی تو شرط ہے۔ میں انہیں کہتا کہ اسے مجلس میں بار ہی نہ ہو۔ آپکی دریا دلی اور فیض منشی اس کی خشک تمناؤں کو ہرا بھرا نہ کرے۔ حاشا وکلا۔ مگر یہ بات تو اب طے ہو جانی چاہیئے کہ آپ کا خیرخواہ دل و جان نثار کون ہے اور ہوس پرست مدعی محبت کون ۔

فیصلہ ہو آج میرا آپ کا   یہ انتظار کھاہے کس دن کے لئے

کیا آپ پسند کریں گے کہ ہر ایک بوالہوس آپکی مجلس میں دعوے محبت و فاکرے اور دعوے دعوے پر ہی آپکی نگاہ کرم دولتوں سے مال ہو جائے۔ عزت پائے اور سچے ہواخواہوں کو وقت بے وقت جاہ و بے جا جھڑکیاں و ڈانٹ بتائے ۔

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی   اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

کیا آپ پسند کریں گے کہ اس کی ہوس اور ہوس ہی ہوس پورا کرنے میں آپکی بے بہا اور کیا ب دولت رائیگاں جائے۔ نہ خدا کی راہ میں اور دنیا کے کام آئے۔ اور صرف چند روزہ اہتمام ای پرانی ٹیکر کو بیٹھنے کا اسلامیوں کا نام ونشان مجھے مٹادے ۔

اگر آپ اسی پر تلے ہوئے ہیں تو میں کون اور میری بساط کیا کہ آپکو سمجھاؤں جو کچھ ہو سکا میں نے کیا۔ آپ جانیں یا نہ جانیں مجھیں یا نہ مجھیں مجھے اختیار ہے۔ زمانہ نے اپنی بے وفائی سے ۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں۔ آپ کو ایسا سبق دیا ہے۔ کہ ہمیشہ یاد رہے گا۔ اور برے بھلے کی

بمنز۔ کھوٹے کھرے کا فرق ۔ ذرا سی توجہ پر چھپے چھپے کرا دیگا ۔ اگر ابھی اور نہیں اتنا تو ہو کہ بوالہوس اور سچے ہوا خواہ آپکی نگاہوں میں اپنی اپنی قدر جتنی کہ انکی شایان شان ہے بٹھا سکیں ۔ ان کو یہ بھی معلوم ہو جائے ۔ کہ آپ سے انہیں کہاں تک رسائی ہے ۔ اور آپکو ان سے کس حد تک ربط ۔ اور ایک دفعہ اتنا تو سمجھ لیں کہ کون آپکو راہ راست پر بیجا کر عزت و عظمت کی کرسی پر بٹھانا چاہتا ہے اور کون صرف تقدس کے پیرایہ میں کانٹوں کا تاج حضرت مسیح کی طرح آپکے سر پر رکھ کر آپکی ہنسی کرانا چاہتا ہے ۔

اب ذرا کسی رقیب بوالہوس کے حالات اس کے افعال ۔ اور بھری مجلسوں میں اس کے اقوال آپکی توجہ کے قابل ہیں ۔

ثنا کسی کی گلہ کسی کا کسی کی مدحت کسی کا شکوہ

رقیب کی بزم میں جز اس کے بتائیے قیل و قال کیا ہے

کیا ان میں ذرا آپ دیکھیں ۔ کوئی ایک بات بھی ایسی ہے جس سے خیر اندیشی ثابت ہو ۔ جو محض ہوس پرستی پر مبنی نہیں ۔ یوں تو دم خیر خواہی بھرنے کو یہ سب سے زیادہ گردن بلاتا ۔ اور منہ اٹھاتا ہے اور آپکی ہوا خواہی میں زبانی جمع خرچ کرنے کو ہر وقت تیار نظر آتا ہے لیکن حقیقت حال تو یہ ہے کہ اس کی خواہشیں اور اس کی ہوسیں آپ کو اسی پرانی لکیر کا فقیر بنا کر دنیا و مافیہا سے ناآشنا رکھنا چاہتی ہیں صرف دنیا ہی نہیں بلکہ عاقبت میں بھی خوار کرنا پسند کرینگی اس کی تو مرضی ہے کہ آپ دنیا دی جاہ و جلال کو خیرباد کہیں ۔ رنگ و بو سے نفرت رکھیں ۔ اچھا کپڑا نہ پہنیں ۔ اچھا کھانا نہ کھائیں ۔ روپے پیسے کو ہاتھ نہ لگائیں اور اگر ہاتھ میں کبھی آجائے تو دام درم تک اسے دے دیں ۔ گھر میں بیٹھنے کو بوریا اور روشنی کو دیا تک نہ ہو ۔ برف آب اور خالص سوڈا بھی آپ کے لئے منع ہے ۔ اور گاڑی گھوڑ نخوت کی نشانی ۔ اس کا مدعا تو یہ ہے کہ آپ کم بخت کوٹ پتلون ملعون سے پرہیز کریں ۔ نیلا تہ بند زیب تن ہو سر اور اس کے زانو بہ زانو سر جھکائے دنیا اور دنیا والوں کو کہانی کی لومڑی کی طرح ۔ خامی کے الزامات لگا لگا کر ایک کونے میں الگ تھلگ بیٹھے جی خوش کر چھوڑیں ۔

تماشے دیکھے ہیں یہ ہم نے بارہا اے شیخ	وہ نکلے سہان متی جو بناتے تھے اکسیر
نہایت آ چکی ہے ان کی ابتدا اے شیخ	گو زن و گور میں بچپن سے تارک دنیا

یہ جانتا ہے آپکی عزت و مرتبت و جاہت ۔ خوش ادائی ۔ خوش کلامی ۔ آپکی لذیذ و نفیس خوراک ۔ آپکا صاف ستھرا لباس ۔ اس کے اغراض کی ہوس کے پورا کرنے کے منافی ہیں ۔ آپکے چلبلاپن کے آگے اس کی طبیعت رکتی ہے اور آپکی متانت سے وہ گھبراتا ہے ۔ بات بات پر چیں بجبیں ہوتا ہے ۔ بشور مچاتا ہے اور جب کچھ بن نہیں آتا ۔ آپ کی سیلی سے سعد اداؤں کو کافر اور فتنہ زا ٹھہراتا ہے ۔ آپ کا قامت اس کے لئے قیامت ہے اور آپ کا رخ انور آفت آپ کی نگاہ کو چور بتاتا ہے اور آپکے حسن کو جہاں سوز آپ کی چتونوں میں اسے شرارت نظر آتی ہے اور آپ کی موہنی آنکھیں اس کے مولویت میں گندے ہوئے الفاظ میں چشم فتاں کے نام سے بدنام کی جاتی ہیں ۔ کبھی کبھی واعظ کا روپ بھر کر سر منڈائے داڑھی بڑھائے مونچھوں کا قریب قریب صفایا کئے ۔ پانچھ اٹھائے گرد و کتاب کے پنوں سے مسلمانان درگور مسلمانی در کتاب کہہ کر آپ کو اور اپنی جان کو کوستا ہے ۔

دعوے تو آپکی خیر خواہی کے اور کوشش یہ کہ آپ کا ہرا بھرا باغ سونا نظر آئے ۔ بوٹے درخت پھول پھل سب کے سب اس کے

اپنے قرب وجوار کی طرح خودرو ہیں۔ وراثت پڑے ہیں۔ بیلدکی کی سبیلیں ناگوار ہوں۔ باولیاں لاری۔ اگرچہ وہ بھی آج کل کے ہنرمندوں کے زمانہ میں نمونے تو بھی کی دکھاتے ہیں۔ سہارا ہے۔ انسان کی کوشش کا ہاتھ کہیں کچھ ہوجاتے۔ ہوا کے جھونکوں پر گذارہ ہے۔ کوئی آگے گرے۔ پیچھے پیچھے سڑے۔ اجڑے آپکی خودپرداخت درکار نہیں۔ پودے ہیں کہ کوئی سہارا نہ ہوتے سے مٹی میں ملے ہوئے۔ کچھ پتیاں مرجھائی ہوئی بدرنگوں اور کچھ الٹ زبوں۔ درخت ہیں کہ بے برگ۔ تنے خشک۔ شاخیں کچھ سوکھی ہوئی۔ اور کچھ ٹوٹی ہوئی۔ پھل بالعموم کڑوے۔ بعض زہریلے۔ اس جہاں میں کام آئیں تو پتا نہیں اس دنیا کے کام کے تو یقیناً نہیں۔

لگاؤ تم میں نہ لاگ زاہد نہ درد الفت کی آگ زاہد
پھر اور کیا کیجئے گا آخر جو ترک دنیا نہ کیجئے گا

اس کے دل کی وحشت شہر میں بیابان پیدا کرکے سینکڑوں گوں صورت انسان نہیں دیکھتی۔ غنچے کی چٹک بے اختیار اس کا ہاتھ گریباں پر لے جاتی ہے۔ اور کلیوں کے کھلنے سے اس کا دل کھلا جاتا ہے۔ بیلوں کی چھاؤں اسے پسند ہے۔ اور زرد زرد پھولوں کی بہار سے جامے میں پھولا نہیں سماتا۔ جھڑتی ہوئی کی افسردہ دلی سے باغ باغ ہورہا ہے۔ اور نرگس بیمار کی بے چارگی سے شاد۔ سوکھے پھولوں کے انبار اس کے مایۂ ناز ہیں۔ اور خشک کانٹوں کے ڈھیر سامان فخر و امتیاز ہیں زیادہ اچھلا تو اس کی تنگ حوصلگی نے اسے طرفۃ العین میں زمین پر دے مارا غنچہ مسکرایا اور اس کی دریا کا رسا رسائی نے اسے ٹہنی سے جھٹکا دے کر گرا دیا۔ چمن کی پیاری پیاری کیاریوں سے اس کا جی جلتا ہے۔ اور اس کی ابھارنے والی روشیں دیکھ کر اس کا دل بیٹھا جاتا ہے۔ پھلوں کی تر و تازہ رنگت اس کا جنون بڑھاتی ہے اور اٹھتے پودوں کی کاٹ چھانٹ باغ کے چہرہ پر وہ ایک دھبہ سمجھتا ہے۔ جس کا علاج انہیں جڑ سے اکھڑوا کر باغ کی چاردیواری سے کوسوں باہر پھینک دینے کے سوا اور کچھ نہیں دیکھتا۔

اگر اس کی کوشش انتہائی کرتی کہ آپکے باغ کی آبادی اور رونق کے لئے بڑ۔ پیپل لگا کر مرغان چمن کے واسطے آندھی اور طوفان میں جائے پناہ دیتی ہے۔ اور تھکے ماندے کے لئے آرامگاہ۔ مٹی کے بڑے بڑے تودے کھڑے کردیتی۔ جو سبزۂ بیگانہ کو ایک جگہ باغ اور باغ والوں سے وابستہ کئے رکھتے اور ساتھ ہی اندھیری راتوں میں بھولے بھٹکے کو سیدھی راہ پر لیجانے کا کام دیتے۔ باغ کے گرداگرد اور جابجا اندر بھی۔ خاردار جھاڑیاں لگا دیتا۔ جو دشمنوں کی دست برد سے باغ کو محفوظ کرتیں جو چشم ما روشن دل ماشاد۔ اس کی اور میری خواہشوں کا ایک ہی مدعا ہوتا اس کی اور میری کوششوں کا ایک ہی مقصد۔ دونوں مل کر کام کرتے اور آپ کی خدمت میں نام پاتے۔ مگر وہ تو صرف خزاں کی جھڑی ہوئی دو چار پتیاں ادھر ادھر سے اکٹھی کرکے ہوا خواہان چمن میں اپنا نام گنوانا چاہتا ہے اور ایک دو خشک ٹہنیاں زمین میں گاڑ کر فلاح باغ کا مدعی بنتا ہے۔

زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند حق را بسجودے۔ نبی را بدرودے

یہ ہے رقیب بوالہوس کی حالت۔

حال اک دفتر پریشانی کام دیکھو تو سارے الٹے جلول

جس کو آپ منہ لگائے سر جھکائے بیٹھے ہیں۔ اور آپ کی بے نیازی اور میری طرف بے توجہی کی کوئی حد نہیں۔ مجھے یہ جتانے کی ضرورت نہیں کہ بسا اوقات وہ میری سیدھی سادی باتیں اپنے مطلب کے پیرایہ میں بیان کر کے آپکی سادگی اور نیک نفسی کو میری مخالفت میں برانگیختہ کر دیا کرتا ہے کیا انصاف نہیں چاہتا کہ آپ محض اپنے فائدے کے لئے ہاں۔ ہاں۔ میرے کسی فائدے کیلئے نہیں اپنے فائدے کے لئے ذرا سوچیں۔ غور کریں کہ میرے گناہ کیا ہیں اور میں کیوں غفلت شعاریوں اور بے اعتنائیوں کا مستوجب ٹھہرایا جا رہا ہوں۔

میرا گناہ ہے تو یہی نا کہ

آپ کو حریفوں کے مقابلے میں معزز و محترم دیکھنا چاہتا ہوں۔ زمانہ کو جو کبھی آپ کا بندۂ درگاہ تھا۔ پھر ایک دفعہ آپ کے قدموں میں لے آنے کے درپے ہو رہا ہوں۔ وہی پہلی سی رونقیں۔ وہی پہلی مجلسیں۔ وہی بانکی ادائیں۔ وہی شوخ نگاہیں۔ وہی ناز وہی نیاز دیکھنے کا مشتاق ہوں۔ رات دن اسی فکر میں ہوں۔ اور فکر ہی فکر نہیں سر توڑ کوشش بھی کر رہا ہوں۔ کہ آپ عزت کی کرسی پر جلوہ گر ہوں زمانہ پہلے کی طرح آپ کے حکم کا بندہ دست بستہ سامنے کھڑا ہو آپ کے لب ہلیں۔ لب ہلنے کی نوبت نہ پہنچے صرف اشارہ ہی ہو۔ تو دنیا کی نعمتیں آپ کی حاضر خدمت ہو جاویں۔ دولت ہو حشمت ہو۔ ثروت ہو۔ علم و حکمت ہو۔ حریف آپکے زلہ ربا۔ اور دوست آپکے خوان کرم کے حاشیہ نشیں قصر و محل رہنے کو۔ مسند و تکیہ بیٹھنے کو۔ دیبا و حریر پہنیں۔ پھولوں کی سیج پر سوئیں۔ محلوں میں شمع عنبریں جلائیں۔ دن عید ہو اور رات شب برات۔

میرا دل تو اس وقت ٹھنڈا ہوگا۔ جب آپکو اس حالت میں دیکھوں گا اور آپ کو اس حالت میں دیکھنے کی امید پر میں نے کیا کیا تکلیف اپنے اوپر گوارا نہیں کیں۔ کیا کیا مشقتیں نہیں اٹھائیں۔ زمین کھود دی۔ دریا چیرے۔ پہاڑ کاٹے اور دیکھئے اپنی ان خاکسار محنتوں کی بنیاد پر ایک عالیشان عمارت آپکی خاطر کھڑی کر دی۔ اب بہار کی ہوائیں۔ شادابی کی نہریں۔ باغ میں لانے کے درپے ہو رہا ہوں۔ چھوٹی چھوٹی کیاریوں کے سینچنے میں رات دن لگا ہوا ہوں۔ اور پیاری پیاری روشوں کے بنانے سنوانے میں دل و جان سے مشغول ہوں۔

ہم آدمی ہیں کام کے اے ناصح شفیق دیکھو ہمارے کام جہاں اختیار ہو

مجھے تو اس وقت آرام آئیگا جب اپنے دل کی اس چنگاری سے جو بڑھے کے دل کی آگ سے نکلی تھی۔ ایک گلزار کھلا دیکھ لونگا اور گلزار بھی وہ کہ چشم زمانے نے پہلے نہ دیکھی ہو۔ وہ دیکھے اور عش عش کرے یہ دیکھے اور دیکھ کر پھر آنکھ بدلنے کا نام نہ لے۔

گلزار کیا ہو۔ ایک دل کشا باغ ہو۔ یہی روکھی سوکھی ٹہنیاں جو اب آپکے باغ کی رونق بن رہی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی شاخیں نکالیں۔ تر و تازگی ان کی گھٹی میں ہو اور سر سبزی و شادابی انکی تربیت کی ذمہ دار۔ پودے بڑھیں۔ پھولیں پھلیں۔ پھلوں کی پختگی اور شیرینی میں زمانہ اور زمانہ کے لوگ رطب اللسان ہیں۔ پھولوں کی مہک دور دور تک پھیلے آس پاس قرب و جوار میں فرحت پھیلائے نئی نئی چمنیں ہوں۔ نئی نئی روشیں قسم قسم کے پھل ہوں۔ طرح طرح کے پھول۔ اگر اس میں ایک خاص لطافت ہے تو اس میں ایک اور ہی نفاست ہو۔ لیکن ان سب کی نسبت آپ سے ہونا۔ آپکا کہلانا۔ میرے لئے کافی دلیل ان سے رشتۂ الفت کی ہوگی۔

آبیاری کی نئی سبیلوں سے اصول زراعت کی تازہ ایجادوں سے باغ کی ترقی۔ باغ کی رونق بڑھادی جائے۔ پرانے چمنوں میں نئی نئی

قسم کے پھول لہلہائیں۔ اور قدیم روشوں پر نئی طرز کے پودے لگائے جائیں۔ نوخیز بوٹے پرانی زمینوں کو سجائیں اور تر و تازہ بوئے گل پرانی ہواؤں کو از سر نو معطر کرے۔ جا بجا گل تر اور نخلہائے رنگین نظر آئیں اور قدم قدم پر شگفتہ پھول اور ہری شاخیں دکھائی دیں اگر یہاں شگوفے سے نکلتا پھول ہنس رہا ہے تو وہاں نونہال چمن اکڑ رہے ہوں۔ پھولوں کی شاخ رنگت اور بھینی بھینی خوشبو آنکھوں میں ٹھنڈک اور دل میں سرور پیدا کریں۔ سوسن کی زبان درازیاں ہوں نرگس کی چشم نمائیاں۔ سرو آزاد بھی ہو اور قمری دل شاد بھی۔ شوریدہ مزاج بلبلیں طرح طرح کے نغمے گائیں۔ اور قسم قسم کے پرندے اڑتے۔ پھرتے۔ چہچہاتے نظر آئیں۔

آپ کا چہرہ آفتاب و مہتاب ہو کر چمکے۔ دشمنوں کے لئے ابرو کمان۔ پلکیں تیر۔ دوستوں کے لئے لب مصری کی ڈلیاں اور زنخدان سیب ہوں۔ چشماں مست و میگون۔ زمانہ کو پھر آپ متوالا کر دیں۔ ادائیں دلفریب اور انداز دلآویز ہوں نگاہ ستم میں کچھ ایجاد ہو۔ بات بات پر زمانہ جان نثاری کے دم بھرے۔ قدم قدم پر دین و ایمان قربان کرے

آساں ہو کہ زمانہ ہو غرض کوئی ہو　　　تم جسے دوست بنا لوگے وہ ہو جائیگا

اور یہ اس لئے کہ ہر ایک شے میں جو آپکی ہے جس کو آپ سے دور کی نسبت بھی ہے وہی ایک رنگ فطرۃ اللہ کا رنگ۔ آرہا ہو کیا پھل اور کیا پھول۔ کیا چمن اور کیا روش۔ سرو آزاد۔ سوسن زبان۔ نرگس شوخ چشم۔ اس چمن کا سبزہ بیگانہ تک بھی۔ اس کا زمین و آسمان اسی رنگ فطرۃ اللہ میں وہی صبغۃ اللہ کے رنگ میں رنگے ہوئے ہوں وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰہِ صِبْغَۃً۔ اور خدا سے اچھا رنگ دینے والا کون ہے۔

اور اس لئے بھی کہ آپکے چہرے کی رونق آپکے حسن کی چمک۔ آپکی ادائیں آپکے انداز اسی ایک رنگ کے شاہد نظر آئیں وہی رنگ فطرۃ اللہ کا　جس نے تیرہ سو سال ہوئے زمانہ کو اپنا فریفتہ کر لیا تھا۔ وہی رنگ جس کے انداز ابھی تک مردہ دلوں میں جان ڈالتے ہیں۔

کسی مولویانہ بیخبری کی یہ ہوس پرستی ہو تو ہوا اپنا تو ہرگز عقیدہ نہیں کہ آپکے حسن کی شان۔ باغ کی سر سبزی اور شادابی اس۔ امی مالی

بلغ العلےٰ بکمالہٖ　　　کشف الدجےٰ بجمالہٖ
حسنت جمیع خصالہٖ　　　صلوا علیہ و آلہٖ

کی ہدایت پر قدم بقدم چلنے کے بغیر کبھی رونق یا قیام حاصل کر سکتی ہیں۔ یا اس نور مجسم کے لوامع سے ذات کا پرتو لینے کے سوا آپکی ہستی کسی دقعت کی نگاہ سے دیکھی جا سکتی ہے۔ بوالہوس رنگ رنگ کے خضاب نکالے لاکھ سبیں بنائے اور ہزار فسوں کرے۔ نکھارے اور بھو کھارے جب تک رنگ وہی اصلی رنگ فطرۃ اللہ کا رنگ جو اس امی مالی نے ہمیں عطا کیا ہے۔ اختیار نہ کریگا۔ نہ دین کا ہوگا۔ نہ دنیا کا۔ ہزار سر ٹکرائے۔ لاکھ بہروپ بدلے۔ اس رنگ کے بغیر۔

نہ خدا ہی ملے نہ وصال صنم　　　نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے

اس رنگ کا کیمیائی نسخہ آپ کو ورثہ میں پہنچا ہے اس کی حفاظت اور اس کا لازم اور سوب کچھ حاصل۔ ہر نسخہ کر ستعال ہو۔

بوالہوس چاہے کچھ کہے۔ جھوٹ کی پہچان نہیں اور مال ومنال و عزت وجاہ و ثروت وعلم۔ حکمت اور سائنس کے سونے پر نسخہ سہاگے کا کام دیتا ہے اور انکے رنگ کو دور کرکے اپنے اصلی فطرتی رنگ میں چمکاتا ہے۔ نسخہ دینے والے کی جو آپ کا اور میرا سچا خیر خواہ تھا۔ جس کی ہدایت میرے اور آپکے لئے راہ نمائی کی اور سچی راہنمائی کی کفیل ہے پیروی ہماری سعادت دارین کی ذمہ داری ہے۔ زید و بکر کا قول فضیل نہیں اور ان کا استدلال بے تکمین ہونے سے خود قیام کا محتاج ہو رہا ہے۔

نسخے کی ترکیب میں کیونکہ یہ ترکیب کسی ہوس پرست کے دماغ کا نتیجہ نہیں اور دور سے جہاں ہوس پرست کی ہستی کیا ہے فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں۔ تجویز ہو کر آئی ہے۔ آپکے مزاج کے ہر پہلو کی بہتری مدنظر رکھ کر انمول موتی کوٹ کوٹ کر بھر دیئے گئے ہیں۔ اس میں آپ کے ظاہری اور باطنی رنگ کا انتظام کیا گیا ہے۔ نسخہ اس وقت میرے ہاتھ میں ہے۔ اور یہ آپ کے سامنے دھرا ہے۔ کیا آپ اس پر عمل کرینگے یا کسی نیم حکیم یا نیم ملا کے مشورے پر۔ آخر ایک دن تو تھا کہ اسی پر آپکی ساری زندگی کا مدار ہو رہا تھا۔ اور اسی کے طفیل آپکے غلاموں نے وہ عروج پایا تھا کہ غیروں کو کم نصیب ہوا ہے۔ آپ ہی بتائیں اس میں آپکی کون سی حاجت۔ کون سی ضرورت۔ کس تکلیف۔ کس آرام اور کس خوشی کا انتظام نہیں کیا گیا۔ کیا اس میں انتظام نہیں کیا گیا کہ پھل پھول اناج حیوانات وجمادات۔ پانی اور ہوا۔ رات اور دن چاند اور سورج۔ ہر ایک چیز جو زمین وآسمان میں ہے آپ کے کام آئے۔ آپ اس سے فائدہ اٹھائیں۔ کھائیں پیئں اور پہنیں بھی۔ ہاں فضول خرچیاں نہ کریں۔ کیا اس میں آپ ذرا ادھر توجہ فرمادیں۔ ایک جگہ لَا تَقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ کے حکم سے اپنے ہاتھوں اپنے پاؤں کلہاڑی مارنے سے روکا نہیں گیا۔ اور دوسری جگہ وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ کے اشارے سے خود بخود ہلاکت میں پڑنے سے بچایا نہیں گیا۔ اپنے بوالہوس سے ذرا پوچھئے تو سہی۔ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ کہ کس نے اچھا پہننے اور اچھا کھانے سے منع کیا ہے۔

کیا آپ اس نسخہ کی تجویز کافی وشافی نہیں سمجھتے کہ ہر کس وناکس کی صلاح پر چلنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ کیا آپ کو اس کے سمجھنے سمجھانے میں کچھ دقتیں ہیں۔ نیا زمانہ کی ناواقفیت کی وجہ سے نسخہ کی ہدایات سے کلی فائدہ اٹھانا آپ کو مشکل نظر آرہا ہے۔ بیشک آپ دیکھ رہے ہونگے کہ ذلت وخواری بیچارگی اور ناداری آپ کو اٹھنے نہیں دیتیں۔ بلاشبہ آپ محسوس کر رہے ہونگے کہ زمانہ کے بدل جانے سے پریشانیوں نے آپ کو کسی کام کا نہیں چھوڑا۔ زمانہ کے موجودہ مذاق سے آپ کو آشنائی نہیں اور بغیر اس آشنائی کے وہ پہلی باتیں خواب وخیال ہو رہی ہیں۔

اب میری دھن تو یہی ہے کہ آپکو پھر پہلے ہی سا خوش وخرم دیکھوں۔ وہی روح افزا ادائیں اور وہی مسیحا نفس انداز۔ چہرہ کی رونق دن بدن دوبالا ہو۔ قد دشمنوں کے لئے قیامت کا سامان رکھتا دکھائی دے۔ پیشانی کا چاند اپنوں کو ہر روز عید کی تقریب پر گلے ملائے اور زلفوں کی بھول بھلیاں ہر شب سیاہی سے گھر جانے پر غیروں کی پریشانیاں بڑھاتیں۔ آپ اچھے سے اچھا لباس پہنیں۔ عمدہ سے عمدہ کھانا کھائیں۔ خدا کی راہ میں دین رسول کی راہ پر چلیں۔ ہنسیں کھیلیں خوشیاں منائیں۔ گھر ہوں یا باہر ظاہر میں اور باطن میں معاش میں بے فکر اور معاد کے لئے ہر وقت تیار۔ حریفوں میں ممتاز اور دشمنوں کی آنکھوں میں خار بھولیں پھلیں۔ لہلہائیں شادابی کی نہریں جاری ہوں سرسبزی کی روشیں نظر آئیں۔

حوروں کی آرزو میں یہ کیفیت کہاں　　　اللہ رکھے اس کی تمنا ہی اور ہے

سچ ہیں یہ کان گر قمِ عیسےٰ کے ہر ہوس　　　مرتے ہیں جس پہ ہم وہ مسیحا ہی اور ہے

کیسا نیاز کس کی وفا کس کی عاشقی!　　　تم جانتے نہیں مجھے دعوے ہی اور ہے

اور میری اس دھن پر بھی آپ کو اسی نسخہ کی ہدایت کی راہ پر لانے کیلئے اگر مجھے براؤں ہی دیکھنا ہے اگر آپکی بے توجہی اور غفلت شعاری آپ کو تذبذب میں ہی رکھنے پر قائم ہے تو انجام معلوم - میں اپنی سی تو کر ہی دیکھونگا جو کچھ مجھ سے بن آئیگا کر گذروں گا۔ لڑ کر جھگڑ کر منت سے سماجت سے آپ مانیں یا نہ مانیں آپ خوش ہوں ناخوش - جب تک میرے دم میں دم ہے آپکو سیدھی راہ پر - اسی راہ پر جو اس نسخہ کیمیا کا منشا ہے۔ اسی راہ پر جو آپ کے باغ کے مالی نے نکالی تھی - اسی راہ پر جس　　　میرے دوہرے مکان کی بنیاد رکھی گئی ہو لے جاؤنگا۔ کم سے کم لے جانے کی کوشش کروں گا۔ میں جانتا ہوں آپ چپہ چپہ پر اڑ بیٹھیے - میں خوب سمجھتا ہوں - آپ قدم قدم پر گھبرائیں گے آپ کا بوالہوس خیر خواہی کا دم بھرنے والا بھی آپکو کھینچیگا ۔ لیکن میں نے بھی عہد کرلیا ہے اور عہد بھی آپ لوگوں کے عہد کی طرح نہیں کہ آنا ہے یہاں اور جانکلے وہاں ۔ صبح کہاں اور شام کہاں ۔ عہد بود انہیں ۔ پکا اور ایسا پکا کہ چاہے کچھ ہو ذلیتں ہوں رسوائیاں ہوں ناکامیاں منہ دکھائیں ۔ مایوسیاں ڈرائیں ۔ کوئی آئے کوئی جائے ۔ اپنی دھن پوری کر چھوڑنی ہے ۔ کچھ کی بھی ہے ۔ اور بہت کچھ بھی کرنا ہے ۔

آپکی محبت کی راہوں میں کس کس نے مجھے پامال نہیں کیا ۔ اور کہاں کہاں میری خاک نہیں اڑی جگہ جگہ میری سبکی ہوئی اور وقت بے وقت مجھے خفیف کرنیکی کوششیں کی گئیں ۔ مگر آپ کی بے توجہی کا پہلو بدلتا ہی نہیں اور آپ کی بے نیازی کی آنکھیں اب تک ترچھی نگاہوں سے مجھے گھائل کر رہی ہیں ۔

اڑا چکا ہوں بہت خاک ہو نگاہ کرم　　　بلند بھی تو کروبے وقار کر کے مجھے

افسانۂ راز عشق کی ذلیتں میں بھولا ہوا نہیں اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آگے ہی مدتوں سے نہ تھی ۔ قدر و منزلت مگر پھر بھی ۔

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ　　　تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

اگر میری یہ شکایتیں ۔ میرے یہ سب شکوے بے اعتنائی کے کانوں سے سنے گئے ہیں اور میرے راز و نیاز بے توجہی کی آنکھوں سے دیکھے گئے ہیں ۔ اور اگر یہاں بے توجہی اور بے اعتنائی کی مایوسیاں ہی میرے نصیبوں میں لکھی ہیں تو داور محشر کے روبرو میرا ہاتھ ہوگا۔ اور آپکا گریبان دنیا دیکھے گی ۔ میری دادخواہی اور آپ کا اضطراب عجب گل کھلائینگے ۔ وہاں بھی میں سارا قصہ ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک بے کم و کاست کہہ سناؤں گا ۔ روئنگا ۔ چلاؤنگا ۔ رولاؤنگا بھی اور اس ہمہ داں ۔ ہمہ داد سے اپنی دادرسی چاہوں گا ۔

حشر تک بات نہ جائیگی جو تم چاہو گے　　　گھر کا گھر ہی میں ابھی فیصلہ ہو جائیگا ۔

اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ مجھے معلوم ہو جائے کہ جو کچھ میں نے کہا وہ سنا گیا ۔ سمجھا گیا اور اس پر عمل بھی ہوگا ۔ اس طرح نہیں کہ اب ۔ ہاں میں ہاں ملائی اور چلدیئے ۔ پھر میں کون اور آپ کون بلکہ اس طرح کہ آپ قول سے فعل سے ۔ اپنے طریق عمل سے میرے ۔ نہیں نہیں اپنے ۔ اس دوہرے مکان کی تکمیل میں اور اس کے مقاصد کے پورا کرنے میں مجھے دل سے مدد دیں گے ۔ بات بات میں انداز میں پھیر

بڑھانے میں ہمت . اور میری ہمتوں میں برکت پیدا کرنے کی کوشش کریجئے ۔ میری آرزو کی جھولی میں کامیابی کے پھول بھر دیئے جائیںگے ر میری تمناؤں کا باغ مراد کی سرسبزی سے لہلہائیگا ۔

پہچان لو فقیر کی صورت سوال ہے تم جان لو یہ ہے مرے سائل کی آرزو

نگہ شرمسار سے حجاب اٹھائے اور مجھ سے آنکھیں ملائے ۔ آپکی نظر عنایت کا مشتاق کھڑا ہوں اور آپکے دست مروت کے بڑھنے کا منتظر ۔

ہاں بھلا کر تیرا بھلا ہوگا ! اور درویش کی صدا کیا ہے

دیکھئے کم بختی تو یہ ہے کہ میرا حرماں نصیب دل آپ کی عنایت سے تسکین پاتا نظر نہیں آتا اور یہ کچھ راستی پر بھی ہے ۔ یہ دیکھ چکا ہے کہ آپکی طبیعت کا کوئی ٹھکانا نہیں ۔ سیماب وار کبھی ادھر کبھی ادھر ، کبھی زمین پر کبھی آسمان پر ۔

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے کہ دامان خیال یار چھوٹا جائے ہے مجھسے

دیکھئے آپکی تلون مزاجی مجھے کس قدر بے قرار کر رہی ہے اور یہ بے قراری یونہی رہی تو ہو چکی زندگی ہماری ۔

اگر اس کھیل میں میری ۔ اور صرف میری ہی جان کی بازی ہوتی تو جیت ہار کر مضائقہ نہ تھا ۔ جان جاتی سو جاتی تو بیشک جاتی آپ کی بلا سے ، مر آپ کے در دولت پر پڑا رہنا یا نہ رہنا ۔ زندوں میں یا مردوں میں ۔ کوئی ایسی بری بات نہ تھی ۔ جس کے لئے اتنی سر دردی کی ضرورت ہوتی مشکل تو یہ آن پڑی ہے کہ آپکی خوشی ۔ مرفہ الحالی آپکے آرام ۔ آپ کی زندگی ۔ موجودہ اور آئندہ کی بازی ہے اور اس صورت میں غفلت کی نیند سونا ۔ خمار کی انگڑائیاں لینا اور کبھی کبھی ہاتھ پاؤں مارنا کسی مذہب میں روا نہیں ۔ اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ گناہ اور بدتر از گناہ ہوگا ۔

یہ حالات ہیں ۔ جنہوں نے مجھے آپکی شمع خراشی کی جرأت دلائی ہے اور اگر ان حالات کے سننے پر بھی بے نیازی کی انداز اور بے اعتنائی کی ادائیں ہی آپ کی پسند خاطر ہیں اور یہ ساری مجلسیں ہنسی کھیل ہی سمجھی گئیں تو پھر مجھ سے اور کیا ہو سکتا ہے ۔ یہی نا کہ بالودگی کے کوتے میں جا بیٹھوں اور نگاہ حسرت کی الوداعی اداؤں سے آپکی اور آپکے باغ کی خیر خواہی کا دم اپنی پریشانیوں میں بھی بھرتا رہوں ۔

ان پریشانیوں میں بھی اگرچہ میری سعی کی رگوں کا خون ٹھنڈا ہو جائے گا ۔ میری بے چارگی کی مٹی قیامت تک آپکی دعاؤں میں سرگرم آسمان کی طرف اڑتی نظر آئے گی ۔

مانو نہ مانو جان جہاں اختیار ہے
ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جاتے ہیں

ابو سلمان شاہجہاں پوری

نئے خزانے

اکتوبر ۶۵ء اور دیگر مہینوں کا پیش نظر اشاریہ مندرجہ ذیل موضوعات کے تحت ترتیب دیا گیا ہے

اردو ادب و زبان

اردو ادب مسائل و مباحث اور تحقیق و تنقید

اردو زبان

آپ بیتی

تاریخ

تعلیم

تمدن و معاشرت

ثقافت

سفرنامہ

سیاسیات

شخصیات

غالب

دیگر شخصیات

طب

کتابیات

لسانیات و لغت

مکاتیب

مذہبیات

تفسیر قرآن

سیرت النبی (صلی اللہ علیہ وسلم)

اخلاق و تصوف

فقہ

جہاد

مسائل و مباحث

مطبوعات جدیدہ (نئی کتابوں پر تبصرے)

پیش نظر اشاریئے کی ترتیب میں اکتوبر ٦٥ء اور دیگر مہینوں کے مندرجہ ذیل رسائل سے مدد لی گئی ہے

ـــ المنار	ربوہ	جولائی تا اگست ٦٥ء	ماہنامہ عارف	لاہور	اکتوبر و نومبر ٦٥ء
ماہنامہ المنبر	لائل پور	اکتوبر ٦٥ء	,, عصمت	کراچی	اکتوبر ٦٥ء
سہ ماہی اردو نامہ	کراچی	جولائی تا ستمبر ٦٥ء	,, فاران	,,	,,
ماہنامہ الرحیم	حیدرآباد	اکتوبر نومبر ٦٥ء	,, فکر و خیال	,,	اگست ستمبر ٦٥ء
,, انجمن اسلامیہ میگزین	کراچی	ستمبر ٦٥ء	,, فکر و نظر	,,	اکتوبر ,,
,, بینات	,,	اکتوبر ٦٥ء	,, قومی زبان	,,	,,
,, پیام عمل	لاہور	,,	,, کتابی دنیا	,,	,,
,, ترجمان القرآن	,,	,,	,, ماہ نو	,,	,,
,, تحریک جدید	ربوہ	اگست ٦٥ء	,, مشرق	,,	اگست ستمبر ٦٥ء
,, تہذیب الاخلاق	لاہور	اکتوبر ٦٥ء	,, منشور	,,	اکتوبر ,,
,, ثقافت	,,	,,	,, نقوش لاہور	لاہور	ستمبر ٦٥ء شمارہ ۱۰۳
,, چراغ راہ	کراچی	,,	,, نئی قدریں	حیدرآباد	شمارہ ۱۰ ٦٥ء
,, خاتون پاکستان	,,	(جنگ و جہاد نمبر) ,,	,, نیرنگ خیال	لاہور	اکتوبر ,,
,, ساقی	,,	ستمبر و اکتوبر ٦٥ء	ہفت روزہ المنبر	لائل پور	,, ,,
,, سیارہ	لاہور	اکتوبر ٦٥ء	,, چٹان	لاہور	,, ,,
,, سیارہ ڈائجسٹ	,,	,,	,, شہاب	,,	ستمبر و اکتوبر ,,
,, طلوع اسلام	,,	,,	,, لاہور	,,	اکتوبر ,,

اردو ادب و زبان

اردو ادب (مسائل و مباحث اور تحقیق و تنقید)

احسن فاروقی، ڈاکٹر	ادب اور علوم	ساقی، ص ۳تا ۸ + ۳۲ - ۳۴، ستمبر
اسمٰعیل حسن خاں، ملک	یگانہ کا مرتبہ بہ حیثیت غزل گو	نقوش، ص ۲۷۵تا ۳۰۰، "
اسمٰعیل پانی پتی، شیخ محمد	سرسید کی ادبی حیثیت (۳)	تہذیب الاخلاق، ص ۷تا ۲۹، اکتوبر
اقتدار عالم خاں	اردو میں ناول نگاری کی ابتدا ۔ ایک نیا زاویہ نظر	نقوش، ص ۲۵۰تا ۲۶۰، ستمبر
اینڈرسن، ڈاکٹر ڈیوڈ ۔ ڈی	پاکستان کی موجودہ شاعری	قومی زبان، ص ۲۴تا ۲۸، اکتوبر
حمید کوثر، پروفیسر	اردو کی قومی شاعری	ساقی، ص ۱۸تا ۲۰، ستمبر
جنید ہاشمی	مثنوی گوئی پر اجمالی نظر	المنار، ص ۱۳تا ۱۸، جولائی ستمبر
شبنم رومانی	ٹیڈی ادب	عارف، ص ۵۴تا ۸۴، اکتوبر نومبر
ظفر مینائی	مثنوی کا ہیرو	ساقی، ص ۱۲تا ۲۷، اکتوبر
عباداللہ فاروقی	اکیڈمی	ثقافت، ص ۲۳تا ۳۵، "
عبداللہ، ڈاکٹر سید	ادبی مسائل	ساقی، ص ۴تا ۱۵ + ۵۸ - ۶۲ + ۶۴، ستمبر
فراق گورکھپوری، شوق، پرکاش	بات چیت	نقوش، ص ۲۳۵تا ۲۳۹، ستمبر
کسری منہاس	رڈیارڈ کپلنگ	" " ۲۶۶تا ۲۷۴، "
ماہر القادری	فاران کی تنقیدیں	فاران، ص ۸تا ۲۴، اکتوبر
"	فیض کی شاعری[1]	نیرنگ خیال، ص ۳۲تا ۵۱، اکتوبر
محمد علیم	اردو ادب کا دبستان لاہور	نئی قدریں، ص ۱۳تا ۲۱،
محمد عقیل، ڈاکٹر سید	تنقید کا تاریخی شعور	نقوش، ص ۲۴۰تا ۲۴۹، ستمبر
معز الدین، ڈاکٹر	نذرالاسلام کی شاعری	ساقی، ص ۴۱تا ۴۳، "

[1] ماہنامہ افکار کے فیض نمبر پر تبصرہ ۔ منقول از فاران ۔ کراچی

ماہر، نصیر احمد — بہزاد اور اس کا فن — ماہ نو، ص ۱۱۱ تا ۱۱۴، اکتوبر

نظامانی، کریم بخش — کیا شاہ عبداللطیف بھٹائی ترقی پسند تھے؟ — چراغ راہ، ص ۲۹ تا ۳۲، "

اردو زبان

نورالدین، ڈاکٹر ابو سعید — مشرقی پاکستان میں اردو — ماہ نو، ص ۷۴ تا ۷۷ + ۱۱۶، اکتوبر

رئیس احمد جعفری — ہماری قومی زبان — ثقافت، ص ۳ تا ۴، اکتوبر

آپ بیتی

ادا جعفری — شگوفے (میری پہلی نظم) — نقوش، ص ۵ تا ۱۰، ستمبر

آرزو، مختار الدین احمد — مختار الدین احمد آرزو — " " ۱۶ تا ۲۸، "

بادکر، ڈاکٹر عبدالرحمٰن — میں اسلام کیوں قبول کیا — المنبر، ص ۲ + ۱۲، ۵؍ اکتوبر

عتیقی، حکیم عبدالمجید — میری داستان زندگی (۱) — شہاب، ص ۴، ۵؍ ستمبر

" " — " " (۲) — " " ۳ + ۱۸، ۱۹؍ "

نعیم صدیقی — درمیان سنگ و آہن — چراغ راہ، ص ۳۳ تا ۳۷، اکتوبر

تاریخ

ابن صحرا — دوسری جنگ عظیم کا آخری منظر — سیارہ ڈائجسٹ، ص ۱۲۵ تا ۱۳۱، اکتوبر

ابو سلمان شاہجہانپوری — زردشت اور ان کا مذہب — الرحیم، ص ۳۹۲ تا ۴۰۰، اکتوبر نومبر

امام اکبر آبادی — مسلم عورت کے کارنامے — عصمت، ص ۲۱۵ تا ۲۵۲، اکتوبر

حسان علوی، حافظ — شہزادہ خسرو اور بی بی بتولن — مشرق، ص ۱۱ تا ۱۴، اگست ستمبر

سعیدالزماں دہلوی — بابائے اردو — " " ۲۸ تا ۳۱، " "

سکندر احمد — ترکی — ایک تاریخی جائزہ — نیرنگ خیال، ص ۶۵ تا ۷۲، اکتوبر

شفقت رضوی — مملکت ارسطو کی نظر میں — فکر و خیال، ص ۵۵ تا ۵۹، اگست ستمبر

شفیق بریلوی — جنگ و جہاد میں مسلمان عورتوں کا حصہ — خاتون پاکستان، ص ۳۶ تا ۳۸، اکتوبر

صفدر حسین، ڈاکٹر — دلی کا زوال — فکر و خیال، ص ۱۷ تا ۲۶، اگست ستمبر

مصنف	عنوان	رسالہ / صفحات / ماہ
ظفر احمد عثمانی، مولانا	حضرت عثمان غنیؓ پر مولانا مودودی کی تنقید	شہاب، ص ۱۰ تا ۱۲، ۵ ستمبر
" "	حضرت عثمان غنیؓ پر الزامات — تاریخ و تحقیق کی روشنی میں (۲)	شہاب، ص ۱۱ تا ۱۲، ۱۹ ستمبر
" "	حضرت عثمان غنیؓ پر الزامات ..... (۳)	" " ۱۱ تا ۱۲، ۲۶ " "
" "	" " " " — تاریخ و تحقیق کی روشنی میں	" " ۳ اکتوبر
	" " " " — تاریخ و تحقیق کی روشنی میں	" " ۱۱ " ۱۰ " "
" "	" " " " — تاریخ و تحقیق کی روشنی میں	" " ۱۱ " ۱۷ " "
مودودی، مولانا سید ابوالاعلیٰ	خلافت اور ملوکیت کا فرق (۳)	ترجمان القرآن، ص ۳۳ تا ۴۶، اکتوبر
" " "	سوالات و اعتراضات بسلسلہ بحث خلافت	" " " ۴۶ تا ۶۱، "
یامین خاں، نواب سر محمد	واقعات گڑھ مکتیشر	عصمت، ص ۲۴۲ تا ۲۴۴، "
———	ہماری تاریخ — مولانا مودودی سے چند سوالات	طلوع اسلام، ص ۳۳ تا ۳۸، "
———	غزوات و فتوحات اسلام	ماہ نو، ص ۳۶، اکتوبر
———	۱۱ ستمبر کی یادیں	طلوع اسلام، ص ۱۷ تا ۲۵، اکتوبر

تعلیم

مصنف	عنوان	رسالہ / صفحات / ماہ
احمد، مولوی ریاض الدین	خوش نصیب لیکچرر	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۳۳ ۔ ۳۴، ستمبر
افسر حسین	معلمی کے پیشے کی اہمیت	فکر و خیال، ص ۲۳ تا ۳۳، اگست ستمبر
مسلم ضیائی	طب مغربی کی تعلیم اردو میں	اردو نامہ، ص ۵۰ تا ۵۹، جولائی تا ستمبر
	فنی و ٹیکنیکی تعلیم	فکر و خیال، ص ۴۴ تا ۵۴، اگست ستمبر

تمدن و معاشرت

مصنف	عنوان	رسالہ / صفحات / ماہ
واحدی، ملا	عقائد کا اثر معاشرے پر	فاران، ص ۵۲ تا ۷۲، اکتوبر

	اسلامی معاشرت کے بنیادی اصول	المنبر، ص ۸ / ۲۲ر اکتوبر
ود طاہر	اصلاح معاشرہ میں طالب علم کا کردار	المنار، ص ۱۹ تا ۲۴، جولائی تا ستمبر
رالنساء رحمٰن	تعلیم نسواں اور ہمارا معاشرہ	عصمت، ص ۱۹ تا ۲۰، اکتوبر
ہر، پروفیسر سعیدہ عروج	عورت اور زمانہ امن و جنگ	خاتون پاکستان، ص ۵۸ تا ۶۲، "
وز سلطان	اسلامی معاشرہ اور تعلیم	فکر و خیال، ص ۴۳ تا ۴۸، اگست و ستمبر
سام اللہ، محمد	سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ اور اصلاح معاشرہ	عارف، ص ۴۳ تا ۴۹، اکتوبر نومبر

ثقافت

یب، مرزا	ان دنوں لاہور میں (۳)	ماہ نو، ص ۱۰۶ تا ۱۱۰، اکتوبر
جپوت، اللہ بخش	پاکستان کا جدید فن تعمیر	" " ۱۱۷ تا ۱۱۹، "
لمان عزیز	اولمپک کے کھیل	تہذیب الاخلاق، ص ۵۴ تا ۵۸، اکتوبر

سفرنامہ

ست الوحی	میرا سفر حج	عصمت، ص ۲۶ تا ۳۳، اکتوبر
مد شریف، مولانا	ارض پاک سے ارض مقدس تک	المنبر، ص ۵ تا ۶، ۹ر اکتوبر

سیاسیات

مد ندیم قاسمی	لاہور، لاہور ہے	خاتون پاکستان، ص ۴۷ تا ۶۷، اکتوبر
تخار جلیل	اقوام متحدہ	منشور، ص ۱۳، اکتوبر
طاف گوہر	محاذ جنگ سے	خاتون پاکستان، ص ۱۷ تا ۳۷، اکتوبر
یوب خاں، فیلڈ مارشل محمد	فائر بندی	" " ۱۲۸ تا ۱۳۰، "
" " " "	صدر کی تقریریں	سیارہ ڈائجسٹ، ص ۸۳ تا ۹۴، "
" " " "	امتحان کا وقت آ پہنچا	خاتون پاکستان، ص ۶ تا ۷، "
ابد عالم اور جرائد عالم	ہم اکیلے نہیں ہیں (مسئلہ کشمیر)	ماہ نو، ص ۳۹ تا ۴۳، اکتوبر
جمیر عالم	دنیائے عرب	نقوش، ص ۵۴۳ تا ۵۴۷، ستمبر

بھارتی نیتا	یوں بھی ہوتا ہے اور یوں بھی (مسئلہ کشمیر)	ماہ نو، ص ۱۶ تا ۱۸، اکتوبر
بھٹو، وزیر خارجہ ذوالفقار علی	کشمیر اور اقوام متحدہ	خاتون پاکستان، ص ۱۲۱ تا ۱۳۰، اکتوبر
ترابی، علامہ رشید	کراری و شبیری	" " ص ۲۷ تا ۳۸، "
خالد حمیدی	کشمیر ـ منظر، پس منظر	منشور، ص ۱۰ تا ۱۱، اکتوبر
خورشید آرا بیگم، پروفیسر	بیداری تقدیر	خاتون پاکستان، ص ۴۵ تا ۵۰، اکتوبر
شفیق بریلوی	پاکستانی فضائیہ، بریہ اور بحریہ	" " ص ۱۲۱ تا ۱۲۶، "
شورش کاشمیری	قرون اولی کے غزوات کی تصویریں ـ لاہور کے مختلف محاذوں پر ایک دن	چٹان، ص ۸ تا ۱۰، ۱۱ راکتوبر
"	شہر کے لوگ[1]	" ص ۸ تا ۹، ۲۵ ر "
عبدالحامد بدایونی، مولانا	نصر من اللہ و فتح قریب	خاتون پاکستان، ص ۳۰، اکتوبر
عبدالوحید، خواجہ	قومی دفاع اور بین الاقوامی تعلقات	" " ص ۴۳ تا ۵۱، "
عبداللہ، شیخ محمد	مسئلہ کشمیر	ماہ نو، ص ۳ تا ۱۵، اکتوبر
عمر ندوی، وحید	مشرقی پاکستان کا جوش جہاد	خاتون پاکستان، ص ۷۷ تا ۷۸، اکتوبر
غنی، میر غلام احمد	کشمیر کشمیری شاعر کی نظر میں	ماہ نو، ص ۱۲۰ تا ۱۲۲، اکتوبر
لطیف انصاری، خواجہ محمد	قومی دفاع	پیام عمل، ص ۳ تا ۷، "
محمد ابراہیم، سردار		
مترجم ـ عنایت اللہ	یوم کشمیر	سیارہ ڈائجسٹ، ص ۳۹ تا ۴۳، اکتوبر
ممتاز لیاقت	پاک فوج، پاک فضائیہ، پاک بحریہ	چٹان، ص ۶ تا ۱۱، ۱۸ راکتوبر
"	مسئلہ کشمیر ـ سلامتی کونسل سے انقلابی کونسل تک (۲)	چٹان، ص ۷ تا ۱۰، ۴ راکتوبر
"	صدر سوئیکارنو اور انڈونیشیا	" ص ۸ تا ۱۰، ۱۸ ر "
مودودی، مولانا سید ابوالاعلی	جہاد پاکستان	خاتون پاکستان، ص ۶۰ تا ۶۹، اکتوبر
بیاں بیگم ہاشمی	لخت جگر محاذ پر	" " ص ۷۹ تا ۸۲، "

---

[1] ریڈیو پاکستان لاہور سے ایک نشریہ ـ ہندوستان پاکستان کے تعلقات کے موضوع پر۔

مصنف	عنوان	ماخذ
————	دماغ ملک و ملت کے لئے دانشوروں کی سرگرمیاں	ماہ نو، ص ۱۳ تا ۲۳، اکتوبر
————	یہ جنگ کیوں لڑی جا رہی ہے؟	سیارہ ڈائجسٹ، ص ۳۴ تا ۴۷، اکتوبر
————	سیالکوٹ محاذ کی روئیداد	چٹان، ص ۱۱ تا ۱۳، ۱۰ر اکتوبر
————	ہندوستانی شکست کی کہانی — عالمی اخبارات کی زبانی	چٹان، ص ۱۵، ۴ر اکتوبر
————	مسئلہ کشمیر — دنیا کیا کہتی ہے	" " ۱۱، ۴ر "
————	۶ر ستمبر سے ۲۳ر ستمبر تک — جنگ و جہاد کے سترہ دن	خاتون پاکستان، ص ۱۳۹ تا ۱۵۵، اکتوبر
————	بھارت کے سیکولرازم کا پس منظر پیش منظر	لاہور، ص ۶ تا ۷ + ۱۱۶، ۲۵ر اکتوبر
————	بدعہد بھارت	" " ۲، ۴ر اکتوبر
————	کشمیر اقبال کی نظر میں	طلوع اسلام، ص ۲۶ تا ۲۹، اکتوبر
————	ملیشیا — ایک سامراجی چال	لاہور، ص ۶ تا ۷ + ۱۵، ۴ر اکتوبر

شخصیات

غالب

مصنف	عنوان	ماخذ
عرشی، امتیاز علی	غالب کی نئی فارسی تحریریں	نقوش، ص ۵۲۷ تا ۵۳۷، ستمبر
" "	مکاتیب عرشی — غالب سے متعلق چند نکات	ماہ نو، ص ۳۵ تا ۵۱ + ۱۱۶، اکتوبر
آفسر، مرزا محمود شاہ بیگ	غالب اور تصوف	نئی قدریں، ص ۲۲ تا ۳۱،

دیگر شخصیات

مصنف	عنوان	ماخذ
ابو الجلال ندوی	خدا کے محبوب	خاتون پاکستان، ص ۲۰ تا ۲۶، ۷ر اکتوبر
احتشام الحق، مولانا	مجاہد اعظم	" " ۳۴ تا ۳۵، "
ادیب	سالار جنگ اعظم	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۲۲ تا ۲۸، ستمبر
اسمٰعیل حسن خاں، ملک	یاس عظیم آبادی	ساقی، ص ۳ تا ۱۴، اکتوبر

برق صدیقی فتح پوری	ایک اہم ڈرامہ نگار	نقوش، ص ۱۳۰ تا ۱۳۲، ستمبر
بلدیو دیوان	مجاز	ساقی، ص ۹ تا ۱۲، ستمبر
حسرت کاسگنجوی	پاکستان کے ممتاز ناول نگار	" " ۲۴ تا ۳۰، "
"	" " "	" " ۴۴ تا ۴۸، اکتوبر
خلیق انجم	منشی عبدالقدیر	" " ۳۸ تا ۴۰ + ۴۴، ستمبر
سراج نظامی	سر سید احمد خاں	سیارہ ڈائجسٹ، ص ۱۷ تا ۲۷، اکتوبر
شاہد احمد دہلوی	مولانا صلاح الدین احمد	ساقی، ص ۵۸ تا ۶۲، اکتوبر
شاہین، شیخ محمد اقبال	یونس حسن خواجہ شہید	چٹان، ص ۴ + ۱۲، ۱۸ار "
شمیم احمد	مولانا حامد علی خاں	قومی زبان، ص ۹ تا ۱۱، "
شورش کاشمیری	قلمی چہرے — دو گورنر — امیر محمد خاں۔ عبدالمنعم خاں	چٹان، ص ۴، ۱۸ر اکتوبر
شہابی، انتظام اللہ	امیر العسکر جنرل بخت خاں	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۱۶ تا ۱۷، ستمبر
"	مولوی باقر حسین	" " " " ۱۸ تا ۲۱، "
"	جسٹس بدر الدین	" " " " ۲۹ تا ۳۰، "
"	مشاہیر اکبر آباد	" " " " ۳۱ تا ۳۴، "
عبدالحمید، ڈاکٹر خواجہ	گاندھی جی اور مولانا شوکت علی — کچھ پرانی یادیں	ثقافت، ص ۳ تا ۷، ۱۰، اکتوبر
عکس، محبوب عالم	ایک عوامی شاعر — طاہر مراد آبادی	ماہ نو، ص ۸۰ تا ۸۱، "
محمد ایوب قادری، پروفیسر	محمد یعقوب نانوتوی	الرحیم، ص ۳۴۰ تا ۳۴۷، اکتوبر نومبر
مغنی حیدر	جوہر حریت مولانا محمد علی جوہر کی یادیں	عارف، ص ۴۱ تا ۵۳، " "
ممتاز حسن	مولانا سید محمد مرتضیٰ ادیب	الحق نامہ، ص ۷ تا ۲۲، جولائی تا ستمبر
واحدی، ملا	عارف ہسوی	ساقی، ص ۳ + ۲۸، ستمبر
———	میجر راجہ عزیز بھٹی نشان حیدر	چٹان، ص ۴، ۱۱ر اکتوبر
———	اعزاز پانے والے چند شیر دل (مجاہد)	خاتون پاکستان، ص ۱۵۰ تا ۱۵۵، اکتوبر
———	سید علی امام	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۳۱ تا ۳۴، ستمبر

	عبدالعزیز خالد — ایک عظیم شاعر - ایک عظیم انسان	شہاب، ص ۸ تا ۱۰، ۳۱ اکتوبر

طب

محمود احمد	گنجے پن کا علاج	سیارہ ڈائجسٹ، ص ۱۱۲ تا ۱۱۵، اکتوبر
یسین علوی، محمد	نفسیاتی علاج کیا ہے؟	فکر و خیال، ص ۴۷ تا ۴۹، اگست و ستمبر

کتابیات

ابو سلمان شاہجہانپوری	نئے خزانے (اپریل ۶۵ء کے اخبارات و رسائل کا موضوع وار اشاریہ)	قومی زبان، ص ۹۲ تا ۱۰۶، اکتوبر
اسلم پرویز، پروفیسر	دلی سے دلی تک [1]	ساقی، ص ۱۵ تا ۵۷ + ۲۰۰، ستمبر
افسر امروہوی	گنج ہائے گراں مایہ (مخطوطات انجمن ترقی اردو کی وضاحتی فہرست)	قومی زبان، ص ۱۷ تا ۳۲، اکتوبر
اکبر الدین صدیقی، محمد	شام غریباں کا ایک نادر نسخہ	نقوش، ص ۲۶۱ تا ۲۶۸، ستمبر
بدوی، لطف اللہ	مثنوی غذائے روح	الرحیم، ص ۳۴۸ تا ۳۶۰، اکتوبر نومبر
رضیہ فصیح احمد	آبلہ پا — ناول کی داستان تحریر و ترتیب	ماہ نو، ص ۶۹ تا ۷۳، اکتوبر
سہیل بخاری	باغ و بہار — ایک تنقیدی جائزہ	" " ۵۴ تا ۶۶، "
طالب ہاشمی	تذکرہ غوثیہ سے چند یادداشتیں	سیارہ، ص ۳۱ تا ۳۶، "
عبدالماجد دریابادی، مولانا	ابوالکلام کی ادبی تخلیقات	نقوش، ص ۵۱۵ تا ۵۱۸، ستمبر
غلام مصطفٰے قاسمی، مولانا	شاہ ولی اللہ کی تالیفات پر ایک نظر	الرحیم، ص ۳۷۱ تا ۳۷۱، اکتوبر نومبر
مہر، مولانا غلام رسول	داغ حسرت کا تعارف	نقوش، ص ۵۱۹ تا ۵۲۶، ستمبر
نصیر الدین ہاشمی، مولوی	مثنوی کدم راؤ پدم راؤ	قومی زبان، ص ۱۲ تا ۱۶، اکتوبر
	تحفۃ الطالبین عالم شال	ثقافت، ص ۴۱ تا ۴۸، "

---

[1] ضمیر کے انشائیوں کے مجموعے "دلی سے دلی تک" پر تنقید

ضیاء الدین احمد	رسالوں پر طائرانہ نظر [1]	کتابی دنیا، ص ۹ تا ۱۵ + ۱۰، اکتوبر

لسانیات و لغت

ب، احمد علی خاں	صحت الفاظ کا معیار	اردو نامہ، ص ۳ تا ۳۰، جولائی تا ستمبر
ی بخاری، سید اے	پشتو کی بنیادی آوازیں۔	" " ۳۷ تا ۴۹ " "
ن	ترتیب لغت کا مسئلہ	" " ۵۳ تا ۶۷ " "
ت سبزواری، ڈاکٹر	اشتقاقات	" " ۶۸ تا ۶۹ " "
یں، حکیم	طیار یا تیار	فاران، ص ۱۱ تا ۱۲، اکتوبر
صابر، ڈاکٹر	ترکی الفاظ، تلفظ اور املا	اردو نامہ، ص ۱۳ تا ۲۶، جولائی تا ستمبر
———	اردو لغت — مجمل ایڈیشن قسط نمبر ۱۵	" " ۷۹ تا ۱۳۰ " "
مصطفیٰ، پروفیسر سید	الفاظ کا سفر	ثقافت، ص ۶۳ تا ۷۰، اکتوبر

مکاتیب

ینہ، دیریندر پرشاد	چند خطوط [2]	ثقافت، ص ۵۳ تا ۵۸، اکتوبر
الحلیم چشتی، مولانا محمد	مرزا حسن علی صغیر اور شاہ عبدالعزیز کے دو مکتوب	الرحیم، ص ۷۳ تا ۹۱، اکتوبر نومبر

مذہبیات

تفسیر قرآن

شفیع، مولانا مفتی	معارف القرآن سورہ ہود آیت ۱ تا ۵	شہاب، ص ۷ + ۱۲، ۵ ستمبر
" "	" " " ۶ تا ۸	" " ۷ + ۱۴، ۱۹ "
" "	" " " ۹ تا ۱۴	" " ۷ + ۱۰، ۲۶ "
" "	نیک عمل کرنے والے کافروں کو عذاب کیوں ہوگا	" " ۷ + ۱۲، ۳ اکتوبر
" "	معارف القرآن	" " ۷ تا ۸، ۱۰ "

---

[1] چند علمی و ادبی رسائل کے مضامین کا تعارف۔ [2] منشی دیا نرائن نگم کے تین غیر مطبوعہ خطوط ٹھاکر چندر بھوشن سنگھ کے نام

نیع، مولانا	معارف القرآن — حضرت نوح علیہ السلام کا قصہ	شہاب، ص ۷ + ۱۲، ۱۷ اکتوبر
دی، مولانا سید ابوالاعلیٰ	الاحقاف (۲)	ترجمان القرآن، ص ۷ تا ۲۲، "
ٹونکی، مولانا سعد حسن خاں	تفسیر سورہ فاتحہ	فاران، ص ۳ تا ۴۲، اکتوبر

سیرت النبی (علیہ الصلوٰۃ والسلام)

ع الاصفہانی، حافظ ا۔ مولوی محمد احمد	اخلاق النبی	بینات، ص ۴۳ تا ۴۹، اکتوبر
ا، ابوطاہر	ہمارا آقا صلی اللہ علیہ وسلم (۱)	لاہور، ص ۴، ۱۱ اکتوبر
"	" " (۲)	" " ۴ + ۲۲، ۱۸ " "
"	" " (۳)	" " ۴ + ۱۴، ۲۵ " "

اخلاق وتصوف

لمال مبارکپوری	اسلامی اخلاق	المنبر، ص ۷ تا ۸، ۵ اکتوبر
ا چشتی	شاہ مراد اور وحدت الوجود کا سماجی پہلو	نیرنگ خیال، ص ۸ تا ۱۳، اکتوبر
رور	وحدت الوجود اور وحدت الشہود	الرحیم، ص ۳۲۵ تا ۳۳۹، اکتوبر نومبر

فقہ

، محمد تقی	احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت	فکرونظر، ص ۲۷۳ تا ۲۸۳، اکتوبر
"	" " " "	طلوع اسلام، ص ۴۹ تا ۴۴، "

جہاد

ن جارچوی، مولانا	امام وقت کی اجازت	خاتون پاکستان، ص ۳۹، اکتوبر
ن اصلاحی، مولانا	موجودہ جہاد — پس منظر اور پیش نظر	المنبر، ص ۷ تا ۸، ۲۹ اکتوبر
. فیروز، محمد	جہاد کی اہم مثالیں	خاتون پاکستان، ص ۴۰ تا ۴۱، اکتوبر

صادق قریشی، پروفیسر محمد	جہاد کے متعلق چند آیات	پیام عمل/ص ۱۰ تا ۱۱/ اکتوبر
عبدالقدوس ہاشمی/ مولانا سید	جہاد اور اس کی اہمیت	خاتون پاکستان/ص ۷ تا ۱۹/ "
محمد اشرف، قاضی	جنگ و جہاد اور احادیث نبوی	" " " ۲۴ تا ۲۵/ "
محمد شفیع، شفیع	جنت تلواروں کے سائے میں	" " " ۳۰ تا ۳۱/ "
مظفر النسا، بیگم	مقصد جہاد	" " " ۵۴ تا ۵۷/ "
محمد شفیع/ مولانا مفتی	موجودہ جہاد میں ہمارے فرائض	فکر و خیال/ص ۱۱ تا ۱۲/ اگست ستمبر

مسائل ومباحث

ادریس/ مولانا محمد	سنت جاریہ دائمہ مجتہدین (۵)	بینات/ص ۳۰ تا ۴۹/ اکتوبر
اشرف، حکیم عبدالرحیم	اسلام ہمارے طرز عمل کی مشعل کیسے ہوسکتا ہے؟	المنبر/ص ۲ + ۱۱/ ۲۹ر "
تمنا عمادی	گداگری اور قرآن حکیم	فکر و نظر/ص ۲۱۹ تا ۲۴۳/ "
جعفر پھلواروی/ مولانا شاہ	کلمہ طیبہ کا زور	خاتون پاکستان/ص ۲۳ تا ۳۳/ اکتوبر
حنیف ندوی/ مولانا محمد	خوارج کے عقائد	ثقافت/ص ۷ تا ۳/ اکتوبر
رفیع اللہ	حالیہ قوانین	فکر و نظر/ص ۲۸۳ تا ۲۹۸/ "
عمر احمد عثمانی	یتیم پوتے کی وراثت	" " ۳۰۴ تا ۳۱۸/ "
عرفان احمد	سیاہ فام افریقہ میں اسلام کی روشنی	المنبر/ص ۹ تا ۱۰/ ۵ر اکتوبر
علی نقی النقوی/ علامہ سید	اسلام میں عورت کا درجہ	پیام عمل/ص ۱۲ تا ۱۵/ "
فاطمہ ہیرن	اسلام کے دروازے پر — ایک برمن خاتون کے قبول اسلام کی ایمان افروز داستان	چراغ راہ/ص ۱۲ تا ۲۲/ اکتوبر
محمد سرور	دین اور شرائع	فکر و نظر/ص ۲۵۳ تا ۲۶۰/ "
محمد نیاز	مسئلہ حفاظت فروج	طلوع اسلام/ص ۶۵ تا ۷۹/ "
نجات اللہ صدیقی، محمد	اسلامی معیشت کے بعض پہلو	چراغ راہ/ص ۱۹ تا ۲۸/ "
منیر جعفری/ سید	اسلام میں مساوات کا مقام	فکر و خیال/ص ۱۳ تا ۱۶/ اگست ستمبر
وحیدالدین خاں	خدمت دین کی مشکلات	المنبر/ص ۵ تا ۶/ ۲۲ر اکتوبر
	اسلام ہمارے طرز عمل کا مشعل کیسے ہوسکتا ہے	" " ۲ + ۱۱/ ۲۲ر "

مطبوعات جدیدہ (نئی کتابوں پر تبصرے)

نام	مصنف	تبصرہ نگار	حوالہ
ارشادات داتا گنج بخشؒ	رؤف احمد نوشاہی	ص۔ا۔ب	کتابی دنیا، ص ۹، اکتوبر
ارمغان صابر	علاء الدین علی احمد صابری	" " "	" " " ۵، "
الٹ پھیر	شوکت تھانوی	" " "	" " " ۹تا۱۰، "
اشاعت اسلام	مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی	—	شہاب، ص ۱۳، ۱۳ر "
بچوں کے لئے قرآن	ڈاکٹر عبدالرؤف	—	" " ۱۳، ۱۳ر "
بھول بھلیاں	سید عنایت علی رضوی	—	فاران، " ۵۴تا۵۷، "
" "	" "	ص۔ا۔ب	کتابی دنیا، ص ۴، "
ذکر نوشاہی	سید شریف احمد شرافت نوشاہی	" " "	" " " ۱۰، "
حیات شیخ سلیم چشتی	سراج احمد عثمانی	" " "	" " " ۹، "
تلامذۂ میر	امداد صابری	" " "	" " " ۸تا۹، "
تمدن یورپ	احسان محمد خاں	" " "	" " " ۷تا۸، "
فارقلیط	عبدالعزیز خالد	مالک رام	" " " ۱تا۳، "
فوائد جامعہ بر عجالہ نافعہ	شاہ عبدالعزیز دہلوی مترجم: مولوی عبدالحلیم چشتی	ص۔ا۔ب	" " " ۴تا۶، "
پاکستان اور بین الاقوامی قانون کا ارتقا	ڈاکٹر محمد احسان	ممتاز احمد	چراغ راہ، ص ۸۴، اکتوبر
تحقیق وحدت الوجود والشہود	مولانا شیخ محمد تھانوی محدث	—	فاران، ص ۳۰تا۳۴، "
تذکرہ افریقہ	گلزار احمد	—	" " ۵۷تا۵۹، "
تذکرہ غالب آلی مع انتخاب کلام	لفٹیننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید	—	" " ۵۲تا۵۴، "
تعلیمات مجددیہ	ملک حسن علی جامعی	—	شہاب، ص ۱۳، ۱۷ر "

نام	مصنف	تبصرہ نگار	حوالہ
تین طلاقیں	محمد قاسم خواجہ	—	المنبر، ص ۱۱، ۲۲ر اکتوبر
ٹیلس آف پروفٹ	ابوالحسن علی ندوی	احمد انس	چراغ راہ، ص ۵۴ تا ۵۶، "
دیواریں	حمید کاشمیری	اختر انصاری	نئی قدریں، ص ۱۰۸ تا ۱۰۹
زمانہ جنگ کی دعائیں	مولانا عبدالرحیم اشرف	—	شہاب، ص ۱۳، ۳۱ر اکتوبر
سب رنگ	عرش صدیقی، مسعود اشعر	اختر انصاری	نئی قدریں، ص ۱۰۹ تا ۱۱۰
سفر	ایس اے رحمٰن	" "	" " ۱۰۶ تا ۱۰۸
سیارہ (ماہنامہ) اشاعت خاص	مدیر:- نعیم صدیقی	ع - ح - ص	ترجمان القرآن، ص ۱۷، اکتوبر
صہبائے سخن	محمد عبدالحی عارفی	غلام محمد	بینات، ص ۵۹ تا ۶۰، "
غم فروزاں	نیاز بدایونی	—	مشرق، ص ۸، ۱۴، اگست ستمبر
فارقلیط	عبدالعزیز خالد	خورشید احمد	چراغ راہ، ص ۴۰ تا ۴۴، اکتوبر
فضائل صحابہ و اہل سنت	شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ	—	فاران، ص ۴۹ تا ۵۰، "
فوائد جامعہ بر عجالہ نافعہ	شاہ عبدالعزیز دہلویؒ مترجم و مرتب:- مولوی عبدالحلیم چشتی	احمد انس	چراغ راہ، ص ۵۴، اکتوبر
فیوض یزدانی	شیخ عبدالقادر جیلانیؒ مترجم:- مولانا عاشق علی میرٹھی	—	شہاب، ص ۱۳، ۱۷ر اکتوبر
قرآن ازم جلد اول و دوم قصاص سیدنا عثمانؓ و تکمیل	غلام احمد صاحب	ع - ح - ص	ترجمان القرآن، ص ۶۱ تا ۶۷، اکتوبر
بیعت رضواں	محمد سلطان نظامی	ص - ا - ب	کتابی دنیا، ص ۶ تا ۷، اکتوبر
قطار شیشہ	خلش بڑودوی	—	فاران، ص ۵۹ تا ۶۲، "
کاروان سائنس (سہ ماہی)	مدیر:- عظمت علی خاں	س - م - ع - ا	مشرق، ص ۷۴ تا ۸۴، اگست ستمبر
کشت زار غزل	عزیز حاصل پوری	—	شہاب، ص ۱۳، ۱۳ر اکتوبر
مراۃ الحق	سید مجیب الدین حسینی داہل	ص - ا - ب	کتابی دنیا، ص ۱۱، اکتوبر
مشارق الانوار (مترجم)	مولانا خرم علی	—	شہاب، ص ۱۳، ۱۷ر "

نام*	مصنف	تبصرہ نگار	حوالہ
معاہدہ عمرانی	روسو		
	مترجم :- ڈاکٹر محمود حسین	ممتاز احمد	چراغ راہ/ ص ۷۴ تا ۸۴/ اکتوبر
معراج العاشقین	سید محمد حسینی	ص - ا - ب	کتابی دنیا/ ص ۱۰/ اکتوبر
ملیشیا کے خلاف انڈونیشیا کی محاذ آرائی	نور احمد قادری	ص - ا - ب	" " " ۵ تا ۷/ "
مولانا مودودی اور جماعت اسلامی علماء کی نظر میں	عارف دہلوی	—	فاران/ ص ۵۰ تا ۵۱/ اکتوبر
میں نے جمعیت سے کیا پایا ؟	—	احمد انس	چراغ راہ/ ص ۴۴ تا ۴۷/ "
نصیحۃ المسلمین	مولانا خرم علی بلہوری	—	شہاب/ ص ۱۷/ اکتوبر
نغمات صداقت	ابو اللیث عتیق الرحمٰن تائب	—	المنبر/ ص ۱۱/ ۲۲/ "

کامیابی

کے لئے ضروری ہے کہ آپ جو الفاظ استعمال کریں اُن کے معانی سے پوری طرح واقف ہوں

اس سلسلے میں

اسٹوڈنٹس اسٹینڈرڈ انگریزی اردو ڈکشنری

آپ کی بہترین معاون ہوسکتی ہے

آپ

گھر میں ہوں —— دفتر میں —— یا —— سفر میں

ہر جگہ یہ ڈکشنری آپ کی بہترین رفیق ہے

طلباء اساتذہ وکلا اطبّا مترجمین اور سرکاری کارکنوں کے لئے

اسٹوڈنٹس اسٹینڈرڈ انگریزی اردو ڈکشنری

ایک بہترین تحفہ ہے

بصورت طباعت، ڈیڑھ ہزار صفحات، اعلےٰ درجے کا بائبل پیپر، مضبوط جلد قیمت صرف ۲۱ روپے

انجمن ترقی اردو، اردو روڈ، کراچی

انجمن ترقی اردو پاکستان کا ماہوار رجحان

قومی زبان

جلد ۲۸ شمارہ ۵

مئی سنہ ۱۹۶۶ء

سالانہ قیمت
دس روپے

فی پرچہ
ایک روپیہ

انجمن ترقی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ
کراچی

فہرست

جناب اختر حسین
صدر انجمن ترقی اردو

تعلیم اور ثقافت

محترم اساتذہ، معزز حاضرین اور عزیز طالب علمو!

میں آپ کا نہایت ممنون ہوں، کہ آپ نے آج کی اس صحبت میں مجھے مدعو کیا۔ اس طرح اپنے ملک کی نئی نسل کے ساتھ چند لمحے گزارنے کا جو موقع مجھے ملا ہے وہ میرے لئے دلی مسرت کا باعث ہے، سب سے پہلے تو میں آپ کو بزم ثقافت کے قیام پر مبارک باد دیتا ہوں اور توقع کرتا ہوں، کہ یہ بزم اس جامعہ کے طالب علموں میں پاکستانی ثقافت سے صحیح معنوں میں دلچسپی پیدا کرنے میں ضرور کامیاب ہوگی،

تعلیم اور ثقافت میں بہت گہرا تعلق ہے تعلیم، ثقافتی قدروں کو اپنانے کا ایک ذریعہ ہے اور ثقافت زندگی بسر کرنے کا ایک مخصوص انداز، وہ تعلیم سراسر نامکمل ہے جس میں ثقافتی قدروں کو نظر انداز کر دیا گیا ہو اور وہ ثقافت زندگی سے دور ہو جاتی ہے جس کی بنیاد اعلیٰ تعلیم اور علمی ماحول پر نہ رکھی گئی ہو۔ تعلیم اگر صرف درسی کتابوں کے مطالعے تک محدود ہے تو طالب علم، زندگی کی پوری وسعتوں سے آگاہ نہیں ہو سکتا اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ معاشرے کی خصوصیات کو بھی پوری طرح سمجھے، کیونکہ ایک اچھا طالب علم کتاب اور ماحول دونوں سے سبق حاصل کرتا ہے، اور انھیں راستوں سے گزر کر اس کی شخصیت، ارتقا کے وہ مدارج طے کرتی ہے، جو ایک باشعور فرد اور ایک صحت مند معاشرے کے لئے ضروری ہیں

ایک امر کی وضاحت بہت ضروری ہے، ہمارے ہاں عام طور پر "ثقافت" کا لفظ نہایت محدود معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے، ثقافت کا دائرۂ عمل عموماً ڈراموں، مشاعروں اور موسیقی کی محفلوں کے انعقاد تک رہ گیا ہے۔ یہ امور ثقافت کا جزو ضرور ہیں۔ لیکن محض انھیں کو ثقافت کا تمام سرمایہ سمجھ لینا کسی طرح مناسب نہیں، ثقافت ایک نہایت سنجیدہ عمل کا نام ہے اس کے دائرہ عمل میں وہ تمام امور آتے ہیں، جن کا تعلق انسان کی ذہنی نشو و نما سے ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ تعلیم کو بھی ثقافت کا جزو سمجھا جاتا ہے، ہمارا رہن سہن، آداب معاشرت، طریق فکر اور اسلوب حیات سبھی کچھ ثقافت سے متعلق ہے اس لئے ہمارے لئے یہ نہایت ضروری ہے، کہ جب ہم ثقافت کا لفظ استعمال کریں۔ تو اسے محض تفریح تک محدود نہ کریں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تفریح بھی زندہ رہنے کے لئے ضروری ہے۔ لیکن صرف تفریح کے سہارے کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی،

آپ کی بزم ثقافت کے پیش نظر سب سے بڑا یہ مقصد ہونا چاہیئے۔ کہ وہ طالب علموں میں ثقافتی شعور پیدا کرے، یہ شعور اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب ہم اس پر غور کریں کہ ہم کیا تھے اب کیا ہیں اور ہمیں آیندہ کیا بننا ہے یعنی ماضی، حال اور مستقبل تینوں زمانوں سے آگاہی رکھنا ضروری ہے، کیونکہ ثقافت زمان و مکان کی وسعتوں پر پھیلی ہوئی ایک اٹل حقیقت اور ایک مسلسل عمل کا نام ہے، ایک ایسا عمل جس میں وقت کے ساتھ ساتھ ارتقا ہوتا رہتا ہے۔ ثقافتی ارتقا منفی بھی ہو سکتا ہے اور مثبت بھی منفی اس طرح کہ ہم اپنے ماضی سے رشتہ توڑ کر بلا سوچے سمجھے دوسری قوموں کی نقالی کرنے لگیں، یہی وہ نقالی ہے، جس کے خلاف اکبرالہ آبادی نے اپنے مخصوص انداز میں طنز کیا تھا۔

ارتقا کی مثبت صورت یہ ہے کہ ہم اپنے ماضی کی روایات کو فراموش نہ کرتے ہوئے دوسری قوموں کی پیروی صرف اسی حد تک کریں، جو نئے حالات سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کرنے کے لئے ضروری ہو۔ ثقافتی ارتقا کے منفی اور مثبت پہلوؤں کو پوری طرح سمجھ لینے ہی کا دوسرا نام ثقافتی شعور ہے اور اسی شعور کو عام کرنا ہمارے لئے ضروری ہے۔ پاکستان ایک نیا ملک ہے۔ لیکن ہماری ثقافتی قدریں نئی نہیں ہیں، ہماری ثقافت کا سرچشمہ ہمارا مذہب ہے، ہم اس سے علیحدہ ہو کر اپنی ثقافت کا تصور نہیں کر سکتے۔ یہی وہ حقیقت ہے جو پاکستان کے مختلف علاقوں کے لئے مشترک ثقافتی پس منظر کا درجہ رکھتی ہے اور لسانی اور معاشرتی تنوع کے باوجود ان کی ثقافتی وحدت کو نمایاں کرتی ہے۔

بعض اوقات "علاقائی ثقافت" کی ایک اصطلاح بھی سننے میں آتی ہے، میرے نزدیک پاکستان کے مختلف علاقوں کی ثقافتوں کو علاقائی ثقافت کہنا درست نہیں، یہ سب ثقافتیں ہماری قومی ثقافت کے مختلف پہلو ہیں۔ اصل چیز پاکستانی ثقافت ہے" پاکستانی ثقافت" کے تصور کو عام کرنے کے لئے ہمیں بڑی جدوجہد کی ضرورت ہے۔ اور یہ مقصد اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا، جب تک ہم شاہ لطیف بھٹائی، بلھے شاہ اور نذرالاسلام وغیرہ کو سندھ پنجاب اور بنگال کے علاقائی فن کار نہ کہیں بلکہ پاکستان کے فن کار کہیں، ان فنکاروں کا تصور، مخصوص علاقوں کے ساتھ نہیں بلکہ پورے پاکستان کے ساتھ وابستہ ہونا چاہیئے، جب ثقافت کا یہ تصور عام ہو جائے گا۔ تو ہم صحیح معنوں میں پاکستانی ثقافت کو سمجھ اور اپنا سکیں گے

آپ طالب علم ہیں آپ زندگی کے ایک ایسے دور سے گزر رہے ہیں، جو کردار کی تشکیل و تعمیر کا دور کہلاتا ہے۔ آپ اس دور میں جو کچھ حاصل کریں گے وہی آیندہ آپ کے پورے ملک کے کام آئیگا۔ اگر آپ یہ طے کر لیں کہ آپ کو پاکستانی ثقافت کے فروغ کیلئے جدوجہد کرنی ہے تو آیندہ چل کر ہماری قومی یکجہتی کا مسئلہ خود بخود حل ہو جائیگا، ثقافت دراصل ایک آئینے کا درجہ رکھتی ہے اس میں کسی قوم کے اصل خدوخال پوری وضاحت سے نظر آتے ہیں، ثقافت کے آئینے میں ہمارا عکس ایسا ہونا چاہیئے کہ جو دیکھے وہ ہمیں پہچان لے

ان الفاظ کے ساتھ میں آپ کی بزم ثقافت کا افتتاح کرتا ہوں، اور دعا کرتا ہوں۔ کہ یہ بزم پاکستانی ثقافت کے فروغ میں اہم حصہ لے

جناب ملک خدا بخش صاحب (رسالۂ قائد اعظم)
وزیر تعلیمات (مغربی پاکستان)

خطبہ

بتقریب جلسہ عطائے اسناد

مغربی پاکستان انجینرنگ یونیورسٹی لاہور

محترم وائس چانسلر، فاضل اساتذہ اور عزیزان کرام!

السلام علیکم!

مَیں وائس چانسلر صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اس جامعہ کے اولین جلسہ عطائے اسناد میں مجھے شمولیت کا موقع دیا۔ نوجوانان وطن کی، جو ملک کے مستقبل کے معمار اور ملت کا سرمایۂ امید ہیں، کامیابی کی خوشیوں میں شرکت کر کے مَیں دلی مسرت محسوس ...رہا ہوں اور انہیں ان کی علمی اور فنی تحصیلات اور حصول اسناد پر دلی مبارکباد پیش کرتے ہوئے دعاگو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کے ...کو ملک و ملت کی خدمت کے جذبے سے سرشار کرے۔ آمین!

عزیزان محترم!

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمانِ خداوندی "قُلْ رَبِّ زِدْنِی عِلْمًا" کی تعمیل میں ایسے علم کی دعا مانگی تھی جو نفع بخش ہو۔ چنانچہ طلب علم ...بارے میں ایک اور دعا جو آپ سے منقول ہے یہ ہے "اللھم انّی اعوذ بک من علم لا ینفع"۔ "یا اللہ! ایسے علم سے تیری پناہ، ...نہ پہنچائے"۔ اس دعائیہ کلمے میں علم کی نفع بخشی پر اٹل اصرار خاص طور پر غور طلب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب سے اُمّت مسلمہ نے اس ...ئے نبوی کی معنوی دانائی کو فراموش کیا ہے اور علم نافع اور علم غیر نافع کی تمیز کھوئی ہے وہ علم کی برکات اور امامت اقوام کے منصب سے محروم ...ہو گئی ہے۔

نبی آخر الزماں نے "العلم سلاحی" فرما کر علم کو اپنا اسلحہ قرار دیا ہے، کسی صاحب ذوق نے انگریزی میں اس کا ترجمہ "Science is my weapon" سے کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر ہم ایٹم بم کی لڑائی کو تلوار کی بدولت جیتنے کی خوش فہمی میں مبتلا رہیں تو نتیجہ ہماری خواہشات کے ...کیسے نکل سکتا ہے؟ ہم پچھلی کئی صدیوں سے زندگی سے براہ راست تعلق رکھنے والے علوم کے بجائے زبان دانی، ادب، شعر و سخن، ...فلسفہ وغیرہ ہی کو کمال تحصیل شمار کرتے رہے ہیں بلکہ آج سے نصف صدی پیشتر تک تو سائنس کو مذہب کی ضد سمجھا جاتا تھا اگرچہ ...بھی شک نہیں کہ ہمارے زمانۂ انحطاط کے ہر دور میں چند ارباب عقل و دانش ضرور یہ محسوس کرتے رہے ہیں کہ ہمارے علوم زندگی کے

ٹھوس مسائل سے روز بروز دُور سے دُور تر ہوتے چلے جا رہے ہیں اور سود و زیاں زندگی سے انہیں کوئی سروکار نہیں رہا لیکن اصلاح احوال کے لئے جو بھی تدابیر اختیار کی گئیں وہ ناکافی تھیں یا پھر زمانے کی برق رفتاری کا ساتھ نہ دے پائیں اور ان کے اثرات دور رس نہ ثابت ہوئے۔

اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تخت نشینی کے موقع پر اپنے اتالیق کی طرف سے مبارکباد کے جواب میں جو مکتوب تحریر کیا تھا اُس میں استاد کے ادب و احترام کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے انھوں نے شکایتاً یہ بھی لکھا تھا کہ ـــــ

"کیا میرے اتالیق کا یہ فرض نہیں تھا کہ وہ مجھے اقوام عالم کے خصائص، اُن کے وسائل اور مادی قوت، اُن کے طریقہ ہائے حرب، اُن کے طور اطوار، اُن کے مذاہب و عقائد، اُن کی رسوم اور عام دلچسپیوں سے آگاہ کرتا اور مجھے تاریخ کا ایسا مطالعہ کرواتا کہ سلطنتوں کی بنا و ابتدا، ان کا عروج و زوال، اُن کی لغزشیں اور کوتاہیاں جن کی بنا پر معاشرتی تبدیلیاں رونما ہوئیں یا انقلاب رونما ہوئے تاریخی واقعات و حوادث اور اسی نوعیت کی جملہ معلومات میرے حیطہ علم میں ہوتیں .... اگر آپ مجھے ایسا فلسفہ پڑھاتے کہ میرا ذہن خوگر استدلال ہو جاتا اور ٹھوس دلائل دیئے بغیر کوئی مجھے قائل نہ کر سکتا، اگر آپ مجھے ایسے اسباق دیتے جو میری روح کی بالیدگی کا سامان بنتے، تقدیر کے تھپیڑوں کو ہمت و پامردی کے ساتھ سہنا سکھاتے اور مجھ میں ایسی حوصلہ مندی پیدا ہو جاتی کہ خوشحالی میرے لئے باعث کبر نہ ہوتی اور بدحالی مجھے پیچانہ دکھا سکتی۔ اگر آپ مجھے مردم شناس بناتے، فطرت و کائنات کے رموز و اسرار سے آگاہ کرتے تاکہ میں ان میں ایک باقاعدگی اور نظم دیکھ پاتا۔ اگر آپ کی نگرانی میں مجھے ایسی تعلیم ملتی تو میں یقیناً ارسطو کے شاگرد افلاطون سے بھی کہیں زیادہ آپ کا احسانمند ہوتا۔"

اسی طرح سر سید احمد خان نے بھی اپنے دَور کے عصری تقاضوں کی صحیح نباضی کرتے ہوئے جس قسم کی تعلیم کو مسلمانوں کیلئے نافع خیال کیا وہ سائنس اور سائنٹیفک افکار تھے۔ جن کے حصول کے لئے اُس زمانے میں انگریزی کی تعلیم ناگزیر تھی۔ چنانچہ انھوں نے مسلمانوں میں انگریزی، سائنس اور سائنٹفک اندازِ فکر کی ترویج کو اپنی زندگی کا مشن قرار دیا۔ اُن کے مشن کے بعض پہلوؤں سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ ان کے مساعی کی بدولت مسلمانوں میں اپنی گمشدہ میراث (یعنی سائنٹفک علوم) کی بازیابی کا شوق پیدا ہوا۔ سر سید اپنے مشن میں بڑے راسخ العقیدہ تھے اور اس کے ایسے پرجوش مبلغ تھے کہ انھوں نے اپنی عزت و شہرت بلکہ زندگی تک کو خطرے میں ڈالنے سے گریز نہیں کیا۔ ملک بھر میں ان کی مخالفت ہوئی۔ سید جمال الدین افغانی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے متعلق سخت کلمات کہے۔ علما نے انہیں نیچری، کافر بلکہ دہریہ تک کا خطاب دے ڈالا۔ لیکن مرحوم اپنی دُھن کے ایسے پکے نکلے کہ انھوں نے اپنے مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچا کر ہی دم لیا۔ مسلمانوں میں جدید سائنٹفک علوم کا ذوق و شوق پیدا کرنے میں ان کا حصہ یقیناً گرانقدر ہے۔

مسلمانوں کی اقتصادی ترقی کے ضمن میں صنعتی علوم کی اہمیت کو سب سے پہلے علامہ اقبال نے محسوس کیا۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں اسٹریچی ہال ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ میں مسلمانوں کے معاشرتی مسائل پر ایک پُر مغز لیکچر دیتے ہوئے آپ نے فرمایا تھا کہ ـــــ

"مسلمان پیشوایان قوم نے اب تک اپنی تمام توجہ اس مسئلے پر صرف کئے رکھی ہے کہ سرکاری نوکریاں ہم لوگوں کو بحصۂ رسدی

ملتی رہیں لیکن یہ بات بھی انہیں مدنظر رکھنی چاہیئے کہ دولت کی پیداوار کا ذریعہ ہونے کے لحاظ سے سرکاری ملازمت ایک نہایت ہی محدود ذریعہ ہے۔ ...... ہمیں صنعتی تعلیم پر ضرور توجہ صرف کرنی چاہیئے جو میری رائے میں اعلیٰ تعلیم سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ صنعتی تعلیم سے عامہ خلائق کی اقتصادی حالت سدھرتی ہے اور یہی طبقہ قوم کے لئے بمنزلہ ریڑھ کی ہڈی کے ہے۔ بخلاف اس کے اعلیٰ تعلیم صرف ان چند افراد کو نفع پہنچاتی ہے جن کی دماغی قابلیت درجہ اوسط سے بڑھی ہوتی ہے۔ ہمارے اعضا کے بذل وجود کا مصرف ایسا ہونا چاہیئے کہ مسلمانوں کے بچے ارزاں تعلیم حاصل کر سکیں۔"

قیام پاکستان کے بعد اللہ تعالیٰ نے ہمیں تعلیم کو ملی مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنانے کا موقع دیا تو ضروری تھا کہ ہم سائنٹیفک اور ٹیکنیکل علوم پر زیادہ سے زیادہ توجہ صرف کرتے۔ یوں بھی ہماری معیشت میں تیزی کے ساتھ انقلاب آرہا تھا، عمائد مملکت ملکی معیشت کا رُخ زراعت سے صنعت کی طرف موڑ رہے ہیں۔ لیکن بڑھتی پھولتی صنعتوں کے لئے اندرون ملک ٹیکنوکریٹ پیدا کرنے کیلئے ٹیکنیکل، تعلیم پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی جا رہی تھی۔ آخر یہ سعادت انقلابی حکومت کے حصے آئی اور مغربی پاکستان میں خالص ٹیکنیکل تعلیم کی غرض و غایت کے لئے سنہ ۱۹۶۱ء میں "ویسٹ پاکستان یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی" کا قیام عمل میں لایا گیا۔

دورِ حاضرہ میں قوموں کا عروج و ارتقا سائنٹیفک اور ٹیکنیکل علوم و فنون ہی کی ترقی اور وسعت پزیری کا رہینِ منت ہے! اقوام دعل کی قوت و شوکت کا انحصار اب کثرت عساکر پر نہیں رہا بلکہ سائنسدانوں اور انجینئروں کی عددی اور معیاری قوت پر ہے کیونکہ یہی وہ قابلِ اعتماد کسوٹی ہے جس پر کسی قوم کی مادی قوت کو پرکھا جاتا ہے۔ اس لئے کسی قوم کی مادی ترقی، اقتصادی اور معاشی خوشحالی کا راز اب اس بات میں مضمر ہے کہ وہ اعلیٰ تربیت یافتہ سائنسدانوں اور انجینئروں کی زیادہ سے زیادہ تعداد پیدا کرنے کا انتظام کرے تاکہ سائنس داں اپنی تحقیقات سے نئے نئے حقائق دریافت کرتے رہیں اور انجینئر ان دریافتوں کو نتیجہ خیز بنا کر ان سے جلد از جلد فائدہ اٹھانے کا اہتمام کریں۔ عصرِ حاضر میں زمان و مکان کے فاصلے سمٹ گئے ہیں، فضا کی پہنائیاں انسان کی مٹھی میں آگئی ہیں اور سائنس و ٹیکنالوجی کے میدان میں اس سُرعت کے ساتھ تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں کہ آج کی جدید ترین دریافت کل ہی کو آثارِ قدیمہ کا ایک نمونہ دکھائی دینے لگتی ہے۔ اس لئے انسانیت کا بڑا مسئلہ آج تحقیق و دریافت ہی نہیں بلکہ عملیت (operationalism) ہے یعنی کم سے کم وقت ضائع کئے بغیر انسان کی علمی کاوشوں کے عملی ثمرات حاصل کرنا۔ انجینئر اور ٹیکنیشن اسی انسانی مسئلے کو حل کرنے کی کوشش میں مصروفِ عمل رہتے ہیں۔

سائنس کے اس نظریہ عملیت پر ایک شہرہ آفاق فلسفی نے اپنے فلسفے کی بنیاد رکھی ہے وہ کہتا ہے کہ سائنٹیفک نظریات چونکہ وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں اور اچھا نظریہ وہ ہے جو "کار آمد" ہو اس لئے جب ایسے مظاہر دریافت ہوتے ہیں جن کے ساتھ یہ نظریہ "کار آمد" نہیں رہتا تو اسے ترک کر دیا جاتا ہے۔ اس سے وہ یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ سائنٹیفک نظریہ دوسرے اوزاروں کی طرح ایک اوزار ہے جو استعمال میں مفید یا غیر مفید ہونے کی بنا پر اچھا یا بُرا قرار پاتا ہے اور جب تک یہ اچھا ہے ہمیں اسے ایک "جائز حقیقت"

فلسفہ جسے برٹرنڈرسل "انجینیروں کا فلسفہ" کہہ کر پکارتا ہے جب افکار و اخلاقیات میں آگھستا ہے تو انسانی شخصیت کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیتا ہے۔ کیونکہ یہ فلسفہ انسان کے اُن دینی عقائد سے براہِ راست متصادم ہوتا ہے جو انسان میں داخلی قطعیت ((Subjective certainty)) پیدا کرکے اس کی شخصیت کو یقین و عقیدہ یعنی داخلی شیرازہ بندی کا سکون بخشتے ہیں چنانچہ سائنس، انجینیرنگ یا ٹیکنالوجی انسان کو مادی سکھ تو پہنچا سکتی ہے لیکن اس کی بے یقینی، تشکیک اور داخلی اضطراب کا علاج نہیں کر سکتی۔

اسلام مادی قوت کے حصول کی نفی یا حوصلہ فرسائی نہیں بلکہ حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ قرآن کریم میں جلیل القدر انبیا کے تذکرے میں اُن کے مادی کمالات کا بھی بیان ملتا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ اُن کے لئے لوہا نرم کر دیا گیا تھا اور وہ اس سے زرہیں اور کڑیاں بنایا کرتے تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ذکر میں بیان ہے کہ اُن کے لئے تانبے کے چشمے بہتے تھے۔ ان باتوں کے بیان کی غرض و غایت اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ یہ باتیں انسان میں دھات سازی، انجینیرنگ اور ٹیکنالوجی وغیرہ کے علوم کے حصول کی تشویق و تحریک کا باعث ہوں یہاں تک کہ لوہے کے عنوان سے ایک سورۃ نازل کی گئی جس میں لوہے کو مظہر قوت و خوف کے علاوہ "منافع للناس" کہہ کر پکارا گیا ہے .... لیکن ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ قرآن حکیم کا اصل کارنامہ تو یہ ہے کہ وہ اپنے مخصوص فلسفۂ توحید کی بدولت انسانی فکر میں داخلی قطعیت (Subjective certainty) کو خارجی کائنات کی معروضی قطعیت (Objective certainty) سے پوری طرح ہم آہنگ کر دیتا ہے۔ وہ اس حقیقت کا واشگاف اعلان کرتا ہے کہ شواہد توحید انسان کے باطن ہی میں نہیں بلکہ خارجی کائنات کی ایک ایک چیز میں بھی پائے جاتے ہیں پھر وہ انسان کو عالم کائنات میں ایسا مقام اور منصب بخشتا ہے کہ خدا کے بعد اسی کا درجہ ہے وہ خدا کی زمین پر اس کا نائب ہے زمین و آسمان کی تمام چیزیں اس کے لئے مسخر ہیں اور وہ بار بار ان پر گہری نظر سے غور کرنے کی دعوت دیتا ہے ان تمام تصوّرات کو نگاہ میں رکھتے ہوئے غور کیجئے کہ کیا سائنس و ٹیکنالوجی کو سیکولر (Secular) رکھنے سے ہی ان میں ترقی کی جا سکتی ہے یا اس کے علاوہ بھی کوئی راہ ممکن ہے؟ جب آپ اس سوال پر پوری دلچسپی اور بے تعصبی سے غور کریں گے تو آپ اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہیں گے کہ اسلام ہی امن و سلامتی اور ترقی کی وہ راہ ہے سائنس کے "لا الٰہ" میں "الا اللّٰہ" کا اضافہ کرکے بنی نوع انسان کو "محمد الرسول اللّٰہ" کی رہنمائی پر منطبق کر سکتی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ خدا کا عقیدہ ہماری ہر علمی کاوش کا نقطہ آغاز ہوتا تھا اور اس زمانے میں ہم نے بیشمار سائنٹیفک علوم ایجاد کر ڈالے اور آج ہماری یہ کیفیت ہے کہ سائنس میں خدا کا نام تک لینے میں متردد ہیں؟ ایک قباحت اور بھی ہے اور وہ یہ کہ ہمارے نوجوان انجینیر اور سائنسدان جن کی زندگیاں عالم ایجادات میں بسر ہوتی ہیں خود اپنی زندگیوں کو بھی "ایجاد بندہ" سمجھنے لگتے ہیں یہ اس پیشے کا وہ گمراہ کن نفسیاتی اثر ہے جس سے طلبہ کو بچانے کے لئے میں جامعہ کے اربابِ اختیار کو خاص طور پر متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ علامہ اقبال نے اپنے کسی نیاز مند کے سامنے مطالعہ فلکیات کو ناپسندیدہ قرار دینے کی دلیل یہ دی تھی کہ وسیع و عریض خلا میں مہیب سیاروں کو تکتے جھانکتے رہنے سے انسان کے دل پر اپنی بے

بضاعتی اور تحقیر کا ایسا نقش جمتا ہے کہ وہ اپنی عظمت سے بے خبر ہو کر خارجی کائنات کی ہیبت سے مرعوب ہو کر رہ جاتا ہے۔ انجینئرنگ کا پیشہ انسانی نفسیات پر ملحدانہ اثرات چھوڑ سکتا ہے۔ روسی سائنسدانوں نے پہلی مرتبہ خلا میں انسان کو بھیجا تو اس کی واپسی پر اعلان کیا کہ انھیں وسعت افلاک میں کہیں خدا نہیں دکھائی دیا حالانکہ وہ اس معمولی سی بات کو بھی نہ سمجھ سکے کہ جو شخص خدا کو اپنی شہ رگ کے نزدیک تر نہیں دیکھ سکتا وہ اُسے خلا کی پہنائیوں میں کیونکر دیکھ سکتا ہے؟ اس صداقت تک انسان کی رسائی اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ انسانی فکر میں داخلی قطعیت اور خارجی قطعیت کی ہم آہنگی ہو جو صرف توحید پر ایمان لانے سے ہی ممکن ہے۔ اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ ہمارا منتہائے مقصود ٹیکنوکریٹ نہیں بلکہ مسلم ٹیکنوکریٹ پیدا کرنا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس جامعہ کے پیش نظر یہی نصب العین ہے۔ شہرہ آفاق ماہر تعلیم مسٹر وائٹ ہیڈ کہتا ہے کہ "تعلیم خواہ لبرل ہو، سائنٹفک یا ٹیکنیکل اُن تمام کا بنیادی موضوع ایک ہی ہے اور وہ ہے انسانی زندگی اپنے تمام مظاہر سمیت"۔ دوسرے الفاظ میں اسے انسان سازی کہہ لیجئے بلکہ تخلیق مومن کہنا اور بھی زیادہ مناسب ہوگا۔

ایک اور ماہر تعلیم مسٹر سٹرٹین (Stratton) کا قول ہے کہ اور ٹکنالوجی اپنے وسیع تر معنوں میں آرٹ، صنعت بلکہ زندگی کے سماجی، سیاسی اور اقتصادی شعبوں پر عمیق اثرات ڈالتی ہے۔ یہ بات حوصلہ افزا ہے کہ انجینئرنگ یونیورسٹی نے ان مضامین کی اہمیت تسلیم کرتے ہوئے معاشرتی اور انسانی علوم کا ایک شعبہ قائم کر دیا ہے جس سے تعلیم کو کامل تر، مفید تر اور مؤثر تر بنانے میں مدد ملے گی۔ مجھے یہ معلوم کر کے بھی بڑی خوشی ہوتی ہے کہ ملک کی توسیع پذیر معیشت کے روز افزوں اور نت نئے تقاضوں کا لحاظ رکھتے ہوئے یونیورسٹی میں نئے نئے شعبہ جات مثلاً پیٹرولیم انجینئرنگ اور پروڈکشن انجینئرنگ وغیرہ کا اہتمام کر دیا گیا ہے مجھے اُمید ہے کہ آئندہ بھی مستقبل کی ضروریات کا پہلے سے اندازہ لگا کر اس کے مطابق نصاب میں ضروری توسیع و ترمیم کی جاتی رہے گی۔

اب میں اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چند باتیں فارغ التحصیل طلبہ سے کرنا چاہتا ہوں۔

(ا) میرے لئے یہ بات باعث تعجب ہی نہیں تکلیف دہ بھی ہے کہ ہمارے انجینئر بالعموم ایڈمنسٹریٹو سروس کے اہل کاروں کے مقابلے میں شعوری یا غیر شعوری طور پر ایک طرح کے احساس کمتری میں مبتلا رہتے ہیں، کیا ہمارے دلوں کو لبھانے کے لئے شاہانہ کرو فر ہی رہ گئے ہیں اور قومی تعمیر کا کام ہمارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتا؟ اگر ایسا ہے تو یہ، ایک نہایت ہی افسوس ناک طرز فکر ہے جو ایک آزاد قوم کے شایانِ شان بہر حال نہیں ہے حب الوطنی اور قومی خدمت کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو ٹیکنیکل سروس کے اہل کاروں کو ملک و ملت کی ٹھوس خدمت کے زیادہ مواقع حاصل ہیں اور یہی وہ دلیل سعادت ہے جس پر انھیں فخر کرنا چاہیئے۔ ہم ایک ایسے دور سے گزر رہے ہیں جس میں انسانی آبادی روز افزوں ہے اور طرح طرح کے مسائل کے ہجوم میں گھری ہوئی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اپنے دور کے چیلنج کو حوصلہ مندی کے ساتھ قبول کیا جائے۔ انسان کی مادی ضروریات کی [illegible]

قوم میں حوصلہ زندگی کو اُبھارنے میں انجینیروں کا کردار نہایت ہی اہمیت رکھتا ہے اور یہ منصب کچھ کم باعثِ فخر نہیں۔ اسی احساس خود شناسی کے تحت مسٹر ہربرٹ ہوور جو امریکہ کے صدر ہونے کے علاوہ ایک بلند پایہ انجینیر بھی تھے ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"مجھے سائنس اور انجینیرنگ کی پیشہ ورانہ تربیت دی گئی تھی یعنی حقیقت کو ڈھونڈ نکالنا اور اسے نوعِ انسان کے مصرف میں لانا۔"

(۲) احساس خود شناسی کے علاوہ دوسری بات جس پر میں آپ کو بالخصوص متوجہ کرنا چاہتا ہوں وہ آپ کے پیشے کے وقار کا تحفظ ہے۔ عزت و توقیر کی بلندیاں سطحی ٹھاٹھ باٹھ سے نہیں ہاتھ آیا کرتیں اور نہ ہی ہاتھ پر ہاتھ دھرے حاصل ہوتی ہیں۔ اگر آپ اپنی سیرت کی پختہ تشکیل چاہتے ہیں اور ملک و ملت کے مفادات آپ کو عزیز ہیں تو جھوٹے وقار کی بجائے خیال کردار کی فکر کیجیے۔ کامیابی کا زندگی آموز راز یہ ہے کہ اپنے ہاتھ سے کام کرنے کی عادت ڈالی جائے اس پسندیدہ عادت سے آپ کی ذہنی اور جسمانی صلاحیتیں اجاگر ہوں گی، رفیقانِ کار اور ماتحتوں کی نظر میں آپ کا وقار بڑھے گا اور آپ کی ذاتی مثال انہیں کام کرنے کی تحریک دے گی۔ دُنیا کی ترقی یافتہ اقوام اور افراد کی مثال آپ کے سامنے ہے۔ وہ لوگ تمام مادی اور آسائشی وسائل رکھنے کے باوجود اپنے کسی کام سے عار نہیں محسوس کرتے۔ ان کے یہی اوصاف ان کی کامیابیوں کا امتیازی نشان بن گئے ہیں۔ عصرِ حاضر کے مادی تقاضوں پر پورا اُترنے کے علاوہ آپ بحیثیت مسلمان بھی اُس رسول پاکؐ کی اُمت میں جو اپنے جوتے تک گانٹھنے میں عار نہیں محسوس کرتے تھے۔

یہاں ایک معروف کیمیائی انجینیر مسٹر کیٹرنگ کے واقعے کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ ایک بار انھوں نے کسی پسٹن کی ساخت کو بہتر بنانے کا منصوبہ پیش کیا اور اُن کے معاندین نے اس بنا پر منصوبے کی مخالفت کی کہ انجینیرنگ کی کتابوں کے مطابق اس کا کوئی جواز نہیں ہے جس پر انھوں نے کہا کہ کتابوں سے پوچھنے کی بجائے کیا آپ نے پسٹن سے بھی پوچھا ہے؟ بعد میں جب عملی طور پر منصوبے کو آزمایا گیا یا بقول کیٹرنگ پسٹن سے پوچھا گیا تو منصوبہ کامیاب ثابت ہوا۔ مشینوں سے براہ راست ہم کلام ہو کر جدید موز فن عملی طور پر سیکھے یا دریافت کیے جا سکتے ہیں اُن تک اُن انجینیروں کی رسائی کیونکر ہو سکتی ہے جو ہاتھوں سے کام کرنے کی بجائے فائلوں سے ہی سروکار رکھنا زیادہ پسند کرتے ہوں۔

(۳) تیسری بات یہ ہے کہ تجسس کی دُنیا میں خوب سے خوب تر کی تلاش کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا لیکن اگر تجسس کو تعلیم و مطالعہ سے خارج کر دیا جائے تو اس کی حیثیت ایک ساکن و ساکت پانی کی رہ جاتی ہے جس میں عفونت کے عمل دخل کا خدشہ ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ یہ تجسس ہی علم و فن کی سطح بدلتا ہے اور اس سپرٹ کا قیام اُسی صورت میں ممکن ہے جب کہ تفصیل علم اور ریسرچ کا عقیدہ ہمیشہ کار فرما رہے اور مسلسل مطالعہ کرنے کی مستقل عادت پیدا کی جائے۔ اگر آپ

اس جذبے کو سلامت رکھیں گے تو اس سے آپ کے علم کی پہنائیاں وسعت پذیر رہیں گی اور آپ کا جذبہ انسانی خدمت کے لئے زیادہ مؤثر ثابت ہوگا اور آپ کو نت نئی سائنسی ایجادات کی تحریک ہوگی۔

(۴) آخر میں ایک اور مشورہ دینے کی جسارت کرتا ہوں جس پر عمل کر کے آپ اپنی اسی زندگی کو رشکِ جنت بنا لیں گے۔ تنگی و فراخی کے علاوہ انسان کو زندگی کے کٹھن سفر میں کئی قسم کی آزمائشوں سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے مثلاً کبھی جلد امیر بننے کی گمراہ کن ہوس اُسے بے اصولی کی بے ڈھب راہوں پر بھی ڈال سکتی ہے۔ جو متزلزل قدم پیہم منزل سے بھٹک جاتے ہیں اُن کی گردش سے افراد کے علاوہ جماعتیں اور پیشے بھی ملوث ہوتے ہیں۔ ایسی آزمائشیں قدم قدم پر آپ کی عملی زندگی کا راستہ روکیں گی۔ اگر آپ ان آزمائشوں پر غالب آئے تو آپ کی ذات پیشے کے وقار کی امین اور انسانی اخلاق کی بلندی کا مینارۂ نور بن جائے گی۔ آپ بے لوث خادم بن کر انسانیت اور قوم کی مخلصانہ خدمت انجام دیں گے۔ آپ کی روشن ضمیری آپ کی رہنمائی کرے گی۔ اور آپ ذہنی اور قلبی سکون کی دولت سے مالا مال ہو جائیں گے۔ اس مشینی اور تجارتی دور میں انسان کی یہ متاعِ بے بہا ہے۔

آخر میں مجھے انجینئرنگ کے اُن چیدہ چیدہ مسائل کی نشاندہی کی اجازت دیجئے جو آپ جیسے نوجوان انجینئروں کے ناخنِ تدبیر کی بدولت گرہ کشائی کے محتاج ہیں۔

(۱) مغربی پاکستان دُنیا کا قدیم ترین اور بے نظیر زرعی خطّہ ہے اور یہاں کا نظام آبپاشی دُنیا بھر میں بے مثل ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ یہ خطۂ ارضی برصغیر ہند و پاکستان کا اناج گھر کہلاتا تھا۔ لیکن آج کیفیت یہ ہے کہ ہم خود اپنی ضروریات کے معاملے میں بھی خود کفیل نہیں ہیں۔ اس ضمن میں کچھ ساری ذمہ داری بیچارے کسان ہی کی نہیں۔ آپ کو بھی دیکھنا پڑے گا کہ اس مسئلے کو حل کرنے میں آپ کیا کردار ادا کر سکتے ہیں۔

(۲) مغربی پاکستان کی دو تہائی زمین ابھی تک بنجر و بے آباد ہے۔ ایک طرف، تھر، تھل، چولستان اور مکران کے وسیع و عریض ریگستان ہماری قومی ہمت کو چیلنج کر رہے ہیں اور دوسری طرف ہماری زرخیز ترین زمینیں سیم اور تھور کی نذر ہو رہی ہیں۔ یہ سبھی مسائل آپ سے تعلق رکھتے ہیں اور آپ کے اپنے مسائل ہیں۔ انہیں حل کرنے کی فکر کیجئے۔ لیکن ایک بات یاد رکھیئے کہ ہماری نجات کا راز صحیح منصوبہ بندی میں ہے جس کے لئے بہت وسعتِ نظر چاہیئے۔ منصوبہ آبپاشی کا ایک انجینئر اپنے فرائض سے پوری طرح عہدہ برآ نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ وہ اپنے فنی علم کے ساتھ ساتھ زرعی اقتصادیات، زرعی اخراجات، زرعی منڈیوں کے مسائل، زرعی انتظامات اور مختلف فصلوں کی ضروریات آبپاشی کے بارے میں واقفیت نہ رکھتا ہو۔ اسی طرح ہمارے انجینئروں کو سائنس و ٹکنالوجی کے سماجی، سیاسی اور اقتصادی اثرات سے بھی باخبر رہنا چاہیئے۔

(۳) قدرت نے مغربی پاکستان کو قوت کے دو بڑے خزانوں یعنی شمسی توانائی اور ہوا کی قوت سے نوازا ہے مگر

ہمارے ذہین و فطین انجینئروں نے ابھی تک اس طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔ میں اکثر یہ سوچا کرتا ہوں کہ ہمارے اکثر ریگستانی علاقے سمندر کے ساتھ ساتھ واقع ہیں۔ کیا ہم کسی طریقے سے سمندری پانی کو آبپاشی کے لئے استعمال میں لاکران ریگزاروں کو سیراب کر سکتے ہیں؟ اور کیا اس مقصد کے لئے پن چکیوں اور شمسی توانائی سے مدد لی جا سکتی ہے ہمارے ملک کے ایک سرکردہ انجینئر نے گوادر اور پسنی کے مقامات پر شمسی توانائی کے ذریعے سمندری پانی کی بار برداری کے امکانات کی طرف اشارہ کیا تھا۔ کیا اس یونیورسٹی کے ماہرین اور فارغ التحصیل نوجوان اس اہم مسئلے پر توجہ دیں گے؟

(۴) مغربی پاکستان کے شمال مغربی حصوں میں معدنیات کی کافی مقدار پائی جاتی ہے لیکن معدنیات دھاتوں کی تلاش، اور کان کنی پر ابھی پوری توجہ صرف نہیں کی گئی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ہمارے ہاں ان علوم میں تربیت یافتہ افراد کی بڑی کمی رہی ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ آئندہ اس اہم مسئلے پر بھی خاطر خواہ توجہ دی جائے گی۔

یہ چند منتشر سے خیالات تھے جو ایک عرصے سے میرے ذہن میں چلے آرہے تھے اور میں نے ان کے اظہار کیلئے یہ موقع تلاش کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کے میدانِ عمل کی وسعتوں کی تسخیر آپ جیسے نوجوانوں کے عزم و ہمت کی محتاج ہے۔

آخر میں دُعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کے عزائم اور آپ کی کاوشوں میں برکتیں عطا کرے۔ مجھے اُمید ہے کہ یہ جامعہ آپ کے بیدار مغز اور تجربہ کار وائس چانسلر کی نگرانی و رہنمائی میں ملک و ملت کے لئے مفید خدمات بجا لاتی رہیگی۔

پروفیسر حمید احمد خاں
وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی

شمعِ معرفت[1]

جب میں نے اس تقریب میں شامل ہونے کی دعوت دلی شکریے اور مسرت کے احساس سے قبول کی تو اس کا سبب پرنسپل کے ساتھ میرے دیرینہ روابط کے علاوہ اس کالج کے اساتذہ و طلبہ کا وہ محبت آمیز بلاوا بھی تھا جو انہوں نے پرنسپل کے توسط سے مجھے بھیجا لیکن ایک اور کشش مجھے اس وجہ سے ہوئی کہ یہ تقریب فی نفسہ ایک نوعمر کالج کا پہلا جلسہ عطائے اسناد ہے، جس میں مجھ سے کہنہ سال مدرس کی حاضری بجائے خود ایک خاص لطف رکھتی ہے۔

حضرات، تعلیمی دنیا کے مجتہد میرے بعض قدامت پسندانہ نظریات پر کبھی کبھی چیں بہ جبیں ہو جاتے ہیں لیکن اپنی تہذیبی روایات کی پاسداری کے باوجود میں بھی دراصل اتنا ہی جدت شناس، نو لوانا اور تازہ کار ہوں، جتنے وہ لوگ جو ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ۔ آندرے ژید اور پیران دیلو کا دم بھرتے ہیں، اور ٹیلی ویژن اور ٹوسٹ اور سپوٹنک اور لادینیت کا نام لے کر جیتے ہیں، ترقی کا ہر قدم جو قوم کو منزلِ مقصود کے قریب لے جائے اور ہر وہ انقلاب جو ایک بہترین زندگی کا پیغام لائے میری رگ و پے میں بھی حرارت کی وہی لہر دوڑا دیتا ہے جس کے اثر سے میرے نوجوان سامعین میں سے ہر ایک کا دل اپنی اپنی بادنا رعبائے فضیلت کے اندر دھڑک رہا ہے۔ پھر اس میں کیا تعجب ہے کہ جواں سال کالج کے جواں ہمال اساتذہ و طلبہ کی یہ محفل مجھے کشاں کشاں لاہور سے جوہر آباد لے آئی،

جناب والا، یہ فضا جسے ہجوم خلائق کی آلودگیوں سے پاک اور فرسودہ رسم پرستی کے تہ بہ تہ جالے کی گھٹن سے ابھی تک آزاد ہے، بلاشبہ تعلیم و تعلم کی صحیح فضا ہے۔ یہاں نئے اندازِ فکر اختیار کرنے کی راہیں ابھی ارزاں چالاکیوں اور ذہانت کش ہتھکنڈوں نے بند نہیں کیں۔ یہاں ذہن کے تموج کے لئے کچھ نہ کچھ گنجائش ابھی باقی ہے۔ اپنی اس بے بہا دولت کی حفاظت کیجئے یہ نہ ہو کہ بڑے شہروں کی وبائیں جو استاد اور شاگرد کے ضمیر میں شریفانہ محنت کی خواہش اور دیانت داری سے حاصل کئے ہوئے نتیجہ نہ مقام کی طلب کو گھن کی طرح کھائے جاتی ہیں۔ آپ کی اس پاک و صاف فضا کو مسموم کر دیں۔ اگر آپ اپنے کالج میں کام کی لگن اور علمی راست روی کو معیارِ فضیلت قرار دینے کی روایت قائم کر سکے تو یقین رکھئے کہ آپ نہ صرف اپنے آپ کو گرد و پیش کے ہلاکت بار جراثیم سے محفوظ کر لیں گے۔ بلکہ ساتھ ہی ملک اور قوم کی بڑی خدمت بھی سر انجام دیں گے۔

حضرات! اس وقت اگرچہ میری توجہ کا مرکز میرے وہ نوجوان احباب ہیں جو تحصیل علم کے بعد میدانِ عمل میں نکلنے والے ہیں، لیکن میرا جی چاہتا ہے کہ کچھ معروضات اساتذہ کرام کے لئے بھی وقف کروں جنہوں نے سند پانے والی اس شاندار جماعت کو تیار کیا۔ سچ پوچھئے تو اس معاملہ میں طلبا اور اساتذہ کے درمیان تفریق کرنا عملاً محال ہے اور آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ اساتذہ سے بات کرتے کرتے میرا روئے سخن خود بخود طلبہ کی طرف پھر گیا ہے۔

مجھے ذاتی طور پر اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ تعلیم و تعلم بھی فنونِ لطیفہ کے انداز کا ایک فنِ شریف ہے۔ یہ فن جس واسطے میں کام کرتا ہے۔ وہ واسطہ پتھر اور رنگ اور آواز سے کہیں زیادہ لطیف و نازک اور پگھلے ہوئے لوہے سے کہیں زیادہ مستحکم ہے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میری مراد انسانی شعور سے ہے جس کی صورت گری فنِ تعلیم کا خاص موضوع ہے۔ جو لوگ اس فنِ شریف کا صحیح ذوق رکھتے ہیں انہیں اندازہ ہے کہ انسانی شعور کے واسطے میں یہ فن کاری جس کا ذکر میں کر رہا ہوں اپنا خاص لطف اور اپنا خاص اجر رکھتی ہے۔ تعلیم کی دنیا کا فن کار سقراط کی طرح جان دے دیتا ہے۔ لیکن اپنے فن سے جو اس کے لئے بمنزلۂ تلاشِ حقیقت ہے۔ دست کش نہیں ہوتا۔

حضرات، آپ کو معلوم ہے کہ تعلیم کی تاریخ چھ ہزار برس پیچھے تک جاتی ہے۔ اس سلسلے میں یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ تاریخ انسانی کے سب سے پہلے معلم حضرات انبیا تھے۔ اور اب بھی معلمی میں پیغمبری کا ایک جزو شامل ہے جو معلم اپنے کام کو محض ذریعہ معاش سمجھتا ہے۔ وہ اپنے بنیادی شرف اور اپنے پیشے کی قدیم ترین روایت کو جھٹلاتا ہے۔ ڈھائی تین ہزار برس گزرے ہیں۔ کہ تعلیم کے مضمون کا دنیوی حصہ بتدریج نمایاں ہوا اور اس کے ساتھ اجرت پر تعلیم کی روایت شروع ہوئی۔ بھی یہ کہنا غلط ہوگا کہ اس نئے پیشہ ورانہ اندازِ تعلیم نے تعلیمی دنیا کی قدیم تر تبلیغی روایت کو یکسر ختم کر دیا۔ یہ سلسلہ افلاطون و ارسطو سے غزالی اور ابن رشد تک اور قرونِ وسطیٰ کے اساتذہ سے شبلی و اقبال تک بدستور قائم رہا۔ آج کی دنیا میں بھی ایسے معلمین موجود ہیں، جو اپنے مشاہرے کی مقدار سے بے نیاز ہو کر بلند ترین مقاصد سے لو لگائے ہوئے ہیں، بایں مجھے اس وقت استاد اور شاگرد کے باہمی تعلق کے روحانی پہلوؤں پر زور دینا مقصود نہیں ہے یہاں اس نفسیاتی کیفیت کا ذکر کرنے کی اجازت چاہتا ہوں جس پر تعلیم و تعلم کے عمل کی بنیاد ہے۔

جناب والا، عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ کہ عمل تعلیم کی ماہیت صرف یہ ہے۔ کہ معلم پیہم کوشش سے اپنا علم متعلم کے اندر یوں ڈالتا ہے، جیسے سقہ اپنی مشک میں سے کسی شخص کا پیالہ پانی سے بھر دے ذرا غور کیجئے۔ تو اندازہ ہوگا کہ استاد کی فاعلی اور شاگرد کی انفعالی حیثیت کا یہ تصور عمل تعلیم کے ساتھ انصاف نہیں کرتا۔ دراصل اس عمل میں شاگرد کی حیثیت محض انفعالی نہیں بلکہ استاد کے برابر فاعلانہ ہے۔ اگرچہ یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ استاد و شاگرد دونوں کی فاعلیت کا انداز جدا جدا ہے۔ کیفیت اس فرق کے باوجود حقیقت یہ ہے۔ کہ دونوں ایک مشترک سرگرمی میں حصہ لے رہے ہیں۔ دونوں کی کامیابی ایک دوسرے کے تعاون پر منحصر ہے دونوں میں سے ایک کو غائب کر دیجئے۔ تو دوسرے کا وجود باقی نہیں رہتا۔ یہ میں اس لئے عرض کرتا

کہ افہام اور تفہیم اپنی اصلیت کے لحاظ سے ایک ہی عمل کے دو رُخ ہیں۔ یوں دیکھئے تو یہ بالکل واضح ہو جائے گا کہ دو فریق جن میں سے ایک معلم ہے اور دوسرا متعلم ایک ہی مقصد کے حصول کے لئے دو مختلف سمتوں سے سرگرم عمل ہیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی ظاہر ہے کہ ایک فریق کی سرگرمی دوسرے کے بغیر جاری نہیں رہ سکتی۔ دونوں کا وجود ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہے۔ اس قسم کی اور مثالیں بھی زندگی کے کاروبار میں موجود ہیں جیسے خرید و فروخت، داد و ستد، سوال و جواب، ان صورتوں میں سے ہر ایک کے لئے دو فریق درکار ہیں اور گو ان مثالوں میں یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایک فریق دوسرے کے مقابلے میں زیادہ سرگرم ہے پھر بھی ان کے باہمی رشتے کو فاعلیت اور انفعال کے تقابل سے تعبیر کرنا قطعاً صحیح نہیں ہے استاد کے سبق کو مداری کے کرتبوں سے تشبیہ نہیں دی جا سکتی جنہیں شاگرد الگ تھلگ بیٹھا ہوا دیکھتا رہتا ہے۔ استاد کا سبق درحقیقت سورج کی روشنی کے رخ پر ایک اور دریچہ کھولنے کی کوشش کا نام ہے جس میں معلم اور متعلم دونوں مل کر زور لگاتے ہیں آپ کو یاد ہے کہ سقراط کا طریق تعلیم تنہا استاد کے لکچر پر نہیں، استاد شاگرد کے مکالمے پر مبنی تھا۔ یعنی استاد سوال کرتا تھا اور شاگرد جواب دیتا تھا اور اسی سوال و جواب کے ذریعے سے تعلیم کا عمل پورا ہوتا تھا۔ اب آپ اس سقراتی طریق کار کا تصور کیجئے۔ کہ استاد اپنے شاگرد کی ذہنی حالت کا اندازہ کر کے ایک مناسب سوال وضع کرتا ہے جس پر ذرا سا غور کر کے شاگرد کا ذہن مناسب جواب تک رسائی حاصل کر لیتا ہے اور سوال و جواب کا یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک استاد اور شاگرد عقلی صداقت کی منزل مقصود تک نہیں پہنچ جاتے۔ اس عمل میں معلم و متعلم دونوں کی فکری کاوش برابر کی شریک ہے خواہ معلم کے فکر کی نوعیت رہبرانہ اور متعلم کے فکر کی نوعیت مقتدیانہ ہی کیوں نہ ہو۔ استاد و شاگرد کے درمیان کامل اشتراک عمل کی حد یہ ہے۔ کہ استاد اسی صورت میں اچھا استاد بنتا ہے۔ جب اسے اچھے شاگرد میسر ہوں اور اچھے شاگرد صرف وہ لوگ ہوتے ہیں جنہیں اچھا استاد ملا ہو۔ تعلیم کے بعد کے عمل کی اساس یہ ہے کہ متعلم کا ذہن پیش نظر مسئلے کی اہمیت پر حاوی اور اس کے صحیح حل کی تلاش پر قادر ہو جائے اچھے استاد کا ذہن شاگرد سے صحیح سوال کا صحیح جواب نہ پاتا بالکل ایسا ہے۔ جیسے مقناطیس لوہے کے ٹکڑے کو حرکت میں نہ لا سکے یا چقماق اور فولاد کی رگڑ سے شرارہ پیدا نہ ہو سوال یہ ہے کہ تعلیم کے عمل میں معلم و متعلم کا عقلی تعاون جس کی نفسیاتی حقیقت پر میں نے اس قدر زور دیا کن حالات میں بروئے کار آتا ہے؟ میں اب اس جذباتی تعاون یا موانست کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس کے بغیر عقلی تعاون کی طرف ایک قدم اٹھانا بھی دشوار ہوتا ہے، قدرت کے کارخانے کا یہ انتظام بے وجہ نہیں ہے کہ احساس و ادراک کے اولین سبق ہمیں ماں کی محبت کی روشنی میں ملتے ہیں۔ اور انسان کی بہت بڑی خوش قسمتی یہ ہے کہ علم کا سرمایہ جمع کرنے کی یہ شرط بچپن سے لے کر بڑھاپے تک قائم رہتی ہے، ہمارے بہترین استاد وہ ہیں، جنہوں نے علم کے خزانے لٹائے، یقین مانئے کہ یہ محض ایک شریفانہ طریق کار کی تلقین کی کوشش نہیں، ایک امر واقعی کا بیان ہے، استاد کے لئے لازم ہے کہ اپنے شاگردوں

اور موانست کے بغیر استاد اور شاگرد کا رشتہ خواہ اس میں کتنی ہی مقدار علم داخل کی جائے، کھوکھلا اور مصنوعی رہتا ہے تعلیم کی بنیاد لفظوں کے ڈھیر پر نہیں ایک ذاتی تعلق پر قائم ہوتی ہے۔ اگرچہ بعد میں اسی ذاتی تعلق کی بنیاد پر الفاظ و معلومات کی عمارت کھڑی کی جا سکتی ہے، بچہ اپنے والدین کی مدد سے گردوپیش کی دنیا کو پیدا کرتا ہے۔ لیکن خود اپنی ذات کی تخلیق میں اسے استاد سے مدد ملتی ہے اچھا استاد شاگرد کے ظاہر سے واقف ہونے پر اکتفا نہیں کرتا، وہ اس کے باطن کو سمجھتا ہے اور اس کی پوری شخصیت کا احاطہ کرتا ہے اور اس طرح خود اپنے نفس کو بھول کر ایک اور نفسِ انسانی کے فروغ کا باعث بنتا ہے، خود فروشی اور خود فراموشی کے اس عمل میں استاد اپنے صحیح مقام و منصب کو پہچانتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے، جہاں شاگرد استاد سے سیکھتا ہے اور استاد شاگرد سے۔

اے اساتذۂ کرام! میں نے یہ سب تفصیل ایک فریاد کی حیثیت سے آپ کے اور آپ کے طلبہ کے سامنے پیش کی ہے اگر آپ اپنے طلبا کے لئے وہ طریق کار مہیا نہیں فرمائیں گے جو تعلیم و تدریس کی پہلی شرط ہے یعنی استاد و شاگرد کے درمیان کامل عقلی، تعاون و اشتراکِ عمل، تو قدرت کا تقاضا، جو ایک نفسیاتی حیثیت کے طور پر مقدر ہو چکا ہے، کس طرح پورا ہو گا؟ اور پھر یہ بھی عرض کر دوں کہ قدرت کا یہ اٹل تقاضا بھی پورا ہو گا۔ جب آپ عمل تعلیم کی دوسری ناگزیر شرط، اپنے طلبا کے ساتھ کامل جذباتی تعاون کا لحاظ کریں گے۔ بس اگر آپ کی روش انسانی فطرت کے ان مقررہ اصولوں سے ہٹی ہوئی ہے، تو آپ نظام تعلیم میں ایک ایسا خلا پیدا کر رہے ہیں، جسے دنیا کی کوئی طاقت پاٹ نہیں سکتی، قومیں معاشرے کے اس خلا کو پر کئے بغیر زندہ نہیں رہ سکتیں، خدا کے لئے قوم کی تعلیم میں اس بڑھتی ہوئی خلیج کو استاد و شاگرد کے درمیان حائل نہ رہنے دیجئے، ورنہ یاد رکھئے کہ ہماری سرحدوں کے باہر سے کسی غنیم کا حملہ ہماری زندگی کو خطرے میں ڈالے یا نہ ڈالے، ہمارا تعلیمی خلفشار ہمیں صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دے گا۔ میں نے بارہا یہ کہا ہے اور اب پھر یہ کہتا ہوں کہ ایشیا کی قسمت کا فیصلہ ایشیا کی یونیورسٹیوں میں ہو گا ہمارے ممالک ہمارے طلبہ کی روشنی ضمیر اور قوتِ عمل سے زندہ رہیں گے یا پھر انہیں طلبہ کے ہنگامۂ تخریب و انتشار سے پارہ پارہ ہو کر فنا ہو جائیں گے اے اساتذۂ کرام۔ آپ اپنے طلبہ کو اپنے دل میں جگہ دیجئے، تاکہ تعلیم کی راہیں ہموار ہو سکیں وقت کے اندھیرے کی جو غلیظ چادر مجھے دور سے نظر آتی ہے، میں آپ کو اس سے ڈرا نہیں رہا ہوں بلکہ آپ کو یقین دلا رہا ہوں کہ خود آپ کے ہاتھ میں وہ شعاعِ نور ہے جو کوندے کی لپک بن کر اس سیاہ چادر کو تار تار کر دے۔

اور اب، اے میرے عزیز طلبہ، جو آج زندگی کے ایک نئے سفر پر روانہ ہو رہے ہو خدا آپ کے اس سفر کا آغاز و انجام مبارک کرے آپ کے سفر کی ہر منزل میں میری دلی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں اللہ تعالےٰ آپ کو اپنے نیک مقاصد میں، اور ان مقاصد کی تمام تفصیلات میں کامیاب و بامراد کرے اس وقت آپ کو خدا حافظ کہتے ہوئے نصیحت کا ایک کلمہ آپ سے کہنا چاہتا ہوں بشرطیکہ آپ بطور زادِ راہ اسے دامن میں باندھ سکیں، یہ نصیحت ایک سیدھی سادھی بات ہے۔ جیسے دوست بادرکرنے میں آپ کو مطلق

ی عملی تشکیل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا ۔ اگر آپ نے مدرسے اور کالج کے زمانے میں اپنے معلمین کے ساتھ کامل ذہنی تعاون کیا ہے ۔ اور ان کی عزت و محبت آپ کے دل میں جاگزیں رہی ہے ۔ تو زندگی کے نصب العین کا واضح تصور قائم کرنا آپ کے لئے دشوار نہ ہوگا یہ دشواری اس انسان کو پیش آتی ہے جس نے صحت مندانہ تعلیمی ماحول میں پرورش نہیں پائی ۔ صحت مندانہ تعلیمی ماحول ، جیسا میں نے ابھی وضاحت کی تھی ، محض استاد کی کوشش سے قائم نہیں ہوتا اس میں شاگردوں کے اشتراک عمل کے بغیر فلاح کی صورت ممکن ہی نہیں ہے ۔ آپ کا ذہنی تعاون اور دلی لگاؤ اگر استاد کو نصیب نہیں ہوا تو خود آپ اپنی مدد سے محروم رہے ہیں گذشتہ دس بیس برس سے ہمارے ملک میں برطانیہ کی تنظیمیں کچھ اس انداز سے حرکت میں آ رہی ہیں ، جیسے علم کی دولت کو استاد پر یلغار کر کے چھیننا ضروری ہو گیا ہے علم کی دولت اس وقت تک پیدا نہیں ہوتی جب تک استاد اور شاگرد باہمی تعاون کی فضا میں بیٹھ کر ایک مشترک کوشش کے ذریعے سے تعلیم کے عمل کی بنیادی صورت کی تکمیل نہ کریں ، تعلیمی مسائل کے حل میں طاقت کا استعمال بے معنی ہے ، مزدوروں کی یونین سرمایہ دار سے اپنے حقوق منوانے کے لئے ہڑتال اور دوسرے حربوں سے کام لے تو بات سمجھ میں آتی ہے لیکن مجلسی زندگی سے متعلق طلبہ کی یونین کوئی مزدور یونین نہیں ہے جس کی راہ نجات صرف مقابلے اور مجادلے میں ہو ہنگامہ و خلفشار میں شمع معرفت روشن نہیں ہوتی بجھ جاتی ہے اور ہمارے لئے وہ دن برا ہوگا جس دن ہمارے مدرسہ و خانقاہ میں شمع معرفت بجھ گئی اور معلم و متعلم کا صحیح رشتہ ٹوٹ گیا تعلیم و تعلم کی بھلائی نیم سیاسی نیم مزدور یونینوں کے فسادات سے نہیں بلکہ دلوں کے اتحاد و ذہنوں کے اشتراک سے پیدا ہوگی ، فساد اور بغاوت کے جراثیم اگر فضائے گرد و پیش کو آلودہ کر رہے ہیں ۔ تو آپ پر کچھ اور زیادہ لازم ہے ۔ کہ اپنے نئے کالج میں ایک ایسے نئے دستور ، ایک ایسی نئی رسم و راہ کا آغاز کریں کہ مریض ذہن بھی دیکھ کر صحت یاب ہو جائیں

درائے تو جرس تو ، دل دادۂ تو
نوا بزن کہ قدم می زنم بجادۂ تو

اس انجمن گل میں

صدر انجمن، جامعہ میں جامعہ کراچی کی بزم ثقافت کی افتتاحی تقریب میں مہمانِ خصوصی جناب اختر حسین صاحب صدر انجمن ترقی اردو کراچی نے تقریر کرتے ہوئے ثقافت اور تعلیم کے باہمی تعلق کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ "ثقافت کا تعلیم سے گہرا تعلق ہے، ثقافت زندگی کے ایک مخصوص طرز کا نام ہے اور تعلیم ثقافتی قدروں کو سمجھنے اور اختیار کرنے کا ذریعہ ہے، جناب موصوف نے پاکستانی ثقافت کے فروغ کی طرف توجہ دلائی اور یہ فرمایا کہ ہمیں ثقافت کے سلسلے میں علاقائی نقطہ ہائے نظر سے نہیں سوچنا چاہئے، موصوف کی تقریر کا پورا متن اس شمارے میں شائع کیا جارہا ہے

انجمن ترقی اردو کے نئے اراکین

مندرجہ ذیل حضرات نے انجمن ترقی اردو کی رکنیت قبول کی ہے

(۱) محترمہ ارجمند بانو قزلباش صاحبہ - (رکن)
پرنسپل گرین وڈ اسکول، کلفٹن روڈ کراچی

(۲) ڈاکٹر نذیر احمد صاحب - (رکن)
۳۰/۴ سی بلاک، ۲ - پی - ای - سی - ایچ ایس - کراچی - ۲۹

(۳) جسٹس سید محبوب مرشد صاحب (رکن)
چیف جسٹس ہائی کورٹ - مشرقی پاکستان، ڈھاکہ

(۴) جناب احسن احمد اشک صاحب (رکن)
مینیجنگ ایڈیٹر، دینک پاکستان، ۵۰ ٹیپو سلطان روڈ، ڈھاکہ

(۵) جناب یعقوب اے پٹیل صاحب (رکن)
سی ۱۰۶ - سینٹرل کمرشیل ایریا - پی - ای - سی - ایچ ایس کراچی ۲۹

(۶) جناب ممتاز حسن صاحب (رکن)
مینیجنگ ڈائرکٹر نیشنل بنک آف پاکستان، میکلوڈ روڈ کراچی

(۷) میاں غلام محمد احمد خان مانیکا صاحب ایم۔پی۔اے (رکن دوامی)

پوسٹ آفس پیر بخش تحصیل، پاک پٹن۔ ضلع منٹگمری

(۸) جناب رفیق احمد صدیقی صاحب (رکن)

۴۶۔گوداموں دہرم شالہ بلڈنگ۔ اوٹرام روڈ۔ کراچی ع۱

(۹) جناب شاهد حسن اعظمی صاحب (رکن)

۱۱۹ سی۔ بلاک نمبرا لیاقت آباد۔ کراچی ع۱۹

(۱۰) جناب راجہ محمد امیر احمد خان صاحب (رکن دوامی)

۲۔ فرام روز روڈ۔ نزد کلفٹن برج۔ کراچی

(۱۱) جناب عبدالقیوم طیب، جی صاحب (رکن دوامی)

"الامین" میکلوڈ روڈ۔ نزد کچہری روڈ متصل کنٹونمنٹ ایکسچینج کراچی

(۱۲) بیگم طاہرہ شاهدی صاحبہ (رکن دوامی)

پرنسپل وقار النسا ڈگری کالج۔ راولپنڈی

(۱۳) جناب اے آر فریدی صاحب (رکن دوامی)

جنرل منیجر بسماشیل لمیٹڈ نیشنل بنک آف پاکستان بلڈنگ کراچی۔

تمغۂ بابائے اردو جامعہ کراچی کے جلسہ تقسیم اسناد کی سالانہ تقریب میں ایک طالب علم غیور احمد کو تمغۂ بابائے اردو دیا گیا ہے۔ غیور احمد صاحب ایم۔اے (اردو) کے امتحان میں اس سال اوّل آئے ہیں، طلائی تمغے کے ساتھ مبلغ پانچ سو روپے کا چیک بھی انہیں پیش کیا گیا۔ واضح رہے۔ کہ انجمن ترقی اردو کی طرف سے پاکستان کی تمام یونیورسٹیوں میں ایم۔اے (اردو) کے امتحان میں اول بدرجۂ اول کامیاب ہونے والے طالب علموں کو ہر سال تمغۂ بابائے اردو (طلائی) اور پانچ سو روپے دیئے جاتے ہیں۔

کتب خانہ خاص کیلئے کتابوں کا عطیہ آنسہ شرفی سرفراز کراچی نے چالیس قلمی و مطبوعہ کتابیں انجمن کے کتب خانہ خاص کو عطا کی ہیں۔ ان کتابوں میں قلمی مخطوطات پر نادر مطبوعات بھی ہیں۔

صدر انجمن کا پیغام لاہور میں ۵ اپریل کو "عقیدت مندان سید" کی طرف سے ملک کے نامور ادیب ڈاکٹر سید عبداللہ کی ساٹھویں سالگرہ منائی گئی اس تقریب میں انجمن کے صدر جناب اختر حسین صاحب کا حسب ذیل پیغام پڑھ کر سنایا گیا۔

"مجھے یہ جان کر بہت مسرت ہوئی کہ ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کی ساٹھویں سالگرہ پر ایک تقریب منعقد کی جا رہی ہے جس میں موصوف کی علمی اور ادبی خدمات پر مقالے پڑھے جائیں گے۔"

ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب ہمارے ملک کے ممتاز اہل علم میں سے ہیں۔ اُن کی علمی ادبی اور تعلیمی خدمات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے زندگی بھر علمی خدمت کی ہے۔ ان کی تصانیف ہمارے ادب میں تنقید و تحقیق کا بلند معیار پیش کرتی ہیں۔ میری دعا ہے کہ وہ آئندہ بھی پوری مستعدی سے ادب کی خدمت کرتے رہیں"

گردوپیش

جامعہ کراچی میں اردو جامعہ کراچی کا سالانہ جلسۂ تقسیم اسناد اس لحاظ سے پاکستان کی تاریخ میں یادگار رہے گا کہ پہلی بار اس کی تمام کارروائی اردو میں ہوئی، جب جلسۂ تقسیم اسناد کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ اور تالیوں کی گونج میں قومی زبان کی پذیرائی کی گئی، یہ یاد رہے کہ اس سے پہلے کراچی یونیورسٹی اپنی اعلےٰ جماعتوں میں اردو کو ذریعۂ تعلیم قرار دے چکی ہے اس لئے امسال یہ اعلان بھی کیا گیا ہے، کہ جامعہ کے مختلف امتحانات میں کامیاب ہونے والے طلبہ کو اسناد بھی اردو ہی میں دی جائیں گی،

میری سنو جو گوش حقیقت نیوش ہے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس جناب اے، آر کارنیلیئس نے ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے، کہ عقل و دانش اور خیالات کے اظہار کا وسیلہ زبان ہے اور پاکستانی عوام کی عقل و دانش اس امر کی مستحق ہے کہ باہر سے درآمد شدہ وسیلۂ اظہار انگریزی سے انہیں نجات دلائی جائے جسٹس کارنیلیئس نے یہ بات ۱۸ مارچ کو اردو اکادمی کے زیر اہتمام ایک جلسے کی صدارت کرتے ہوئی کہی ہے،

مشرقی پاکستان میں قومی زبان مشرقی پاکستان واپڈا نے اپنی تمام گاڑیوں کی نمبر پلیٹیں انگریزی سے بنگلہ میں تبدیل کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اس قسم کے فیصلے اور بھی اداروں نے کئے ہیں، اور بعض ادارے اس پر عمل بھی کر چکے ہیں، واپڈا کے اس فیصلے کے بعد امید کی جا رہی ہے کہ باقی ادارے بھی فوری طور پر اس فیصلہ پر عمل کر کے دکھائیں گے۔ اور مغربی پاکستان کی حکومت بھی اس سلسلے میں پیچھے نہ رہے گی۔

بی بی سی سے اردو خبریں بی بی سی نے پاکستان کے لئے صبح سویرے اردو میں خبریں نشر کرنے کا سلسلہ تجربہ کے طور پہ شروع کر دیا تھا۔ ۳۱ مارچ تک اس تجربے کو عمل میں لایا گیا جب

اردو انجمنوں کا نمائندہ اجلاس

۲۶ اپریل کو لاہور میں ڈاکٹر سید عبداللہ کی دعوت پر مغربی پاکستان کی اردو انجمنوں کا ایک نمائندہ اجلاس ہوا جس میں یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ حکومت پر زور دیا جائے کہ اردو کو فوری طور پر دفتری زبان بنا دیا جائے۔ اور پبلک سروس کمیشن کے تمام امتحانات میں قومی زبانوں کو انگریزی کے مساوی درجہ دیا جائے۔ نیز امیدواروں سے انٹرویو اردو میں کیا جائے۔ یہ اجلاس انجمن ترقی اردو لاہور کے دفتر میں حکیم نیر واسطی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس میں کراچی، راولپنڈی، پشاور، لائل پور، سرگودھا، گجرات، لالاموسیٰ، پھالیہ، خانیوال، ملتان، لیہ، رحیم یار خان، بہاولپور، ہزارہ اور دوسرے مقامات کی اردو انجمنوں کے عہدیدار شریک ہوئے۔ لاہور کے مندوبین میں حلقہ ارباب ذوق کی جانب سے اعجاز حسین بٹالوی اور یوتھ موومنٹ کی طرف سے حکیم آفتاب قریشی بھی شریک ہوئے تھے۔ حکیم نیر واسطی نے اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ دنیا میں کسی بھی ملک میں کسی غیر ملکی زبان کو وہ درجہ حاصل نہیں جو بدقسمتی سے پاکستان میں انگریزی کو دیا جا رہا ہے۔ اس اجلاس میں قراردادیں منظور کی گئی ہیں، اُن میں کہا گیا ہے۔ "دفتری اصطلاحات کی اردو لغات شائع ہونے کے بعد اب سرکاری دفتروں میں اردو کے نفاذ میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہنی چاہئے"۔ ایک اور قرارداد میں عوام سے کہا گیا ہے کہ وہ نجی شعبوں میں انگریزی کو نہ پھیلنے دیں۔

علمی ادبی تعلیمی اور تہذیبی خبریں

جامعہ کراچی کا جلسہ تقسیم اسناد

۱۶ اپریل کو جامعہ کراچی کے جلسۂ تقسیم اسناد کی شاندار تقریب منعقد ہوئی شیخ الجامعہ نے ۲ ہزار طلبہ اور طالبات کو اسناد دیں۔ فنون کے طلبہ کو شیخ الجامعہ کے سامنے ڈاکٹر محمود حسین نے سائنس کے طلبا کو۔ ڈاکٹر ایم۔ اے۔ ایچ قادری نے کامرس کے طلبا کو جناب آئی اے ممتاز نے، بی ایڈ اور ایم ایڈ کے طلبا کو ڈاکٹر سلیم الزماں نے، ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کے طلبہ کو ڈاکٹر ایم۔ ایچ شاہ نے، انجینئرنگ کے طلبہ کو جناب عزیز کے شیخ نے، قانون کے طلبہ کو کرنل عطاالرحیم اور جناب جی۔ ایم خاں نے اور معارف اسلامیہ کے طلبا کو مولانا منتخب الحق نے پیش کیا۔ تقریب میں سفارتی نمائندوں، اعلیٰ سرکاری حکام معززین شہر، اور اساتذہ کی بھاری اکثریت نے شرکت کی تقسیم اسناد کی کارروائی انتہائی نظم و ضبط کے ساتھ انجام پائی۔

اس موقع پر شیخ الجامعہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے ارشاد فرمایا کہ جب کوئی قوم اپنی ثقافت، طرز زندگی اور اپنی زبان سے شرمانے لگے۔ تو پھر اسے تباہی سے کوئی نہیں بچا سکتا انہوں نے فرمایا کہ کسی قوم کا وجود قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے، کہ وہ اپنے دل میں اپنے ورثہ، اپنے طرز زندگی اور اپنی اخلاقیات پر فخر کا جذبہ پیدا کرے۔ انہوں نے جامعات کو ترقی دینے پر بہت زور دیا۔ اس کی اہمیت واضح کی۔ ڈاکٹر قریشی کے خطبے کا پورا متن "قومی

کے اسی شمارہ میں شائع کیا جا رہا ہے ،

ادبی تاریخ تکمیلی مرحلے پر پنجاب یونیورسٹی نے برصغیر کے مسلمانوں کی ادبی تاریخ مرتب کرنے کا جو منصوبہ شروع کیا تھا تکمیل کے آخری مرحلے میں داخل ہو گیا ہے ۔ اس منصوبے کے مطابق برصغیر کے مسلمانوں کے ادبی کارناموں کی تاریخ مرتب ہو رہی ہے ، جو ۱۴ جلدوں میں مکمل ہو گی ، اس کے تقسیم عمل کے تین مراحل رکھے گئے تھے ۔ پنجاب یونیورسٹی کی اطلاع کے مطابق تیسرے مرحلہ پر کام تیزی سے ہو رہا ہے ۔ اور پہلے دو مراحل بخوبی طے کر لیئے گئے ہیں ،

دو لاکھ بتیس ہزار پونڈ کی تصویر لندن میں مصوری کے ایک شیدائی نے پانچ انچ لمبے اور چار انچ چوڑے پوسٹ کارڈ سائز کی ایک تصویر کو دو لاکھ بتیس ہزار پونڈ میں خریدا ہے ۔ یہ چھوٹی سی تصویر پندرھویں صدی میں ہربرٹ وان آئیک نے بنائی تھی جس میں سینٹ جارج کو ایک اژدھا مارتے ہوئے دکھایا گیا ہے ، اس تصویر کی نمائش اس سے پہلے کئی بار ہو چکی تھی ۔ ایک سال پہلے ایک فرانسیسی مصور کی بنائی ہوئی تصویر بھی ۳۵ ہزار پونڈ میں نیلام ہو چکی ہے ، مگر سینٹ جارج والی تصویر کی جو قیمت ادا کی گئی ہے وہ تصویروں کی خریداری کی سب سے بڑی قیمت ہے ،

قرآن پاک کا ترجمہ ایک سو زبانوں میں ممتاز مسلمان محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے استنبول میں قرآن مجید کے تراجم کی ایک کتابیات مرتب کی ہے جس کو ۱۹۶۸ء میں اس وقت شائع کیا جائے گا ۔ جب رمضان ۱۳۸۷ھ کے مطابق) نزول قرآن کو چودہ سو سال ہو جائیں گے ۔ اس کتابیات کے مطابق قرآن مجید کا ترجمہ اب تک سو زبانوں میں ہو چکا ہے ، ان میں سے ۶۳ زبانوں میں شائع ہونے والے تراجم قرآن کے تمام اعداد و شمار اس کتاب میں موجود ہیں ، اس کے علاوہ اس کتاب سے یہ بھی انکشاف ہوتا ہے کہ صرف ترکی زبان میں قرآن پاک کے سو ترجمے موجود ہیں ، اور اتنے ہی فارسی میں ہیں ، پچاس سے زائد ترجمے انگریزی اور چالیس کے قریب لاطینی زبان میں موجود ہیں ،

شبیر علی کاظمی کی کتاب پر انعام ۱۹۶۵ء کے لئے جن کتابوں کو داؤد ادبی انعام کا مستحق سمجھا گیا ہے ، ان میں " اردو بنگلہ کے مشترک الفاظ " نامی کتاب بھی شامل ہے ۔ یہ مفید اور اہم کتاب جناب شبیر علی کاظمی کی مرتب کی ہوئی ہے جس پر انہیں اس انعام کا مستحق سمجھا گیا ہے ،

کتابوں کی خریداری ۱۹۶۵ء میں نیدرلینڈ میں پانچ کروڑ کتابیں فروخت ہوئی ہیں ، یہ فروخت نیدرلینڈ میں ایک ریکارڈ کی حیثیت اختیار کر گئی ہے ۔ ۱۹۶۳ء میں چار کروڑ کتابیں فروخت ہوئی تھیں ۔ ان اعداد و شمار کے مطابق نیدرلینڈ میں ہر خاندان ہر سال اوسطاً سترہ کتابیں خریدتا ہے ۔ اس تعداد میں

نصابی کتابیں شامل نہیں ہیں ،

ریڈیو اور ٹیلی ویژن اور مشرقی زبانیں

یونیورسٹی اورینٹل کالج کے ۹۶ ویں یوم تاسیس کے موقع پر صوبائی وزیر تعلیم ملک خدا بخش بچہ نے مشرقی علوم کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہا کہ مشرقی علوم سے تغافل بہت مہنگا پڑے گا ۔ انہوں نے فرمایا کہ آج بھی ہم اپنے ثقافتی اور اسلامی ورثے کی حفاظت ، عربی ، فارسی اور اردو زبانوں کو زندہ اور پائندہ رکھکر ہی کر سکتے ہیں انہوں نے کہا کہ ان زبانوں کی تعلیم اور ترقی ایک ایسا اہم فریضہ ہے ، جس پر ہمیں خصوصیت سے توجہ دینی چاہئے جناب بچہ نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر مشرقی زبانوں کو زیادہ سے زیادہ اختیار کرنے پر زور دیا ۔ اور اس کی افادیت کو بہت پر زور انداز میں واضح کیا ۔

ایک دلچسپ تحقیق

ڈیلی ٹیلی گراف لندن کے ایک کالم نویس نے اس بات کا دعویٰ کیا ہے ۔ کہ شیکسپیئر کے ڈرامے دراصل ایک یمنی شاعر نے مرتب کئے تھے ، کالم نویس نے اس یمنی شاعر کا نام شیخ زبیر بتایا ہے ۔ اس تحقیق کے مطابق شیخ زبیر کا مترجم ایک انگریز بیکن ہے جس کا اصلی نام کوشن بے تھا ۔ اور وہ زبیر کو پہلی بار بیت المقدس میں ملا تھا ۔ اور اس نے انگلستان واپس آکر کوشن بے کا نام اختیار کر لیا ۔ اس کو ایک دن شیخ زبیر کی طرف سے ایک پارسل موصول ہوا تھا ۔ جس میں شیخ زبیر کے چند ڈراموں کے مسودات تھے ۔ جن کا ترجمہ اس نے انگریزی میں کیا تھا ۔ ڈیلی ٹیلی گراف کے اس کالم نویس کا نام پیٹر بلڈ ہے ،

درد سعیدی کیلئے اپیل

انجمن صحافیاں ٹنڈو آدم کے صدر نے ایک اپیل میں ضلع کونسل سانگھڑ سے ممتاز شاعر درد سعیدی کی مدد کے لئے درخواست کی ہے ۔ درد سعیدی جو ایک عامل صحافی بھی رہے ہیں ، ان دنوں سرطان میں مبتلا ہونے کے سبب موت و زیست کی کشمکش سے گذر رہے ہیں ۔ اپیل میں کہا گیا ہے ، کہ درد سعیدی نے اپنے اخبارات قائد اور طوفان سے اس ضلع کے عوام کی بڑی خدمات انجام دی ہیں اور اس کے علاوہ وہ ایک اعلے درجے کے شاعر بھی ہیں ۔ جن کے اشعار سے اردو ادب اور انسانی اقدار کو فروغ ہوا ہے ، اپیل میں درد سعیدی کے لئے فوری طور پر امداد دینے کے اخلاقی اور انسانی مطالب پر زور دیا گیا ہے ،

ڈھاکہ یونیورسٹی میں ترکی زبان

ڈھاکہ یونیورسٹی میں ترکی زبان کی تدریس عنقریب شروع ہو جائے گی ، اس بات کا انکشاف پاک ترکی ثقافتی انجمن کے صدر حکیم نیر واسطی نے کیا ہے ، حکیم نیر واسطی ڈھاکہ میں پاک ترکی ثقافتی انجمن کی شاخ قائم کر کے واپس لاہور آگئے ہیں ، انہوں نے کہا ، کہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب عثمان غنی نے اس بارے میں اس تجویز سے اتفاق کر لیا ہے کہ وہاں ترکی زبان کی تدریس کا فوراً آغاز ہو جانا چاہئے ”

اس آئینہ خانے میں

ڈاکٹر سید عبداللہ کی سالگرہ

۵ راپریل ۱۹۶۶ء کو لاہور میں "عقیدت مندان سید" کی طرف سے ڈاکٹر سید عبداللہ کی ساٹھویں سالگرہ بڑے خلوص اور عقیدت سے منائی گئی جس کو "یوم تجدید عزم" کا نام دے کر اس سالگرہ کو بھی ایک بڑے مقصد کا آغاز قرار دے دیا گیا۔ اس تقریب میں ڈاکٹر سید عبداللہ کے رفقاء، عقیدت مند دوستوں عزیزوں اور شاگردوں نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ اس تقریب کی صدارت مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے جج جناب جسٹس سجاد احمد جان نے کی، انہوں نے اپنے خطبہ صدارت میں فرمایا "سید عبداللہ نے بے سرو سامانی کے عالم میں کامیابی کے ساتھ اپنی زندگی کی منازل طے کی ہیں، انہوں نے اپنی زندگی میں نصب العین، اصولوں اور فلسفۂ حیات کو عزیز رکھا ہے، اُن میں کام کرنے کی لگن اور تڑپ پائی جاتی ہے، اور وہ انسانیت کے لئے درد مند دل رکھتے ہیں۔" آپ نے مزید کہا کہ اردو زبان کے بہی خواہوں کی کوشش رائیگاں نہیں جائے گی، اردو زبان کی ترویج اور ترقی کے لئے اسی رفتار سے کام ہوتا رہا تو انگریزی زبان کا اثر جلد ختم ہو جائے گا۔ انہوں نے سید صاحب کی اُن خدمات کو خراج تحسین پیش کیا جو انہوں نے قومی زبان کو اس کا جائز مقام دلانے کے لئے انجام دی ہیں۔

تقریب کا آغاز ممتاز منگلوری کے خطبۂ استقبالیہ سے ہوا جس میں انہوں نے ڈاکٹر سید عبداللہ کی خدمات کو زبردست خراج تحسین پیش کیا۔ سید عبدالباقی، قیوم شاکر، ذوالفقار علی بخاری، میاں بشیر احمد، جمیل ملک اور حفیظ جالندھری جیسے اہلِ قلم نے آپ کی علمی، ادبی اور شخصی خوبیوں پر روشنی ڈالی اور اپنے تاثرات بیان کئے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے اس تقریب کے شرکاء کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ میں آئندہ بھی تصنیف و تالیف کا کام جاری رکھوں گا، اور اس وقت مروں گا، جب انگریزی پاکستان میں اپنے موجودہ مقام سے رخصت ہو جائے گی۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کی ساٹھویں سالگرہ پر پروفیسر حمید احمد خان، چودھری محمد افضل، ڈاکٹر صابر علی خان، مرزا ادیب اور ڈاکٹر بشارت علی خان کی طرف سے تحفے پیش کئے گئے۔ اس کے بعد ایک ادبی نشست کا آغاز ہوا جس کی صدارت جناب حکیم احمد شجاع نے کی۔

نذر رحمٰن

لاہور میں، راپریل کو مجلس نذر رحمٰن کی طرف سے جسٹس ایس۔ اے رحمان کی خدمت میں اُن کی علمی، ادبی قومی اور ثقافتی خدمات کے اعتراف میں ایک ارمغان "نذر رحمٰن" پیش کیا گیا، جو تین سال کی تیاری کے بعد شائع ہوا ہے۔ یہ علمی ارمغان ۲۶۲ صفحات، پچاس سے زائد تصاویر اور اسلامی طرز فکر سے مزین آرائش پر مبنی ہے جس میں ۲۲ مضامین اور اشعار کا گلدستۂ انتخاب شامل ہے۔ یہ ارمغان ڈاکٹر سید عبداللہ کی نگرانی میں مرتب کیا گیا ہے۔ اس تقریب میں اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عبداللہ نے فرمایا کہ ڈاکٹر جسٹس ایس اے رحمان

نے پاکستان کی فکری زندگی میں جو اہم خدمات انجام دی ہیں، انھیں قوم کبھی فراموش نہیں کر سکتی، انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصّہ قومی مفادات کے لئے صرف کیا اور ملک کے فکری مسائل کے ضمن میں ہر موقع پر پیش قدمی کی، پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر حمید احمد خان نے خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ انہوں نے ہماری تہذیبی روایات میں نمایاں حصّہ لیا ہے، چوہدری نذیر احمد سابق اٹارنی جنرل نے کہا کہ جسٹس رحمان اپنے بلند عہدے اور تخیل کے ساتھ ہمیشہ اسلام اقدار، اسلامی تعلیمات اور ماحول سے وابستہ رہے ہیں، اس تقریب کی صدارت جناب جسٹس محمد شریف نے کی اور اپنے خطبہ صدارت میں جسٹس ایس۔ اے رحمان کی علمی، ادبی اور ثقافتی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا۔

جسٹس مرشد کے اعزاز میں

مشرقی پاکستان ہائی کورٹ کے چیف جسٹس جناب محبوب مرشد جب لاہور تشریف لائے تو مغربی پاکستان ادارۂ مصنفین پاکستان کے زیر اہتمام ایک تقریب منعقد کی گئی، جس میں تقریر کرتے ہوئے جسٹس مرشد نے فرمایا کہ مشرقی پاکستان کے عوام کو اردو اور فارسی ادب سے گہری دلچسپی ہے اور مذہبی و ادبی اداروں میں ذریعہ تعلیم اردو ہی ہے، خود موصوف جس ادارۂ عالیہ کے صدر ہیں، اس میں بھی ذریعہ تعلیم اردو ہے، آپ نے یہ خواہش ظاہر کی ہے، کہ دونوں صوبوں کے ادیبوں اور شاعروں کو اپنے ہی وسائل سے کام لیکر ایک دوسرے صوبے کا دورہ کرنا چاہیئے جس سے قومی یکجہتی کو فروغ حاصل ہوگا۔

یادوں کے چراغ

مجلس یادگار آزاد

مجلس یادگار محمّد حسین آزاد کے زیر اہتمام لاہور میں ۳ راپریل کو ایک جلسہ منعقد ہوا جسکی صدارت جسٹس ایس اے رحمان نے فرمائی، اجلاس میں مقررین نے مولانا محمّد حسین آزاد مرحوم کی ادبی خدمات اور ان کی عدیم المثال تحریروں کو زبردست خراج تحسین ادا کیا ہے، مولانا محمد حسین آزاد کی ۵۶ ویں برسی کے موقع پر اس مجلس میں اس بات پر اظہار افسوس کیا گیا، کہ مولانائے مرحوم کی تہذیبی تصانیف غیر مطبوعہ حالت میں ہیں، جن کی اشاعت کی بے حد ضرورت ہے، سید عابد علی عابد نے مولانا کے اسلوب پر ایک مقالہ پڑھا۔ صدر جلسہ نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مولانا آزاد مرحوم ایسی شخصیتیں صدیوں کے بعد پیدا ہوتی ہیں۔ انہوں نے تجویز پیش کی کہ آئندہ مولانا کی برسی کے بجائے سالگرہ منائی جانی چاہیئے، سید محمد جعفری نے "سخندان فارس" کا فارسی ترجمہ کرنے کی تجاویز پیش کیں، اور ان ہی کی قیادت میں مولانا کی قبر پر پھولوں کی چادر چڑھائی گئی۔

یوم اقبال کی تقریبات

کراچی میں ۱۶ اور ۱۷ راپریل کو ایک شاندار تقریب شاعر مشرق علامہ اقبال کی

یاد میں منعقد ہوئی جس کا اہتمام اولڈ راوینز ایسوسی ایشن، اقبال اکادمی اور دوسری انجمنوں نے باہمی اشتراک سے کیا تھا اس تقریب میں شرکت کرنے کے لئے علامہ اقبال کے پرانے ملازم جناب علی بخش کو خاص طور سے مدعو کیا گیا تھا۔ اس موقع پر ادبی اجلاس اور تقاریر کے جلسہ کے علاوہ علامہ اقبال کے خطوط اور کتابوں کی نمائش بھی کی گئی، نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے ایران کے سفیر کبیر جناب ہوشنگ انصاری نے فرمایا کہ علامہ اقبال کی فارسی شاعری نے ایران اور پاکستان کے درمیان ثقافتی اور تاریخی رشتہ کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے، انھوں نے کہا، کہ اس برصغیر میں علامہ اقبال کی اردو شاعری اور ایران کے مسلمانوں کے انداز فکر میں اُن کی فارسی شاعری نے ایک انقلاب پیدا کر دیا، جناب آغا عبدالحمید نے علامہ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اپنی طالب علمی کے اس دور کی یاد تازہ کی جب وہ علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ انھوں نے کہا، کہ علامہ کی یہ نصیحت مجھے ہمیشہ یاد رہی ہے، کہ انسان خواہ کوئی بھی کام کرے اس میں اخلاص کا ہونا ضروری ہے، پیکنگ یونیورسٹی کے فلسفہ کے پروفیسر جناب چن چی ای نے فرمایا، کہ چین کے عوام اقبال کو عظیم فلسفی شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں، انھوں نے کہا کہ اقبال کی شاعری نے پاکستانی عوام کو سامراجیت اور نوآبادیاتی نظام کے خلاف جنگ کا درس دیا۔ جناب ممتاز حسن نے کہا۔ کہ اقبال کا پیغام مسلمانوں کے لئے ہی نہیں بلکہ پوری انسانیت کے لئے تھا۔ ۳۱ ہموقعہ پر جامعہ ازہر کے ڈاکٹر یحییٰ الخشاف نے ارشاد کیا۔ کہ علامہ اقبال عربوں کے محبوب ہیں، کیونکہ اقبال نے عربوں سے محبت کی تھی، انہوں نے کہا کہ آج اقبال کے فلسفہ خودی کی گونج عرب ممالک میں بھی سنائی دے رہی ہے، اور عرب نوجوانوں پر اس کا گہرا اثر ہے، مقالات پڑھنے والوں میں پروفیسر عابد علی عابد یعقوب توفیق، پروفیسر یوسف سلیم چشتی، جناب نصیر احمد ناصر، جناب ایس اے واحد، جناب پروفیسر لطف اللہ بدوی اور کمشنر کراچی جناب دربار علی شاہ کے نام خاص طور سے اہمیت رکھتے ہیں، مرکزی وزیر قانون جناب ایس ایم ظفر نے کہا، کہ ہمیں علامہ اقبال کے پیغام کو عملی جامہ پہنانے کے لئے مسلسل جدوجہد کرنا چاہئے۔ انھوں نے کہا، اقبال کے فلسفہ خودی نے ایک ایسی قوم تشکیل دی جو دنیا کے لئے مثال بن گئی، فیض احمد فیض نے اقبال کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی، یوم اقبال کے مختلف اجلاسوں کی صدارت کے فرائض آغا عبدالحمید۔ علی بخش۔ وزیر قانون سید محمد ظفر اور شیخ الجامعہ کراچی جناب اشتیاق حسین قریشی نے انجام دیئے، کلام اقبال پر مشتمل قوالی کا پروگرام بھی ہوا۔

اس سے پہلے ورایپل کو پاک ترک ثقافتی انجمن کے معتمد جناب شمس الضحیٰ یہ اہم خبر سنا چکے ہیں، کہ ترکی میں مولانا رومی کے مزار کے پہلو میں ایک ایسا مرکز قائم کیا جا رہا ہے۔ جہاں علامہ اقبال کی تصانیف اور اہم یادگاریں رکھی جائیں گی، اس کام کی نگرانی انجمن کی استنبول شاخ کرے گی، یوم اقبال کے سلسلے میں مغربی پاکستان مسلم لیگ کے صدر جناب ملک خدا بخش حکومت سے یہ درخواست بھی کر چکے ہیں، کہ اقبال کا یوم وفات سرکاری طور سے منایا جائے، کیونکہ اقبال کی خدمات پاکستان کے لئے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتی ہیں، انھوں نے صوبائی حکومت سے یہ اپیل کی ہے، کہ یوم اقبال پر عام تعطیل کا اعلان کر دیا جائے (یہ سطور لکھی جا چکی

شاہ حسین کی یاد میں

شاہ حسین مشہور صوفی شاعر اور بزرگ کا عرس اور میلہ لاہور میں بڑی دھوم سے انعقاد پذیر ہوا۔ اس موقع پر ایک مجلس مذاکرہ، ادبی نشست اور محفل مشاعرہ بھی منعقد ہوا۔ مجلس مذاکرہ میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے جناب محمد یٰسین وٹو وزیر سماجی بہبود نے کہا، کہ تمام زبانیں انسان کی قوت فکر و اظہار کی ترجمان ہیں، ہمیں سب سے پیار ہے اور اردو بنگالی ہماری آزادی اور عظمت کا نشان ہیں، جن کو اپنا سمجھنا ہمارا فرض ہے، شاہ حسین کے جلسے سے خطاب کرتے ہوئے صوبائی وزیر تعلیم ملک خدا بخش نے کہا کہ قومی اتحاد اور بین الصوبائی استحکام اسی صورت میں ممکن ہے، کہ دونوں قومی زبانوں اردو بنگلہ کے لئے عربی رسم الخط اختیار کر لیا جائے۔

غالب کی سو سالہ برسی

حیدرآباد میں غالب کی سو سالہ برسی سنہ ہجری کے اعتبار سے بہت دھوم دھام کے ساتھ منائی گئی، اس شاندار تقریب کا اہتمام رائیٹرز کلب کی جانب سے ہوا تھا اور سندھ یونیورسٹی میں غالب پرستوں اور مداحوں کا ہجوم نظر آ رہا تھا۔ اس تقریب کی صدارت پروفیسر حسن علی عبدالرحمان وائس چانسلر جامعہ سندھ نے فرمائی، جن کا خطبۂ صدارت غالب کو خراج عقیدت پیش کرنے کا ایک نادر نمونہ تھا۔ تقریب کا آغاز تلاوت کلام پاک کے بعد پروفیسر خان رشید کی تعارفی تقریر سے ہوا۔ سندھی کے معروف ادیب جناب ڈاکٹر غلام نبی بختر بلوچ نے بھی غالب کی شخصیت اور فن پر اپنی تقریر میں روشنی ڈالی، مقالہ نگاروں میں حیدرآباد کے ادبی حلقوں کے جانے پہچانے نام شامل تھے، آخر میں رئیس شعبہ فارسی نے اپنے انگریزی مقالے کا اردو ترجمہ پیش کیا، ڈاکٹر محمد احسن فاروقی نے غالب پر اپنے خاص انداز سے ایک شگفتہ اور پر مغز تقریر کی۔ دوسری نشست جو منظومات پر مشتمل تھی، جناب ابراہیم خلیل شیخ کی زیر صدارت منعقد ہوئی۔ اس میں جن شعراء نے حصہ لیا۔ ان کے نام یہ ہیں، رشید تبسم، قاصد عزیز، جبریل صدیقی، برگ یوسفی بیکہ واسطی، حضور احمد سلیم، مسعود الوز۔ ڈاکٹر خان رشید اور ابراہیم خلیل شیخ

خطبات بیاد اقبال

پنجاب یونیورسٹی کے زیر اہتمام ۱۹ اپریل کو لاہور میں "خطبات بیاد اقبالؒ" کے سلسلے میں ایک سالانہ تقریب منعقد ہوئی، جس کی صدارت شیخ الجامعہ پنجاب یونیورسٹی پروفیسر حمید احمد خان نے کی، اس موقع پر جامعہ کراچی کے شیخ الجامعہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے فلسفہ اقبال کے نفسیاتی مطالع، کے زیر عنوان ایک پر مغز تقریر کی جس میں آپ نے کہا، کہ ملت کے استحکام کے لئے لازمی ہے، کہ ہمارے ذہنوں میں فلسفۂ اقبال کا ادراک کمزور نہ پڑے بلکہ ضروری ہے، کہ ہماری ملت شعوری طور پر اسے اپنا نظریۂ حیات بنا لے، کیونکہ ملت کی تعمیر میں جن عوامل نے کام کیا ہے، وہی فلسفۂ اقبال کی تشکیل میں کارفرما تھے۔

بہادر یار جنگ اکادمی

۱۹ مارچ کو کراچی میں بہادر یار جنگ اکادمی کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اس تقریب میں کراچی کے ممتاز ادیبوں اور شاعروں اور دانشوروں نے شرکت کی، سنگ بنیاد جناب ممتاز حسن نے رکھا۔ انہوں نے فرمایا۔ کہ یہ اکادمی ایک ایسے مرد مجاہد کے نام پر قائم کی گئی ہے جس کی شعلہ بیانی کی پوری قوم

معترف ہے، اور جس نے جنگ آزادی میں قائداعظم کے شانہ بشانہ کام کیا تھا۔

سر شاہ سلیمان کی یاد میں

کراچی میں ۱۰ مارچ کو برصغیر کے ممتاز مدبر، ماہر قانون و تعلیم، مشہور سائنسدان اور نقاد فن سر شاہ محمد سلیمان کی یاد میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت عدالت عالیہ کے چیف جسٹس جناب اے آر کارنیلیس نے کی، سر شاہ محمد سلیمان کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے ملک کے ممتاز دانشور اور شخصیتیں اس جلسہ میں جمع ہو گئی تھیں، سابق وزیر قانون اور ملک کی ممتاز شخصیت جناب اے کے بروہی نے کہا۔ کہ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ آئن اسٹائن کی سطح کا سائنسدان اور زبردست ماہر قانون و تعلیم سر شاہ محمد سلیمان کی یاد میں اب تک کوئی کام نہیں ہوا۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے سابق مرکزی وزیر جناب اے۔ ایچ اصفہانی نے موجودہ نظام تعلیم پر کڑی نکتہ چینی کی اور کہا کہ اس کی کوتاہیوں کی وجہ سے ہمارے یہاں سر شاہ سلیمان جیسے افراد پیدا نہیں ہو رہے ہیں، انہوں نے نظام تعلیم کو فوراً بدلنے کا مشورہ دیا۔ تاکہ ہم ایک درجہ اول کی قوم بن سکیں، اس موقع پر جمیل انصاری اور مولانا اسد القادری نے بھی تقریریں کیں،

اردو اکادمی کے زیر اہتمام اس جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے جناب جسٹس اے آر کارنیلیس نے فرمایا، کہ اگر سر شاہ سلیمان زندہ ہوتے تو شعبہ الفاظ، حساب، سائنس اور تعلیم میں ایک انقلاب آجاتا۔ انہوں نے کہا۔ کہ وہ کبھی ایک بیرونی زبان کو ایک لمحہ کے لئے پاکستان میں برداشت نہ کرتے۔ جسٹس کارنیلیس نے سر شاہ محمد سلیمان کی شخصیت اور عظمت کو بہت شاندار الفاظ میں ذکر کیا۔

آئینہ ہند

آندھرا پردیش میں اردو

انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش نے ریاستی سرکاری زبان بل میں اردو کے قانونی موقف کے تعین کے لئے یوم اردو منانے کی اپیل کی تھی، جس کے تحت ماہ فروری ۱۹۶۶ء کے پہلے ہفتے میں شاندار پیمانے پر اردو ہفتہ منایا گیا۔ حیدرآباد کے علاوہ صوبہ کے دیگر بارہ اضلاع میں پچاس سے زائد جلسے منعقد کئے گئے، جن میں مختلف سیاسی جماعتوں ادبی اور تہذیبی انجمنوں اور سماجی تنظیموں سے تعلق رکھنے والی ممتاز شخصیتوں نے شرکت کی اور ان جلسوں کو پارلیمنٹ، اسمبلی، قانون ساز کونسل کے اراکین سابق وزراء سابق گورنر اور ضلع پریشدوں کے صدوروں نے خطاب کیا۔ ہندی اور تلگو اداروں کے سربراہوں نے ان جلسوں میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ اور اردو کے جائز مطالبے کی تائید میں آواز بلند کی، اردو والوں نے بھی تلگو کو سرکاری زبان قرار دینے کے مطالبے کی شدت سے تائید کی،

ٹیگور انعامات کی تقسیم

حکومت مغربی بنگال نے ۱۹۶۵،۶۶ء کے لئے رابندر ناتھ ٹیگور یادگار انعامات کا اعلان کر دیا ہے۔ شریمتی آشا پورنا دیوی کو ان کی بنگلہ تصنیف "پرتھم پرتشرتی" پر۔ شری نشانتھ بھٹاچاریہ کو ان کی اردو تصنیف "بنگالی ہندوؤں کی اردو خدمات پر" اور شری [illegible]

بنگلہ تصنیف وید سبھا نگر پر پانچ پانچ ہزار روپیے کے انعامات کا مستحق قرار دیا گیا ہے ،

کربل کتھا کو انعام

شمالی ہند میں اردو نثر کی پہلی کتاب "کربل کتھا" کو جس کا مصنف فضلی تھا ، اور جسے مالک رام اور ڈاکٹر مختار الدین آرزو نے ایڈٹ کیا ہے "میرانعام" کا مستحق قرار دیا گیا ہے "میرانعام" ایک ہزار روپیہ کا ہے ، جو میرا کادمی کی جانب سے سال کی بہترین اردو تصنیف پر دیا جاتا ہے ،

"من سمجھاون" پر انعام

آل انڈیا میرا کادمی کے صدر جناب مقبول احمد لاری نے ڈاکٹر سیدہ جعفر کو ان کی کتاب "من سمجھاون" پر اور عمر انصاری کو ان کے مجموعہ کلام "سازبے خودی" پر دو سو روپیہ کے مخصوص انعامات عطا کئے ہیں ۔ "من سمجھاون" پر ۱۹۶۰ء میں آندھرا پردیش حکومت نے بھی اول درجے کا ادبی انعام دیا تھا ۔ یہ نظم قدیم گجراتی شاعر ترلب جی کی صوفیانہ تخلیق ہے ، جس کو ڈاکٹر سیدہ جعفر نے بڑی محنت سے مرتب کر کے ایک ضخیم مقدمے کے ساتھ شایع کیا ہے ،

ادیب کا دوبارہ اجرا

یہ خبر ادبی حلقوں میں مسرت سے سنی جائے گی ، کہ جامع اردو علیگڈھ کا ترجمان "ادیب" جو بند ہو گیا تھا ۔ دوبارہ ابن فرید کی زیر ادارت شائع ہو رہا ہے "ادیب" دوماہی ہوگا ، اور ہر شمارے کی قیمت ایک روپیہ ہوگی ، پہلا شمارہ شایع ہو چکا ہے ، خاص نمبر دو روپیہ میں دستیاب ہو سکے گا ، مزید تفصیلات کے لئے سرسید بک ڈپو علی گڑھ عنہ سے رجوع کیا جا سکتا ہے ،

عرشی صاحب کی اکسٹھویں سالگرہ

۲۰ مارچ کو نئی دھلی میں سپرو ہاؤس کے وسیع اور پر فضا سبزہ زار پر مولانا امتیاز علی عرشی کی اکسٹھویں سالگرہ کی تقریب کا جلسہ ہوا جس میں دہلی اور بیرون دہلی سے تمام ممتاز ادیب اور شاعر اور عرشی صاحب کے احباب شریک رہے ۔ جلسے کی صدارت نائب صدر جمہوریہ ہند جناب ڈاکٹر ذاکر حسین نے فرمائی جن حضرات نے تقاریر کیں ، ان میں پروفیسر مجیب وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ دھلی ، کرنل بشیر حسین زیدی ممبر پارلیمنٹ اور آل احمد سرور قابل ذکر ہیں ، عرشی صاحب کی علمی اور ادبی خدمات کے اعتراف میں انہیں ساہتیہ اکادمی کی جانب سے ۱۹۶۱ء میں انعام بھی دیا جا چکا ہے ، جلسے میں شرکت کرنے والی اور قابل ذکر ہستیوں میں احتشام حسین ڈاکٹر مختار الدین آرزو اور مولانا عبدالسلام شامل ہیں ،

چاندہ میں انجمن ترقی اردو

ضلع چاندہ میں اردو کے تحفظ کے لئے انجمن ترقی اردو کی شاخ قائم کر دی گئی ہے اس شاخ کے قیام کی تقریب فیض انصاری کی صدارت میں منعقد ہوئی ، عہدیداروں کا انتخاب عمل میں آیا اور چند تجاویز منظور کی گئیں ، پہلی تجویز کے ماتحت بالغوں کے لئے ایک مدرسہ شبینہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا گیا ۔ جو شاخ کی نگرانی میں کام کرے گا ۔ ایک اور تجویز کے مطابق اردو پرائمری اسکول کھولنے اور اس کے لئے امداد لینے کا فیصلہ کیا گیا ۔ ۳۱ مو ضع پر ضلع چاندہ ۳۰ اردو کے بہی خواہوں اور ہمدردوں سے حاصل کی گئی ہے ،

کہ وہ اپنے بچوں کو اردو اسکولوں میں داخل کرائیں اور اردو کے لئے چندہ فراہم کریں ۔

"نئے چراغ" کا قیام علی گڑھ میں ادبی ذوق رکھنے والی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی طالبات نے خواتین کی ایک ادبی انجمن کی داغ بیل ڈال دی ہے جس کا نام "نئے چراغ" رکھا گیا ہے ۔ اس انجمن کا افتتاحی اجلاس ۲۴ فروری کو منعقد ہوا ۔ انجمن کا افتتاح محترمہ رضیہ سجاد ظہیر نے فرمایا اور اس موقع پر اپنا ایک افسانہ بھی پڑھا ۔

ادبی ہفتہ علی گڑھ یونیورسٹی کے این آر ایس سی بی کلب میں "ادبی ہفتہ" منایا گیا جس میں نسیم قریشی صاحب لیکچرار اردو نے ایک تقریر میں اس بات پر مایوسی کا اظہار کیا کہ علی گڑھ یونیورسٹی جو کبھی اردو کا مرکز تھی ، اردو سے بیگانہ ہوتی جا رہی ہے اور وہاں انگریزی سے دلچسپی برابر بڑھ رہی ہے اردو تقاریر میں حصہ لینے کا تناسب بھی اسی رفتار سے کم ہو رہا ہے ، نسیم قریشی صاحب نے اس کی ذمہ داری ان اساتذہ پر بھی ڈالی ہے ، جو خود اردو پروگراموں میں دلچسپی لینا چھوڑ چکے ہیں ،

پنجابی صوبے کا قیام حکومت ہندوستان نے بالآخر لسانی بنیاد پر پنجابی صوبے کی منظوری کا اعلان کر دیا ۔ یہ فیصلہ پنجاب میں زبردست موافق اور مخالف ہنگاموں کے بعد کیا گیا ہے ، پنجابی صوبہ تین حصوں میں تقسیم کیا جائے گا ، لو اضلاع پنجابی بولنے والوں کے لئے ، ہندی بولنے والوں کے لئے ہریانہ اور باقی پہاڑی مقامات ہماچل پردیش میں شامل ہوں گے یہ بات اس سلسلے میں قابل ذکر ہے کہ پنجاب میں اب بھی اردو کو لنگوا فرنکا مقام حاصل ہے ، مگر اس کا ذکر کہیں بھی نہیں کیا گیا ہے ،

اردو کیلئے مطالبہ اردو کو اتر پردیش کی علاقائی یا معاون زبان تسلیم کرنے کا مطالبہ ، یوپی کونسل میں آزاد ممبر جناب ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی نے کیا ہے ، انھوں نے اس پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ ۸۰ لاکھ پنجابی بولنے والوں کے لئے تو ایک الگ صوبہ تسلیم کر لیا گیا لیکن ایک کروڑ سے زائد اردو بولنے والوں کی زبان کو علاقائی زبان بھی تسلیم کرنے سے انکار کیا جا رہا ہے ، ڈاکٹر عبدالجلیل صاحب نے ۲۸ مطالبہ پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگر اردو کو علاقائی یا معاون زبان کی حیثیت نہ ملی تو اس کے خلاف احتجاجی کارروائیاں کی جائیں گی

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی

پاکستان میں یونیورسٹیوں کی اہمیت

اصحاب سعادت، خواتین و حضرات![۱]

میں آپ تمام مہمانوں کا شکر گذار ہوں، کہ آپ نے آج صبح ہماری اس مقدس اور اہم تقریب میں شرکت کی تکلیف گوارہ فرمائی، اسی تقریب پر ہمیں یہ موقع نصیب ہوتا ہے کہ آپ کی خدمت میں اپنے ان خیالات کا اظہار کریں جو ہمارے نزدیک اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، نیز آپ کی شرکت اس امر کی علامت ہے، کہ آپ کو ہماری فلاح و ترقی سے دلچسپی ہے، ہمارے دل میں آپ کی اس دلچسپی کی بڑی وقعت ہے اس لئے کہ جامعہ قومی خدمت مناسب طور پر اسی طرح انجام دے سکتی ہے کہ معاشرہ اس کے ساتھ ہمدردی اور اس کے مسائل کا ادراک رکھتا ہو۔

چند روز قبل ۲۹ مارچ کو ہمارے شعبۂ معاشیات کے صدر پروفیسر قاضی محمد فرید صاحب نے یکایک قلب کے مرض کے باعث داعی اجل کو لبیک کہا اور ہمیں داغ مفارقت دے گئے۔ ان کی صحت بظاہر اس قدر اچھی تھی اور ان میں زندگی کا ولولہ اس درجہ موجود تھا۔ کہ ان کا انتقال بالکل غیر متوقع تھا۔ اس سے ہمیں جو صدمہ ہوا اس کا اندازہ آپ لگا سکتے ہیں۔

جیسا کہ ہم سب اچھی طرح آگاہ ہیں، یہ سال ہمارے ملک کی تاریخ میں امتحان و آزمائش کے لئے یادگار رہے گا۔ ابھی طویل تعطیل کے بعد ہماری تعلیمی سرگرمیاں شروع ہی ہونے پائی تھیں۔ کہ ہم نے یہ خبر سنی کہ ہمارے ہمسایہ ملک نے ۶ ستمبر کو ہم پر بغیر کسی اشتعال کے اچانک حملہ کر دیا اس کے پاس جو ذرائع بھی تھے۔ اس نے اس ناپاک جارحانہ مہم میں جھونک دیئے۔ یہ ہمسایہ ملک پاکستان سے چوگنی وسعت کا مالک ہے۔ اور اس کی صنعتی ترقی ہماری صنعت و حرفت کے قیام سے بہت پہلے شروع ہو چکی تھی دنیا کی سب سے بڑی قوتیں اس ملک کو مسلح کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتی رہی ہیں اس لئے کہ وہ جنوب مشرقی ایشیا میں اپنے مفاد کی حفاظت کے لئے ایک مضبوط قلعہ تعمیر کرنا چاہتی ہیں۔ برسوں سے یہ اسلحہ جمع ہو رہے تھے اور انھیں ایک ایسے ملک کے خلاف استعمال کیا گیا۔ جو ہندوستان سے چھوٹا اقتصادی ترقی میں اس کے مقابلہ میں پسماندہ، قومی طاقت میں کم اور امن پسند ہے۔ پاکستان کا وجود قیام پاکستان سے ہی ہندوستان کو ناپسند رہا ہے جب حملہ ہوا تو ہندوستان نے پاکستان میں بہت سے ممالک کے سفارت خانوں کو یہ توقع تھی کہ پاکستان اس حملہ سے جاں بر نہ ہو سکے گا۔ اور جلد ہی اس کا

خاتمہ ہو جائے گا حملہ آور بھی اسی گمان میں تھے، چنانچہ ان کے سپہ سالار اعلیٰ نے اپنے رفقائے کار سے یہ وعدہ کیا تھا کہ حملہ کے دن ہی لاہور کے جمخانہ کلب میں ان کی شراب سے تواضع کی جائے گی، لاہور کے فتح ہونے کی خبر ریڈیو اور ٹیلیویژن کے بعض اہم مرکزوں سے نشر بھی کر دی گئی،

بہت سے ممالک کا یہ خیال تھا کہ حملہ کا ایک ہی نتیجہ نکل سکتا ہے۔ اس لئے کہ ہندوستان کو ہر سامان میں تفوق حاصل تھا اس کے باوجود پاکستان کی افواج نے جو تعداد میں کم تھیں، اسلحہ کے اعتبار سے نسبتاً کمزور تھیں، سرحد سے چند میل پر حملہ آوروں کو روک دیا۔ اور اکثر مقامات پر انھیں دور تک شدید نقصان پہونچا کر ان کے علاقوں میں دھکیل دیا۔ مزید برآں جغرافیائی مشکلات کے باوجود انہوں نے دشمن کے سیکڑوں مربع میل رقبے پر قبضہ کر لیا۔

جنگ کے ان سترہ دنوں نے ہمارے جذبات میں بھی وہی ہیجان پیدا کیا جو ساری قوم کے جذبات میں بسا تھا۔ ہمارے دل شدت سے فکرمند تھے۔ لیکن اس فکرمندی کے ساتھ ساتھ جذبۂ ایثار، ہمت اور استقلال سے بھی مملو تھے۔ اس جامعہ کی تاریخ میں اس سے قبل کوئی موقع ایسا نہ آیا تھا جب ہمارے دلوں کی دھڑکنوں میں ایسی ہم آہنگی پیدا ہو۔ قریب قریب ہر صحت مند شخص فوجی تربیت حاصل کرنے کا خواہاں تھا۔ چنانچہ اس قلیل عرصے میں ہم ایک کمپنی سے زیادہ افراد کو مجاہدین کے درجہ کی تربیت دینے میں کامیاب بھی ہوئے، جن لوگوں کی عمر فوجی تربیت کی اہلیت سے آگے گذر چکی تھی، انہوں نے شہری دفاع اور ابتدائی طبی امداد کی تربیت حاصل کی، شفا خانے ان رضاکاروں کا خون جمع کرنے سے قاصر رہے جنہوں نے اس خدمت کے لئے اپنے آپ کو پیش کیا، جامعہ کی آبادی میں خواتین نے مجاہدوں، زخمیوں اور تباہ کاری کے شکار افراد کے لئے تحفے جمع کئے اور ان کے پارسل بنائے، طالب علم ان کاموں میں برابر کے شریک رہے اور انہوں نے بھی روپیہ اور سامان فراہم کیا، تمام عملہ اور طالب علموں نے ان فرائض کو جو ان کے ذمہ کئے گئے پورے جوش سے انجام دیا۔ ہم نے کچھ اور بھی ضمنی جنگی خدمات انجام دیں، جن کا ذکر مناسب نہیں ہے۔ مزید برآں سارے عملہ نے دیگر نقد عطیات کے علاوہ اپنی آمدنی کے مطابق تنخواہ کا پانچ یا دس فیصد حصہ بھی دفاع کے لئے دیا سب کی ہمتیں اس درجہ بلند تھیں کہ کسی وقت ہمارے دلوں میں خوف کا شائبہ بھی پیدا نہیں ہوا اور نہ کسی وقت یہ شبہ ہوا کہ ہم اپنے دفاع میں ناکام رہیں گے،

یہ تمام جذبات وہی تھے جو ساری قوم کے دل میں موجزن تھے۔ اگرچہ ہمارا وجود خطرے میں تھا لیکن کبھی ہم جھجکے نہیں کبھی مایوسی ہمارے پاس نہیں پھٹکی، ہم نے کبھی بھی جان کی بازی میں منفعت و نقصان کا اندازہ نہیں لگایا اور کبھی خطرہ سے جان نہیں چرائی صرف اپنی آزادی کی حفاظت اور اپنے مقتدر قومی وجود کا دفاع ہی ہمارے پیش نظر رہا اور ان دنوں کے مقابلہ میں ہر چیز کی ہستی ہمارے نزدیک ہیچ تھی، فوجی ماہروں کے اندازہ کے مطابق ہمیں فنا ہو جانا چاہئے تھا۔ لیکن ان کے اندازہ میں ہماری باطنی قوت کے سوت شامل نہ تھے۔ نہ انہوں نے ہماری ہمت اور روحانی طاقت کو اپنے حساب میں گنا تھا۔ ہمارا قلعہ ہمارا یہ یقین واثق تھا کہ انصاف ہمارا شریک ہے اور اس لئے فتح یقینی ہے۔

وہ کیا چیز تھی جس نے خطرہ کے وقت ہماری مدد کی ؟ اس وقت جب دنیا سمجھتی تھی کہ ہماری تباہی یقینی ہے ، تو کونسی قوت ہمارے آڑے آئی ؟ یہ کیونکر ہوا کہ ہم نے شجاعت و جانبازی کے وہ جوہر دکھائے جنہوں نے دفاعی جنگ کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ایک بھی پاکستانی ایسا نہیں جو ان سوالوں کے جواب نہ جانتا ہو وہ مددگار قوتیں تھیں ۔ اللہ پر ہمارا ایمان اور ہمارا یقین کہ ایسے ابتلا کی گھڑی میں وہ ہمیں نہیں چھوڑے گا اور اب جبکہ فوجیں واپس ہٹ چکی ہیں ۔ اور ہمیں اتنی مہلت ہے کہ سترہ دن کے نازک زمانہ پر نظر ڈال سکیں تو ہمیں اس خیال سے تقویت ہوتی ہے ، کہ خدا نے ہماری دعاؤں کو سُنا اور ہمیں وہ طاقت عطا کی جس سے ہم اپنے خود مختار وجود کی اس طرح حفاظت کر سکے کہ ہمارے طرزِ عمل سے ہمارے عظیم المرتبت آباؤ اجداد کی روایات کو دھبہ نہیں لگا ۔ اس خطرہ کا ہماری قوم نے جس طرح مقابلہ کیا ان سب کو جن کا تعلیم سے تعلق ہے غور و فکر کی تعلیم دیتا ہے ایسی دنیا میں زندہ رہنے کے لئے جہاں انصاف کو مفاد پرستی کی قربان گاہ پر ہر روز بھینٹ چڑھایا جاتا ہے ، جہاں ان کے نزدیک جو حالیہ تاریخ کے دھاروں کا رخ بدلنے کی قوت رکھتے ہیں ۔ واحد اصول میکیاولی کی سکھائی ہوئی بے اصولی ہے جہاں چھوٹے بڑے ممالک کے درمیان تکنیکی معلومات اور مادی ذرائع کے ایسے زبردست تفاوت ہیں ہم زندہ رہنے کی کیا تدابیر اختیار کریں ؟ سائنس نے بڑی اور ترقی یافتہ اقوام کے ہاتھ میں ایسے ہتھیار دے دیئے ہیں ، کہ چھوٹی اور کم ترقی یافتہ اقوام تو کس شمار میں ہیں ساری بنی نوع انسان کی تباہی ان کے حیطۂ وسائل سے باہر نہیں رہی ہے بڑی اور چھوٹی قوموں کے درمیان جو تفاوت ہے صرف اسی کے خیال سے وحشت نہیں ہوتی بلکہ یہ خیال اور بھی خوفناک ہے کہ یہ فرق بڑھتا ہی جاتا ہے ۔ اگر کسی ملک کو مجرمانہ حماقت یا طمع کے باعث کوئی قوم تباہ ہو جائے تو تجربہ شاید ہے کہ آج کل کی بے رحم دنیا میں اس کی قسمت پر کوئی آنسو نہیں بہائے گا ۔ اس انسان دشمن کوشش میں کہ ان کے مفاد ہر قیمت پر روبہ ترقی رہیں ۔ ہر فرد ، ہر انسان ، ہر قوم کو مٹانا ان کے نزدیک جائز ہے اس لئے کم ترقی یافتہ اقوام ، اس خطرہ کی طرف سے کہ چند ممالک کے ہاتھوں میں ساری قوت جمع ہو جائے اپنے وجود کو خطرہ میں ڈال کر ہی غافل ہو سکتی ہے ، کلی تباہی کا خطرہ نہ صرف کمزور ممالک ہی کے لئے نیندیں اچاٹنے والا نہیں ہے ، زیادہ سے زیادہ طاقتور قوتیں بھی یہی ڈراونا خواب دیکھنے پر مجبور ہیں ۔

یہ ہمارے امکان میں نہیں ہے ، کہ ہم اپنے آپ کو یا دنیا کو اس خطرہ سے نجات دلا سکیں ، ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے ، کہ دنیا میں احمقانہ تباہی کے خلاف رائے عامہ کی تعمیر میں شریک رہیں ، بین الاقوامی بے اصولی کا بنیادی محرک اسی وقت تک موجود رہے گا ، جب تک دول عظمیٰ مفاد پرستی کی بجائے انصاف کو اپنا شعار نہ بنائیں ، اور ہر قوم کے اس حق کا احترام نہ کریں کہ وہ اپنے مستقبل کا خود فیصلہ کر سکتی ہے ، البتہ چھوٹے ملکوں کے اختیار میں یہ ضرور ہے کہ اپنے آپ کو دوسروں کی محتاجی اور ان کی مفاد پرستی کا شکار ہونے سے بچا سکیں ، اس لئے ان ہی کا دوسرا نام غلامی ہے ، اس کے لئے مصلحت شناسی اور معقول منصوبوں کے تحت مسلسل مساعی کی ضرورت ہے

ایک طویل مدت تک یہ ممکن ہے کہ سائنسی اور تکنیکی ترقی کے ذریعہ کمزور اقوام کو ان کے ملکوں کی ہمسری نصیب

نہ ہو، جو بہت آگے بڑھ چکے ہیں، لیکن اس کے ذریعہ وہ دوسروں کی زبردستی مفاد پرستی کا شکار بننے کے خلاف زیادہ قوت پیدا کر سکتی ہیں، احتیاج اور فاقہ کشی کا غلبہ اسی قدر تباہ کن ثابت ہو سکتا ہے۔ جتنا سامراجیت کا نفوذ اور ان موانع کی موجودگی میں وہ اپنا کامل وقار حاصل نہیں کر سکیں، ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ ٹیکنیکی مہارت کے ساتھ ساتھ معاشرتی علوم میں اہلیت بھی کچھ کم اہم نہیں ہے، پیداوار کے جدید طریقوں کے رواج سے جو فائدے حاصل ہوتے ہیں، وہ اقتصادی، سماجی اور سیاسی قوتوں کے عمل سے پوری واقفیت نہ ہونے کے باعث رائیگاں جا سکتے ہیں، حفاظت اور خوش حالی کی دائم اور عاقلانہ تلاش قومی مفاد کی حفاظت بلکہ قومی وجود کے دفاع کے لئے ضروری ہے ان دونوں میدانوں میں مناسب ماہرانہ علم کے حصول کی مسلسل کوشش کسی ملک کی یونیورسٹیوں کے علاوہ اور کہاں جاری رہ سکتی ہے۔

میں اس سے قبل بیان کر چکا ہوں۔ کہ ہندوستان کے ساتھ گذشتہ جنگ میں اللہ پر ہمارے ایمان نے کیا کارنمایاں انجام دیا، یہ ایمان ہمارے ورثہ کا ایک جزو ہے اور اگرچہ اہل ایمان کی حیثیت سے ہماری کوتاہیاں سب کو معلوم ہیں، تاہم یہ ایمان اس وقت ہمارے آڑے آیا۔ جب ہمارے وجود کی تباہی کا خطرہ لاحق تھا۔ جنگ شروع ہونے تک اپنے معاشرہ میں اعمال کی دلشکن خرابیوں کے باعث ہمارے ذہن میں یہ شبہ پیدا ہو چلا تھا کہ ہمارے دلوں میں ایمان کی رمق باقی بھی رہی ہے یا نہیں، پھر باطنی طاقت کا یہ طوفان کہاں سے امڈا؟ ایک قلیل مدت کے لئے وہ دولت جو بظاہر ہم گنوا چکے تھے کہاں سے دوبارہ ہمارے ہاتھ لگی؟ وہ اس لئے دوبارہ حاصل ہوئی کہ ہمارے تحت الشعور میں دفن تھی، جہاں عارضی مطمحیات کے ساتھ ہمارے شغف نے اسے دبا لیا تھا۔ اس شغف کے دوبارہ زندہ ہونے کے ساتھ ہی ہمارا ایمان پھر پس منظر میں چلا جائے گا اور بتدریج ہمارے شعور سے غائب ہو جائے گا، خود یہ خیال خوشگوار نہیں ہے کہ ہم اس چیز کو جو ہمارے ہر کام میں مشعل راہ ہونی چاہیئے، اپنے تحت الشعور کے کہیں خالی میں جھونک دیں، مگر یہ خطرہ تو اور بھی جان لیوا ہے، کہ وہ لاپرواہی اور عدم توجہ کے باعث وہاں سے بھی محو ہو جائے، ایمان دل میں خود بخود پیدا نہیں ہوتا۔ اس شجر کو تعلیم نصب کرتی ہے، ہمیں اپنے ضمیر سے یہ سوال کرنا چاہیئے۔ کہ ہم اپنے نوجوانوں میں یہ شعور پیدا کرنے کی کیا کوشش کر رہے ہیں، کہ بغیر ایمان کے زندگی بے معنی ہے اور اس میں یہ سکت نہیں رہتی، کہ کسی بحران اور خطرہ کا مقابلہ کر سکے کیا ہم انہیں یہ حقیقت سکھانے میں کامیاب ہوئے ہیں، کہ جس دل میں ایمان کی قوت ہو اسے کوئی مغلوب نہیں کر سکتا؟ اس سے انسان کی زندگی تباہی کے دائرہ سے باہر نکل جاتی ہے، اور انسان موت پر اس درجہ غالب آ جاتا ہے۔ کہ جسمانی موت محض دوام میں انتقال کا ذریعہ بن جاتی ہے،

کسی قوم کا وجود قائم رہنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے دل میں اپنے ورثہ، اپنی اخلاقیات اور اپنے طریقہ زندگی پر فخر پیدا کرے اپنی زندگی کے ہر لمحہ اس پر اپنی خودی کا انکشاف ہونا چاہیئے، تاکہ وہ اپنی انا کو کھو نہ بیٹھے۔ ملت محض افراد کا مجموعہ نہیں ہوتی، ملت ایک روح، ایک انا، ایک خودی کی مالک ہوتی ہے۔ اگر اس میں انا نہیں تو وہ موجود بھی نہیں، اور اگر ملت جان بوجھ کر یا غیر شعوری طور پر احساس کمتری کے باعث اپنی انفرادیت گنوانے پر کمر بستہ ہو جائے تو یہ انا رائیگاں جاتی ہے۔ اس لئے کہ ملت اس حالت

میں اپنی ثقافت و معتقدات کو چھوڑ کر اپنی منفرد ہستی کو سمو لینے کی کوشش کرتی ہے، اور ان سے یگانگت تلاش کرتی ہے، جن کی وہ سراپا جبراً مداح ہوتی ہے، جب یہ مرض پیدا ہوتا ہے، تو ملت محض ایک بے مقصد انبوہ بن جاتی ہے، جن کے سامنے روز بروز زندگی گذارنے کے علاوہ کوئی منزل و منہاج نہیں ہوتا۔ اس مرض کی علامت یہ ہوتی ہے، کہ ملت کو اپنی زبان پر بھی شرم آتی ہے، اس لئے کہ اس میں وہ جذبات وتخیلات بھرے ہوتے ہیں، جو قومی ثقافت میں فعال ہوتے ہیں، اور ان ہی جذبات وتخیلات کو وہ بھولنا چاہتی ہے ایسی قوم کو خطرہ سے کون بچا سکتا ہے، اگر کچھ کر سکتے ہیں، تو اس کے ذی فہم طبقہ کے وہ بچے کھچے افراد ہی کر سکتے ہیں، جن کے دلوں میں کچھ عزت نفس یا مقاصد حیات باقی رہ گئے ہوں۔

خواہ وہ سائنس یا تکنیکی ترقی ہو یا معاشرہ کے مختلف اشتغال وافعال کے فہم کے ذریعہ معاشرہ کا مطالعہ ہوتا کہ مسلسل خبرداری کی وساطت سے پیش آئند، خطروں یا امکانی فائدوں سے ملت کو آگاہ کیا جا سکے۔ یا اللہ پر ایمان اور اپنے نظریہ حیات پر یقین کی تقویت ہو یا اپنی ثقافت وانفرادیت پر فخر کے جذبہ کا احیا ہو۔ ان میں سے کسی خدمت کا انجام دینا اس وقت تک ناممکن ہے جب تک ہماری جامعات کو مضبوط نہ بنایا جائے انسانی علم نے اس قدر حجم حاصل کر لیا ہے، اور ایک علم دوسرے علوم میں ایسا لپٹا ہوا ہے کہ علمی تحقیق میں افراد نہیں ادارے ہی اس قابل ہو سکتے ہیں، کہ وہ کچھ عمق حاصل کریں۔ اور اس دور کی زندگی کی پیچیدگیوں کے ساتھ تمام تحقیقات وانکشافات کا تطابق کریں۔ آج تمام متمدن ممالک میں حکومتوں اور جمہور کی اصلی مشیر جامعات ہی ہیں، جامعات گذشتہ ادوار کی طرح اب عافیت کوش اور علمی سرگرمیوں کی چہار دیواری میں معتکف نہیں ہیں، موجودہ زندگی کے شعور وتر سے ان کی قدرے علیحدگی فی الحقیقت زیادہ خدمت کا ایک آلہ ہے، نہ حکام، نہ شہریوں کے پاس اتنا وقت ہے، کہ وہ ذاتیات ورحجانات کے بنیادی اسباب کی تہ تک پہنچ سکیں اور وہ سب ان افراد کے انکشافات پر تکیہ کرتے ہیں، جن کا اس کے علاوہ کوئی اور کام نہیں۔ کہ وہ انسانی علم کی افق کو وسیع تر بنائیں، یہ ضروری نہیں ہوتا کہ روزمرہ کے فیصلوں میں جن کی اہمیت عارضی ہو جامعات سے استصواب کیا جائے۔ لیکن کوئی بنیادی فیصلہ ایسا نہیں ہوتا جس میں ان سے مشورہ طلب نہ کیا جائے، اور اس مشورہ کا احترام نہ کیا جائے، جن معاشروں میں ایسا نہیں ہوتا وہ اور ان کی حکومتیں اپنی خود پیدا کردہ تاریکی میں سرگرداں پھرتی رہتی ہے،

معاشروں کی پختہ کاری کا یہ اشاریہ کہ اس کی زندگی میں اس کی جامعات کا کیا مقام ہے غلطی سے بالکل مبرا ہوتا ہے، اس لئے کہ اس سے ظاہر ہوتا ہے، کہ وہ معاشرہ اپنے مسائل کے صحیح اور معقول مطالعہ کو کیا درجہ دیتا ہے، ہر ترقی یافتہ ملک کے ماہروں کو جو اقتدار حاصل ہے۔ وہ اس کا نتیجہ ہے کہ یہ تمام ممالک معلومات کی سائنسی تشخیص اور اس سے برآمد ہونے والے نتائج پر تکیہ کرتے ہیں، بعض ممالک نے جو ہوشربا ترقی کی ہے۔ وہ اس کے عملداروں کے احکام کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ سائنس دانوں، انجینئروں اور مفکرین کی خدمات کا نتیجہ ہے جو با جامعات سے متعلق ہیں۔ یا اعلیٰ تعلیم کے ان اداروں میں ہونے والی بنیادی تحقیقات پر تکیہ کرتے ہیں کسی ملک میں اس سے زیادہ منافع کسی اور کام میں روپیہ لگانے سے نہیں ہوتا جتنا جامعات کی ترقی اور روزمرہ کے مصارف پر خرچ کرنے سے

ہوتا ہے، اور اگر یہ ترقی کسی سمجھے بوجھے منصوبے کے تحت ہو تو منافع جلد ہی حاصل ہونے لگتا ہے آج کی دنیا میں اچھی جامعات جن میں اساتذہ اور سامان کافی ہو اوّل ضروریات میں شامل ہیں، طمطراق کا سامان نہیں ہیں، وہ نئی نہروں اور جدید کارخانوں سے بھی زیادہ ضروری ہیں، اس لئے کہ ان کے ذریعہ سے ہی وسائل کے صحیح استعمال کی نشاندہی ہوتی ہے۔ یہ نکتہ اب بچوں کی دانست میں بھی ہے، کہ خوشحالی قدرتی وسائل سے انسانی علم کی روشنی میں استفادہ کے ذریعہ ہی حاصل ہوتی ہے۔ ترقی یافتہ سماجی یا سائنسی تکنیکوں کے لئے تخصص میں ایسے عمق کی ضرورت ہے، جو غیر عالم کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ خواہ وہ کتنا ہی ذہین کیوں نہ ہو اور نہ یہ تکنیک ایک حد سے آگے مستعار لائے جا سکتے ہیں، اس لئے کہ ہر ملک کا یہ کام ہے کہ وہ اپنے مخصوص سماجی، جغرافیائی اور اقتصادی حالات کے مطابق اپنے خصوصی وسائل کو استعمال کرنے کے بہترین طریقے معلوم کرے۔

اگر مادی ترقی کے متعلق یہ درست ہے، تو اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کسی ملت کے اخلاقی انحطاط کو روکنے اور اس میں ذہنی فضیلت کا شوق پیدا کرنے، قومی ورثہ پر فخر کے احیاء اور اس کی اقدار سے وابستگی اور ایمان کی تقویت، اس کی زندگی میں قابل قدر مقاصد و منازل کے شمول، اور مختلف اور بعض اوقات متنازع گروہوں میں وحدت پیدا کر کے انہیں شعوری طور پر ایک قوم بنانے کے لئے کس قدر علم اور فکر کی ضرورت ہے۔ یہ تمام مقاصد یوں حاصل نہیں ہو سکتے کہ قوم بے مقصدی کے دھارے پر بہتی رہے یا ایسے طریقے اختیار کئے جائیں۔ جو منصوبہ بندی فہم اور نظم سے عاری ہوں۔ آج سماجی ترقی کے لئے سائنسی تکنیک انسان کو حاصل ہیں، جنہیں ماہرین پاکستان کی ضروریات کے سانچے میں ڈھال سکتے ہیں۔ ان کے مطالعہ اور انہیں اپنی ضروریات کے مطابق بنانے کا کام اگر جامعات میں نہیں تو اور کہاں انجام پا سکتا ہے۔

ہمیں انگریزوں کے زمانے سے ایک مغالطہ ورثہ میں ملا ہے۔ وہ اپنے مقصد کے لئے اس نظریہ کو پھیلاتے رہے کہ تعلیم کو ابتدائی درجہ پر ہی وسعت دینی چاہئے۔ یہ صرف شروعات میں ہی درست ہوتا ہے۔ لیکن کچھ عرصہ گذر جانے کے بعد جب تک اعلیٰ درجہ پر جلد اور مناسب ترقی نہ ہو۔ تو کسی سطح پر بھی وسعت ممکن نہیں ہوتی اب دنیا میں روشن خیال رائے اس کی معترف ہے کہ مادی سماجی اور ذہنی ترقی یکساں طور پر جامعات ہی کی ترقی کی محتاج ہے۔ ہر درجہ کے مکاتب کی تعلیم میں توسیع کا تو خصوصاً بلاواسطہ جامعات پر انحصار ہے اس لئے کہ ان کے بغیر تربیت یافتہ اور روشن خیال اساتذہ کافی تعداد میں مہیا نہیں ہو سکتے،

اس ملک میں جامعات ہر گوشے سے ناجائز نکتہ چینی کی ہدف ہیں۔ ان کی ضروریات کا ماہرانہ جائزہ لئے بغیر کہا جاتا ہے کہ وہ فضول خرچ اور مسرف ہیں ان پر یہ الزام بھی ہے، کہ انہوں نے تعلیم کے معیار کو درست نہیں کیا۔ حالانکہ کسی نے یہ زحمت گوارا نہیں کی کہ یہ تو معلوم کرے کہ آیا ان کے پاس اتنا سامان اور اتنے اساتذہ ہیں کہ وہ اپنے فرائض صحیح طور پر انجام دے سکیں اور نہ رائے عامہ اس وقت ان کے آڑے آتی ہے۔ جب شورش اور ہڑتالوں سے انہیں معطل کر دیا جاتا ہے۔ ان سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ تعلیم و تحقیقات کی مرکز ہوں حالانکہ ان کے پاس تحقیقات اور کتب خانوں کی سہولتیں اور مختبر وافی نہیں ہیں۔ اس جامعہ نے اکثر اپنے درسی معیار میں کمی کا رونا رویا ہے۔ لیکن کسی کے کان پر ہمارے ماتم سے جوں بھی نہیں رینگی۔ سبب اصل میں یہ ہے۔

کہ معاشرہ نہ جامعات کی اہمیت سے واقف ہے۔ نہ ان کی ضروریات سے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے پاس اپنے تہ نشین غیر علمی رویہ کی وجہ سے کوئی ایسا مقیاس نہیں کہ ہم اپنی علمی ضروریات کو ناپ سکیں۔ اور نہ ہم خدام تعلیم یا جامعات کے افراد کی درخواستیں سننے کا ذوق رکھتے ہیں۔ ہمیں جہالت کا وہ خول جو ہم نے اپنے چاروں طرف بنا لیا ہے توڑنا پڑے گا۔ ہمیں اپنے دل سے یہ خیال دور کرنا پڑے گا۔ کہ جو کچھ ہم بزعم خود جانتے ہیں، اس سے زیادہ ہمیں جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ہمارا زعم محض ایک توہم ہے اس لئے کہ جس رائے کی بنیاد دوائی علم پر قائم نہ ہو وہ توہم سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی جب تک جہالت کا یہ خول ٹوٹے گا نہیں فلاح کی کوئی امید نہیں ہو سکتی، موجودہ فضا میں ہر ذی شعور انسان ہر قدم پر اپنے آپ کو نیچ پاتا ہے اور اس کے لئے زندگی غیر مشکور سعی اور بے نتیجہ کوشش کی ایک داستان بن جاتی ہے۔

یہ مناسب نہیں ہوگا کہ میں اس مایوسی کے اظہار پر سلسلۂ کلام ختم کروں، جامعات کو اپنے ذمہ یہ کام لینا پڑے گا۔ کہ وہ قوم کو اپنی اہمیت سے روشناس کرائیں۔ یہ درست ہے کہ ان کی روایات اور حالات اس فرض کی انجام دہی میں ان کے لئے رکاوٹ ہیں۔ لیکن قومی مفاد کے پیش نظر انہیں قدم اٹھانا ہی پڑیگا۔ اگر ہم اپنے راستہ سے ان رکاوٹوں کو دور کرنے کی کوشش کریں تو یہ عمل ہمارے لئے جائز ہوگا۔ اس لئے کہ اس کے بغیر ہماری ترقی اور قوم کی خدمت کی صلاحیت شدت سے مسدود ہو جائے گی، قوم کو یہ امور سمجھانے میں خود ہمارے فہم کو بھی ترقی ہوگی۔ جب ہم دوسروں کو یہ بتائیں گے کہ جامعات سے کیا توقعات رکھنی چاہئیں، تو ہمیں اپنی ذمہ داریوں کا بھی احساس زیادہ ہوگا۔ ہم اپنے متعلق قوم کے دل میں جو توقعات پیدا کریں گے انہیں پورا کرنے کی بھی کوشش کرنی پڑے گی۔ مگر ہم یہ سب جب ہی کر سکتے ہیں۔ کہ قوم میں بھی ہماری اہمیت اور ضروریات کا صحیح احساس موجود ہو

اب میں چند الفاظ اس جلسے کے سند یافتگان سے کہنا چاہتا ہوں۔ بہت سے موقع ایسے ہوتے ہیں۔ جب ہم میں سے بعض نے ان رجحانات کے متعلق تشویش کا اظہار کیا ہے جو ہم نے اپنے ملک کے نوجوانوں میں پائے ہیں۔ ہم یہ اس لئے کرتے رہے ہیں۔ کہ ہمارا فرض تھا کہ ہم آپ کو اس خطرات سے آگاہ کر دیں جو ہمیں ان رجحانات میں مضمر نظر آتے رہے۔ لیکن ہمیں آپ پر ہمیشہ اعتماد رہا۔ اس لئے کہ اس اعتماد کو کھو لینے کے یہ معنی ہوتے کہ ہم اپنی قوم کے مستقبل سے مایوس ہو جاتے اس کے علاوہ اس اعتماد کے بغیر ہمارا تعلیم کے ساتھ شغف ہی بے معنی ہو جاتا۔ ملت کی آزمائش کے ان سترہ دنوں میں یہ بات ثابت ہو گئی کہ ہمارا اعتماد بے جا نہ تھا۔ اس لئے کہ اس موقع پر آپ نے علو ہمت کا ایسا مظاہرہ کیا کہ ہمارے اندیشے دور ہو گئے۔ اور ہمارے دل فخر اور امید سے بھر گئے۔ ایسے نوجوانوں نے جو آپ سے کچھ زیادہ معمر نہ تھے اپنی جانبازی ایثار ہمت اور ایمان کی شہادت اپنے خون سے لکھی۔ وہی جذبات جو ان کے دل میں تھے۔ آپ کے دلوں میں بھی موجزن تھے۔ اور اگر آپ کی طلبی کا موقع آتا۔ تو آپ بھی بے دھڑک کچھ بغیر پیچھے بغیر اپنی جانیں قربان کر دیتے آپ نے ثابت کر دیا۔ کہ آپ بھی اسی خمیر سے بنے ہیں جس سے شہدا بنتے ہیں۔ آپ اب ان خوبیوں کو زندگی کے معمول میں قائم رکھنے کے سبق سیکھ لیں۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو آپ کے ذریعہ ایسی قوم کی تعمیر ہوگی۔ جو اپنی عظمت کے لحاظ سے تاریخ عالم کی تمام اقوام سے بازی لے جائے گی۔

ملّا واحدی

خود نوشت سوانح عمری کا ایک باب

ملّا واحدی، یادگارِ زمانہ لوگوں میں سے ہیں۔ گوشہ نشینی کے باوجود ان کی زندگی انجمن آرائیوں میں گزری اور وہ سب سے الگ ہوتے ہوئے بھی سب سے گھلے ملے رہے۔ دہلی سے انھیں بے پناہ محبت ہے، پہلے وہ خود دہلی کی وجہ سے زندہ تھے، اور اب دہلی ان کے دم سے زندہ ہے "میرے زمانے کی دلّی" لکھ کر انھوں نے اس شہر کی ثقافت کا جیتا جاگتا مرقع پیش کیا ہے۔ آج کل واحدی صاحب اپنی داستان حیات لکھ رہے ہیں جسے وہ اپنی اولاد تک محدود رکھنا چاہتے تھے کسی نہ کسی طرح اس داستان کے کچھ اجزا مدیر قومی زبان تک بھی پہنچ گئے۔ واحدی صاحب سے درخواست کی گئی کہ وہ اس کی اشاعت کو محدود نہ رکھیں۔ انھوں نے اس درخواست کو قبول تو کیا ہے لیکن خاص خاص حصّوں کی حد تک ـــ بہرحال اس داستان کا ایک حصّہ، جو شخصیات سے متعلق ہے شائع کیا جا رہا ہے۔

(ادارہ)

ملوانے والا اور نہ ملوانے والا تو اللہ ہے، لیکن ظاہر ذریعہ مندرجہ ذیل حضرات سے ملاقات کا نظام المشائخ بنا نظام المشائخ نہ نکلتا اور خواجہ حسن نظامی میرے ہاں نہ رہنے لگتے تو ان حضرات تک میری رسائی شاید کبھی نہ ہوتی۔ یہ آتے تھے خواجہ صاحب کے پاس ـــ لیکن میرے گھر پر آتے تھے، لہٰذا مجھ سے بھی مراسم بڑھتے تھے۔ یا جاتے تھے خواجہ صاحب ان کے پاس مجھے ساتھ لے لیتے تھے۔ اس لئے میری بھی ملاقات ہو جاتی تھی۔ ان میں بعض ایسے بھی ہیں کہ انھیں مجھ سے اتنا تعلق ہو گیا کہ اتنا خواجہ صاحب سے نہیں تھا۔

دوسرے رسالے اور اخبار جو میں نے جاری کئے وہ بھی حقیقتاً نظام المشائخ کی کامیابی کے طفیل جاری ہوئے تھے۔ نظام المشائخ کی کامیابی سے اور رسالے اور اخبار نکالنے کا حوصلہ پیدا ہوا۔

خود خواجہ صاحب کے اور میرے تعلقات نظام المشائخ نے استوار کئے تھے۔

نواب عبداللہ کسمنڈوی

نواب عبداللہ کسمنڈوی کا گزشتہ صفحات میں ذکر آچکا ہے۔ عوام نواب کسمنڈوی سے زیادہ واقف نہیں تھے۔ لیکن خواص میں انھیں بہت اہمیت حاصل تھی۔

نواب کسمنڈوی پُراسرار آدمی تھے۔ دینی اعتبار سے بھی سمجھنا مشکل تھا کہ ان کا کیا مقام ہے اور دنیاوی اعتبار سے بھی انھیں محض اخبار نویس کہنا درست نہیں تھا۔ اخبار نویس اردو کے ان سے اونچے اور موجود تھے۔ لیکن نواب کسمنڈی کا اثر ہندوستان کی ریاستوں پر اور ہندوستان کے انگریز حاکموں پر بلا کا تھا۔ راجہ نواب گمان کرتے تھے۔ کہ نواب کسمنڈی کے توسل سے حکومت ہندوستان کو راضی رکھا جاسکتا ہے اور حکومت ہندوستان کو حسن ظن تھا کہ ہم نواب کسمنڈی کی معرفت ریاستوں سے اپنی مرضی کے مطابق کام کرا سکتے ہیں۔

دربار ۱۹۱۱ء کے زمانے میں جس دن جارج پنجم آرام لیتے تھے اور تقریبات بند رہتی تھیں اس دن نواب کسمنڈی میرے گھر میں ہوتے تھے اور حیدرآباد، دکن کے "جنگ" اور "دولہ" ان سے ملنے آتے تھے۔ نواب کسمنڈوی ان کے استقبال کے لئے نہیں اٹھتے تھے۔ آرام کرسی پر پڑے پڑے سلام کا جواب دے دیتے تھے۔

خواجہ حسن نظامی کا مہاراجہ سرکشن پرشاد، وزیر اعظم ریاست حیدرآباد سے تعارف نواب کسمنڈوی نے کرایا تھا۔ نواب کسمنڈوی حیدرآباد جاتے تھے تو ہز اکزالٹیڈ ہائی نس نظام دکن کے مہمان ہوتے تھے۔

علامہ شبلی نعمانی

نظام المشائخ کے اجرا کے بعد سب سے پہلے مولانا شبلی نعمانی ہمارے ہاں تشریف لائے تھے اور تقریباً مہینہ بھر ٹھہرے تھے۔ خواجہ حسن نظامی کو مولانا شبلی نے کسی خط میں لکھا تھا کہ کام کرتے کرتے تھک گیا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ مہینہ بھر کے لئے کہیں باہر چلا جاوں۔ خواجہ صاحب نے جواب دیا کہ اور کہیں نہ جایئے یہاں تشریف لے آیئے سکون کا پورا بندوبست کر دیا جائے گا۔ مولانا نے یہ تجویز بہ ایں شرط منظور فرمائی کہ آپ فقط قیام کا انتظام کریں۔ طعام کا انتظام میرا باورچی کرے گا باورچی کو لاوں گا۔

خواجہ صاحب نے نواب بدھن کی پوری محل سرا مولانا کے سپرد کر دی، جہاں وہ باورچی سے آگ تنور سلگواتے تھے اور چپاتیاں پکواتے تھے، باقی سالن اپنے ہاتھ سے پکاتے تھے۔ یہ نظام مشائخ کا بالکل ابتدائی زمانہ تھا۔ نظام المشائخ کا دفتر ابھی نواب بدھن کے مردانہ مکان میں تھا جو نواب بدھن کا کمرہ کہلاتا تھا۔

میں نے دیکھا کہ مولانا شبلی روز صبح آٹھ بجے سے دس بجے تک ایک کمرے بند ہو جاتے ہیں اور دو گھنٹے صرف لکھتے

ہیں۔ مولانا نے مجھے بتایا کہ میں دو گھنٹے سے زیادہ نہیں لکھتا حتی الامکان ناغہ نہیں کرتا۔ میری تمام تصنیفات اسی دو گھنٹے کی پابندی کا ثمرہ ہیں۔ دو گھنٹے کے بعد مولانا کمرے سے نکل آتے تھے اور کتابیں پڑھتے رہتے تھے۔ یا باتیں کرتے رہتے تھے۔ مولانا شبلی کی ہر بات میں معلومات ہوتی تھیں۔ جب واپس جانے لگے تو میں اسٹیشن پہنچانے گیا تھا، خواجہ صاحب کی طبیعت کچھ ناساز تھی۔ وہ نہیں جا سکتے تھے۔ مولانا کی ایک ٹانگ کٹی ہوئی تھی۔ لیکن بیساکھیوں کے سہارے، ٹرین کے انتظار میں پلیٹ فارم پر چہل قدمی کر رہے تھے اور معلومات کے دریا بہا رہے تھے۔

مولانا ابوالکلام اور نواب بہادر یار جنگ:

مولانا ابوالکلام آزاد اور نواب بہادر یار جنگ سے بھی نظام المشائخ کے ابتدائی زمانے میں نواب بدھن کے کمرے ہی پر ملاقات ہوگئی تھی۔ یہ دونوں میرے ہم عمر تھے۔ مولانا ابوالکلام سے میں ایک دفعہ پہلے بھی مل چکا تھا۔ خواجہ حسن نظامی کے ساتھ، کانپور کے اسٹیشن پر اور حافظ محمد حلیم تاجر چرم کانپور کی کوٹھی پر۔ اور پھر ۱۹۴۷ء تک ملتا رہا۔ وہ میرے ہاں بیسیوں مرتبہ تشریف لائے۔ اور آخر میں تو مسٹر آصف علی کا گھر ان کا گھر بن گیا تھا۔

نواب بہادر یار جنگ سے جہاں تک یاد پڑتا ہے، دوبارہ ملنا نہیں ہوا۔ البتہ ان کی دین داری اور ان کے اخلاص کی ہر شخص سے برابر سنتا رہا۔

مولانا ابوالکلام کو تو اللہ تعالیٰ نے لکھنے کا بھی کمال دیا تھا اور بولنے کا بھی۔ نواب بہادر یار جنگ کی تحریر کیسی تھی، اس کا علم نہیں ہے۔ تقریر میں وہ مولانا ابوالکلام کے مقابلے کے بتائے جاتے تھے گویا اردو زبان کے مقرروں میں صف اول کے مقرر تھے۔

مولانا ابوالکلام کو انڈین نیشنل کانگریس میں جو مقام حاصل تھا، وہی مقام آل انڈیا مسلم لیگ میں نواب بہادر یار جنگ کا تھا۔

مولانا ابوالکلام اور نواب بہادر یار جنگ کی بات چیت بھی غیر معمولی پرکشش ہوتی تھی۔ مولانا ابوالکلام اپنی مشہور "انا" کے باوجود مخاطب کو متاثر کر لیتے تھے اور نواب بہادر یار جنگ کی زبان کا جادو بھی مجھے یاد ہے۔ ۱۹۱۱ء میں نواب صاحب نواب بہادر خاں تھے نواب بہادر یار جنگ کا خطاب بعد میں ملا تھا۔

مولانا ابوالکلام کی "انا" مغروروں اور متکبروں کی سی "انا" نہیں تھی۔ وہ اللہ کے سوا کسی کے آگے جھکتے نہیں تھے تو یہ تو قابل ستائش "انا" ہے۔ یا اپنے علم وفضل اور اپنی ذہانت و طباعی کا انھیں احساس تھا تو اس میں بھی کیا برائی ہے۔ تھے ہی مولانا واقعی جینیس۔ مغرور اور متکبر وہ قطعی نہیں تھے۔ میں نے ان کی حالت میں کبھی فرق نہیں پایا۔ مولانا ابوالکلام جیسے ۱۹۱۰ء میں تھے ۱۹۴۷ء تک مجھے تو ویسے ہی نظر آئے۔ اقتدار نے ان کے دماغ اور

زبان پر کوئی برا اثر نہیں کیا تھا۔ وہ بے شک گاندھی اور جواہر لال کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ لیکن ہم معمولی ملنے والوں پر دھونس نہیں جماتے تھے۔

مولانا شاہ سلیمان پھلواروی

مولانا شاہ سلیمان کی زیارت متعدد بار اپنے مکان میں نصیب ہوئی۔ ان کے فرزند اکبر مولانا شاہ حسن میاں میرے ہم عمر اور میرے دوست تھے۔ مولانا شاہ سلیمان مجھ پر باپ کی طرح کرم فرماتے تھے۔ ان کے خاندان سے مجھے اور ان کے خاندان کو مجھ سے اب بھی تعلق ہے۔

مولانا شاہ سلیمان پھلواروی مشایخ ہند میں پہلے شخص تھے جنھوں نے سرسید احمد خاں کی تحریک کا ساتھ دیا تھا، امیر حبیب اللہ خاں والی افغانستان، ۱۹۰۵ء میں ہندوستان آئے ہیں اور علی گڑھ کالج دیکھنے گئے ہیں تو نواب محسن الملک، سکریٹری علی گڑھ کالج نے اس موقع پر خواجہ حسن نظامی کو مولانا شاہ سلیمان ہی کے کہنے سے علی گڑھ بلایا تھا۔ خواجہ صاحب کو اپنا بزرگ اور سرپرست سمجھتے تھے۔

شاہ صاحب اپنے دور کے ممتاز مقرروں میں تھے۔ تقریر میں مثنوی مولانا روم ضرور پڑھتے تھے اور ایسی خوش لحانی سے پڑھتے تھے کہ سماں بندھ جاتا تھا۔

میر غلام بھیک نیرنگ

میر غلام بھیک نیرنگ انبالے کے ممتاز وکیل تھے۔ بہت اچھے شاعر، بہت اچھے انشاپرداز، بہت اچھے نقاد اور بہت اچھے مسلمان۔ ان کے پیر کو بھی میں نے دیکھا ہے۔ پیر صاحب حضرت خواجہ نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت امیر خسرو کے عرسوں میں آیا کرتے تھے اور خواجہ حسن نظامی کے ہاں کی مجلس اور محافل میں شریک ہوتے تھے۔ بڑی نورانی شکل تھی۔ انھیں دیکھ کر میر القصور قدیم مشایخ کی طرف چلا جاتا تھا۔

شیخ (سر) عبدالقادر نے اپنے ماہ نامہ "مخزن" کی تنقید میر نیرنگ کے سپرد کر رکھی تھی۔ میر نیرنگ، شیخ عبدالقادر، علامہ اقبال اور مسٹر عبدالعزیز (فلک پیما) وغیرہ ایک دوسرے کے دوست اور معاون تھے "مخزن" جاری کرانے میں ان سب کا ہاتھ تھا۔

میر نیرنگ کے مقدمات دہلی کی عدالتوں میں بھی رہتے تھے۔ مقدمات کی پیروی کے لئے دلی تشریف لاتے تھے تو میرے ہاں ٹھہرتے تھے۔

یخ عبدالقادر :-

شیخ عبدالقادر کا نام سامنے آگیا ہے تو کیوں نہ ان کا تذکرہ کروں ۔ میں بڑا آدمی نہیں ہوں ۔ لیکن اس عیسوی صدی
ے ربع اول کے بے شمار بڑے آدمیوں سے مجھے قریب کی یا بعید کی نسبت ضرور ہے ۔

شیخ عبدالقادر کی خدمت میں نظام المشائخ سے پہلے ہی نیاز حاصل تھا ۔ انھوں نے بیرسٹری پاس کرکے (غالباً
ن ۱۹۰۹ء) دلی میں پریکٹس شروع کی تھی ۔ ماہنامہ مخزن کا دفتر بھی لاہور سے دلی منتقل ہوگیا تھا ۔ شیخ عبدالقادر خود
شمیری دروازے کی طرف کچہری کے قریب رہتے تھے ۔ مخزن کا دفتر مکان کے سامنے کوچہ چیلاں میں تھا ۔ مخزن کو
یخ محمد اکرام (معاون اڈیٹر) نے سنبھال رکھا تھا ۔ لیکن شیخ عبدالقادر شام سے رات گئے تک کئی گھنٹے دفتر مخزن
یں گزارتے تھے ۔

دفتر مخزن اس عظیم الشان عمارت میں تھا ، جسے بعد میں مولانا محمد علی نے دفتر ہمدرد اور کامریڈ بنایا ۔ دفتر
مخزن کے طویل و عریض صحن میں پھاٹک کے پاس والے چبوترے پر فرش بچھ جاتا تھا ۔ وہاں شیخ عبدالقادر تشریف
فرما ہوتے تھے اور دلی کے تمام ادیب اور شعرا (بہ استثنائے چند) ان سے ملنے آتے تھے ۔ مجھے اور آصف علی کو
بھی ہم محلگی کی وجہ سے حاضری کی اجازت تھی ۔

یہ دور گزر گیا تو دوبارہ شیخ عبدالقادر وائسرائے کی اکزکٹو کونسل کے ممبر ہوکر دلی پہنچے ۔ کونسل کی ممبری کے
دور میں بھی میرا ان کا ملنا جلنا رہا ۔ اب وہ سر عبدالقادر تھے ۔

سر عبدالقادر لاہور کے حکیم اجمل خاں تھے ۔ ویسے ہی شستہ و شائستہ ، ویسے ہی سنجیدہ اور متین ۔ باتیں بھی
حکیم اجمل خاں کی طرح جچی تلی کرتے تھے ، لیکن حکیم صاحب مقرر نہیں تھے ۔ سر عبدالقادر بلند پایہ مقرر تھے ، جیسا
لکھتے تھے ویسا ہی بولتے تھے ۔ زبان بالکل دلی والوں کی سی تھی ، لہجہ بھی دلی والوں کا سا ، حرکات و سکنات بھی
دلی والوں کی سی ۔

علامہ اقبال :-

علامہ اقبال اس زمانے میں ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کہلاتے تھے ۔ خواجہ حسن نظامی ، شیخ عبدالقادر اور شیخ
محمد اقبال کو شیخین لکھا کرتے تھے ۔

علامہ اقبال سے میری پہلی ملاقات مسلم ہائی اسکول ، انبالہ کے افتتاح کے موقع پر ہوئی تھی ۔ مجھے اور خواجہ صاحب
کو میر نیرنگ نے بلایا تھا ۔ وہ بانیان اسکول میں تھے ۔ علامہ اقبال پٹیالے سے آئے تھے ۔ پٹیالے میں نواب ذوالفقار علی خاں

وزیر اعظم تھے۔ علامہ اقبال ان کے ہاں گئے ہوئے تھے۔ آتے ہی علامہ اقبال نے خواجہ صاحب سے فرمایا۔ "خواجہ صاحب! ذوالفقار نے تاکید کردی ہے کہ اکیلے مت آنا۔ خواجہ حسن نظامی کو ساتھ لے کر آنا"

خواجہ صاحب نے میری معذوری بتائی کہ یہ اپنے چھوٹے بھائی بہن کے گارجین ہیں۔ انھیں فلاں تاریخ کو ڈسٹرکٹ جج کی عدالت میں جائداد کی آمد و خرچ کا حساب پیش کرنا ہے۔ علامہ اقبال نے ڈسٹرکٹ جج، دلی کے نام تار بھیج دیا اور تاریخ بدلوادی۔ پھر میں اور خواجہ صاحب سات آٹھ دن نواب ذوالفقار علی خاں کے ہاں دن رات علامہ اقبال کی صحبت میں رہے۔ علامہ اقبال نہایت سادہ مزاج اور بے تکلف انسان تھے۔ سات آٹھ ہی دن میں انھوں نے مجھے یہ بچکانہ اور گستاخانہ سوال کرنے کی جرأت بخش دی کہ ڈاکٹر صاحب! کیا بات ہے، آپ جیسا لکھتے ہیں ویسا بولتے نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس سوال پر منہ نہیں بگاڑا۔ میری طرف سے رُخ نہیں پھیرا، بلکہ ہنس کے کہا "جتنی محنت لکھنے میں کرنی پڑتی ہے اتنی بولنے میں بھی کرنے لگوں تو دیوانہ ہو جاؤں۔ بولتا میں انگریزی بھی بے پروائی سے ہوں۔ مگر لکھتے وقت انگریزی اور اردو، دونوں کے الفاظ کو اس طرح تراشتا ہوں جس طرح شیشے سے نگینہ تراشا جاتا ہے۔

میں علامہ اقبال سے ایک دفعہ لاہور کی پرانی انار کلی میں بھی ملا تھا، جہاں ان کا وکالت کا دفتر تھا۔ ان دنوں شیخ عبدالقادر بھی کہیں نزدیک ہی رہتے تھے۔ دلی سے واپس آچکے تھے۔ علامہ اقبال نے شیخ عبدالقادر کو اپنے دفتر میں بلوایا تھا، میں اور خواجہ صاحب غلام غوث صمدانی[1] کی شادی سے فارغ ہو کر کھڑے کھڑے جالندھر سے شیخین پنجاب سے ملنے لاہور چلے گئے تھے، شام تک چاروں دفتر کے کمرے میں بیٹھے۔ شام کو شیخین پنجاب نے اسٹیشن پہنچا دیا اور خدا حافظ کہا۔

اس کے بعد میری ملاقات علامہ اقبال سے ہمیشہ اپنے ہی گھر پر ہوئی۔ ایک دفعہ وہ میرے ہاں مہمان بھی رہے تھے۔ ویسے دلی کا پھیرا کرتے تھے تو میرے ہاں آتے ضرور تھے۔

مولوی ظفر علی خاں:-

مولانا روم کے بعد مولانا روم کی نوع کا شاعر علامہ اقبال کے سوا دوسرا پیدا نہیں ہوا۔ شیخ سر عبدالقادر سے زیادہ علامہ اقبال سے اور علامہ اقبال سے زیادہ مولوی ظفر علی خاں سے میرے مراسم رہے۔ جب تک مولوی

---

[1] مسٹر غلام غوث صمدانی اس زمانے میں علی گڑھ کالج کے طالب علم تھے۔ پھر بھاولپور میں اسٹیٹ انجینیر رہے، اب موڈل ٹاؤن لاہور میں رہتے ہیں۔ مجھ سے خط کتابت ہے۔

ظفر علی خاں کے بیٹے اختر علی خاں اخبار زمیندار کے کام میں حصہ لینے کے قابل نہ ہو گئے مولوی ظفر علی خاں تب تک دلّی بہت آتے تھے اور میرے ہاں ٹھہرتے تھے۔ میں اخبار زمیندار میں اکثر لکھا بھی کرتا تھا۔ میرے اپنے کسی پرچے پر ضمانت یا وارنٹ کی بجلیاں نہیں گریں۔ لیکن اتفاق کی بات ہے کہ زمیندار سے پہلی ضمانت میرے مضمون پر لی گئی تھی۔ جس کا عنوان تھا "اٹلی کے مال کو آگ لگا دو" ضمانت طلب کی گئی تو مولوی ظفر علی خاں نے وہ مضمون دوبارہ چھاپا تھا کہ دیکھئے ایسے معصوم مضمون پر ضمانت مانگی ہے۔

مولانا ظفر علی خاں پنجاب کے مولانا محمد علی اور مولانا ابو الکلام تھے۔ پنجاب کے مسلمانوں کی مدد کے بغیر ہندوستان کے اور صوبوں کے مسلمان کیا کر سکتے تھے۔ پنجاب کے مسلمانوں کو بیدار کرنے کا سہرا مولوی ظفر علی خاں کے سر ہے۔ مولوی ظفر علی خاں پنجابی تھے اور اہل پنجاب کے دل کی گہرائیوں میں پہنچ جاتے تھے۔ انھیں اللہ نے نثر لکھنے کا بھی سلیقہ دیا تھا اور نظم لکھنے کا بھی۔ بولتے بھی خوب تھے۔ ان کی تحریریں اور تقریریں اہل پنجاب کے ذوق کے بالکل مطابق ہوتی تھیں۔

مولوی ظفر علی خاں نے تعلیم علی گڑھ کالج میں پائی تھی اور بلدۂ حیدر آباد دکن میں کافی عرصہ گزارا تھا۔ علی گڑھ اور حیدر آباد کے ماحول کا ان پر غیر معمولی اثر تھا۔

مولوی محفوظ علی بدایونی، مولانا عبد الحلیم شررؔ لکھنوی اور بیدلؔ شاہ جہانپوری۔

۱۹۱۱ء کے دربار میں جارج پنجم نے اعلان فرمایا تھا کہ آئندہ کلکتے کی بجائے دلّی ہندوستان کا دار السلطنت ہوگا۔ اس اعلان پر مولانا محمد علی اپنے انگریزی ہفت روزہ کامریڈ کا دفتر دلّی لے آئے، جو سال ڈیڑھ سال سے کلکتے میں نکل رہا تھا۔ دلّی میں مولانا نے کوچہ چیلاں کے اسی مکان کو اپنا دفتر بنایا جس میں چند سال قبل مخزن کا دفتر تھا اور مولانا نے طے کیا کہ اردو کا روزنامہ اخبار "ہمدرد" اور جاری کروں گا۔ اس کی ایڈیٹری کے لئے مولانا عبد الحلیم شررؔ لکھنوی اور منیجری کے لئے مولوی محفوظ علی بدایونی بلائے گئے اور اسسٹینٹ منیجری کے لئے بیدل شاہ جہاں پوری۔

مولانا محمد علی ابھی مسٹر محمد علی آکسن تھے۔ مجھ میں اور ان میں آگے چل کر تو خاصی یگانگت ہو گئی تھی۔ لیکن شروع شروع میں ان کا رجحان وکیلوں اور بیرسٹروں کی جانب تھا۔ البتہ مولانا عبد الحلیم شرر اور مولوی محفوظ علی اور بیدلؔ شاہ جہانپوری کی نشست روز شام کو میرے ہاں رہتی تھی۔

میں مولوی عبد الحلیم شررؔ سے لکھنؤ میں ان کے گھر جا کر مل چکا تھا۔ مولوی محفوظ علی سے ملاقات ہمدرد کے سلسلے میں ہوئی اور بیدلؔ شاہ جہانپوری بالکل نئے تھے۔ مولانا عبد الحلیم شررؔ کے ناولوں کا شہرہ تھا۔ اور

مولوی محفوظ علی کے مضامین کی دھوم تھی۔ مگر بیدل شاہ جہاں پوری کے اوصاف سے خاص خاص لوگ واقف تھے۔ عوام تک ان کا نام نہیں پہنچا تھا۔ مولانا محمد علی کے یہ تینوں حضرات دوست تھے۔

مولانا محمد علی نے ہمدرد کے اسٹاف میں دوستوں کو بھر لیا تھا۔ مولانا سمجھتے تھے کہ مولانا عبدالحلیم شرر اتنے عظیم ناول نویس ہیں اور ماہنامہ "دل گداز" کے اڈیٹر ہیں، روزنامہ اخبار کی ایڈیٹری کیوں نہ کر سکیں گے۔ اور مولوی محفوظ علی نے مولوی ظفر علی خاں کی شرکت میں کاروبار کھولا تھا، وہ اگرچہ چلا نہیں تاہم مولوی محفوظ علی انتظامی قابلیت رکھتے ہیں اور ہمدرد کا انتظام سنبھال لیں گے۔ خیر ہمدرد کے جاری ہونے میں کئی مہینے لگ گئے اور مولانا عبدالحلیم شرر اور مولوی محفوظ علی اپنے اپنے شہر واپس چلے گئے۔ ان کا تجربہ نہیں ہو سکا۔ بیدل صاحب ہمدرد کے اجرا تک ہمدرد سے منسلک رہے۔ وہ کام خوش اسلوبی سے انجام نہ دے سکے اور ان کی اور مولانا محمد علی کی چشمک ہو گئی۔ بیدل صاحب ہمدرد سے رخصت کر دئے گئے۔ میرے ہاں چونکہ آنا جانا تھا۔ بیدل صاحب میرے ہاں آ گئے، اور بحیثیت دوست کے اور مہمان رہنے لگے۔ کام انھوں نے مانگا اور نہ میں نے دیا۔

بیدل صاحب کا نام سید حامد حسین تھا۔ بیدل صاحب کس کام کے واسطے دنیا میں بھیجے گئے تھے، اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے انھیں تادم مرگ ایسا کام میسر نہیں آیا جو ان کی طبیعت سے مناسبت کھاتا۔ کاوری آدمیوں کو مناسبت طبع کام میسر آ جاتا ہے تو وہ اسے آسانی سے انجام دے لیتے ہیں اور ہمیشہ ہوشمند آدمیوں کو مناسبت طبع کا کام میسر نہیں آتا تو وہ بیدل صاحب کی طرح ناکام رہتے ہیں۔

بیدل صاحب کی زبان میں موہنی تھی اور وہ علم مجلسی کے ماہر تھے۔ ان دو صفتوں کے ساتھ تنک مزاجی کا نقص نہ چمٹا ہوتا تو ممکن تھا کہ بیدل شاہ جہاں پوری دوسرے ہوش بلگرامی[1] بن جاتے اور اچھی اچھی پوزیشن والے ان کے پیچھے پیچھے پھرتے۔ مگر اس کے واسطے بیدل صاحب کو اول خود خدا جانے کتنوں کے پیچھے پیچھے پھرنا پڑتا۔ یہ بیدل صاحب کے بس کا نہ تھا۔

بیدل صاحب رئیسوں اور امیروں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ ان کے مراسم اہل قلم سے تھے اور اہل قلم رئیس اور امیر نہیں ہوتے۔ ملک کا ایک ایک شخص جسے اردو لکھنی آتی تھی بیدل صاحب کا شناسا تھا بیدل صاحب اردو کے ہر شاعر اور ادیب کی طرف دل کا تحفہ لے کر بڑھتے تھے اور اردو کا ہر شاعر اور ادیب ان کی قدر کرتا تھا، ویسی قدر جیسی بیدل صاحب چاہتے تھے اہل قلم اور اہل علم کر سکتے ہیں، اہل دول نہیں کر سکتے۔ حکیم محمد احمد خاں جو دلی کے اطبا اور روسا میں خود بہت تنک مزاج تھے بیدل صاحب کی تنک مزاجی سے

---

[1] ہوش بلگرامی۔ نظام دکن کے مصاحب تھے۔

پناہ مانگتے تھے ۔

۱۹۱۴ء میں مولانا نیاز فتحپوری اور بے دل شاہ جہانپوری مولانا ابوالکلام آزاد سے ملنے گئے۔ مولانا ابوالکلام دلّی میں حکیم بھورے میاں کے ہاں مقیم تھے ۔ بیدلؔ صاحب دس منٹ بیٹھ کر اٹھ آئے ۔ نیازؔ صاحب بیٹھے رہے مولانا ابوالکلام نے پوچھا آپ کا بیدل صاحب سے ملنا کہاں ہوا ۔ نیازؔ صاحب نے کہا ہم دونوں واحدی صاحب کے مہمان ہیں" مولانا ابوالکلام نے پوچھا ۔ واحدی صاحب سے بیدل صاحب کی ملاقات کب سے ہے " نیاز صاحب نے کہا " تین سال سے " مولانا ابوالکلام اپنے مخصوص انداز میں بولے " بیدلؔ صاحب سے ملاقات کی عمر تین سال ؟ جس کے معنی یہ تھے کہ مولانا ابوالکلام بھی بیدل صاحب کی تنک مزاجی کو جانتے تھے ۔

المختصر بیدل صاحب شگفتگی اور تنک مزاجی کا عجیب وغریب مجموعہ تھے ۔

تحریر اور تقریر کی مانند گفتگو کرنے کی صلاحیت بھی اللہ تعالےٰ کسی کسی ہی کو دیتا ہے ۔ ہر شخص نذیر احمد، محمد حسین آزاد ، حسن نظامی اور راشد الخیری جیسا انشا پرداز اور ابوالکلام ، بہادر یار جنگ ، احمد سعید اور عطاء اللہ شاہ بخاری جیسا مقرر نہیں ہو سکتا ۔ علیٰ ہذا موہ لینے والی باتیں کرنے کے مشاق میں نے بیدلؔ صاحب جیسے کم دیکھے ہیں ۔

میرا گھر بیدل صاحب کا ۱۹۱۲ء سے تا دم مرگ ہیڈ کوارٹر رہا ۔ دن آج اس دوست کے ساتھ اور کل اس دوست کے ساتھ بسر کرتے تھے ۔ رات کو سونے میرے ہاں آجاتے تھے ۔ دلی سے باہر کی بھی یہی صورت تھی ۔ باہر کے پھیرے لگاتے رہتے تھے اور پھر پھر کر دلی پہنچ جاتے تھے ۔

ایک لطیفہ سنو! ایک مرتبہ بمبئی سے دلی تشریف لا رہے تھے ٹکٹ خریدا نہیں تھا یا کھو گیا تھا ۔ راستے میں ایک دیہاتی اسٹیشن پر پکڑ لئے گئے ۔ اسٹیشن ماسٹر یوپی کا مسلمان تھا ۔ بیدل صاحب کے منہ سے پھول جھڑے تو وہ ٹکٹ کو بھول گیا اور بولا کہ آپ کی سزا یہ ہے کہ پندرہ دن اس جنگل میں مہمان رہئے ۔ سولھویں دن کوئی گارڈ دلی پہنچا دے گا ۔

سید قدرت نقوی

عظمتِ غالب

جب کسی کی عظمت کے متعلق گفتگو کی جاتی ہے تو سب سے پہلے ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ اس ہستی کو کیوں عظیم مانا جاتا ہے، گویا یہ جستجو ہوتی ہے کہ اس کی عظمت کے اسباب کیا ہیں؟ زمانہ اس کی عظمت کیوں تسلیم کرتا ہے؟ کیا اس نے بنی نوع انسان کو اپنے کردار و افکار سے کچھ فائدہ پہنچایا ہے؟ اس نے اپنے اور آنے والے دور کو کس قدر متاثر کیا؟

غالب کو ادب میں ایک عظیم ہستی تسلیم کیا جاتا ہے، اور یہ شرف بہت کم ہستیوں کو ملا ہے پاک و ہند کی ادبی تاریخ میں اگر عظیم شخصیتوں کو شمار کیا جائے تو ہمیں والمیک، کالی داس، امیر خسرو، فیضی، ابوالفضل کے بعد میر، غالب، انیس اقبال اور ٹیگور سرِفہرست نظر آتے ہیں، ان میں جو عظمت و برتری غالب کو نصیب ہے وہ اور کو نہیں، اقبال بھی معترف ہیں

فکرِ انسان پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا!

مولوی عبدالحق کا خیال ہے کہ "اگر غالب نہ ہوتے تو حالی اور اقبال بھی نہ ہوتے" مگر میں نے اپنے مضمون "غالب اور سرسید" (ماہ نو فروری ۱۹۶۱ء) میں بدلائل ثابت کیا ہے کہ سرسید کی تحریکات کا سرچشمہ غالب ہی کی ذات ہے اس لئے یہ کہنا بجا ہوگا کہ اگر غالب نہ ہوتے تو سرسید، حالی اور اقبال بھی نہ ہوتے۔

ہم جب غالب کی عظمت کے اسباب و علل تلاش کرتے ہیں تو ہمیں عظمتِ غالب دو باتوں سے تشکیل ہوتی نظر آتی ہے ظاہر ہے کہ اس عظمت نے غالب کی زندگی سے تشکیل پائی یہ زندگی تعبیر ہے، معاشرتی روابط و ضوابط کے ردِعمل اور ادبی شعور و افکار کے آثار سے۔ انہی دو امور کے ذریعے عظمتِ غالب پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

غالب نے اس دور میں جنم لیا، جب مغلیہ تہذیب و حکومت آخری سانس لے رہی تھی، مگر ماضی کی درخشانی کی جھلک موجود تھی، اس عہد میں جاگیرداری نظام زوال کے آخری مرحلہ پر پہنچ کر بھی اپنی شان و شوکت قائم کئے ہوئے تھا اس کو آپ کھوکھلا وقار بھی کہہ سکتے ہیں، لیکن تہذیب کا رکھ رکھاؤ باقی تھا۔ غالب خود بھی جاگیردار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے بچپن نہایت بے فکری میں گزرا، لڑکپن میں عیش کیا، جوانی کے ابتدائی زمانے میں خوب دادِ عیش دی چچا کی جاگیر ننھیال کی فارغ البالی نے کبھی جبیں شکن آلود نہ ہونے دی۔ اسی ماحول میں پرورش پانے سے معاشرتی احساس تفوق و برتری پیدا ہوا جو آخر وقت

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم   الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

یہی احساس تھا کہ جب ۱۸۴۲ء میں دہلی کالج کی پروفیسری کے لئے ان کو بلایا گیا اور مسٹر ٹامسن نے ان کا استقبال نہ کیا تو ملازمت کرنے سے صاف انکار کر دیا اور باہر ہی سے واپس آ گئے۔ ذہنی طور پر اسی احساس کا نتیجہ تھا کہ جب قمار بازی کے سلسلہ میں قید ہو گئے تو اپنی برتری قائم رکھنے کی سبیل یہ نکالی کہ اب استاد یا پیر یا مداح بن کر ریاستوں وغیرہ سے تعلقات قائم کرنے چاہئیں، تفتہ کو لکھتے ہیں،

"جو پورا کا امر محض اتفاقی ہے، . . . . سرکار انگریزی میں بڑا پایہ رکھتا تھا۔ رئیس زادوں میں گنا جاتا تھا پورا خلعت پاتا تھا۔ اب بدنام ہو گیا ہوں۔ اور ایک بہت بڑا دھبہ لگ گیا ہے۔ کسی ریاست میں دخل کر نہیں سکتا۔ مگر ہاں استاد یا پیر یا مداح بن کر راہ و رسم پیدا کروں"

غرض آخر عمر تک وہ نوابی اور امارت کے نشہ میں سرشار رہے، ان کے تعلقات ہمیشہ اونچے طبقے کے لوگوں سے وابستہ رہے، جن میں شہزادے، نواب، ارکان دولت، افسران حکومت، جید علما، ممتاز شعرا شامل ہیں، لیکن اس ہی کے ساتھ وہ عوام سے بھی روابط رکھتے تھے، جہاں ان کے احباب میں مندرجہ بالا ذی اقتدار و وقار ہستیاں شامل تھیں، وہاں ہم بہت سے بے آسرا اور بے نوا حضرات کو بھی ان کا شناسا پاتے ہیں، جن سے غالب کا برتاؤ نہایت مشفقانہ اور دوستانہ تھا

غدر (جنگ آزادی ۱۸۵۷ء) سے پہلے جو ماحول تھا غالب اس میں بلند مرتبہ طبقے سے متعلق تھے۔ اگرچہ پرانا نظام ختم ہو رہا تھا اور نئے نظام کا تسلط بڑھتا جا رہا تھا۔ لیکن پرانے نظام حیات کی دلکشی باقی تھی۔ اور اس سے محبت کی ایک نئی لہر دوڑ رہی تھی، اس کو بچانے کی کوشش کا جذبہ بھی دلوں میں جاگ رہا تھا۔ غدر (جنگ آزادی) اسی جذبے کا ایک آخری سنبھالا تھا۔ اس ماحول اور تہذیب کے پروردہ دلوں کی آخری تڑپ، لیکن غیر منظم اور غیر مدبرانہ۔ اسی بنا پر جو صاحبان بصیرت تھے وہ اس کے نتائج سے متحیر نہیں ہوئے بلکہ ان کے علم و یقین میں یہ بات تھی کہ نیا نظام تو مسلط ہو کر رہے گا۔ انہی میں غالب اور سرسید بھی شامل تھے،

غرض اسی ماحول اور تہذیب نے ان کے افکار پر گہرا اثر ڈالا۔ وہ خود کو بہت بلند مرتبہ خیال کرتے تھے، چنانچہ فارسی نظم و نثر میں انہوں نے اپنی عالی نسبی اور بزرگی خاندان کو ہر جگہ اور ہر مقام پر ملحوظ رکھا اور پیش کیا ہے۔ وہ اپنا سلسلہ نسب افراسیاب و پشنگ سے ملاتے تھے، متعدد اردو اور فارسی خطوط میں یہ تفاخر ملتا ہے۔ فارسی قصائد و قطعات میں فخریہ بیان کرتے رہے ہیں ایک جگہ لکھتے ہیں،

خلیجم ولے تو ز چشم محیطم   غریبم ولے روشناسِ جہانم
گرفتم کہ از تخم افراسیابم   گرفتم کہ از نسل سلجوقیانم
دل و دست تیغ آزمائی ندارم   رہ و رسم کشور کشائی ندانم

چہل سال توقیع معنی نبشتم　　　سزد گر نویسند صاحب قرانم

غالب کے آبا و اجداد ایک خاندان کے ترک تھے، سپاہ گری پیشہ تھا "سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری"
جب سپہ گری دسترس سے باہر ہو گئی تو آلات حرب سے دوسرا کام لیا۔

چوں رفت سپہبدی، ز دم چنگ بشعر　　　شد تیر شکستۂ نیاگاں قلمم

جو سپاہیانہ کر و فر انہیں خاندان سے وراثتاً ملا تھا۔ اس کے اظہار کے مواقع میدان جنگ میں تو میسر نہ آئے،
لیکن میدانِ ادب میں اسی سپاہیانہ عزم و استقلال اور جاہ و جلال نے عظمت کے پرچم لہرائے جس نے کورانہ تقلید سے
آزادی کا راستہ دکھایا، غلط راہروی سے بچایا اور روشِ عام سے ہٹ کر چلنا سکھایا۔

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں　　　جانا کہ اک بزرگ ہمیں راہبر ملے

چنانچہ جب آگرہ سے دہلی پہنچے تو شعرا سے معرکہ آرائی رہی، دہلی سے کلکتے گئے تو قتیل کے معتقدین سے نبرد
نبرد اور ترکی بہ ترکی جواب دیا، فرہنگ نویسوں کی غلطیاں نکالیں اور پورے ہندوستان سے جنگ مول لے لی، ان معرکوں
میں وہ حریف غالب ہی رہے کیونکہ انہوں نے جو کچھ کہا وہ خوب سوچ سمجھ کر کہا۔ اگر وہ شوخی سے آگے نہ بڑھ جاتے تو پھر بھی ان
کی مخالفت اتنی ہی ہوتی جتنی کہ ہوئی لیکن ان کا دامن استہزا سے پاک رہ جاتا، درحقیقت ہندوستانی فرہنگ نویسوں کے خلاف
آواز بلند کرنا ان کی عظمت کی ایک بہت بڑی دلیل ہے، کیونکہ اس زمانہ میں بھی فرہنگ نویسوں کی غلطیوں کو آشکارا
کرنے کی جرأت بہت کم لوگوں میں ہے، اس سلسلہ کی اگر تمام وہ کتابیں دیکھی جائیں، جو مخالفین و موافقین نے شائع کیں
تو حقیقت واضح ہو جائے، کہ غالب کے اعتراضات کا جواب نہیں دیا گیا اور ان کے اعتراضات بدستور قائم ہیں۔ بقول مولانا حالی
کہ غالب کے اعتراضات کی تائید فرہنگ ناصری سے بھی ہوتی ہے جو ایران میں لکھی گئی اور اس کے مصنف رضا قلی خان ہدایت
ایرانی ہیں، غالب کی عظمت اس امر سے بھی ظاہر ہوتی ہے، کہ اس لغوی نزاع میں غالب نے لفظ افسوس کو عربی الاصل بتایا تھا
جو غلط تھا، غلطی کا علم ہوتے ہی انہوں نے اپنی غلطی کو تسلیم کر لیا۔

اگر غالب کی عظمت کے ادبی پہلوؤں پر غور کیا جائے۔ تو وہ فنی اعتبار سے اپنے ہم عصروں سے بہت بلند نظر آتے
ہیں، اور اپنے سے پہلے والوں پر بھی سبقت لئے ہوئے ہیں، کیونکہ غالب کے ہاں ہر رنگ پایا جاتا ہے۔ اور دوسرے شعرا کے
ہاں صرف ایک ہی رنگ ملتا ہے، مثلاً عرفی کا قصیدہ، نظیری کی غزل، ظہوری کی مثنوی اور نثر، فیضی کے کثیر کلام میں سے صرف غزل اور
ابوالفضل کی صرف نثر بہتر حالت میں پائی جاتی ہے، مگر غالب کے ہاں یہ سب اصناف سخن ان سب کے برابر مرتبہ رکھتی ہیں، بلکہ بعض
اصناف میں غالب کا پلہ بھاری نظر آتا ہے، مثلاً مثنوی میں ظہوری کا ساقی نامہ شہرت رکھتا ہے، لیکن اگر غالب کی مثنوی ابر گہربار
کے ساقی نامہ سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہو جائے کہ ظہوری کا ساقی نامہ اس کے سامنے بے کیف ہے آغاز اس طرح کیا ہے!

بیا ساقی آئین جم تازہ کن　　　طراز بساط کرم تازہ کن

اسی طرح ان کے قصائد عرفی کے قصائد سے کسی طرح کم مرتبہ نہیں ہیں، عرفی کی زمین میں قصیدے لکھے ہیں اور اس کے ہم پلہ ہیں، بلکہ بعض قصائد کی تشبیب بہت بلند ہے، حمد میں ایک قصیدہ کا مطلع ہے،

اے زوہم غیر غوغا در جہاں انداختہ گفتہ خود حرفے و خود را در گماں انداختہ

یا ایک قصیدہ کا یہ شعر ہے،

ذوقِ غم، حوصلۂ لذتِ آزارم داد پا ئے کوباں بسرِ خارِ مغیلاں رفتم

یہ قصیدے عرفی کی زمین میں ہیں اور بہت عمدہ ہیں، اسی طرح غزل میں نظیری کے بالمقابل ہیں جس کا موازنہ مولانا حالی نے یادگارِ غالب میں اچھی طرح کیا ہے نثر میں وہ خود کو ابوالفضل وغیرہ سے بلند خیال کرنے میں حق بجانب نظر آتے ہیں،

اردو میں بھی وہ اپنے عہد میں سب سے ممتاز ہیں متقدمین میں بھی ان کا مقابل کوئی نہیں، اردو کلام میں زیادہ تر غزلیات ہیں، چند رباعیاں چند قطعے اور چند قصیدے، لیکن بقول ڈاکٹر بجنوری "لوح سے تمت تک مشکل سے سو صفحے ہیں، لیکن کیا ہے جو یہاں حاضر نہیں؟ کونسا نغمہ ہے جو اس سازِ زندگی کے تاروں پر بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں ہے"

درحقیقت غالب کی عظمت کا راز ہی یہ ہے کہ یہاں سب کچھ ہے اسی رنگا رنگی کی بہار نے ان کو عظیم بنایا اور یہی ان کو عظیم تر بناتی رہے گی۔ کیونکہ ادب کا اصل مقصد روح و قلبِ انسانی کو سکون و مسرت بخشنا ہے اور غالب کے کلام کا یہ خاصہ ہے، کہ جو بھی اس کا مطالعہ کرتا ہے وہ اپنے ذوق کی تسکین کا سامان پا لیتا ہے، انتہا یہ ہے جس کے متعلق اقبال نے کہا تھا،

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا

بالیقین غالب کا تخیل، رفعت میں اس مقام پر پہونچا جو انسانی تصور کی آخری حدود ہیں اس رفعت تخیل کے نمونے فارسی میں بیشتر اور اردو میں کمتر ہیں،

دود سودائے تتق بست آسماں نامیدمش دیدہ برخواب پریشاں زد جہاں نامیدمش

یہ شعر جن حقائق کا آئینہ دار ہے موجودہ سائنس بھی اپنے وسیع و کثیر وسائل معلومات کے ذریعے اسی نتیجہ پر پہنچی ہے اردو میں کہتے ہیں

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگزارِ بادیاں

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں ! ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

ان اشعار کو ملاحظہ فرمایئے ! ہر ایک اپنے دامن میں جہانِ معنی چھپائے ہوئے ہے۔

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے؟ شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

غالبؔ کے متعلق عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے، کہ اس کا کلام دقیق اور مشکل ہوتا ہے۔ ان کو عظیم بنانے میں اس خیال کو بھی کافی دخل ہے لیکن اگر اس حیثیت کو پیش نظر رکھا جائے کہ الفاظ کا انتخاب و استعمال، مطلب و معنی کی مناسبت سے ہوتا ہے تو واضح ہوگا کہ اگر کوئی بات دقیق ہے تو اس کو سہل الفاظ میں بیان ہی نہیں کیا جا سکتا، غالبؔ کی مشکل پسندی اسی حیثیت کی ہے:

کون ہوتا ہے؟ حریفِ مئے مردافگنِ عشق ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

اس شعر میں سے "حریفِ مئے مردافگنِ عشق" کے ٹکڑے کو نکال دیجئے اور کوشش کیجئے۔ کہ اس کا مترادف مل جائے ناممکن ہے کہ ان پانچ لفظوں کا مترادف مل سکے اگر اس کی تشریح کے پیش نظر الفاظ لاتے جائیے۔ تو شعر کا ظرف ان کا متحمل نہ ہو سکے گا۔ اس شعر میں جو فنی خوبی ہے وہ اور بھی لطف انگیز ہے کہ مصرعہ اول کی تکرار لب کشائی پر ہے اور پیہم دعوت مقابلہ دے رہا، جواب نہ ملنے پر خود بھی اظہار تاسف کرتے ہوئے کہتا ہے "کون ہوتا ہے حریف مئے مردافگن عشق۔!"

اردو شاعری میں غزل کو جو برتری حاصل ہے وہ محتاج تعارف نہیں، اردو غزل میں سر فہرست دو نام نظر آتے ہیں ایک میرؔ دوسرے غالبؔ، دونوں ہی کو عظیم مانا گیا ہے، لیکن بحیثیت مجموعی غالبؔ کا پلہ بھاری ہے کیونکہ میرؔ کے ہاں سادگی ہے مگر غنائیت میں غالبؔ سے کم ہیں، رفعت تخیل، فلسفہ، تصوف، شوخی، بذلہ سنجی میں غالبؔ منفرد اور میرؔ کے ہاں یہ امور مفقود، درد و سوز البتہ کچھ زیادہ ہے لیکن اس کی بھی یہ حالت ہے کہ بہت جلد افسردہ کر دیتا ہے طوالت و تکرار کلام سے طبیعت جلد اکتا جاتی ہے مگر غالبؔ کے ہاں یہ افسردگی اور اکتاہٹ نہیں پائی جاتی بلکہ زندگی کی تڑپ محسوس ہوتی ہے اس کے ہاں آرزوئے نشاط پائی جاتی ہے اگر اس نے یہ کہا۔

قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں
غم اگرچہ جانگسل ہے پہ بچیں کہاں کہ دل ہے غمِ عشق گر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا!

تو ساتھ ہی تسلی، جرأت آموزی اور حوصلہ افزائی کے لئے یہ بھی کہہ دیا۔

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم
رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

غالبؔ رموزِ حیاتِ انسانی اور اس کے جذبات و خصائل کے رازداں تھے۔ انہوں نے ایسی باتیں بیان کیں جو انسانی جذبات کی آئینہ دار ہیں، حیاتِ انسانی کے اسرار و رموز کی نقاب کشائی کچھ اس انداز سے کی ہے کہ ان کا کلام انسانی زندگی پر محیط نظر آتا ہے، یہی وہ پہلو ہے جو عظمت کا حامل ہے چنانچہ ان کے اشعار ضرب الامثال کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں ملاحظہ فرمائیے!!!

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
ہے خبر گرم اُن کے آنے کی آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ | تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں
وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں | اٹھیئے! بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی
رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی میں معاف | آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے
ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن | دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے
بے خودی بے سبب نہیں غالبؔ | کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے؟
جان تم پر نثار کرتا ہوں | میں نہیں جانتا دعا کیا ہے
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار | یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟
سیکھے ہیں مہ رخوں کے لئے ہم مصوری | تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیئے

ان اشعار کے علاوہ اور بھی بہت سے اشعار ہیں جو ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں

غالبؔ نے جس طرح اردو شعر کو توانا لہجہ، رفعت تخیل، زورِ بیان معانی بلند اور ندرت ادا سے مالامال کیا، اسی طرح اردو نثر کے دامن کو بھی جواہرات سے مرصع کیا ہے، خطوط نویسی میں ایسی باتیں پیدا کیں جو اگلوں کے ہاں مفقود تھیں اور آنے والے بھی ان سے پیچھے رہ گئے ایک خط میں خود لکھتے ہیں

"مرزا صاحب! میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے، ہزار کوس سے بزبانِ قلم باتیں کیا کرو ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو"

غالبؔ کے خطوط کی خصوصیات بہت ہیں جن پر بڑی دقت نظر سے سیر حاصل تبصرے اور جائزے کی ضرورت ہے مختصر یہ ہے کہ اگر غالبؔ نظم کی طرح نثر کا راستہ بھی نہ بدلتے تو نہ معلوم ہم کو موجودہ منزل تک پہونچنے میں کس قدر دشوار اور پرپیچ راستوں سے گزرنا پڑتا۔ اگر صرف غالبؔ کے خطوط ہی ہم تک پہونچتے تو پھر بھی غالبؔ کی عظمت کے لئے یہ سرمایہ کافی ہوتا، کیونکہ آج تک غالبؔ کے خطوط منفرد خیال کئے جاتے ہیں، سرسید مہدی افادی، شبلی نعمانی، مولانا آزاد اور نیاز فتحپوری کے خطوط ہمارے سامنے ہیں، شبلی کے بعض خطوط میں غالب کا رنگ جھلکتا ہے باقی حضرات کے خطوط کو غالبؔ کے خطوط سے کوئی نسبت نہیں، البتہ محمد علی ردولوی کے خطوط میں غالبؔ کا انداز پیش کرنے کی عمداً کوشش کہیں کہیں کامیاب نظر آتی ہے

مختصر یہ ہے کہ غالبؔ کا سرمایہ اردو نظم و نثر، اردو ادب کے لئے سرمایۂ افتخار ہے، اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے، کہ غالبؔ کے ہاں زندگی کا جذبہ اتنا گہرا ہے، کہ اس نے انسانی نفسیات کے ہر پہلو کو پیش کر دیا ہے یعنی اس کے کلام کی ایک خوبی تو یہ ہے کہ "میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے" اور دوسرے یہ کہ ہر مذاق کے انسان کو اپنی تسکین کا سامان مل جاتا ہے خطوط میں جہاں نثری انقلاب پایا جاتا ہے وہاں طرزِ ادا کی جدتیں بھی ہیں، جن کی بدولت اردو نثر میں ترقی کی داغ بیل پڑی اور ہمیں اس عہد کی ایسی عمدہ تاریخ ان خطوط کے ذریعے ہاتھ آئی جو ہر طرح مستند ہے

بطور اختصار غالب کی عظمت کے چند پہلو ہم نے پیش کئے لیکن درحقیقت ہر شخص کی عظمت کا اندازہ اثر آفرینی اور اثر اندازی میں مضمر ہے، ہم اس بارے میں غالب کو صف اول میں پاتے ہیں، کلام غالب آج تک اپنا اثر زمانہ پر ڈال رہا ہے خدا معلوم کتنی ہستیوں کو اس نے متاثر کر کے آگے بڑھایا اور بڑھاتا رہے گا ادبی شاہراہ میں یہ ہمیشہ راہنما اور رہبر کا کام دیتا رہا اور دیتا رہے گا، غالب کی اثر اندازی عام لوگوں کے علاوہ ہمیں غالب کے دور کے بعد تین ممتاز ہستیوں پر بہت زیادہ نظر آتی ہے ایک سر سید احمد، دوسرے حالی اور تیسرے اقبال، سر سید اور حالی پر براہ راست غالب کی ہستی اثر انداز ہوئی، علامہ اقبال پر ان کا کلام اثر انداز ہوا۔ یورپ کے عظیم ادیبوں اور شاعروں کی صف پر نظر ڈالی جائے، انہوں نے اپنے کلام سے نوع انسانی کو بہت کچھ دیا، لیکن ان میں شاید ہی کوئی ایسی ہستی ہو جس نے اپنے بعد ایسی ہستیوں کو متاثر کیا ہو جو خود بھی عظیم ہوں، غالب کے متعلق اس سے بڑھکر اور کیا عظمت کی دلیل ہوگی؟ کہ ان کی ذات ایک انقلاب انگیز و آزادی جو جماعت کے سرخیل حضرات کے لئے چشم فیض و ذریعہ راہنمائی بنی اور ایک ملک کے باشندوں کے سوچنے کے انداز کو بدل دیا ان کے دلوں کو گرمایا اور طبیعتوں میں تلاش حقیقت کی لگن پیدا کی تقلید اور کورانہ تقلید سے نجات دلائی اس کا کلام زبان زد خاص و عام ہے اور ہر شخص کے ظرف کے مطابق اس کو فیض پہنچا رہا ہے ؎

(بقیہ از صـ)

کرا چکے تھے۔ مولوی صاحب چاہتے تھے۔ کہ میر صاحب کی باقی عمر آرام و آسودگی میں بسر ہو اس کا انتظام کر لیا تھا لیکن میر صاحب کی عمر نے وفا نہ کی، مولوی صاحب لکھتے ہیں،

"میں جب حیدرآباد میں تھا۔ میں نے صدر اعظم سر کشن پرشاد سے ان کا تذکرہ کیا۔ انہیں ان کی داستانیں سننے کا اشتیاق ہوا اور مجھ سے فرمایا، کہ آپ میر صاحب کو یہاں بلا لیجئے تاکہ وہ اپنی بقیہ زندگی فارغ البالی میں بسر کریں۔ چنانچہ میں نے انہیں خط لکھا۔ مگر وہ میرا خط پہنچنے سے پیشتر ہی وفات پا چکے تھے اس جیسا آدمی اب امید نہیں کہ پیدا ہو۔"

میر صاحب کے داماد سید صغیر حسین نے کراچی میں "ادارۂ داستان" قائم کیا تھا جس کے ذریعے وہ چاہتے تھے۔ کہ میر صاحب مرحوم کی کتابیں جو کمیاب ہوگئی ہیں دوبارہ چھاپی جائیں۔ تاکہ میر باقر علی داستان گو کا نام اور ان کے شاہکار زندہ رہیں۔ چنانچہ اسی سلسلے میں انہوں نے "خلیل خان فاختہ" کا تیسرا ایڈیشن چھاپا تھی۔ لیکن اس جنس گراں کا کوئی خریدار نہ ملا۔ لہٰذا چپ سادھ لی۔

اشرف علی

پاکستان کا قومی کتب خانہ

کسی قوم کی تہذیب و تمدن اور ادب و ثقافت کا اندازہ اس کے قومی کتب خانوں، عجائب گھروں اور آرٹ گیلریوں سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ برصغیر میں نہ صرف تہذیب انسانی کا آغاز ہوا۔ بلکہ اس خطے نے علم و ہنر کے میدان میں بھی عرصہ دراز تک دنیا کی قیادت کی۔ انگریزی حکومت کے قیام کے بعد برصغیر کے علمی نوادر کو بے رحمی سے پامال کیا اور جو نوادر اس پامالی سے بچ گئے۔ ان سے سے اپنے وطن کے تاریک ایوانوں کو منور کیا۔

انگریز کے دو سو سالہ عہد اقتدار نے پاک و ہند کے مظلوم عوام کو جہاں فکر و فن کی صلاحیتوں سے محروم کیا وہاں انہیں سامراجی قوت کا بھی بری طرح نشانہ بنایا بالخصوص پنجاب اور سرحد کا علاقہ اس سلسلے میں زیادہ خسارے میں رہا۔ جہاں کے جوانوں کو ہمیشہ استعمار کی دیوی پر بھینٹ چڑھانے کیلئے منتخب کیا جاتا رہا۔

جبر و استبداد کے اس طویل دور میں ادب و ثقافت کے جو ذخیرے ہم نے جمع کئے تھے وہ سب درہم برہم ہو گئے۔ ۱۹۴۷ء میں برصغیر کی خونریز تقسیم جان بوجھ کر اس طور پر کی گئی کہ مسلم آبادی کے بہت سے حصے اور اس کے سینکڑوں علمی اور ادبی مراکز جو ہر طرح پاکستان کا حصہ تھے اس سے جدا کر دیئے گئے۔ یہی کچھ مشرقی پاکستان میں ہوا مسلمانوں کا بہترین ادبی و تاریخی سرمایہ جو کلکتہ لائبریری میں جمع کیا گیا تھا۔ ہمیں اس سے محروم کر دیا گیا اس غیر منصفانہ تقسیم سے ہمارے تہذیبی اور علمی ورثے کو جس قدر نقصان پہنچا وہ پاکستان کی تاریخ کا بڑا المیہ ہے۔ سینکڑوں علمی و ادبی ادارے تباہ و برباد ہو گئے۔

اس پر آشوب دور میں ملک عوامی کتب خانوں سے یکسر خالی تھا۔ پنجاب کی سرزمین جو فیروز شاہی اور اکبری دور میں عوامی کتب خانوں کا شہر کہلاتی تھی ویران ہو چکی تھی۔ لاہور جیسا علم و ادب کا مرکز صرف پنجاب پبلک لائبریری کو سینے سے لگائے اپنے ماضی پر سوگوار تھا جس ملک میں علمی اور ادبی اداروں کا ایسا قحط ہو اس کی بے سروسامانی پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔

آزادی کے بعد ملک کو جہاں سینکڑوں مسائل درپیش تھے وہاں تعلیمی اور ثقافتی ڈھانچے میں نئی زندگی پھونکنے کا اہم مسئلہ بھی تھا حکومت نے تعلیمی مسائل پر خاصی دلچسپی کا اظہار کیا اور یونیورسٹیوں کے قیام کے ساتھ ساتھ قومی اور عوامی کتب خانوں کا قیام لازمی ہوا ہر ملک میں ایک قومی لائبریری ہوتی ہے۔ جیسے برطانیہ میں برٹش میوزیم اور امریکہ میں لائبریری آف کانگریس۔ اسی طرح

پر پاکستان میں بھی ۱۹۵۱ء میں قومی کتب خانے کی داغ بیل ڈالی گئی۔ دیگر ممالک کے قومی کتب خانوں کی طرح پاکستان کے قومی کتب خانے کا مقصد بھی ملک میں شائع ہونے والی تمام مطبوعات کو محفوظ کرنا نیز تحقیقی کاموں کے لئے موثر طور پر نشر واشاعت کرنا ہے اس کے علاوہ کتب خانے میں ایسے غیر ملکی ادب کو بھی جگہ دی گئی ہے جو مطالعے کیلئے مفید خیال کیا جاتا ہے۔

قومی کتب خانہ دراصل کسی ملک کے دوسرے عوامی کتب خانوں کا دل کہا جاتا ہے۔ وہ ملک کے تمام چھوٹے بڑے کتب خانوں کے لئے نمونہ پیش کرتا ہے۔ ملحقہ کتابوں کی امداد و امانت اور ان کیلئے ضروری قوانین و ضابطے مرتب کرتا ہے۔ قومی کتابیات تیار کرنا بھی اس کے فرائض میں شامل ہے۔

مندرجہ بالا ضروریات کے پیش نظر قومی کتب خانے نے اپنا کام کراچی میں اسوقت شروع کیا جبکہ ۱۹۵۱ء میں اس کو ڈائریکٹریٹ آف آرکائیوز اینڈ لائبریری کی تحویل میں دیا گیا۔ ۱۹۵۴ء میں جب قومی کتب خانے میں لیاقت میموریل کتب خانہ بھی شامل کر دیا گیا تو اس کا نام لیاقت نیشنل لائبریری ہو گیا۔ قومی کتب خانہ لیاقت نیشنل لائبریری، جو وقت نظامت آرکائیوز اور لائبریری میں شامل ہوا تو اس کا ذخیرہ کتب کراچی سکریٹریٹ کے بلاک نمبر ۶۷ میں تھا اور سیکریٹریٹ کا کتب خانہ بھی اسی جگہ موجود تھا۔ ۱۹۵۴ء میں لیاقت نیشنل لائبریری کو بلاک نمبر ۶۷ سے میری ویدر ٹاور کے قریب پاکستان مسلم لیگ ہاؤس کی عمارت میں منتقل کیا گیا۔ اس عمارت کے ایک تنگ و تاریک حصے میں کتب خانہ دس سال تک علم و ادب کی خدمت کرتا رہا حتیٰ کہ ۱۹۶۴ء میں ناگزیر حالات کے پیش نظر کتب خانے کو ایک بار پھر سوسائٹی کے ایک خوبصورت بنگلے میں منتقل کرنا پڑا۔

قومی کتب خانہ نئی جگہ پر منتقل تو ہوا مگر تعلیمی اداروں سے دور اور شائقین کی دست رس سے باہر ہو گیا۔ دوسری چیز جو ذہن میں پیدا ہوتی ہے وہ بنگلے کے کرائے کی وہ کثیر رقم ہے جس سے کتب خانے کی اپنی عمارت تعمیر کرائی جا سکتی تھی میرے اس استفسار کے جواب میں مہتمم کتب خانہ نے یہ فرمایا کہ بنگلے کے کرائے میں جو پانچ چھ ہزار روپیہ ماہانہ رقم ادا کی جا رہی ہے اس کی ایک سال بھر کی رقم سے بھی نہ تو شہر میں کوئی مرکزی جگہ دستیاب ہو سکتی تھی اور نہ اس قدر روپے سے کوئی عمارت مکمل کرائی جا سکتی تھی۔ لہٰذا یہی مناسب سمجھا گیا کہ عارضی طور پر کوئی عمارت کرائے پر حاصل کر لی جائے۔

کراچی کے پڑھے لکھے طبقے کو یہ تشویش تھی کہ لیاقت نیشنل لائبریری، جو مرکزی حکومت کا ایک اہم ادارہ ہے۔ کہیں دیگر مرکزی دفاتر کی طرح نئے دارالحکومت میں منتقل نہ ہو جائے۔ اور اس طرح کراچی ہی بڑا شہر ہے جس میں عوامی کتب خانوں کا پہلے ہی فقدان ہے ایک بڑے ذخیرہ کتب سے محروم ہو جائیگا مگر حکومت نے بر وقت دانشمندانہ قدم اٹھایا اور فیصلہ کیا کہ "لیاقت نیشنل لائبریری کراچی ہی میں لیاقت میموریل لائبریری" کے نام سے بدستور اہالیان کراچی کی خدمت انجام دیتی رہے گی۔ اور اسلام آباد میں قومی کتب خانہ نئے سرے سے قائم کیا جائے گا۔

علمی حلقوں میں یہ خبر دلچسپی سے سنی جائے گی کہ لیاقت نیشنل لائبریری کی اپنی عمارت کا تعمیراتی کام جیل روڈ پر لیاقت ہسپتال کے مقابل جامعہ کراچی کے مضافات میں شروع ہو چکا ہے اور انشاء اللہ کتب خانہ سال رواں کے آخر تک نئی عمارت میں اپنا کام

شروع کر دے گا۔

قومی کتب خانہ پاکستان کے عظیم کتب خانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ کراچی میں ایسے پڑھے لکھے حضرات کم ہوں گے جنہوں نے کتب خانے سے کسی نہ کسی طور پر تھوڑا بہت استفادہ نہ کیا ہو۔

لیاقت نیشنل لائبریری تقریباً پچاس ہزار کتابوں اور دو ہزار رسائل پر مشتمل ہے۔ اردو اور انگریزی ادب پر یہاں بیش بہا کتابیں موجود ہیں۔ تمام ذخیرہ ڈیوی کی درجہ بندی کے اصول پر تقسیم کیا گیا ہے۔ یعنی عام موضوعات جس میں صحافت و خطابت وغیرہ شامل ہیں اس کے بعد فلسفہ، معاشرتی علوم، لسانیات خالص، سائنس، مفید سائنس تفریحات ادب اور تاریخ اقوامِ عالم وغیرہ کتب خانے کو اگرچہ درجہ بندی اور فہرست سازی کے اعتبار سے مکمل نہیں کہا جا سکتا تاہم ذخیرہ کتب سے بڑے حصے کی درجہ بندی اور فہرست سازی کا کام مکمل ہو چکا ہے

قومی کتب خانہ ملک کے دوسرے کتب خانوں سے ہٹ کر زیادہ اہم فرائض انجام دیتا ہے۔ یہاں قومی ادب کو جمع کر کے محفوظ کیا جاتا ہے اور پھر اس کو اس طرح ترتیب دیا جاتا ہے کہ تحقیقی کاموں میں موثر طور پر اس کی نشر و اشاعت کی جا سکے یعنی کتب خانہ محققین کو مطلوبہ مواد فراہم کرتا ہے۔ موجودہ سائنسی دور میں جبکہ ایجادات و تحقیقات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے کتب خانوں میں حوالہ جاتی خدمات کی اہمیت بہت بڑھتی جا رہی ہے چنانچہ مغربی ممالک میں مرکزی کتب خانے محققین کو ان کے کاموں میں سہولتیں مہیا کرنے کی غرض سے اس موضوعات پر کتابیات (ببلوگرافی) مائیکرو فلم فوٹو اسٹیٹ فوٹو کارڈ وغیرہ امدادی مواد فراہم کرتے ہیں۔ ہمارے یہاں قومی کتب خانہ اگرچہ ابھی جدید آلات سے لیس نہیں تاہم حوالہ جاتی خدمت کو موثر بنانے کیلئے فہرست سازی اور قومی کتابیات کا کام شروع کر دیا گیا ہے اور ۱۹۶۲ء کی قومی کتابیات عنقریب شائع ہو جائے گی۔

کتب خانہ مذکور میں نہ صرف عمدہ قدیم و جدید معیاری ادب موجود ہے بلکہ عملے میں مطالعے کے شائقین کی خدمت کا جذبہ بھی پایا جاتا ہے مہتمم کتب خانہ جناب ابن حسن قیصر اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے ادیب اور کہنہ مشق کا بار بھی ہیں۔ موصوف گزشتہ بارہ سال سے کتب خانے میں قارئین کی خدمات انجام دیتے چلے آرہے ہیں۔

قومی کتب خانہ کئی شعبوں پر مشتمل ہیں۔ ان میں ذیل کے شعبے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

شعبۂ اردو:۔ تقریباً دس ہزار کتابوں پر مشتمل ہے۔ اس میں یوں تو مختلف موضوعات کی کتابیں جمع ہیں مگر اردو ادب پر جس قدر اچھی کتابیں یہاں موجود ہیں وہ کسی دوسرے سرکاری کتب خانے میں نہیں تاریخ ادب اردو، تذکرے اور اردو تنقید پر معیاری کتابیں خریدی گئی ہیں۔ اس شعبے کو جس چیز نے اہم بنا دیا ہے وہ اردو اخبارات و رسائل کے پرانے فائل ہیں۔ اکثر پرانے رسائل مکمل اور اچھی حالت میں ہیں۔ اس شعبے کے براہ راست نگراں یوں تو خود مہتمم کتب خانہ ہیں۔ مگر خواتین کی مدد کیلئے ایک تربیت یافتہ خاتون کو بھی رکھا گیا ہے۔

شعبۂ عربی:۔ اس شعبے میں تقریباً چار ہزار کتابیں موجود ہیں جس میں اسلام، عربی ادب اور تاریخ کی کتابیں شامل ہیں۔ عربی زبان میں اتنا اچھا ذخیرہ پاکستان کے کم کتب خانوں میں ہو گا شعبے کے نگراں مولانا عبد الحلیم چشتی خود عربی زبان ادب نیز اسلامیات پر گہری نظر

رکھتے ہیں۔ ان کا عمیق مطالعہ ہمیشہ ناظرین کی رہنمائی کرتا ہے۔

شعبۂ انگریزی: کتب خانے میں شعبۂ انگریزی دیگر سب شعبوں سے بڑا ہے اس میں تقریباً ۲ ہزار کتابیں ہیں۔ جو فلسفہ، مذہبیات معاشیات زبان و ادب جغرافیہ اور تاریخ عالم جیسے موضوعات سے متعلق ہیں۔ انگریزی ادب کے شعبے کو ہر طرح کامل اور جامع بنانے کی کوشش کی گئی ہے نثر، نظم اور ڈراموں پر بعض شعراء، با کی جملہ تصانیف حاصل کی گئی ہیں۔ انگریزی ادب پر تحقیق کرنے والے حضرات کو یہاں کافی مواد دستیاب ہو سکتا ہے۔ شعبۂ انگریزی میں تاریخ اقوام عالم پر بیش قیمت ذخیرۂ کتب ہے جو بڑی کاوشوں اور محنت سے فراہم کیا گیا ہے۔ یہاں قدیم نایاب کتابوں کو نہایت سلیقے سے آراستہ کیا گیا ہے۔ عربی اور فارسی مورخین کی تصانیف کے معتبر تراجم خاص کوشش سے بہم پہنچائے گئے ہیں تاریخی کتب میں صرف برصغیر کی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ہی پر سینکڑوں کتابوں کی فہرست تیار کی جا سکتی ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ریکارڈ، لارڈوں اور نوابوں کے مراسلات اور تاج برطانیہ اور کمپنی کے نام فرمانوں پر مشتمل بہت سی کتابیں اس لائبریری میں ہیں گزیٹر اور جنرل بھی خاصی تعداد میں ہیں جو تاریخ کے محقق کو بیش بہا معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔ کتب خانے میں مخطوطات اور نادر کتابوں کی بھی خاصی تعداد موجود ہے ان میں سے زیادہ تر عربی فارسی اور اردو مخطوطات شامل ہیں۔ بعض نوادر نہ صرف اپنے متن کے اعتبار سے کافی اہم ہیں بلکہ فن کتابت کے لحاظ سے بھی عجوبہ روزگار ہیں۔ مخطوطات کی افادیت و معنویت کا بیان ایک علیحدہ مضمون کا متقاضی ہے جو انشاء اللہ آئندہ کسی صحبت میں ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔ سردست قارئین کرام کی دلچسپی کیلئے چند ایسی مطبوعہ کتابوں کا ذکر کرنا مناسب ہوگا۔ جو اپنے موضوع کے علاوہ اہل کتابت و طباعت اور قدامت کے اعتبار سے قابل بیان ٹھہرائی جا سکتی ہیں۔

۱۔ کلیات میر تقی میر۔ مطبوعہ ہندوستانی پریس کلکتہ $\frac{\text{۱۸۱۱ء}}{\text{۱۲۲۶ھ}}$ ایک ہزار پچاسی صفحات کا یہ کلیات میر تقی میر کی وفات کے ایک سال بعد فورٹ ولیم کالج کے اساتذہ کی نگرانی میں نستعلیق ٹائپ میں چھپا تھا۔

۲۔ آئین اکبری۔ مصنف ابوالفضل علامی۔ مرتبہ جواد الدولہ سید احمد خاں بہادر عارف جنگ مطبع اسمٰعیلیہ۔
علامی کی کتاب آئین اکبری کا شمار امہات کتب میں ہوتا ہے۔ سر سید نے نہ صرف یہ کہ مختلف نسخوں کو سامنے رکھ کر ایک صحیح نسخہ ترتیب دیا۔ بلکہ اس پر جا بجا حاشیے بھی لکھے جس سے اس کتاب کی افادیت میں زبردست اضافہ ہو گیا۔ آئین اکبری کا یہ نسخہ ۱۶×۱۰ کے ۱۰۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب تصاویر اور جدول سے آراستہ ہے

۳۔ تذکرہ عالم۔ مرتبہ بلاقی داس مالک کارخانہ میور پریس دہلی ۱۹۰۹ء ۲۹۲ صفحات بڑا سائز ۹۱ خوبصورت رنگین تصاویر۔
تذکرہ عالم جو کہ سلاطین کی تصاویر کا ایک سلسلہ تھا۔ یہ اسی کی ایک کڑی ہے جس میں بلاقی داس نے اپنی چالیس سالہ محنت سے ایسی رنگین تصاویر پیش کی ہیں جن میں مغلیہ سلطنت کے تمام بادشاہ نیز انکی بیگمات کی تصاویر بھی شامل ہیں۔

۴۔ انگریزی ہندوستانی ڈکشنری: ۔ مولفہ ڈاکٹر گلکرائسٹ۔ مولف نے ہندوستانی فلالوجی کے عنوان سے ایک سلسلہ کتب تالیف کیا تھا جو تین جلدوں پر مشتمل تھا اس سلسلے کی پہلی تصنیف "انگریزی ہندوستانی ڈکشنری" ہے جو بڑے سائز کی ہے اور تقریباً آٹھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس ڈکشنری کے شروع میں ایک سو صفحات کا طویل دیباچہ ہے جس میں اردو زبان کی گرامر سے بحث کی گئی ہے۔ یہ ڈکشنری لندن میں ۱۸۲۵ء میں چھپی تھی۔

مرزا غالب کا ایک "نیا شعر"
اور
گلدستۂ انجمن

مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبار "الہلال" کی ۲۲ جولائی ۱۹۱۴ء کی اشاعت میں ص۴۹ پر ادبیات کے مستقل عنوان کے تحت "آثار علمیۂ خطیہ — مرزا غالب مرحوم کا غیر مطبوعہ کلام" کی ذیلی سرخی کے ساتھ غالب کی وہ مشہور غزل شائع ہوئی تھی جس کا مطلع یہ ہے

شب وصال میں مونس گیا ہے بن تکیہ
ہوا ہے موجب آرام جان و تن تکیہ

یہ غزل الہلال سے دیوان غالب کے اس نسخے میں شامل کی گئی جو ۱۹۲۲ء میں نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوا تھا (ص۲۵) بعد ازاں سید ہاشمی فرید آبادی نے اپنے ایک مضمون "غالب کا فلسفہ" میں اس کو نقل کیا۔ یہ مضمون رسالہ "اردو" کے اکتوبر ۱۹۲۵ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ آخرالذکر دونوں اشاعتوں میں صراحت کی گئی ہے کہ "الہلال" میں یہ غزل نواب احمد سعید خان طالب کی بیاض سے نقل کر کے چھاپی گئی تھی۔[1] سید ہاشمی مرحوم نے لکھا ہے:۔

"نواب احمد سعید خاں طالب فرماتے تھے کہ مرزا کی سب سے آخری غزل جس کے چند ہی روز بعد وہ مرض الموت میں مبتلا ہوئے یہ ہے (ص ۶۰۲) یہ غزل کسی مشاعرے کے واسطے لکھی گئی اور غالباً اس کے گلدستے میں چھپی بھی تھی۔ مگر حال میں اسے طالب مرحوم کی قلمی بیاض سے ایڈیٹر الہلال نے نقل کر کے اپنے اخبار میں شائع کیا اور اس سے مطبع نظامی بدایوں نے اپنے نسخۂ دیوان غالب کے آخر میں شامل کر دیا ہے۔" ص ۶۰۴

سہ ماہی "اردو" اکتوبر ۱۹۲۵ء

---

[1] "الہلال" کا متعلقہ شمارہ راقم الحروف کے پیش نظر ہے، لیکن غزل جس صفحے پر چھپی ہے، وہاں اس قسم کی کوئی بات نہیں ملتی، ممکن ہے، سرورق پر اس کی صراحت کی گئی ہو۔ افسوس کہ میرے پیش نظر جو شمارہ ہے اس میں پہلا صفحہ یا سرورق کم ہے

دیوان غالب نسخۂ عرشی میں دیوان غالب کے طاہر ایڈیشن سے یہ غزل نقل کی گئی ہے۔ "الہلال" سے نسخۂ عرشی تک اس غزل کے چودہ شعر نقل ہوئے ہیں لیکن اصل غزل میں پندرہ شعر تھے۔ مندرجہ ذیل شعر دیوان غالب کے کسی نسخے میں شامل نہیں ہے:

جو بعد قتل مرا دشت میں مزار بنا
لگا کے بیٹھتے ہیں اُس سے راہزن تکیہ

مکمل غزل پہلی مرتبہ" گلدستۂ انجمن" میں شائع ہوئی تھی۔ یہ گلدستہ محمد عبدالکریم کا ترتیب دیا ہوا ہے اور ۱۲۸۳ھ میں مطبع اکبری دہلی سے سید ظہیر الدین حسین کے اہتمام سے شائع ہوا تھا۔

دیباچے میں مرتب نے بتایا ہے کہ محمد کرم اللہ خان اور محمد احسان الرحمٰن خاں" نے اپنے کاشانۂ ارم نشانہ میں مہینہ میں دو بار جلسۂ مشاعرہ مقرر فرمایا اور باربزم آرائی اس مجلس کا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میر عبدالرحمٰن[1] خلف اکبر میر حسین صاحب تسکین نے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اپنے دوش ہمت پر اٹھایا" ان مشاعروں میں طرحی غزلیں پڑھی جاتی تھیں۔"گلدستہ مشاعرہ" کا جو نسخہ میرے پیش نظر ہے' وہ بیس ۲۰ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں دو مشاعروں کی غزلیں شامل ہیں۔ دونوں مشاعروں کے طرحی مصرعے بالترتیب یہ ہیں:

۱۔　یہ مدّعی بغل میں چھپایا نہ جائے گا

۲۔　مرا درد مجھ کو دوا ہو گیا

پہلی طرح میں ستائیس شاعروں کی غزلیں ہیں اور دوسری طرح میں صرف تین شاعروں کی غزلیں ہیں' جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ گلدستے کا یہ نسخہ ناقص الآخر ہے۔ تمام غزلیں شعرا کے تخلص کے اعتبار سے ردیف وار درج کی گئی ہیں۔ غالب کی غزل غیر طرحی ہے اور اسے دوسرے شاعرے کی غزلوں سے پہلے درج کیا گیا ہے۔ غزل سے پہلے یہ عبارت لکھی گئی ہے:

"غزل جناب مستطاب نواب نجم الدولہ دبیر الملک اسداللہ خان بہادر نظام جنگ المتخلّص بہ غالب سلمہ اللہ تعالےٰ تبرکاً وتیمّناً بقالب تحریر درآمد"

یہ کہنا مشکل ہے کہ غالب نے اس مشاعرے میں بذات خود شرکت کی تھی یا نہیں لیکن سرورق پر" مجموعۂ غزلیات رونق افروزان بزم مشاعرہ" لکھا ہے جس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ غالب نے بھی اس مشاعرے میں شرکت کی ہوگی اور یہ غیر طرحی غزل پڑھی ہوگی۔

---

[1] ان کا تخلّص آہی تھا۔ انتخاب یادگار اور سخن شعرا میں ذکر ہے۔

"گلدستہ انجمن" ایک اہم ادبی ماخذ ہے اگر یہاں اس کی مزید تفصیلات بھی دے دی جائیں تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔ مرتب کے دیباچے کا متن حسب ذیل ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حلاوت کار شکریں گفتاران شیریں بیان اوس کے فیضان بیان ستائش سے رشک افزائے شیرینیٔ جانِ شیریں ہوسکتی ہے کہ جس نے اپنے ظہور خالقیت اضداد کے لئے کام و زبان شیریں زبانان فصیح بیان کو نمک زار فصاحت کیا نظم

خالق باری کہ سخن آفرید چیست سخن کام دہن آفرید
نام سخن باقی و پائندہ کرد مردہ دلاں را بہ سخن زندہ کرد
لطف معانی بہ سخن سازدار نازبیاں را سرانداز دار

جل جلالہ وعم نوالہ اور شور بازار فصیح بیانیٔ سخن سنجان گزیدہ شعار اوس کے فیض چاشنی گیری نعت پاک سے شورش افزائے غیرت بے نمک سازیٔ ملاحت ملیحان عالم ممکن ہے کہ جس نے اپنی شیریں مقالی سے بازار فصیحان عرب وعجم یک قلم پھیکا کر دیا۔ رباعی

یعنی وہ محمدِ نبیٔ مرسل! ہے جس کا سخن قولِ حقِ عز وجل
ہو اوس پہ اور اوس کے آل پر لاکھ درود اور اُس کے صحابہ پہ دُرودِ اکمل

چونکہ اس بحر بے پایان وبے کنار کو انتہا و ساحل نہیں اس واسطے اس خیال محال سے عطف عنان لازم و واجب ہوا سخن ورانِ والا نظر پر ہویدا ہو کہ یہ احقر العباد خاکسار محمد عبدالکریم ابتدائے عمر سے گلچین چمن فیض خدمت سخن گویانِ رنگین مقال رہا ہے اور گلبانگ شگفتہ بیانی سخن موزوں کو ہمیشہ واسطۂ ابتسام غنچہ خاطر افسردہ جانتا ہے جو کلام عاشقانہ سراپا سوز و گداز نظر آتا ہے دل مذاق منزل لطافت آشنا تڑپ جاتا ہے بالخصوص کلام تازہ کے دیکھنے سے حلاوت بے اندازہ ملتی ہے اور جراحت کہن دل بسمل ادا بندی سخن گفتار نو سے لطف بے قراری تازہ پاتا ہے۔ ہرچند اس زمانہ میں علم و ہنر کی کساد بازاری ہے اور نخل فضل و کمال کا ہنگامِ برگ ریزی ہے مگر پھر بھی جو کہ صاحبانِ طبع رسا اور مذاق سخن سے آشنا ہیں اُن کی محفل میں ایسے ہی امور مذکور ہوتے ہیں چنانچہ مخدومی مکرم اللہ خان صاحب خلف محمد شفیع خان عرف منشی آغا خان صاحب مرحوم و مغفور میر منشی رزیڈنٹی راجپوتانہ اور محمد احسان الرحمن خان صاحب خلف اصغر نواب سیف الرحمن خان عرف موسیٰ خان صاحب کہ جسم دوستی کی جان آگاہ اور چشم اخلاق کے نور نگاہ ہیں از بسکہ سنجیدہ و فہمیدہ

مظہر اوصاف حمیدہ ہیں اہل سخن کے جلسۂ صحبت کے راغب اور صاحب کمال کے ملنے کے طالب یہ تجویز فرمائی کہ بیکاری میں عمر صرف کرنا اسراف (کذا) ہے کوئی محفل احبا قرار دینی چاہیئے کہ جس میں سب سخن دان جمع ہو کر داد شعر و شاعری دیں اور علی الرغم زمانہ فارغ البالی میں پہر دو پہر بسر اوقات کریں جو کہ (کذا) اس امر کے واسطے کوئی تدبیر بہتر مشاعرہ سے نہ تھی اس واسطے جناب موصوفین نے اپنے کاشانہ ارم نشانہ میں مہینے میں دو بار جلسۂ مشاعرہ مقرر فرمایا اور بار بزم آرائی اس مجلس کا سخن سنج نکتہ پرور نقاد جوہر خوش کلامی والا نظر مکرّمی میر عبدالرحمٰن صاحب خلف اکبر میر حسین صاحب تسکین نے کہ نسبت برادر زادگی اور شاگردی جناب حکیم محمد مومن خان صاحب مومن نور اللہ مرقدہ سے رکھتے ہیں اپنے دوش ہمت پر اُٹھایا چونکہ میر صاحب موصوف اکابر شہر سے ہیں اور ان کا پاس خاطر روسائے شہر کو بدل منظور ہے ہر ایک صاحب محفل مشاعرہ میں تشریف لاتے ہیں۔ پہلے ہی جلسے میں وہ مشاعرہ غزل خوانی ہوا کہ ہنگام اختتام بزم مشاعرہ انتشار نورِ صبح ثانی ہوا جو کہ (کذا) بہ پائے بند وفاق مدّت سے اس بات کا مشتاق تھا کہ کوئی ایسا سبب ہو کہ ہر ایک سخن سنج کا کلام رنگیں اور نتائج طبع سحر آفرین ایک جا فراہم ہوتا اوس کا دیکھنا سبب انشراح خاطر مشتاقان نزدیک و دور ہو اور ہر جا شعر و شاعری کا مذکور ہو' اس لیے یہ تدبیر کی گئی کہ ہر مشاعرہ کی غزلیں مجتمع ہو کر منطبع ہوں تاکہ جو شائقین بانمکین آنے سے معذور یا اس شہر سے دور ہیں وہ اس مجموعہ کو منگا کر اپنے دولت خانہ میں بیٹھے ہوئے محفل مشاعرہ ملاحظہ فرمائیں ازبسکہ اس تالیف میں احباب با صفا کا کلام ہے اس واسطے گلدستہ انجمن اس کا نام ہے اور بنظر شکایت تقدیم و تاخیر بقید ردیف سب صاحبوں کے نام اور تخلّص لکھے گئے اور ہر مشاعرہ کو ایک انجمن قرار دیا۔ واللہ مؤید لحصول المقصود و وصول المطلوب[۵]

پہلی طرح کی غزلوں کے مجموعے کا عنوان "انجمن اوّل" ہے اس انجمن میں جن شعرا نے اپنا کلام سنایا اُن کے نام اور اُن کی غزلوں کے مطلعے اور مقطعے ذیل میں دیئے جاتے ہیں۔ ناموں کی عبارت اصل کے مطابق ہے

۱:۔ "ترانہ سنجی عندلیب خامۂ گہر طراز ناظم بے ہمتا نا ثر یکتا سخن گوئے معنی پرور سید شجاع الدین عرف امراؤ مرزا متخلص بہ انور خلف اصغر میر جلال الدّین صاحب مرحوم و مغفور خوش نویس اوستاد حضرت بادشاہ جنت پناہ محمّد بہادر شاہ ارشد تلامذۂ خاقانیٔ ہند شیخ محمّد ابراہیم ذوق مرحوم و مغفور"

غزل اوّل : گریہ سے غصّہ اُن کا مٹایا نہ جائے گا
شعلہ بھڑک اُٹھا ہے بجھایا نہ جائے گا

انور لکھو اک اور بھی اس بحر میں غزل
اور یوں تو رنگ طبع دکھایا نہ جائے گا

غزل دوم :۔ رتبہ کسی کا ہم سے گھٹایا نہ جائے گا
آنکھوں سے اشک غم بھی گرایا نہ جائے گا
انور طلب کریں گے ہم اک قلزم شراب
ساقی کے حوصلہ کو گھٹایا نہ جائے گا

صہ ۳-۴

۲- "لمعہ افروزئ چراغ طبع خواجہ ضیاء الدین صاحب متخلّص بہ آزاد صاحب فکر سلیم اند و مشق سخن از کسے نمی کنند"؛

کعبہ ہزار بار بھی جایا نہ جائے گا
پر دل سے غم بتوں کا بھلایا نہ جائے گا
دیں وہ زکوٰۃ حسن مجھ آزاد کو مگر
عالم بنا کے شکل گدایا نہ جائے گا

ص ۴-۵

۳- "گل شگفتہ گلزار رنگیں بیانی طوطی شکریں مقال چمنستان سخن گوئی و سخن دانی مرزا عبد الغنی صاحب متخلّص بہ ارشد [٥] تلامذہ جناب مرزا صابر صاحب"؛

دل اُس پری لقا سے چھپایا نہ جائے گا
دل کے لئے دل اُس کا کڑھایا نہ جائے گا
ارشد کہیں گے غیر کہ اندھیر ہو گیا
گر اُن سے میرے دل کو جلایا نہ جائے گا

ص ۵

۱- در شاہ وار انسر سخن طرازی صاحب عالم مرزا محمد عثمان صاحب انسر تخلّص شاگرد مرزا صابر صاحب

---

٥ ایک لفظ کی جگہ خالی ہے۔ یہاں ارشد ہونا چاہیئے۔

ازآں اوست"

کوئے بتاں سے دل کو ہٹایا نہ جائے گا
بلبل سے آشیانہ چھڑایا نہ جائے گا
افسر ادب کا ہے یہ تقاضا بوقت صلح
اُن کے قدم کو ہاتھ لگایا نہ جائے گا

ص ۵-۶

۵- "برق افشانیٔ سحاب خامۂ ابر نیسان شوخ گفتاری شاعر نازک خیال سخن ور بے مثال دوست محمد خان صاحب المتخلص بہ بیتاب خلف عبدالرسول خان صاحب شاگرد سید امراؤ مرزا انور"

سر اُس کے آستاں سے ہٹایا نہ جائے گا
تقدیر کا لکھا ہے مٹایا نہ جائے گا
بے تاب اُس کے کوچہ میں کس اضطراب سے
خوش خوش گئے کہ واں سے پھر آیا نہ جائے گا

ص ۶

۶- "نونہال چمنستان سخن محمد عبدالرحیم خان صاحب بیدل تخلص خلف اصغر مولانا مولوی محمد تقی خان صاحب شاگرد امراؤ مرزا صاحب انور"

آتش کو غم کی دل میں دبایا نہ جائے گا
یہ عشق وہ بلا ہے چھپایا نہ جائے گا
عشق صنم وہ شے ہے کہ بیدل اگر کبھی
کعبہ بھی جائیں گے تو چھپایا نہ جائے گا

ص ۶-۷

۷- "سحر آفرینیٔ خامۂ مشکین لباس حکیم ارسطو فطرت فلاطون فطنت حدیقۂ سخن را نو رسیدۂ گل حکیم تجمل رسول خان متخلص بہ تجمل"

بعد فنا جنازہ پہ آیا نہ جائے گا
تم سے تو خاک میں بھی ملایا نہ جائے گا
اُس سے بگاڑنا تو تجمل نہ زینہار
[illegible]

۸۔ "سخن گستر بے مثل نکتہ پرور بے بدل جامع فروع وصول حاوی معقول ومنقول مولوی الطاف حسین صاحب متخلص بہ حالی از شاگردان جناب نجم الدولہ مرزا اسداللہ خان صاحب غالب سلمہ اللہ تعالےٰ از آن اوست"

دل سے خیالِ دوست بھلایا نہ جائے گا
سینہ میں داغ ہے کہ مٹایا نہ جائے گا
حالی کو دو نہ شعر کی تکلیف ورنہ پھر
یہ خاکسار دل سے بھلایا نہ جائے گا

ص ۷-۸

۹۔ "گہرافشانی بیان اعجاز تو امان عالی مناصب والا مناقب بہار افروز گلستان معانی رونق بخش حدیقۂ سخن دانی نواب محمد علی خان صاحب متخلص بہ آشکی خلف اکبر جناب مستطاب نواب حاجی محمد مصطفےٰ خان صاحب دام افضالہم صاحب تذکرۂ گلشن بے خار شیفتۂ ریختہ وحسرتیؔ فارسی ارشد تلامذہ جناب نجم الدولہ نواب اسداللہ خان صاحب سلمہ اللہ تعالےٰ"

بے بادہ شوق وصل جتایا نہ جائے گا
بے چنگ و نے یہ قصہ سنایا نہ جائے گا
آشکی بھی آج بیٹھ گیا بزم دوست میں
دشمن تو یہ نہیں کہ اٹھایا نہ جائے گا

ص ۸

۱۰۔ "چمن نکتہ دانی خوان شیریں بیان حافظ محمد اسمٰعیل خان متخلص بہ ذہین نبیرۂ حافظ محمد داؤد خان مرحوم شاگرد حافظ غلام دستگیر صاحب متخلص بہ مبین"

نام اُس صنم کا دل سے بھلایا نہ جائے گا
ہے نقش کالحجر یہ مٹایا نہ جائے گا
انداز جور ماہ وشاں اور ہے ذہین
گردوں ستائے لاکھ ستایا نہ جائے گا

ص ۸-۹

۱۱۔ "نوک ریز خامہ جادو رقم شاعر بے مثال نکتہ پرور بے عدیل مالک ممالک سخن مرزا قربان علی بیگ خان صاحب المتخلص بہ سالکؔ خلف اکبر نواب مرزا عالم بیگ خان صاحب۔ از اشرف تلامذہ جناب نجم الدولہ مرزا اسد اللہ خان صاحب غالب سلمہ اللہ تعالیٰ"

کچھ بھی جو روز حشر بڑھایا نہ جائے گا
قصہ تمام ہم سے سنایا نہ جائے گا
سالکؔ چراغ پردۂ فانوس کی طرح
سینہ میں داغ دل کا چھپایا نہ جائے گا

ص ۹

۱۲۔ "شاعر خوش فکر موزوں طبع شتاب خاں صاحب سپہر تخلص از شاگردان مرزا صابر صاحب از آن اوست"

آئینہ حور وش کو دکھایا نہ جائے گا
مغرور و معجب اس کو بنایا نہ جائے گا
چھوڑے گا عشق گردشِ چشم بتاں نہ وہ
چکر میں تا سپہر کو لایا نہ جائے گا

ص ۹-۱۰

۱۳۔ "نخل بند گلستان معانی گل نو رسیدۂ ریاض سخن دانی مرزا حسین علی خان صاحب متخلص بہ شاداںؔ خلف اصغر مرزا زین العابدین خان صاحب عارف مرحوم نبیرہ جناب اقا حضرت مآب نجم الدولہ غالب سلمہ اللہ تعالیٰ از آن اوست"

آزارِ عشق ہے تو چھپایا نہ جائے گا
کیوں کر کہوں کہ حال سنایا نہ جائے گا
شاداں نے دل لگا کے بتوں سے برا کیا
اس سے یہ رازِ عشق چھپایا نہ جائے گا

ص ۱۰

۱۴۔ "فروغ شبستان دودۂ شاہی مرزا مجاہد الدین صاحب متخلص بہ شاہی شاگرد جناب
[illegible] از آن اوست"

اُن سے مرے جنازہ پر آیا نہ جائے گا
تا پہلے اذن عام سُنایا نہ جائے گا
شاہی ھزار اپنا مقلد ہو غیر پر
انداز اُس سے میرا اُڑایا نہ جائے گا

ص ۱۰

۱۵۔ "شکوہ نمائے افواج معانی مالک اقلیم سخن دانی شمع دودمانِ گورگانی حضرت صاحب عالم جہاں پرور مرزا محمد قادر بخش صاحب المتخلص بہ صابر صاحب تذکرہ گلستان سخن از ارشد تلامذہ جناب حافظ عبدالرحمن خان احسان مغفور و مرحوم صاحب دیوان فخر شعرائے ہندوستان سلمہ اللہ تعالےٰ"

یہ ضعف ہے تو کام بنایا نہ جائے گا
ہم سے ترے خیال میں جایا نہ جائے گا
صابر کو ہم بلائیں گے غصہ میں یہ نہ کہہ
اُس تفتہ جاں کو ہاتھ لگایا نہ جائے گا

ص ۱۱

۱۶۔ "خوش بیانی شاعر شیریں گفتار غلام جیلانی صاحب ضیا تخلص شاگرد امراؤ مرزا صاحب انور"

واں ناز وہ کہ در تلک آیا نہ جائے گا
یاں ضعف یہ کہ جان سے جایا نہ جائے گا
گردن پہ بارِ خون ضیا کیوں اٹھاتے ہو
نازک ہو تم سے بوجھ اُٹھایا نہ جائے گا

ص ۱۲

۱۷۔ "زعفران زار کشیر سخن دانی آبیاری خامۂ مشکیں لباس نخل بند معانی پنڈت کشن لال صاحب متخلص بہ طالب سر دفتر داکوٹنٹ محکمۂ نہر جمن ضلع دہلی شاگرد سابق مولوی محمد حسین صاحب آزاد حال شاگرد نواب مرزا صاحب ظہیر سلمہ اللہ تعالےٰ"

محفل سے گر عدو کو اٹھایا نہ جائے گا
ہم سے تو گھر میں دوست کے جایا نہ جائے گا
طالب نہ دنیا آتشِ الفت کو دل میں جا
گر جل اٹھا یہ گھر تو بجھایا نہ جائے گا

ص ۱۲-۱۳

۱۸- "سحر طرازی خامۂ جادو نگار سخن سنج یکتا شاعر بے مثال سریر آرائے معانی سید ظہیر الدین حسین صاحب عرف نواب مرزا المتخلص ظہیر خلف اکبر میر جلال الدین صاحب مرحوم خوش نویس استاد حضرت جہاں پناہ خلد آرام گاہ"

دل سے نہ جا کہیں کہ پھر آیا نہ جائے گا
جوں بوئے گل نکل کے سمایا نہ جائے گا
جانے کو خیر جائیے اس بزم میں ظہیر
حضرت سلامت آپ سے آیا نہ جائے گا

ص ۱۳-۱۴

۱۹- "متاع گراں بہائے سخن نقاد لآلی آبدار معانی مضامین وجوہری گوہر شاہوار معانی ہائے رنگیں سلطان ذاکرین مرزا یوسف علی خان صاحب عزیز دہلوی مسکن بنارسی موار صاحب دیوان از اشرف تلامذہ حضرت غالب سلمہ اللہ تعالیٰ"

غزل اول:- سر بلند آسماں سے پھرایا نہ جائے گا!
کج رو کو راہ راست پہ لایا نہ جائے گا
تسلیم امر غیر کیا جائے کب عزیز
سر رو بر کسی کے جھکایا نہ جائے گا

غزل دوم:- طغیان اشک چشم میں لایا نہ جائے گا
یا دجلہ سے بھنور میں سمایا نہ جائے گا
گر راستہ میں جلوہ دکھاوے وہ بت عزیز
آتا تو کیا کہ ہوش میں آیا نہ جائے گا

ص ۱۴

۲۰۔ "طبع زاد شاعر موزوں طبع دولت رام نام عبرت تخلص شاگرد نواب مرزا حسن ظہیر"

ہم سے خیال یار بھلایا نہ جائے گا
یہ داغ دل ہے وہ کہ مٹایا نہ جائے گا
عبرت ہمیں یقین ہے بے خاک میں ملے
اُس بے وفا کو راہ پہ لایا نہ جائے گا

ص ۱۴۔ ۱۵

۲۱۔ "معنی آفرینئ صاحب طبع سلیم و فکر رسا سیّد مرزا علی صاحب قیس تخلص شاگرد مرزا صابر صاحب"

ہم سے تو رنج ہجر اٹھایا نہ جائے گا
اب کیا بنے گی دم جو خدایا نہ جائے گا
اظہار عشق قیس کیا ہے نہ ہم کریں
یہ درد چارہ گر کو سنایا نہ جائے گا

ص ۱۵

۲۲۔ "تازگی افکار دل کش سخن آرائے معانی حکیم اسد علی خان صاحب مضطر تخلص خلف حکیم ببر علی خاں صاحب شاگرد مرزا قربان علی بیگ صاحب سالک سلمہ اللہ تعالےٰ"

اے حشر تجھ سے دہر میں آیا نہ جائے گا!
جب تک فغاں سے چرخ ہلایا نہ جائے گا
مضطر ہم آپ بن کے طلب گار جائیں کیوں
کیا جذب دل سے یاں انہیں لایا نہ جائے گا

ص ۱۵۔ ۱۶

۲۳۔ "شاعر موزوں طبع سردار مرزا صاحب متخلص بہ مضطر خلف مرزا ایوب بیگ صاحب"

اُس ناوک مژہ سے بچایا نہ جائے گا
سینہ میں مرغ دل کو چھپایا نہ جائے گا
تسکین نہ ہوگی وصل میں مضطر کو ماہ وش
جب تک کہ پردہ رخ سے اٹھایا نہ جائے گا

ص ۱۶

۲۴۔ "طبع زاد شاعر خوش ... سخن ..."

وہ ساتھ لائے غیر کو گر بزم میں تو کیا
آنکھوں سے منّتوں سے بٹھایا نہ جائے گا
ہوگا اثر جو دل میں تو خود جان لیں گے وہ
مشتاق ہم سے عشق جتایا نہ جائے گا

ص ۱۶

۲۵- "لمعہ افروزئ مہر آسمان سخن وری شاعر فصیح البیان ناظم روشن بیان حافظ غلام دستگیر صاحب متخلص مبیّن خلف الرشید وہم شاگرد جناب حافظ قطب الدین صاحب متخلص بہ مشیر سلمہما اللہ تعالٰی"

کب صفحۂ جہاں پہ جو آیا نہ جائے گا
کیوں کر کہوں رقیب مٹایا نہ جائے گا
بے تابیوں سے دل کی یقیں ہے ہمیں مبیںؔ
عشق نہاں کا حال چھپایا نہ جائے گا

ص ۱۶-۱۷

۲۶- "خوش بیانئ شاعر بے نظیر ناظم لاجواب سیّد ناصر نواب صاحب متخلص بہ ناصر خلف اصغر خواجہ محمّد ناصر امیر صاحب مرحوم صاحب سجّادہ واز آل مطہر جناب عرفان مآب خواجہ میر دردؔ صاحب رحمتہ اللہ علیہ زانوئے ادب بخدمت مرزا قربان علی بیگ صاحب سالک طے کردہ سلمہ اللہ تعالٰی"

اے شیخ ہم سے کعبہ کو جایا نہ جائے گا
دل بت کدے سے یار اٹھایا نہ جائے گا
کیوں اُس کی بزم ناز میں ناصرؔ گئے ہیں ہم
دیکھا وہ کچھ کہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

ص ۱۷

۲۷- "شیریں گفتارئ یکتا گوہر دریائے معانی جوہر جوہری سخن سنجی وسخن دانی شاعر نغز گفتار معجز بیاں مولوی محمد امو جان صاحب متخلص بہ ولی از شاگردان جناب نجم الدولہ مرزا اسد اللہ خاں صاحب غالب سلمہ اللہ تعالٰی"

غزل اول:- رزوانہ اس کی بزم میں جایا نہ جائے گا
منہ آنسوؤں کے ہمدموں سے چھپایا نہ جائے گا

سوزشں بہت ہے دل میں ولی اور لکھ غزل
اب قفل تجھ سے منہ پہ لایا نہ جائے گا

غزل دوم:- زنہار اُس پہ ضعف جتایا نہ جائے گا
شاید کہے کہ ظلم اُٹھایا نہ جائے گا
آیا ہے بزم مے میں ولی لیک ضعف سے
جامِ شراب منہ سے لگایا نہ جائے گا

ص ۱۷-۱۸

انجمن دوم کے تین شعرا کی غزلیں اس نسخے میں موجود ہیں۔ غالبؔ کی غزل سب سے پہلے ہے جس کی تفصیل اوپر پیش کی جا چکی ہے۔ اس کے بعد مندرجہ ذیل شعرا کا کلام ہے۔

۱- "امراؤ مرزا صاحب متخلص بہ انور"

ترا تیر یاں دل کشا ہوگیا
ستم قابل مرحبا ہوگیا
نہیں انور اس کی نظر سے دوچار
اجل سے مگر سامنا ہوگیا

ص ۱۹-۲۰

۲- "مرزا عبد الغنی صاحب المتخلص بہ ارشد شاگرد مرزا صابر صاحب دہلوی"

مجھے لاغری سے یہ کیا ہوگیا
کہ ہر دوست نا آشنا ہوگیا
وہ ارشد بُرا یا بھلا کچھ سہی
مگر وہ غلام آپ کا ہوگیا ص ۲۰

۳- "مرزا محمد عثمان صاحب متخلص بہ افسر شاگرد مرزا صابر صاحب"

..... زلف دوتا ہوگیا
یہ دل مبتلائے بلا ہوگیا

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، گلدستہ انجمن کا یہ نسخہ ناقص الآخر ہے اس لئے افسرؔ کی غزل نامکمل ہے

تحسین سروری

میر باقر علی داستان گو

ہمارے بہت سارے فن جو معدوم سے ہوگئے ہیں، ان میں ایک "داستان گوئی" بھی ہے۔ داستان گوئی جتنا دلچسپ فن ہے۔ اتنا ہی مشکل بھی ہے، سننے والے کئی کئی راتیں گذار دیتے تھے لیکن سیری نہ ہوتی اور داستان گو کا کمال یہ تھا کہ نہ کبھی وہ تھکتا اور نہ داستان میں جھول آنے دیتا، سننے والوں کا جیسے جیسے اشتیاق بڑھتا ویسے ویسے داستان گو کی زبان سے پھول جھڑنے لگتے۔ ہماری کتابی داستانوں میں الف لیلہ، امیر حمزہ، عمرو عیار، فسانہ آزاد وسیر کہسار اور نذیر احمد اور شرر کے ناولوں کو کلاسکی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن یہ سب ایسی تصانیف ہیں جو سوچ سوچ کر لکھی گئی ہیں۔ اور جملوں اور عبارتوں کو بنانے، سنوارنے میں نہیں معلوم مصنفین نے کتنے کاغذ چاک کئے ہوں گے، لیکن برخلاف اس کے داستان گوئی فی البدیہہ تقریر کا فن ہے۔ داستان گو نے جو کہہ دیا کہہ دیا۔ وہ کوئی غلط لفظ استعمال کر کے واپس لینے سے تو رہا۔ لہٰذا داستان گو جس رفتار سے بولتا ہے اسی رفتار سے سوچتا بھی جاتا ہے، یہ بھی خیال رکھنا پڑتا ہے کہ داستان کا تسلسل نہ ٹوٹے، بات سے بات بھی پیدا کی جائے۔ اگر داستان کا کوئی ٹکڑا بوجھل ہو جائے تو اس کو ایسا سبک بنایا جائے کہ سامعین کی توجہ میں کمی نہ آئے۔

داستان گوئی کے جھگڑے میں نہ ناٹک کے پردے ہوتے تھے نہ فلم کے متحرک عکس ہوتے تھے۔ اس لئے جنگل پہاڑ، دریا، ریگستان اندھیری رات اور دن کا اجالا۔ یہ سب کچھ داستان گو کو لفظوں کے ساتھ حرکات کے ذریعہ دکھانا پڑتا تھا۔ اس لحاظ سے یہ بڑا مشکل فن ہے بغیر علم اور وسیع مطالعے کے اس کا حاصل کرنا مشکل ہے۔ اس کے ساتھ ہی طبیعت کو مناسبت بھی ہونی چاہیئے شاعری، موسیقی اور مصوری کی طرح داستان گوئی بھی وہبی فن ہے۔ اگر یہ فن محض اکتسابی ہوتا تو اس میں نہ اتنی دلکشی ہوتی۔ اور نہ اس میں اتنی نزاکتیں اور نکتے ہوتے، داستان گوئی میں ذہانت و فطانت کی بھی ضرورت ہوتی ہے، زبان محاورہ پر قدرت اور شعر و ادب کا مذاق سلیم نہ ہو تو کوئی شخص داستان گو بن ہی نہیں سکتا داستان گو کے لئے لازمی ہے، کہ وہ علوم متداولہ میں طاق ہو اور اس کا مشاہدہ گہرا اور دائرہ معلومات وسیع ہو۔

داستان گوئی کا فن ہمارے ہاں قدیم سے ہے۔ اس کا مقصد تفریح اور فرصت کے اوقات کو خوشگوار بنانا نہیں تھا۔ بلکہ علم، تجربہ اور معلومات میں اضافہ کرنا تھا۔ گویا داستان گوئی سے درس و تدریس کا کام لیا جاتا تھا۔ شہزادوں اور امیرزادوں

کو داستان گوئی کی محفلوں میں بطور خاص بٹھایا جاتا ہے۔ تاکہ اپنی تاریخی معلومات میں اضافہ کریں اور جنگی معرکے سر کرنے کے اصول سیکھ لیں۔ بعض دفعہ تو داستانیں سُن کر بادشاہ اپنے اعمال کا جائزہ لیتے اور اپنی کمزوریوں اور حکمت عملی پر نظر ثانی کرتے تھے۔ غرض داستان گوئی ایک ایسا فن ہے جس سے بڑے بڑے کام بھی لئے گئے ہیں، اور آگے چل کر ہمارے ادب کا یہ جزو بھی بن گیا۔ اب نہ اس فن کے ماہر رہے نہ اس کا کوئی شائق۔

فن داستان گوئی کی روشنی کو بیسویں صدی عیسوی کے ربع اول تک باقی رکھنے والے میر باقر علی داستان گو تھے جن کے بعد داستان گوئی کا چراغ ہی گل ہو گیا

میر باقر علی سنہ ۱۸۵۰ء میں دہلی میں پیدا ہوئے ۸۷ سال کی عمر پا کر ۱۸ مارچ ۱۹۲۸ء میں انتقال کیا ان کے بزرگ ایران سے ہندوستان آئے تھے۔ ان کے والد میر حسین علی اور نانا میر امیر علی شاہی ملازم تھے بچپن میں والد کا انتقال ہو گیا۔ نانا نے پرورش کی

میر امیر علی قلعے میں قصہ خواں تھے ۱۸۵۷ء میں وہ بھی مر گئے۔ ان کی جگہ باقر علی کے ماموں میر کاظم علی مامور ہوئے۔ جو قصہ خوانی کے دائرے سے نکل کر داستان گو بن گئے۔ اور اس فن کو ایسی ترقی دی۔ کہ لکھنؤ اور فیض آباد کے داستان گو تک رشک کرنے لگے شمالی ہند سے پھر ان کی شہرت دکن پہونچی۔ اس وقت کے وزیر اعظم ریاست سر آسمان جاہ بہادر نے انہیں حیدر آباد بلا لیا۔ وہ حیدر آباد ایسے گئے کہ پھر وطن واپس نہ ہوئے۔ وہیں وفات پائی۔ میر باقر علی ان ہی میر کاظم علی کے شاگرد و جانشین تھے میر کاظم علی کے ہونہار بھانجے نے داستان گوئی میں ایسا نام پیدا کیا کہ اس کا کوئی ثانی نہ ہوا۔ بلکہ اس فن کا خاتمہ ہی ان پر ہو گیا۔

کالجوں اور مدرسوں کے علاوہ میر باقر علی کو نامی رئیسوں اور والیان ریاست کے ہاں سے بھی بلاوے آتے تھے، چنانچہ اسی فن داستان گوئی کے سلسلے میں وہ کئی کئی بار حیدر آباد، رام پور، لوہارو، دوجانہ، دتیا۔ مالیر کوٹلہ، پٹیالہ، کشمیر وغیرہ ہو آئے تھے۔ اور داد و تحسین کے ساتھ صلے بھی پاتے تھے۔

میر صاحب کی آنکھیں دیکھے ہوئے لوگ بفضلہ ابھی موجود ہیں۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ میر صاحب پرانی وضع داری کے پابند اور اخلاق کا مجسمہ تھے۔ غریب تھے مگر بلا کے غیور بھی تھے تنگ دستی میں زندگی گذار دی۔ لیکن خودداری کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ میر صاحب کھرے سید تھے۔ بڑی بڑی جگہوں پر داستان گو کی حیثیت سے جاتے لیکن اپنی سیادت اور نسبی نجابت کو نہ بھولتے،

ملا واحدی صاحب نے میر صاحب کا کیا عمدہ نقشہ کھینچا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

میر صاحب مخنی آدمی تھے۔ دبلے پتلے دھان پان، قد بھی معمولی۔ لیکن داستان میں کسی بادشاہ کا ذکر آجاتا کہ اس نے یہ حکم دیا تو حکم اس شان سے ادا کرتے تھے کہ گمان ہونے لگتا۔ کہ ہم ایک قہار بادشاہ کے سامنے بیٹھے ہیں اور اُسے بولتا دیکھ رہے ہیں۔ کسی ڈاکو کی نقل اتارتے تو ڈاکو کا نقشہ کھینچ دیتے کسی معمر عورت کا قول دہراتے تو ناک، لے

داستول کے بن جاتے ۔"

اسی طرح میدان جنگ ، شادی بیاہ کی محفلوں وغیرہ کی "ایسی تصویریں کھینچتے کہ خود تصویر بن جاتے" بقول اشرف صبوحی صاحب "وہ اصوات و حرکات کے پورے اداکار تھے ۔ بلا کا حافظہ پایا تھا ۔ دفتر کے دفتر نوک زبان تھے ۔ کھانوں کا ذکر آیا تو الوان نعمت کی فہرست کھول کر رکھ دی کشتی کا ذکر آیا ۔ سارے داؤ پیچ گنوا دیتے ،

میر باقر علی کے متعلق میں نے ان کے جتنے اور مستند اہل قلم کی تحریریں پڑھی ہیں ۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے ۔ کہ میر صاحب کی ہر جگہ دھاک تھی ، اور اچھے اچھے علمائے تاریخ و ادب ان کے علمی تبحر اور معلومات عامہ پر عش عش کرتے تھے ۔ داستان گوئی کو پیشہ بنا لیا تھا لیکن ان کا مزاج پیشہ وروں کا سا نہ تھا ۔ طبیعت میں انکسار تھا لیکن اپنے فن پر انہیں ناز تھا ۔ مزاج دار آدمی تھے ۔ بدماغ نہیں تھے جلیم و بسند باری میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا ۔ ہزاروں اشعار یاد تھے ۔ نہیں وہ برمحل استعمال کرنے کا سلیقہ بھی جانتے تھے ۔ زبان کے تو ایسے دھنی کہ شاعر و انشاپرداز میر صاحب کو سند مانتے تھے ۔

میر باقر علی ، داستان گو کے علاوہ ایک مصنف کی حیثیت سے بھی کافی مشہور ہیں ۔ ان کی جو داستانیں زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آئیں ان میں بہادر شاہ ظفر کا ہاتھی مولا بخش ، گاڑھے خاں کا دُکھڑا گاڑھے خاں نے ململ جان کو طلاق دے دی بالوں کی باتیں ، کانا باتی ، فقیر کی جھولی ، اہل محلہ اور نااہل پڑوسی ، استانی ، طلسم ہوش افزا وغیرہ ، کوئی ڈیڑھ دو درجن کتابیں ہیں جو بے حد مقبول ہوئیں ۔ اور اردو ادب کا قابل قدر سرمایہ سمجھی جاتی ہیں ۔

لوگ بیان کرتے ہیں کہ میر صاحب کی بعض داستانیں دس دس بارہ بارہ برس گذرنے کے بعد بھی پوری نہ ہوئیں ۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ فن و زبان کے کتنے بڑے ماہر تھے ،

میر باقر علی کے کوئی اولاد نرینہ نہ تھی ۔ صرف ایک صاحبزادی باقری بیگم تھیں ۔ جو طبیہ کالج دہلی کی سند یافتہ طبیبہ تھیں ، افسوس کہ چند سال قبل وہ بھی کراچی میں چل بسیں ۔ سنا ہے باقری بیگم نے اپنے باپ سے یہ فن کسی قدر سیکھا تھا غالباً میر صاحب نے اپنا ایسا کوئی شاگرد بھی نہیں چھوڑا جسے ان کا جانشیں قرار دیا جا سکے ، جناب ذوالفقار علی بخاری نے البتہ ان کی شاگردی اختیار کی تھی لیکن فن داستان گوئی کی روایت کو وہ بھی زندہ نہ رکھ سکے ، وہ تحریر فرماتے ہیں ،

> ایک دور آیا ۔ کہ میر صاحب بھوجلا پہاڑی والے مکان میں جمعرات کو کہانی سناتے ، سننے والے آتے اور دُونی طاق پر رکھ کر کہانی سننے بیٹھ جاتے میر صاحب کے ہاتھ میں افیون کی پیالی اور زبان پہ داستان یوں بے تکان سناتے چلے جاتے کہ بڑے بڑے طرار جوانوں کو ان کے بڑھاپے پہ رشک آتا ۔ میں اس زمانے میں میر صاحب کی شاگردی کا دم بھرتا تھا ۔ میر صاحب نے مجھے اپنا فن سکھانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ۔ مگر میری کوتاہیوں نے مجھے وہ فیض حاصل نہ کرنے دیا جن کا دروازہ میر صاحب نے میرے لئے کھول رکھا تھا ۔"

بابائے اردو مولوی عبدالحق بھی میر صاحب کے فن کے بڑے قدر دان تھے ۔ وہ چند بار اپنے ہاں داستان کی محفلیں منعقد

گنج ہائے گراں مایہ

انجمن کے مخطوطات کی وضاحتی فہرست (جلد دوم)

مرتبہ افسر صدیقی امروہوی

دوسری جلد کے مندرجہ ذیل مخطوطات پر قومی زبان میں حواشی شائع ہو چکے ہیں

- وصیت نامہ
۲- فتح المجاہدین — مسکین
۳- شفاعت نامہ — عبدالقادر
۴- قصہ شاہ جمجمہ — کمترین
۵- تلقین الہدی — عاصی
۶- تنبیہ العوام — شاہ محمد بدھن احقر
۷- مثنوی گوہر — ابراہیم گوہر
۸- حملہ حیدری — ذوالفقار علی صفا
۹-۱۰- محی الدین نامہ (دو نسخے) — عبدالملک عبد
۱۱- دیوان ہمت — خواجہ ہمت علی خاں
۱۲- گنج قدرت — اعزالدین خاں نامی
۱۳- فتح نامہ — یٰسین
۱۴- پند نامہ — جعفر زٹلی
۱۵- دیوان تمنا — اسد علی خاں تمنا
۱۶- تاریخ فیض عام — مہدوی
۱۷- حشر نامہ — ......
۱۸- قصیدہ غوثیہ — رحمت اللہ
۱۹- نصائح الاطفال — رضا
۲۰- نصیحت نامہ — ......
۲۱- مذمت بے نمازاں — ......
۲۲-۲۶- شمائل نامہ (پانچ نسخے) — عبدالمحمد ترین
۲۷-۲۸- تنبیہ نامہ (دو نسخے) — ولی
۲۹- معجزہ حضرت فاطمہ — قلندر
۳۰-۳۲- دیوان فراق (تین نسخے) — ثناءاللہ فراق دہلوی
۳۳- صبح نوبہار عشق — محمد باقر آگاہ
۳۴- گلزار عشق — " " "
۳۵- ندرت عشق — " " "
۳۶- محبوب القلوب — " " "
۳۷- " " (نسخہ ثانی) — " " "
۳۸- آدم نامہ — دولہ قلندر
۳۹- شہادت حضرت قاسم — ولی ویلوری
۴۰- معراج نامہ — محمد بن مجتبیٰ مہدوی
۴۱- مولود سرور عالم — مختار
۴۲- تعلیم الصلوٰۃ — محمد فیع الدین
۴۳- خزانہ حسنات — سید امام الدین علی تامن دہلوی
۴۴- کنز المصلی — غلام علی بسمل
۴۵- مصباح الصلوٰۃ — شاہ سعید الدین کرنولی
۴۶- روضۃ الاسلام — محمد باقر آگاہ ویلوری

اس شمارے میں مندرجہ ذیل مخطوطات پر حواشی دیے جا رہے ہیں

۱- دیوان غلامی — غلام نبی غلامی
۲- مجموعہ غزلیات — نامعلوم
۳- کلام صادق — صادق دکنی
۴- تنبیہ النساء — خواجہ رحمت اللہ
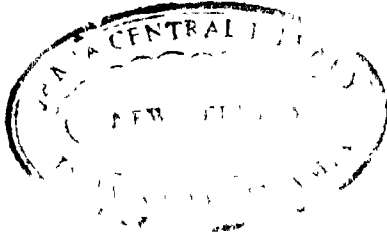
دیوان غلامی

سائز ۹ × ۶ صفحات ۲۰ سطور ۱۵ سنہ تصنیف قبل از ۱۲۵۲ھ

۲۰ مختلف نعتوں کا یہ مجموعہ محمد یار جنگ خطیب مکہ مسجد حیدر آباد کے دادا مولوی غلام نبی غلامی کا ہے ان کے پوتے کا نام سید غلام ضامن تھا (تاریخ دکن ص۲۸۹) غلامی کہیں کہیں اور پورا نام غلام نبی بھی تخلص کے طور پر استعمال کرتے تھے اس مجموعہ کی ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے نہیں ہے۔ ہر نظم کو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع کیا گیا ہے۔ املا کی غلطیوں کے باوجود تحریر صاف اور پسندیدہ ہے مخطوطہ مکمل نہیں ہے صفحہ ۲۰ کا ترک صفحہ مابعد سے نہیں ملتا جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک ورق ضائع ہوگیا ہے۔

صاحب اولیائے دکن کا بیان ہے کہ غلامی شاہ غلام سرور صاحب خطیب کے صاحبزادے سادات صحیح النسب سے تھے عابد زاہد فرشتہ سیرت پسندیدہ صورت تھے فقہ و حدیث میں عمدہ مہارت حاصل تھی مکہ مسجد کو ان کی خطابت سے رونق حاصل تھی مولانا عبدالکریم شہید کے قصاص کی بابت مہدویہ کے مقابلے کے لئے علما کی جو مجلس قائم ہوئی تھی آپ اس مجلس کے رکن اعظم تھے ۱۲۵۲ھ میں اس جہان فانی سے رہگرائے عالم باقی ہوئے مدفن بیرون کھڑکی لودلی صاحب ہے

غلامی فنی شاعر نہیں تھے بلکہ عقیدت کا جوش نظم کی صورت اختیار کرتا تھا۔ حمد و مناجات لکھنے کا زیادہ شوق تھا ان کی ایک اور تصنیف "ارشاد النبی" کا مخطوطہ بھی کتب خانہ خاص میں موجود ہے۔ نصیرالدین نقش نے عروس الاذکار میں ان کا نام غلام نبی خان لکھا ہے ممکن ہے کہ "خاں" خطاب ہو انہیں بیعت اپنے والد ماجد سے تھی اور خلافت پائی تھی۔ چاروں سلسلوں میں مرید کرتے تھے۔

غلامی صاحب نے حصن حصین کا ترجمہ بھی اردو میں کیا تھا اس کا ایک نسخہ سنٹرل لائبریری حیدر آباد میں موجود ہے۔

زیر نظر مخطوطہ کی پہلی غزل یہ ہے ؎

ہے اللہ کل شے میں حق جلوہ آرا — سوا اس کے ہے کس کا پیارا نظارا

نبی شاہ کونین صلو علیہ — غلام نبی جان اون پرسے وارا

چوتھی نظم کا مطلع یہ ہے ؎

چراغ دل کو روشن کر خدایا　　مرے گلخن کو گلشن کر خدایا

مقطع میں کہتے ہیں ؎

نبی صاحب کی برکت سے شتابی　　نبی کا پاک تن من کر خدایا

چھٹی نظم کی ردیف "یا حی" ہے اس کا مقطع خوب لکھا ہے ؎

ہو غلام نبی کی عرض قبول　　ہے وہ احقر عباد سے یا حی

آٹھویں نظم مربع کی شکل میں ہے اور اس میں بطفیل پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام و ائمہ اربعہ صحت جسمانی و حصول راحت کی دعا کی ہے۔

تیئسویں نظم کی ردیف نئی ہے کہتے ہیں ؎

زبونی قال سے استغفر اللہ　　برے افعال سے استغفر اللہ

چھبیسویں نظم مثنوی کی صورت میں ہے اس میں صرف دس ابیات ہیں آخری بیت یہ ہے ؎

غلام نبی کو سدا شاد رکھنا　　اسے سب روش خانہ آباد رکھنا

مخطوطہ ہذا جس نظم پر ختم ہوا ہے اس کا مطلع و مقطع ذیل میں لکھا جاتا ہے ؎

ترا ہووے کرم اللہ ہو اللہ　　کہے دل دمبدم اللہ ہو اللہ

نبی صاحب کے اوپر سے فلا حی　　تصدق دمبدم اللہ ہو اللہ

کوئی ترقیمہ نہیں ہے۔

مجموعۂ غزلیات

سائز ۹ × ۵ ½ صفحات ۲۳۵ سطور مختلف سنہ تصنیف × سنہ کتابت ×

یہ مجموعۂ غزلیات کسی صاحب ذوق نے (۱۰۹) شاعروں کے کلام سے مدوّن کیا ہے جس کی ترتیب دیوان کی صورت میں ہے صفحہ ۲۱۴ تک غزلیات ہیں اس کے بعد ایک نعتیہ قصیدہ ہے جس کا مقطع یہ ہے ؎

نعت پیغمبر میں رہتا ہے نقیہ دولت عظیم　　　　از مناقب سروری بہتر نہیں ہے شاعری

اس قصیدہ کے خاتمے پر (۱۲) مستزاد ہیں ان میں سے تین مستزاد سراج کے ہیں اور ایک ایک مستزاد ظفر، معزز، ہمایوں، اکبر، موج، امان، انشا، حسین، ورمعلّم کا ہے۔ پھر شہیدی کے مشہور قصیدہ نعتیہ ؎

طلوع روشنی جیسے نشان ہوشہ کی آمد کا　　　　ظہور حق کی محبت ہے جہاں میں نور احمد کا

پر دلدار علی مذاق کا مخمس ہے دوسرا مخمس نعتیہ جرات کا ہے۔ ایک قصیدہ نعتیہ سی خادم نجم الدین کا لکھنے کے بعد الہی بخش، خاں معروف کی دو تضمینیں ہیں جو امیر خسروؒ اور حافظ کی فارسی غزلوں کی ہیں۔ آخر میں ایک اردو مخمس ہے جس کے عنوان میں لکھا ہے مخمس معروف برغزل میر نظام الدین المتخلص بہ ممنون، لیکن آخری بند میں اصل غزل کے مصرع اول میں معروف کا تخلص آیا ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ تضمین ممنون کی ہے اور غزل معروف کی۔

شروع اور آخر میں فدا الدین حسین کی مستطیل مہر ہے۔ صفحہ ۲۳۲ کے بعد کا ایک ورق ضائع ہو گیا ہے جس کی وجہ سے آتش کے ایک مخمس کا آخری حصہ اور قاضی محمد صادق اختر کے ایک مشہور قطعہ کا ابتدائی حصہ درج نہیں ہے۔

اس مجموعے میں سب سے زیادہ غزلیں سودا کی ہیں جن کی تعداد (۳۹) ہے اس کے بعد نمبر میر تقی کا ہے ان کی ۳۵ غزلیں ہیں انشا کی (۳۳) آتش کی (۲۶) اور ناسخ کی (۲۳) غزلیں مجموعہ میں شامل کی گئی ہیں نظیر اکبرآبادی کی (۱۴) ظفر کی (۱۰) سراج و سوز کی (۱۲) جرأت و درد و ذوق کی دس دس اور مومن کی (۹) غزلیں نقل کی گئی ہیں

غالب تخلص کے ایک شاعر کی دو غزلیں ہیں لیکن یہ کوئی غیر معروف شاعر ہے ان غزلوں کے مطلع یہ ہیں ؎

کب رہا ہے اب بھی حور و بشر کا امتیاز　　　　دیکھ کر جاتا رہا تجھکو نظر کا امتیاز

ہیگا جو ناز و ادا اُس بت لاثانی میں　　　　ایک بھی بات نہ تھی یوسف کنعانی میں

تعجب ہے کہ مرتب مجموعہ کو مرزا اسداللہ خاں غالب کی کوئی غزل پسند نہیں آئی یہ مجموعہ ان سے پہلے کا تو نہیں ہو سکتا جب کہ خواجہ حیدر علی آتش کا کلام اس میں موجود ہے اور غالب مرحوم آتش کے انتقال کے وقت استادی کے درجے پر فائز ہو چکے تھے۔

اساتذہ مشاہیر کے علاوہ مخطوطہ زیر تبصرہ میں متعدد بہت ہی غیر معروف شعرا کا کلام جمع کیا گیا ہے مثلاً امان، تبسم، حافظ، حکیم، رمضان، سلیمی، شجاعت، صمصام، عبداللہ، عزیز الدین، قلندر، کنور، مستان، ملنگ شاہ، واحد علی۔ یہ ایسے شعرا ہیں جو کسی تذکرے میں نظر نہیں آتے۔ مرتب نے غزلوں کے انتخاب میں کسی شاعر کا نام نہیں لکھا اس سے غلط فہمی پیدا ہونا ممکن ہے۔

کوئی ترقیمہ موجود نہ ہونے کی وجہ سے مخطوطہ کا سنہ کتابت معلوم نہ ہو سکا لیکن کتابت کے اندازہ اور کاغذ کی کرم

...زگی سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مجموعہ گزشتہ صدی کے نصف آخر کا ہے۔

آغاز :-

مقدور ہمیں کب ترے وصفوں کے رقم کا　　حق کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا

اس مسند عزت پہ کہ تو جلوہ نما ہے　　کیا تاب گذر ہووے تعقل کے قدم کا

اختتام ؎

احیا کا اگرچہ معجزہ آرائے ہے مسیح　　لیکن مریض عشق سے شرمائے ہے مسیح

ممنوں کا ر رد دیگر کے فرمائے ہے مسیح　　معروف درد عشق کو کب پائے ہے مسیح

عاجز ہے اس مرض سے دوا اور دوائے ہم

کلام صادق

سائز ۱۲ × ۸ صفحات ۶ سطور ۱۷ سنہ تصنیف قبل از ۱۲۲۰ھ سنہ کتابت

مجلد مخطوطہ ہذا میں صادق دکنی کی ۱۱ غزلیں ہیں ان میں سے تین غزلیں ص۱ تا ص۲ پر ہیں اور آٹھ غزلیں ص۹ سے ص۱۲ تک ہیں واضعین قانون شعر کے اصول کے خلاف ان کی ہر غزل میں ۶ شعر ہیں ان غزلوں سے دو باتوں کا پتا چلتا ہے اول یہ کہ صادق چشتی سلسلے سے تعلق رکھتے تھے ؎

بندۂ چشتی ہے یہ صادق صادق مقال　　ہے تو ہی خیر ہے جا بجہاں اور ہے

دوسرے یہ کہ صادق کو شاہ خیر سے نسبت ارادت تھی اور ان کا نام اکثر مقطعوں میں نظم کیا ہے ؎

صادق شہ خیر ہوں ہے بیقراری ہاؤ پر　　سر سے لیکر تا قدم تک ہلہلائی بانسری

صادق ہے قول شاہ خیر آدیکھیے جو کہ چاہے　　کوچے میں دلربا کے بدنام ہے تو یہ ہے

صادق حفظ مراتب پر نظر خیر ہے　　ہر ذرہ چکی بھی پیسے ورنہ ہور سو کیا مجال

صادق کے حالات تشنۂ تحقیق ہیں صاحب برکات الاولیا نے صادق علی شاہ حیدرآبادی متوفی ۱۲۲۰ھ ایک بزرگ کا ذکر کیا ہے مگر وہ نقشبندی تھے۔ شاہ خیر بھی متحقق نہیں اس نام کے دو بزرگ مشہور ہیں ایک مولوی خیرالدین سورتی متوفی ۱۲۰۶ھ دوسرے سید خیرالدین شاہ جن کی تحریک پر رحیم نے تحفۃ النصائح کو نقل کیا ہے یہ نقل ۱۲۲۵ھ کی ہے (تذکرہ مخطوطات اول ص۲۳۲) ممکن ہے کہ صادق نے جن شاہ خیر کا ذکر اپنے کلام میں کیا ہے وہ موخر الذکر بزرگ ہوں اور یہ وہی ہوں جن کا مزار کلیانی میں ہے۔ ذیل میں ان ۱۱ غزلوں کے مطلع درج کیے جاتے ہیں

[illegible]

بازارِ حسن گرم ہے عاشق کی عید ہے زاغ البصر سے جنس یہ اب خوش خرید ہے

مرا نام ہے مست، میں ہوں شرابی طلب ہے مجھ پاس شیشہ گلابی

کافر عشق جو ہے عشق میں سرشار بھی ہے لیک اسلام حقیقی اسے درکار بھی ہے

یہ صورتِ جسکی ہے جلوہ گری اُسکی ہے پردہ گری جسکی ہے پردہ دری اُس کی ہے

باغ یہی غنچہ یہی گُل یہی جاناں یہی جاں یہی جز یہی کُل یہی

تختِ جہاں عشق کا ہے سومکاں اور ہے بادشہِ حسن کا نام ونشاں اور ہے

سانورے کارے کنہیانے بجائی بانسری یہ اندھیری کوٹھری سے سنائی بانسری

عشق کے اور عقل کے فتنہ یہ باہم یا ہے عشق تو اقرار پر ہے عقل کو انکار ہے

مرنے کے آگے مرنا گر کام ہے تو یہ ہے اثبات کفر کرنا اسلام ہے تو یہ ہے

ایک مصنف کا ہے سارا کھیل گر باندھو خیال دل ہے کیا ہے آئینہ ہے قلب جس کا وصال

تنبیہ النسا

سائز ۹ × ۷ صفحات ۵۴ سطور ۱۳ سنہ تصنیف قبل از ۱۱۹۵ھ سنہ کتابت ۱۲۴۲ھ

زیر تبصرہ مخطوطے میں کاتب نے کوئی ایسی بیت نہیں لکھی جس سے مصنف کا نام یا تخلص معلوم ہو سکتا لیکن آغاز و انجام کی جو ابیات ہیں وہ تنبیہ النساء کے ان نسخوں سے مطابقت رکھتی ہیں جو ادارۂ ادبیات حیدر آباد میں موجود ہیں اور جن کا ذکر ڈاکٹر محی الدین زورؔ قادری نے فہرست اول کے صفحہ ۱۷۰ سے ۱۷۳ تک اور فہرست سوم کے صفحہ ۲۸۵ و ۲۸۶ پر کیا ہے۔ یہ نسخہ ادارۂ ادبیات کے اس نسخہ سے مطابقت رکھتا ہے جس کا نمبر ۱۳۵ ہے زیر تبصرہ نسخے میں (۶۵۰) ابیات ہیں اتنی ہی ابیات اس نسخہ میں بھی بتائی گئی ہیں اور وہ ابیات اس میں بھی شامل نہیں ہیں جن میں مصنف نے اپنا نام اور ابیات و ابواب کی تعداد ظاہر کی ہے۔ چونکہ ادارۂ ادبیات کا مذکورۂ بالا نسخہ جس کا سنہ کتابت ۱۲۵۰ھ ہے کتابت کے لحاظ سے باقی نسخوں سے قدیم ہے اس لئے گمان ہو سکتا ہے کہ بعد کی نقلوں میں ابیات کے اضافے کئے گئے ہیں اور یہ اضافے اصل کتاب کا جزو نہیں معلوم ہوتے کیونکہ اگر تنبیہ النساء کے مصنف خواجہ رحمت اللہ ادگیری ہیں جیسا کہ ڈاکٹر زورؔ کا خیال ہے تو اضافہ کی ہوئی ابیات ان کی نہیں ہو سکتیں وہ ۱۱۹۵ھ میں وفات پا چکے تھے۔

یہ بیان کر دینا غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ زورؔ قادری نے تذکرہ مخطوطات جلد سوم کے صفحہ ۱۴۸ پر سید خواجہ رحمت اللہ کو ۱۲۷۲ھ میں حیات اور "صبح کا ستارہ" نام کی کتاب کا کاتب ظاہر کیا ہے اور اشاریہ میں خواجہ رحمت اللہ نائب رسول اللہ کی ذیل میں ان کے اس صفحہ کی نشان دہی کی ہے حالانکہ یہ سید خواجہ رحمت اللہ کوئی اور بزرگ ہیں۔ خواجہ رحمت اللہ کی دو تصنیفات اور بھی ہیں ان میں سے ایک کا نام چہل و چار مسلسل ہے جس کا مخطوطہ انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانے میں ہے دوسری تصنیف ارشاد نامہ ہے جو علی گڑھ میں ہے۔

تنبیہ النساء میں جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے عورتوں کی اصلاح و ہدایت مدنظر ہے اور ان مذموم رسوم کی تنقیص کی گئی ہے جو فقہ اسلامی کی رو سے جائز نہیں۔

زیر تبصرہ مخطوطے میں بعض احادیث کے حوالے بھی ہیں۔ عنوانات سرخ روشنائی سے لکھے گئے ہیں۔ خط نستعلیق ہے۔

آغاز:

حمد بحد ہے اُسی سبحان کو   جو کیا پیدا جسم اور جان کو
جو جہاں کا خالق اور دائم ہے اُو   سب فنا آخر کتیں قائم ہے او

آغاز:

ہم دکھا راہ نبی درکار ہے   کوئی چلے کوئی نا چلے مختار ہے
گر چلیں گے تو خدا دیوے جزا   نا چلیں گے تو یقیں پاوے سزا

ترقیمہ:- روز جمعہ تاریخ چہاردہم ماہ صفر المظفر ۱۲۷۲ھ اختتام یافت۔

مطبوعات انجمن

داستان زبان اردو (ڈاکٹر شوکت سبزواری) :-

ڈاکٹر شوکت سبزواری اردو کے لسانی مسائل پر کئی گرانقدر مقالے اور کتابیں لکھ چکے ہیں۔ "داستان زبان اردو" ان کا تازہ ترین علمی کارنامہ ہے جس میں انہوں نے اردو زبان کے لسانی سرمائے، مختلف نظریوں، مولد و منشاء صرفی نحوی... نشو ونما، مزاج و منہاج اور ارتقاء کے مدارج پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اردو زبان کے بارے میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ قیمت :- پانچ روپے۔

کیفیہ (پنڈت برج موہن دتا تریہ کیفی) :-

اردو زبان کی مختصر تاریخ اور اس کی انشاء، املا، نحوی مسائل وغیرہ کے متعلق ہر قسم کے ضروری اور اہم امور سے بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب علامہ کیفی کی، زندگی بھر کی علمی تگ و دو کا حاصل ہے۔ اس میں انھوں نے زبانِ اردو کو پیش آنے والے بہت سے مسائل کا حل تجویز کیا ہے نیز ان مشکلات کو دور کرنے کی کوشش کی ہے جو ہماری زبان کی ترقی میں حارج ہیں۔ قیمت :- پانچ روپے

سید احمد خان ـــ حالات و افکار (بابائے اردو) :-

ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنی نشاۃ ثانیہ کے اولین معمار سید احمد خان کی شخصیت اور علمی کارناموں کا جائزہ جس میں بابائے اردو نے سرسید کے حالات اور افکار کے بعض پہلوؤں پر نئے انداز سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کتاب کو مولانا حالی کی "حیات جاوید" کا ضمیمہ سمجھنا چاہیئے۔ قیمت :- چار روپے

غالب ـ فکر و فن (ڈاکٹر شوکت سبزواری) :-

مطالعۂ غالب کے سلسلے میں ڈاکٹر شوکت سبزواری درجۂ استناد رکھتے ہیں۔ انھوں نے غالب کی شخصیت، اس کے ماحول اور فن کے بارے میں وقتاً فوقتاً جو مقالات لکھے ہیں انہیں اس کتاب میں جمع کر دیا گیا ہے

قیمت :- پانچ روپے

انجمن ترقی اردو، بابائے اردو روڈ، کراچی

ابوسلمان شاہجہانپوری

نئے خزانے

نومبر ۶۵ء[1] کے اردو اخبارات و رسائل کا اشاریہ

موضوعات

[1] اس اشاریے میں گزشتہ مہینوں کے ایسے اخبارات و رسائل بھی شامل کئے گئے ہیں جو پہلے دستیاب نہ ہو سکے تھے۔

پیش نظر اشاریے کی ترتیب میں نومبر ۱۹۶۵ء اور دیگر مہینوں کے مندرجہ ذیل رسائل سے مدد لی گئی ہے

	رسالہ	شہر	شمارہ		رسالہ	شہر	شمارہ
ماہنامہ	الشجاع	کراچی	نومبر ۱۹۶۵ء	ماہنامہ	طلوع اسلام	لاہور	نومبر ۱۹۶۵ء
"	ادبی دنیا	لاہور	"	"	فاران	کراچی	"
"	افکار (خاص نمبر)	کراچی	اکتوبر و نومبر	"	فکر و نظر	"	"
"	انجمن اسلامیہ میگزین	کراچی	اکتوبر ۱۹۶۵ء	"	قومی زبان	"	"
"	بینات	کراچی	نومبر ۱۹۶۵ء	"	مشرق	"	اکتوبر نومبر ۱۹۶۵ء
"	پیام عمل	لاہور	نومبر ۱۹۶۵ء	"	نصرت	لاہور	ستمبر اکتوبر ۱۹۶۵ء
"	ترجمان القرآن	"	"	سہ ماہی	نوائے ادب	بمبئی	اپریل ۱۹۶۵ء
"	تہذیب الاخلاق	"	"	ماہنامہ	نیرنگ خیال	لاہور	نومبر دسمبر ۱۹۶۵ء
"	ثقافت	"	"	ہفت روزہ	المنبر	لائل پور	نومبر ۱۹۶۵ء
"	زاویے	حیدرآباد	"	"	آئین	لاہور	"
"	ساقی	کراچی	"	"	چٹان	"	"
—	سویرا	لاہور	نمبر ۳۵	"	خدام الدین	"	جہاد نمبر
ماہنامہ	سیارہ	"	نومبر ۱۹۶۵ء	"	شہاب	"	"
"	صحیفہ	"	اکتوبر ۱۹۶۵ء	"	لاہور	"	"

اردو ادب و زبان

اردو ادب (تحقیق و تنقید اور مسائل و مباحث)

مصنف	عنوان	رسالہ، صفحات	ماہ
احسن فاروقی، ڈاکٹر محمد	ادب اور اصناف	ساقی، ص ۳۸ تا ۴۴	نومبر
”	پاکستانی کلچر[۵]	قومی زبان، ص ۲۳ تا ۲۴	نومبر
اسلم فرخی، ڈاکٹر	نگارستان فارس	قومی زبان ص ۳۷ تا ۴۶	نومبر
اسماعیل پانی پتی، شیخ محمد	سرسیّد کی ادبی حیثیت (۴)	تہذیب الاخلاق، ص ۸ تا ۲۳	”
افتخار حسین، آغا۔ الطاف گوہر اور دیگر حضرات[۶]	جنگ اور ادب	افکار (خاص نمبر)، ص ۲۷ تا ۶۸	اکتوبر نومبر
اوصاف علی دہلوی، سید	میرامن کی باغ و بہار	ساقی، ص ۶۳ تا ۶۴	نومبر
اینڈرسن، ڈاکٹر ڈیوڈ ڈی	یوجین اونیل اور موجودہ امریکی ڈراما	قومی زبان ص ۲۹ تا ۳۶	”
پرنس علی خاں	نقش جاوداں	فاران، ص ۶۰ تا ۶۲	”
تحسین سروری	اردو ادب کے غیر ادبی مآخذ	قومی زبان، ص ۲۵ تا ۲۸	”
تقوی، پروفیسر نعیمہ حیدر	رباعی اور اس کا فن	زاویے، ص ۲۳ تا ۲۸	”
سرور اکبر آبادی	نظیر اکبر آبادی	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۲۵ تا ۳۸	اکتوبر
شاعر، حمایت علی	فن اور شخصیت (سلطان جمیل نسیم)	زاویے، ص ۱۴ تا ۳۷	نومبر
شہابی، مفتی انتظام اللہ	آگرہ کی ادبی صحبتیں	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۲۷ تا ۲۸	اکتوبر
صفدر حسین، ڈاکٹر سیّد	احیائے تہذیب ملت اور اکبر الہ آبادی	صحیفہ، ص ۹ تا ۲۰	اکتوبر
صلاح الدین، صلاح الدین محمود، محمد سلیم الرحمٰن	عبداللہ حسین سے بات چیت	سویرا، ص ۹ تا ۳۷	
عبدالودود، قاضی	برہان قاطع اور ہندوستان (۲)	نوائے ادب، ص ۵ تا ۱۳	اپریل

---

۵ جناب جالبی صاحب کی فاضلانہ تصنیف

۶ یہ ایک مذاکرہ ہے جس میں ان حضرات کرام نے بھی حصہ لیا ہے۔ پروفیسر احسن علی خاں، قدوس صہبائی، سید محمد تقی۔ سید الطاف علی بریلوی، بریگیڈیر گلزار احمد، فتح اللہ عثمانی، سحر انصاری، کمانڈر رشید انور، ڈاکٹر حسن منظر، مجتبیٰ حسین۔

عمر، ڈاکٹر محمد	سودا کی شاعری کا تہذیبی مطالعہ	نوائے ادب، ص ۴۲ تا ۶۱	اپریل

اردو زبان اور اس کے مسائل

احمد رفاعی	اردو میں فن سوانح نگاری	زاویے، ص ۱۴ تا ۲۳	نومبر
پیام شاہجہاں پوری	اردو زبان اور اس کا ارتقائی پس منظر	تہذیب الاخلاق، ص ۴۲ تا ۴۳	″
صارم، عبدالصمد	اُردو زبان کی تاریخ	ادبی دنیا، ص ۱۷ تا ۲۴	″
عبداللہ، پروفیسر محمد	بنگلہ پر عربی، فارسی اور اردو کا اثر	ساقی، ص ۳۰ تا ۴۳	″

آپ بیتی

راجہ راؤ مترجم اشفاق انور	کچھ اپنے بارے میں	سویرا، ص ۳۸ تا ۵۰	
——	پاکستانی صحافیوں کی آپ بیتی کا ایک ورق	المنبر، ص ۱۱	رجب

تاریخ

ابوسلمان شاہجہانپوری	زردشت اور ان کا مذہب	الرحیم، ص ۳۹۲ تا ۴۰۰	اکتوبر نومبر
عبدالقادر لائل پوری، شیخ	قارون کون تھا؟	لاہور، ص ۶ تا ۷ + ۱۰	نومبر
عثمان غنی	مسلمان خواتین —— میدان جہاد میں	آئین، ص ۸ تا ۹	نومبر
——	۲۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء	طلوع اسلام، ص ۳، تا ۷	″
——	فرار (جاپانی قیدیوں کا دشمن کی قید سے فرار)	الشجاع، ص ۹ تا ۱۲	نومبر

تعلیم

چودھری، پروفیسر عبدالغفور	دیسی تعلیم کی کہانی	تہذیب الاخلاق، ص ۵۱ تا ۵۸	نومبر
یونگ اسٹون، سر رچرڈ مترجم عبدالرحمان تبسم	تعلیم اور تربیت کردار	آئین، ص ۷ تا ۱۴	نومبر

سیاسیات

احمد، نجم الدین	افریشیائی کانفرنس ۔ مسئلہ قبرص	شہاب، ص ۸ تا ۹، نومبر
اختر حسین	موجودہ ہنگامی حالات اور قومی کردار	قومی زبان، ص ۳ تا ۴، "
اشتیاق اظہر	زندہ جاوید سرگودھا	نیرنگ خیال، ص ۷۰ تا ۷۱، نومبر دسمبر
اشرف، عبدالرحیم	قتال کی فرضیت بحال ہے	المنبر، ص ۳، رجب ۴
اشرف، مولانا حکیم عبدالرحیم	افکار و سوانح [1]	بینات، ص ۵ تا ۱۱، نومبر
"	قتال کی فرضیت بحال ہے	المنبر، ص ۱ تا ۲ + ۱۰، رجب
ایوب خاں، فیلڈ مارشل محمد	امتحان کا وقت [2]	نیرنگ خیال، ص ۵ تا ۶، نومبر دسمبر
ایوب خاں، صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد	استقامت [3]	" ص ۷ تا ۹، " "
ایوب خاں، " " "	جنگ کا محاسبہ [4]	" ص ۷۰ تا ۱۱، " "
ہفت روزہ المتجمع (بیروت) مترجم سلیم اللہ	پاک و ہند جنگ ۔ عظیم درس عبرت	المنبر، ص ۵ تا ۶ + ۹، رجب
بشیر احمد، محمد	پاک فضائیہ	نیرنگ خیال، ص ۷ تا ۹، نومبر دسمبر
پرویز	شہر کے لوگ (ایک نشری تقریر)	طلوع اسلام، ص ۱۲ تا ۲۴، نومبر
تاج الدین انصاری ماسٹر	کشمیر	چٹان، ص ۲، "
ثمر، عبدالکریم	سنتے ہیں معجزوں کے زمانے گزر گئے	" ص ۴ "
جعفری، رئیس احمد	معرکہ حق و باطل	ثقافت، ص ۳ تا ۴ "
جیفرے بارا کلو مترجم بشیر ساجد	نہرو کی ناکامی	نصرت، ص ۱۴ تا ۱۵، ستمبر اکتوبر

---

[1] منقول از ہفت روزہ المنبر لائلپور
[2] ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی نشری تقریر
[3] ۲۲ ستمبر ۱۹۶۵ء کی نشری تقریر
[4] یکم اکتوبر ۱۹۶۵ء کی نشری تقریر

حامد مجید	بھارت شکستوں کا قبرستان	شہاب، ص ۱۱ تا ۱۲ ، نومبر
حنیف رامے	کچھ اپنے سیاسی نظام کے بارے میں	نصرت، ص ۹ تا ۱۳، ستمبر اکتوبر
خدا بخش، غازی	آلات جنگ کی تیاری	خدام الدین، ص ۳ ، نومبر
خلیل حامدی	جہاد پاکستان اور دنیائے اسلام	ترجمان القرآن، ص ۴۹ تا ۶۷ ، "
خورشید عالم	سادگی اپنی بھی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ	طلوع اسلام، ص ۴۵ تا ۴۹، "
شریف، پروفیسر ایم ایم	ڈاکٹر رادھا کرشنن، فلسفی یا سیاستداں	ثقافت، ص ۷ تا ۱۳، "
شورش کاشمیری	آپ ایک بھیڑیے اور سانپ سے کیا توقع رکھ سکتے ہیں	چٹان، ص ۹ + ۱۶، "
صفدر سلیمی	مسئلہ کشمیر	طلوع اسلام، ص ۵۰ تا ۲۷، "
فاطمہ یوسف، کنیز	معاہدہ استنبول	نصرت، ص ۱۷ تا ۳۶، ستمبر اکتوبر
فضل الرحمٰن، ڈاکٹر	ڈاکٹر رادھا کرشنن اور غیر مذہبی حکومت	فکر و نظر، ص ۳۳۳ تا ۳۴۰، نومبر
قمر، سیدہ	خطّہ لاہور	نیرنگ خیال، ص ۸۳ تا ۸۹، نومبر دسمبر
کوثر نیازی	آئیے شہداء کے خون کو چراغ راہ بنائیں[1]	شہاب، ص ۹ تا ۱۰، ۲۸ نومبر
"	کشمیر کا مسئلہ اور بڑی طاقتیں	شہاب، ص ۳ ، ۷ نومبر
محمد شفیع	اصلاح و استحکام کا اہم ترین موقع۔	
	بھارت پاک جنگ اور اس کے نتائج	المنبر، ص ۲ + ۱۱ ، ۲۹ رجب
محمد یوسف بنوری، مولانا	جہاد پاکستان ۔ چند عظیم نتائج	" ص ۷ ، ۱۱ "
مخمور، مختار حسن	جنگ اور امن کا مفہوم	مشرق، ص ۱۹ تا ۲۰ ، اکتوبر نومبر
ممتاز لیاقت	اسرائیل	چٹان، ص ۱۰ تا ۱۲ + ۱۶، ۸ نومبر
"	پاک فضائیہ	" ص ۶ + ۱۲ یکم نومبر
"	دنیا ہے تری منتظر روز مکافات	" " ۱۰ تا ۱۲ ۲۲ "
"	وادی کشمیر	" ۸ + ۱۶ ۲۵ اکتوبر
منظور قادر	ہماری سیاست اور ہمارا دستور	نصرت ص ۵۹ تا ۸۰، ستمبر اکتوبر
مودودی، مولانا سید ابوالاعلیٰ	اسلام ہمارا محافظ[2]	نیرنگ خیال ص ۶۲ تا ۶۳ نومبر دسمبر

---

[1] ریڈیو پاکستان۔ سے کوثر نیازی صاحب کی نشری تقریر [2] ستمبر کی جنگ پر تبصرہ

مولوی، ضیاء الحسن	راجستھان محاذ	الشجاع، ص ۵ تا ۸ ، نومبر
—	بھارت کی کہانی عالمی اخباروں کی زبانی	چٹان ، ص ۱۳ تا ۱۴، ۲۹ر "
—	داستان جنگ	سیارہ ، ص ۱۵ تا ۲۱، "
—	جنگ کی برکات	طلوع اسلام، ص ۳۷ تا ۴۴ ، "
—	مسئلہ کشمیر اکتوبر ۱۹۴۷ء سے اکتوبر ۱۹۶۵ء تک	مشرق، ص ۱۵ تا ۱۸ ، اکتوبر نومبر
—	بھارتی جارحیت کے خلاف پاکستان کی کامیاب مدافعت	چٹان ، ۲۵ر اکتوبر
—	اسرائیلی ناسور	المنبر ص ۵ تا ۶ ، ۱۸ر رجب
—	اسرائیل — دنیائے عرب کا ناسور	المنبر ص ۸ ۱۱ر رجب
—	سعودی عرب - خطۂ پاک کا عظیم ہمنوا	المنبر ص ۶ + ۱۰ ۲ر شعبان
—	پس پردہ جنگی فضا	نیرنگ خیال ص ۹۰ تا ۹۶ + ۷۵ نومبر دسمبر
—	۱۷ روزہ جنگ کا حساب	" ص ۷۴ تا ۷۵ " "
—	بھارتی جارحیت کا شکار	" ص ۷۶ " "
—	مشرقی پاکستان کے ہوا بازوں کے کارنامے	" ص ۷۹ " "
—	پاک بحریہ کے کارنامے	" ص ۶۳ تا ۶۶ " "
—	جنگ کی ڈائری	" ص ۴۱ تا ۴۸ " "
—	ادبا کے فرائض جنگی ماحول میں	" ص ۱۳ تا ۱۴ " "
—	سترہ دن اور اس کے بعد	" ص ۱۰ تا ۱۲ " "

شخصیات

اقبال

اشرف ندوی، سید نجیب	اقبال اور کشمیر	نیرنگ خیال، ص ۸۱ تا ۸۲، نومبر دسمبر
شمس تبریز خاں آروی	اقبال، اشتراکیت اور ترقی پسندی	فاران ص ۲۱ تا ۳۰ ، نومبر
شیدائی، پروفیسر اسد الحق	اقبال کا تصور ابلیس	ساقی ص ۳۵ تا ۳۷ "

غالب

طالب کشمیری، پروفیسر ان - ایل - کول	سرمایہ کلام غالب	نوائے ادب ص ۶۲ تا ۷۶ ، اپریل
—		

نصیر احمد حکیم	دوسرا قدم	ادبی دنیا، ص ۳۴ تا ۴۸، نومبر
ابوبکر صدیقی ایم اے	کلام غالب کے موضوعات	" ص ۴۹ تا ۵۶، "
محمد حسن	غالب کی شاعری میں غم	الشجاع ص ۵۸ تا ۶۳ "

دیگر شخصیات

افتخار حسین، آغا	انگلینڈ دو پردل	صحیفہ ص ۲۱ تا ۳۰، اکتوبر
ایوب قادری ایم اے، پروفیسر محمد	مولانا محمد یعقوب نانوتوی	الرحیم، ص ۳۴۰ تا ۳۴۷، اکتوبر نومبر
بسمل، سید یعقوب	برہان قاطع کا پہلا ناقد	قومی زبان، ص ۴۷ تا ۵۰ نومبر
تمنا، مولوی محمد یحییٰ	سید احسن مارہروی	" ص ۱۹ تا ۲۲ "
عصمت سلاس گنجوی	خدیجہ مستور	ساقی، ص ۵۳ تا ۵۴ "
شمیم احمد	سید امتیاز علی تاج	قومی زبان، ص ۵ تا ۱۴ "
شورش کاشمیری	دو جج۔ ایس اے رحمٰن۔ انوار الحق قلمی چہرے۔ چٹان، ص ۵، ۲۵ اکتوبر	
"	دو خطیب۔ علامہ رشید ترابی و مولانا اظہر حسن زیدی (قلمی چہرے) چٹان، ص ۵، ۸ نومبر	
"	دو سیاستدان۔ مشتاق گرمانی۔ ممتاز دولتانہ (قلمی چہرے) چٹان، ص ۴، ۱۵ نومبر	
"	قرن اول کے دو مسلمان۔ ماسٹر تاج الدین انصاری۔ مولانا تاج محمود۔ (قلمی چہرے)	" ص ۵، ۲۲ "
"	چھ اخبار نویس[1] (قلمی چہرے)	" ص ۱۰ تا ۱۲، ۲۹ "
شہابی، مفتی انتظام اللہ	نواب نجیب الدولہ	انجمن اسلامیہ میگزین ص ۱ تا ۱۷، اکتوبر
" "	مشاہیر اکبر آبادی	" " ص ۹۷ تا ۱۱۲ "
صدیقی، میجر اے آر		
مترجم، محمد عظیم	بنگال کے شیر	نیرنگ خیال ص ۲۷ تا ۳۷، نومبر دسمبر
غلام محمد خاں لونڈ خوڑ	ماسٹر ممتاز۔ ایک سیاسی مدبر	چٹان ص ۱۵ تا ۱۶، ۸ نومبر
فرحت شاہجہانپوری	مولانا شرر لکھنوی	صحیفہ ص ۳۹ تا ۷۷، اکتوبر

---

[1] مجید نظامی، اقبال زبیری، انتظار حسین، ظہور عالم شہید، عالی رضوی، بشیر احمد ارشد

مصنف	عنوان	ماخذ
کلیم اختر	مرزا البشیر الدین محمود	لاہور ۲۲ر نومبر
مظہر، محمد رمضان	جھنگ کے دو جانباز مجاہد	چٹان ص ۱۹ + ۱۸ ۲۲ر نومبر
ملک، ایم ٹی	اسلام کے عظیم المرتبت مورخین	انجمن اسلامیہ میگزین ص ۲۳ تا ۲۴، اکتوبر
ممتاز حسن	مولانا سید محمد مرتضیٰ ادیب	ثقافت، ص ۱۹ تا ۳۷، نومبر
ہلالی	میجر راجہ عزیز بھٹی (شہید)	ادبی دنیا، ص ۱۱ تا ۱۶، "

کتابیات

مصنف	عنوان	ماخذ
ابوسلمان شاہجہاں پوری	نئے خزانے[1]	قومی زبان ص ۶۵ تا ۹۳، "
افسر امروہوی	گنج ہائے گرانمایہ[2]	" ص ۵۵ تا ۶۴، "
بدوی، لطف اللہ	مثنوی غذائے روح	الرحیم ص ۳۴۸ تا ۳۶۰، اکتوبر نومبر
ساحل، عبدالحلیم و دیگر معاونین	مقالہ نما[3]	نوائے ادب ص ۱ تا ۱۸، اپریل
عبدالحلیم، مولانا محمد	حضرت سید احمد شہید کی اردو تصانیف	فاران، ص ۳۱ تا ۴۷، نومبر
قاسمی، مولانا غلام مصطفیٰ	شاہ ولی اللہ کی تالیفات پر ایک نظر	الرحیم، ص ۳۶۱ تا ۳۷۱، اکتوبر نومبر

مذہبیات

تفسیر قرآن

مصنف	عنوان	ماخذ
زاہد الحسینی، قاضی محمد مرتب: محمد عثمان بی اے	سورۃ الصٰفٰت (آیت ۱۰ تا ۱۲)	خدام الدین (جہاد نمبر) ص ۳۱ تا ۳۲ ۱۹ر نومبر
عبدالرحمٰن لدھیانوی، ایم	سورہ یٰسین	" ص ۱۱ تا ۱۲ ۲۶ر نومبر
علی نقی النقوی، علامہ	تفسیر القرآن (سورہ بقر آیت ۴۰)	پیام عمل ص ۱۰ تا ۱۱ "
محمد شفیع، مولانا مفتی	معارف القرآن (سورہ ہود آیت ۴۱ تا ۴۴)	شہاب ص ۷ + ۱۰ ۷ر نومبر

---

[1] مئی ۶۶ء کے اخبارات و رسائل کا موضوع وار اشاریہ

[2] مخطوطات انجمن ترقی اردو کا تعارف

[3] اکتوبر تا دسمبر ۶۵ء کے رسائل و جرائد کے خاص خاص مضامین کا موضوع وار اشاریہ

محمد شفیع ، مولانا مفتی	معارف القرآن (سورہ ہود آیت ۴۵ تا ۴۹)	شہاب ص ۷ + ۱۰ ،	۱۴ نومبر
———	معارف القرآن (سورہ ہود آیت ۵۰ ، ۶۰)	〃 ص ۷ + ۱۲ ،	۲۸ نومبر
مودودی ، مولانا سید ابوالاعلیٰ	الاحقاف (۳) و محمدؐ	ترجمان القرآن ، ص ۱۷ تا ۲۰ ،	نومبر
یوسفی ٹونکی ، مولانا سعد حسن خاں	تفسیر سورہ فاتحہ	فاران ، ص ۱۱ تا ۲۰ ،	〃

سیرت النبی (صلی اللہ علیہ وسلم)

ابوالشیخ الاصفہانی مترجم مولوی محمد احمد	اخلاق النبی صلعم	بینات ، ص ۱۲ تا ۱۶	نومبر
حسینی محمد ثانی	دربار رسالت	المنبر ، ص ۴	۱۸ رجب
محمد شریف ، پروفیسر	دربار حبیب کی باتیں	〃 ، ص ۵	۲ شعبان
غلانی ، ابوطاہر	ہمارا آقا صلی اللہ علیہ وسلم (۴)	لاہور ص ۲ + ۹	یکم نومبر
〃 〃	ہمارا آقا صلی اللہ علیہ وسلم (۵)	〃 ص ۵	۸ نومبر
〃 〃	ہمارا آقا صلی اللہ علیہ وسلم (۶)	〃 ص ۵	۱۵ نومبر
〃 〃	〃 〃 〃 (۷)	〃 ص ۶	۲۲ نومبر
〃 〃	〃 〃 〃 (۸)	〃 ص ۵	۲۹ نومبر
———	مسلم خواتین سے حضور اکرم صلعم کا خطاب	المنبر ص ۱۱ + ۱۰	۲ شعبان
———	احادیث الرسول	خدام الدین ص ۲	۲۷ نومبر

تصوّف

حنیف ندوی ، مولانا محمد	تصوف کے مابعد الطبیعی مسائل	ثقافت ص ۴ تا ۱۸	نومبر
محمد سرور	وحدت الوجود اور وحدت الشہود	الرحیم ص ۳۲۵ تا ۳۳۹	اکتوبر نومبر

جہاد

ارشد ، حافظ عبدالرشید	تمھیں سے اے مجاہدو !	خدام الدین (جہاد نمبر) ص ۵ ا تا ۱۷ ،	۱۹ نومبر
انور ، مولانا عبید اللہ	جہاد جاری رکھئے (خطبہ جمعہ)	〃 〃 ص ۳ تا ۵ + ۳۲	۹ نومبر

مسائل ومباحث

محمد سرور — تقریب بین المذاہب اسلامیہ — فکر و نظر، ص ۳۴۱ تا ۳۴۸ ، نومبر

معین الدین احمد ندوی، شاہ — مسلمانوں کا زوال اور اس کے اسباب — المنبر ص ۷ تا ۸ — ۲ر شعبان

مغنیہ، شیخ محمد جواد — اجتہاد — علمائے شیعہ کی نظر میں — فکر و نظر ص ۳۷۸ تا ۳۸۴ ، نومبر

مودودی، مولانا سید ابو الاعلی — مسلمانوں میں مذہبی اختلافات کی ابتداء اور اسکے اسباب — ترجمان القرآن، ص ۳۸ تا ۴۸ ، ″

مکاتیب

چشتی، مولانا عبدالحلیم — مرزا حسن علی اور شاہ عبدالعزیز کے دو مکتوب — الرحیم، ص ۳۷۲ تا ۳۹۱ ، اکتوبر نومبر

فاضل، مرتضیٰ حسین — گارساں دتاسی کا ایک نادر خط — صحیفہ، ص ۳۲ تا ۳۷ ، اکتوبر

وفیات

——— — مرزا البشیر الدین محمود — لاہور، ص ۳، ۴ ، ۱۵ نومبر

مطبوعات جدیدہ (نئی کتابوں اور رسالوں پر تبصرہ)

نام	مصنف	تبصرہ نگار	حوالہ
ادب اور اسلامی قدریں	اسرار احمد خاں سہاروی	—	فاران ص ۸۶ ، نومبر
اردو شاعری کا مزاج	ڈاکٹر وزیر آغا	سحر انصاری	افکار، ص ۱۶۴ تا ۱۶۵ ، اکتوبر نومبر
اقبال ریویو	جملہ اقبال اکاڈمی	سلیم اختر	ادبی دنیا ص ۱۰۱ تا ۱۰۲ نومبر
الٹ پھیر	شوکت تھانوی	ماہر القادری	فاران ص ۵۹ تا ۶۰ ″
الحق، ماہنامہ	دارالعلوم حقانیہ۔ اکوڑہ خٹک	نور محمد انور	خدام الدین ص ۱۱ ، ۲۴ نومبر
انوار السلام بجواب مصابیح الاسلام۔	ابو محمد امام الدین	ماہر القادری	فاران ص ۵۷ ، نومبر
اور شیروانی اندر پریشانی	ابراہیم جلیس	سین الف	الشجاع ص ۶۳ ، ″
باز آؤ اور زندہ رہو	حنیف رامے	ریاض احمد	سویرا، ص ۱۹۷ تا ۱۹۹
بہار آرزو	نسیم چغتائی	گوہر نوشاہی	صحیفہ، ص ۹۱ ، اکتوبر
جہاں گرد کی واپسی	ہومر مترجم محمد سلیم الرحمٰن	اعجاز احمد	سویرا، ص ۲۰۱ تا ۲۰۴

خوشحالی کی تلاش	برائن کروزیر، مترجم جلیس عابدی	گوہر نوشاہی	صحیفہ، ص ۹۱تا۹۲، اکتوبر
درد کا شہر	زاہد ڈار	محمد سلیم الرحمٰن	سویرا، ص ۲۰۰تا۲۰۱،
دلی سے دلی تک	سید ضمیر حسن	مرتضیٰ حسین فاضل	صحیفہ، ص ۸۹ تا ۹۰، ״
زمانہ عدالت نہیں (شعری مجموعہ)	مبارک احمد	انیس ناگی	ادبی دنیا، ص ۹۸ تا ۱۰۱، نومبر
سوانح حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکر	وحید احمد مسعود	نظر زیدی	ادبی دنیا، ص ۹۲ تا ۹۳، نومبر
سیرت فریدیہ	سرسید احمد خاں، مرتب: محمود احمد برکاتی	گوہر نوشاہی	صحیفہ، ص ۹۲ ، اکتوبر
شاخ طوبیٰ	آغا صادق	ماہر القادری	فاران، ص ۵۸ تا ۵۹، نومبر
عروج و زوال امت	امجد القادری	—	سیارہ، ص ۸۶ نومبر
فتوح البلدان	البلاذری، مترجم ابوالخیر مودودی	ماہر القادری	فاران، ص ۷۳ تا ۷۵، نومبر
فضائل صحابہ و اہل بیت	شاہ عبدالعزیز و شاہ رفیع الدین دہلوی	محمد علم الدین سالک	ادبی دنیا، ص ۸۹ تا ۹۱ نومبر
کشت زار غزل	عزیز حاصل پوری	عاصی کرنالی	״ ص ۹۳ تا ۹۷ ״
گلبانگ جہاد	طاہر شادانی، قمر صدیقی و دیگر حضرات	—	آئین، ص ۷ ، ۳۰ نومبر
مرحوم دلی کی ایک جھلک	شمیم احمد	مرتضیٰ حسین فاضل	صحیفہ، ص ۸۸ تا ۸۹، اکتوبر
مغرب کے عظیم فلسفی	عبدالرؤف ملک	آغا افتخار حسین	افکار (خاص نمبر) ص ۱۶۱ تا ۱۶۳، اکتوبر
نقطۂ نظر	عبدالمغنی	سحر انصاری	״ ״ ص ۱۶۵ اکتوبر
ینابیع التصوف	طالب صفوی	گوہر نوشاہی	صحیفہ، ص ۹۰ - اکتوبر

پی آئی اے کی انجینیئرنگ کا اعلیٰ معیار

دنیا کی ہر ایئرلائن اپنے ہوائی جہازوں کی اچھی طرح دیکھ بھال کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ موجودہ دور میں ہوائی سفر اس درجہ بے خطر ہے۔ پی آئی اے کے ورکشاپوں میں سائنسدانوں اور انجنیئروں کو ہوائی ساز و سامان جانچنے پرکھنے کی بہترین مشق دی جاتی ہے۔ اس کی بدولت پی آئی اے نے پچھلے پانچ سال میں اپنی پروازوں کی تاخیر کی شرح کو ۳۰ فیصد سے مزید گھٹا کر ۲۰ فیصد تک پہنچا دیا ہے۔ غرضیکہ نہ صرف پی آئی اے نے دیکھ بھال اور پابندیٔ اوقات کے بلند معیار قائم کئے ہیں بلکہ دنیا بھر کے مسافر بے ساختہ کہہ اٹھتے ہیں کہ پی آئی اے باکمال لوگ ہیں اور ان کی پرواز لاجواب ہے۔

پاکستان
انٹرنیشنل
ایئرلائنز

باکمال لوگ
لاجواب پرواز

PIA

چین - پاکستان - افغانستان - مشرقی وسطیٰ - روس - یورپ - برطانیہ

انجمن ترقی اردو پاکستان کا ماہوار ترجمان

قومی زبان

جلد ۲۸ شمارہ ۶

جون سنہ ۱۹۶۶ء

سالانہ قیمت
دس روپے

فی پرچہ
ایک روپیہ

انجمن ترقی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ
کراچی

فہرست

نیاز فتحپوری

حضرت نیاز کی وفات ایک بہت بڑا سانحہ ہے وہ ہمارے ادب کے ایک پورے عہد پر چھائے ہوتے ہیں اور گزشتہ نصف صدی کے تمام ادبی ادبی تحریکیں اُن سے کسی نہ کسی صورت میں متاثر ہوتی ہیں۔ اُن کی ہنگامہ پرور شخصیت نے جہاں ایک طرف بہت سی ادبی رسوم سے بغاوت کی، وہیں دوسری طرف بہت سی ایسی روایتوں کی بنا ڈالی جو اب اردو ادب کے مزاج کا حصہ بن چکی ہیں۔ یہی ہمہ گیری اور یہی ہمہ گیری نے اُنھیں ہمارے ادب کی ایک اہم ترین شخصیت بنا دیا۔ اور اسی خصوصیت کی بنا پر لوگ اُن سے قریب بھی ہوئے اور دُور بھی لیکن ان کی عظمت کا اعتراف سبھی نے کیا۔

نیاز تنہا روی کے خوگر تھے۔ وہ ہجوم کے ساتھ چلنے کے قائل نہ تھے۔ خواہ اس ہجوم میں اُنھیں قائد ہی کی حیثیت حاصل کیوں نہ ہو۔ اس تنہا روی نے انھیں بہت فائدے پہنچائے، اُن کے قلم کو بے باکی اور مزاج کو بے نیازی عطا کی۔ وہ مصلحتوں سے بے نیاز ہو کر اپنے خیالات کا اظہار کرتے، اظہار کے ردِ عمل اور نتیجے کی پروا انھوں نے کبھی نہ کی اور اسی شانِ بے نیازی کی وجہ سے انھوں نے اپنی راہ سب سے الگ نکالی۔

جہاں تک اُردو کی خدمت کا تعلق، بلا شبہ ان کا شمار محسنینِ اُردو میں ہوتا ہے۔ "نگار" کے ذریعے انھوں نے اس زبان کا پیغام گھر گھر پہنچایا اور اِس طرح اردو کی ترویج واشاعت میں انھوں نے جو حصہ لیا وہ کسی بھی بڑے سے بڑے ادارے کی خدمات سے کم نہیں ہے۔

نیاز نے بے شمار ادبی اور سماجی موضوعات پر قلم اٹھایا۔ اُن کا ادبی سرمایہ ہزارہا صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ ممکن ہے اُن کے ادبی وسماجی نظریات آئندہ چل کر "تقویم پارینہ" بن جائیں، لیکن اپنے بانکے اور پیارے اسلوب کی بنا پر نیاز کی تمام تحریریں ہمیشہ دلچسپی سے پڑھی جائیں گی۔ ایک صاحبِ طرز انشا پرداز کی حیثیت سے نیاز کسی نقاد یا ادبی مورخ کی ہمدردی کے محتاج نہیں ہیں، بے رحم سے بے رحم نقاد اور متعصب سے متعصب ادبی مورخ بھی صاحبِ طرزِ انشا پرداز نیاز کے حضور خراجِ عقیدت پیش کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

نیاز نے ایک طویل زندگی پائی، یہ زندگی انھوں نے اس طرح گزاری جیسے کوئی میدانِ کارزار میں سینہ سپر ہو
وہ [illegible]

ہمیشہ فتح و شکست کے خیال سے بالاتر رہ کر معرکہ آرائیوں میں حصہ لیا۔ اُن کی آخری معرکہ آرائی موت سے ہوئی، وہ تقریباً ایک سال موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہے۔ اس دوران میں اُن پر بڑے بڑے نازک لمحے آئے، لیکن کسی وقت بھی انھوں نے کم ہمتی کا مظاہرہ نہ کیا، آخر وقت تک وہ نہایت صبر و تحمل سے موت کا مقابلہ کرتے رہے۔ ان کا جسم دیر تک اُن کا ساتھ نہ دے سکا، لیکن دماغ آخری لمحے تک اپنا کام کرتا رہا۔ نیاز نے موت سے ہار تو مانی، لیکن یہ بھی ثابت کر دیا کہ وُہ آسانی سے شکست ماننے والوں میں نہیں۔

نیاز ہم سے جُدا ہو چکے ہیں، لیکن وہ اُس وقت تک زندہ رہیں گے جب تک اُردو زبان زندہ ہے۔

قطعہ تاریخ وفات حضرت نیاز فتحپوری

رئیس امروہوی

بدیعہ نگار و کرشمہ طراز — نگارِ دبستانِ اُردو "نیاز"
وہ سرمایۂ نازِ اربابِ فن — بہ اسلوبِ تازہ۔ بہ طرزِ کہن
ادیب گراں مایۂ و سحر کار — نگارِ ادارت۔ مدیرِ نگار
وہ صدر بساطِ سخن گستری — وہ علامۂ فن دانش وری
وہ طباع۔ اے طبع نکتہ نواز! — وہ طنّاز۔ انشا کو خود جس پہ ناز
وہ باقی رہے گا وہ فانی نہ تھا — ادب میں کوئی اسکا ثانی نہ تھا
ہوا رتبۂ وصل سے سرفراز — رئیسؔ آہ ہجرِ جنابِ نیاز

رقم کر قلم اے قلم اے قلم
"نیازِ نگارِ بہشتِ رقم"
۱۳۸۶ھ

جناب اختر حسین
صدر انجمن ترقی اردو

جامعہ عثمانیہ کی خدمات

خواتین و حضرات[1]

میں انجمن طلبائے قدیم جامعہ عثمانیہ کا ممنون ہوں جس کی وجہ سے مجھے اس ادبی محفل میں شرکت کا موقع ملا ہے۔ اس قسم کی ادبی محفلیں، صحت مند ادبی فضا کے لئے بہت مفید ثابت ہوتی ہیں، مجھے توقع ہے کہ یہ انجمن آئندہ بھی اس قسم کی محفلیں منعقد کرتی رہے گی۔

آپ کی انجمن کا تعلق ایک ایسی جامعہ سے ہے جو اردو زبان کی تاریخ میں ایک درخشاں باب کی حیثیت رکھتی ہے جامعہ عثمانیہ نے علوم و فنون کے تمام شعبوں میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنا کر برصغیر ہند و پاکستان کے تعلیمی ماحول میں جو شاندار تجربہ کیا، اس کی کوئی دوسری مثال موجود نہیں ہے۔ وہ لوگ جو اردو کو ذریعہ تعلیم بننے کا اہل نہیں سمجھتے تھے، اس جامعہ کے قیام سے انہیں اچھی طرح معلوم ہوگیا کہ یہ زبان ہر اعتبار سے ذریعہ تعلیم بننے کے قابل ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے ساتھ ساتھ اس کے دارالترجمہ نے بھی اردو کی بیش بہا خدمت کی ہے۔ اس ادارے نے بلند پایہ علمی و فنی کتابیں سینکڑوں کی تعداد میں اردو میں منتقل کیں اور آج جو اس زبان میں ہمیں علمی بیداری کے آثار نظر آتے ہیں انہیں اس دارالترجمے کا فیضان سمجھنا چاہیئے۔
بھارتی حکومت نے آزاد ہونے کے بعد سب سے پہلے جامعہ عثمانیہ ہی کو اپنے تعصب کا نشانہ بنایا اور اردو کے ذریعہ تعلیم ہونے کی قید اٹھا دی اس اقدام سے اردو کو یقیناً ایک بہت بڑا نقصان پہنچا۔ جس طرح عثمانیہ کا قیام اردو کی تاریخ کا ایک خوشگوار پہلو تھا اسی طرح بھارتی حکومت کے اقدام کو ایک المناک واقعہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس قسم کے حادثے ایک زندہ زبان کے راستے میں رکاوٹ پیدا نہیں کر سکتے، جامعہ عثمانیہ اگرچہ ہم سے چھن چکی ہے لیکن اس درسگاہ کے تربیت یافتہ اہل علم ہزاروں کی تعداد میں آج بھی ہمارے درمیان موجود ہیں اور یہ ان کا فرض ہے کہ وہ اس مشعل کو زندہ رکھیں جو اُن کی مادر علمی نے روشن کی تھی۔

خوش قسمتی سے کراچی میں جامعہ عثمانیہ کی روایات کو انجمن ترقی اردو نے اردو کالج کے ذریعے قائم رکھا ہے، جیسا کہ

---

[1] [illegible] اپریل [illegible] کو انجمن طلبائے قدیم جامعہ عثمانیہ کے زیر اہتمام ایک ادبی محفل منعقد ہوئی جس میں جناب سبط حسن نے اپنے قیام حیدرآباد کے بارے میں ایک مقالہ پڑھا جناب اختر حسین نے اس تقریب کی صدارت کی۔ ان کا خطبہ صدارت شائع کیا جاتا ہے۔

آپ حضرات کو معلوم ہے یہ کالج گزشتہ سترہ سال سے قائم ہے اور اس میں تمام علوم و فنون کی تعلیم اردو کے ذریعے دی جاتی ہے ۔ اب اس کے لئے بیس ایکڑ زمین حاصل کی ہے جس پر نئی عمارت تعمیر کی جائے گی ۔ اقامتی اردو کالج کے قیام کے بعد پاکستان کے تمام علاقوں کے طالب علم اس درس گاہ سے استفادہ کر سکیں گے ۔ میں آپ حضرات سے توقع رکھتا ہوں کہ آپ اس سلسلے میری انجمن کا ہاتھ بٹائیں گے کیونکہ آپ کی انجمن کا مقصد بھی اردو زبان کی ترویج و اشاعت ہے ۔

آج کی ادبی محفل میں جناب سبط حسن صاحب حیدرآباد میں اپنے قیام سے متعلق تاثرات پیش کریں گے ، امید ہے کہ ان کے یہ تاثرات سبق آموز بھی ہوں اور مفید بھی ۔ کیونکہ اب حیدرآباد ہمارے ماضی کا ایک حصہ ہے اور ماضی کی باتوں میں بڑی دلکشی ہوتی ہے ۔ سبط حسن صاحب کہنہ مشق صحافی اور ادیب ہیں ، یقیناً وہ جو کچھ کہیں گے وہ ان کے دل کی آواز ہو گی ۔

آخر میں ایک مرتبہ میں پھر آپ حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور توقع کرتا ہوں کہ آپ کی یہ انجمن اردو زبان کی ترقی کے لئے زیادہ سے زیادہ کام کرے گی ۔

خود نوشت سوانح عمری کا ایک باب[1]

لام محمد طور اور نیازؔ فتح پوری

مسٹر غلام محمد طور، ایم۔ اے (پنجاب) کے بڑے ہونہار شاعر تھے۔ زندہ رہتے تو علامہ اقبالؔ کے بعد
البًا ان ہی کا نام چمکتا۔ پنجاب کے کسی کالج میں پروفیسر بھی تھے۔ ان کی شادی دلی میں مولانا ناصر جلالی کی
اموں زاد بہن سے ہوئی تھی۔ سسرال آتے تھے تو مجھ سے ضرور ملتے تھے۔

مولانا نیازؔ فتح پوری کی شہرت کا آغاز تھا۔ ۱۹۱۲ء میں خواجہ حسن نظامی انھیں میرے پاس لائے اور بتایا کہ
ھیں میں نے اخبار توحید کے کام میں اپنا مددگار بنایا ہے۔ توحید ہفتہ وار اخبار تھا۔ میرٹھ سے بھیا احسان الحق
ائع کرتے تھے۔ خواجہ صاحب اس کے اڈیٹر تھے۔

۱۹۱۶ء میں نیاز صاحب حکیم اجمل خاں کو انگریزی پڑھانے تشریف لائے اور میرے ہاں ٹھہرے۔ میرا
فت روزہ خطیب جاری تھا۔ نیاز صاحب خطیب کے لئے مضامین بھی لکھتے تھے۔

نیازؔ صاحب کم آمیز آدمی ہیں، ہر کس و ناکس کو خاطر میں نہیں لاتے۔ لیکن جس سے کھل جاتے ہیں، اس کے
ق میں باغ و بہار بن جاتے ہیں۔ ان کی مجلس خالص ادبی مجلس ہوتی تھی۔ منشی محمد الدین خلیقی، مولانا عارف ہسوی،
ید ظفر احسن علوی، اور حکیم مجیب الدین بقائی ان کے ساتھ جمع ہو جاتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے گھر کے
ن میں مہکتے پھول کھل گئے۔

نیازؔ صاحب کے ذریعے مندرجہ بالا چار آدمیوں سے ۱۹۱۶ء میں نیاز حاصل ہوا تھا۔ ۱۹۱۹ء میں نیاز صاحب
میں نے روزنامہ رعیت کی ادارت سپرد کی۔ نیازؔ صاحب بھوپال میں تھے وہاں سے بلایا۔ ۱۹۱۹ء میں ان کے طفیل
لانا عبد الماجد دریابادی، ڈاکٹر ذاکر حسین، مسٹر عبد الرؤف، مسٹر نور الرحمٰن اور مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کو دیکھا۔
مولانا دریابادی سینٹ اسٹیفنز مشن کالج دلی میں ایم۔ اے کا داخلہ لینے کے خیال سے آئے تھے۔ ذاکر صاحب

---

[1] دوسری اور آخری قسط

عبدالرؤف اور نورالرحمٰن علی گڑھ کالج میں پڑھ رہے تھے اور نیازؔ صاحب کے ادبی معتقد تھے۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو اخبار نویسی کا نیا نیا شوق ہوا تھا۔ وہ نیازؔ صاحب سے اخبار نویسی سیکھتے تھے اور روزنامہ رعیت کی بغیر معاوضے کے مدد کرتے تھے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین، نائب صدر جمہوریہ ہند اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، امیر جماعت اسلامی سے ساری دنیا آشنا ہے۔ عبدالرؤف ڈپٹی کلکٹر ہو گئے تھے۔ اب معلوم نہیں کہاں ہیں۔ نورالرحمٰن کا انشورنس سے تعلق ہے۔ مشرقی پاکستان میں ہیں۔ ایک دفعہ خط آیا تھا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین دلی میں برابر ملتے رہے۔ جس دن ہم نے دلی کو خیرباد کہا ہے اس سے ہفتہ بھر قبل تک تشریف لائے تھے۔

روزنامہ رعیت نے زیادہ عمر نہیں پائی۔ دو مہینے سردار دیوان سنگھ مفتوں کی ملکیت رہا اور خواجہ حسن نظامی کی زیرادارت، اور تین مہینے میری اور بھیا احسان الحق کی ملکیت اور مولانا نیاز فتحپوری کی زیرادارت۔ سردار دیوان سنگھ ہمارے دور میں بھی "رعیت" کے منیجر تھے اور بھیا احسان الحق سلیپنگ پارٹنر (SLEEPING PARTNER) رعیت بند ہو گیا تو نیاز صاحب پھر بھوپال چلے گئے۔ وہاں سے لکھنؤ پہنچے۔ لکھنؤ سے ماہنامہ "نگار" نکالا۔ اب کراچی میں ہیں اور نگار کراچی سے نکلتا ہے۔ ہمت کے آدمی ہیں۔ اسّی سے اوپر عمر ہے۔ حال میں کینسر کا آپریشن کرایا ہے۔ لیکن لکھنا پڑھنا نہیں چھوڑا۔ لکھنے پڑھنے کا مرض کینسر کے مرض پر غالب ہے۔

حاجی ریاض الدین بریلوی اور مولوی حسن الدین خاموشؔ:

حاجی ریاض الدین بریلوی اور مولوی حسن الدین خاموش اپنے زمانے کے ممتاز صحافی تھے۔ حاجی ریاض الدین کی عمر ۱۹۱۹ء میں ستّر پچھتّر سے اوپر تھی اور ایسی ہی عمر مولوی حسن الدین خاموش کی ہوگی۔ اب ان دونوں کے جاننے والے بھی دنیا میں تھوڑے ہیں۔ حاجی ریاض الدین نے خدا جانے کس کس اخبار کی ایڈیٹری اور سب ایڈیٹری کی تھی۔ آخری سب ایڈیٹر وہ ۱۹۱۹ء میں میرے روزنامہ "رعیت" کے تھے۔ اور مولانا نیاز فتحپوری کی طرح میرے ساتھ رہے تھے صحافی اتنے مسکین اور سیدھے عموماً نہیں ہوتے۔ جتنے حاجی ریاض الدین تھے۔

مولوی حسن الدین خاموش میں حاجی صاحب کی نسبت زندگی باقی تھی۔ لیکن اللہ سے ڈرنے والے آدمی تھے صرف نماز روزے ہی کے پابند نہیں۔ دین کی تمام باتوں پر عمل کرنے والے ایک چھوٹا سا واقعہ لکھتا ہوں۔ اس سے ان کا اندازہ لگاؤ۔

جس زمانے میں خاموش صاحب میرے ہاں اور خواجہ حسن نظامی کے ہاں بہت تشریف لایا کرتے تھے، اس [illegible] ۱۹۲۴ء سے پہلے ایک دفعہ فہیم صاحب

خاموش صاحب سے ملنے گئے۔ خاموش صاحب نے ریاست بھوپال کے کسی گاؤں میں اپنے نئے مکان تعمیر کرایا تھا، نعیم صاحب وہاں پہنچے آواز دی۔ آٹھ دس برس کا بچہ باہر نکلا اور بولا دادا ابا بھوپال گئے ہوئے ہیں۔ پرسوں چار بجے انشاءاللہ واپس آجائیں گے۔ نعیم صاحب نے کہا "میں دوبارہ پھیرا کر تو سکتا ہوں، لیکن پھیرا پھر کہیں خالی نہ جائے، تم ان کا بھوپال کا پتہ بتا دو۔ بھوپال میں ڈھونڈ لوں گا۔ بھوپال سے یہاں تک کا سفر کرنا مشکل ہے" بچے نے کہا "بھوپال کا پتہ بڑا آدمی بتا سکتا ہے۔ بڑا گھر میں اس وقت کوئی نہیں ہے۔ آپ اطمینان رکھئے، دادا ابا جھوٹ نہیں بولتے۔ پرسوں چار بجے ضرور آجائیں گے"۔ "دادا ابا جھوٹ نہیں بولتے" یہ فقرہ انھیں اور ان کے گھر کے ماحول کو سمجھنے کے لئے کافی ہے۔

ماسٹر احمد حسین فرید آبادی اور ڈاکٹر سعید احمد بریلوی:

ماسٹر احمد حسین فرید آبادی کا تذکرہ مجھے پہلے کرنا چاہیئے تھا۔ ۱۹۱۳ء میں وہ میرے ہفت روزہ طبیب کے ایڈیٹر تھے۔ طبیب کو حکیم احمد حسین الہ آبادی ایڈٹ کرنے والے تھے۔ حکیم اجمل خاں نے ان سے طے کر لیا تھا۔ مگر انھیں خدا جانے کیا ہوا کہ طے کر کے نہیں آئے۔ میں نے حکیم اجمل خاں کی اجازت سے حکیم احمد حسین کے ہم نام ماسٹر احمد حسین کو لگا لیا۔ ماسٹر صاحب اخبار وکیل امرتسر کے ایڈیٹر رہے تھے۔ انھیں اڈیٹری کا تجربہ تھا۔ طبیب طبی پرچہ نہیں تھا، طبی کانفرنس کا آرگن تھا۔ اسے ماسٹر صاحب نے کامیابی سے ایڈٹ کیا۔

ماسٹر احمد حسین احمدی تھے۔ مرزا غلام احمد قادیانی کے عاشق۔ جب کام کا وقت گزر جاتا تھا ماسٹر احمد حسین مجھے احمدی ہو جانے کی ترغیب دیا کرتے تھے۔ میں نے ایک دن کہا "ماسٹر صاحب! میں خواجہ حسن نظامی کا مرید نہ ہو گیا ہوتا تو آپ کا مرید ہو جاتا۔ مگر مرزا غلام احمد کی طرف میری طبیعت نہیں کھنچتی"۔ ماسٹر صاحب بے حد نیک انسان تھے۔

ڈاکٹر سعید احمد بریلوی مولانا محمد علی کے روزنامہ ہمدرد کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں تھے۔ میرے مکان کے برابر ان کا مکان تھا۔ میرے ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب مطب بھی کرتے تھے، لیکن رجحان طبع شاعری، ادب اور صحافت کی طرف تھا۔ حاجی ریاض الدین بریلوی مولوی حسن الدین خاموش اور ماسٹر احمد حسین کی طرح مقدس قسم کے صحافی تھے۔

مولانا محمد علی جوہر:

مولانا محمد علی سے تعارف لکھنؤ میں، مولوی عزیز مرزا، آل انڈیا مسلم لیگ کے سکریٹری اول کے ہاں ہو چکا تھا۔ ۱۹۱۲ء سے مولانا دلّی میں رہنے لگے تو ملاقاتوں کے مواقع بھی میسّر آئے۔ لیکن قابل ذکر تعلق عرصے کے بعد ہوا۔ پھر تو عنایتوں کی انتہا نہ رہی۔ میں ان کے ہاں اکثر جاتا تھا۔ اور وہ ہر جمعہ کو جامع مسجد سے سیدھے

میرے ہاں تشریف لاتے تھے، اور عصر اور مغرب کی نمازیں میرے ساتھ پڑھتے تھے اور چونکہ ذیابیطس کا مرض تھا پرہیزی کھانا اپنے گھر سے منگاتے تھے اور میرے دسترخوان پر رکھ کر کھاتے تھے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کو مجھ پر مہربان مولانا محمد علی ہی نے کیا تھا۔

مولانا محمد علی اور خواجہ حسن نظامی کا جھگڑا اٹھا تو مولانا محمد علی مجھ سے بھی خفا ہو گئے۔ مولانا محمد علی نے مولانا راشد الخیری سے شکایت کی کہ مجھے توقع تھی داعدی حق کا ساتھ دے گا۔ میں نے مولانا راشد الخیری ہی کی معرفت جواب بھیجا کہ "خواجہ صاحب اور آپ مجھ سے صرف دس دس اور بارہ بارہ برس بڑے ہیں۔ لیکن میں خواجہ صاحب کو مثل باپ کے اور آپ کو مثل چچا کے خیال کرتا ہوں۔ میرا فرض یہ تھا کہ باپ اور چچا کی لڑائی نہ ہونے دوں۔ یہ فرض میں نے ادا نہ کیا۔" خواجہ صاحب میرا کہنا مان لیتے تو مجھے یقین تھا کہ آپ میری گواہی کا یقین کریں گے اور میری بات مان جائیں گے۔ مگر تقدیر کا لکھا مٹ نہیں سکتا۔ اب باپ اور چچا لڑ رہے ہیں مجھے یہ زیب نہیں دیتا کہ اب کسی کا ساتھ دوں۔ میں خواجہ صاحب کا بھی ساتھ نہیں دے رہا۔ اس قدر بے تعلق ہوں کہ اس قصے کو اخباروں میں پڑھتا تک نہیں۔" میرے جواب کے بعد بھی مولانا محمد علی غالباً مطمئن نہیں ہوئے۔ خفگی قائم رہی۔

مولانا عبدالماجد دریابادی:۔

مولانا عبدالماجد دریابادی مجھے جانتے تھے، اور میں مولانا عبدالماجد دریابادی کو جانتا تھا۔ ہم دونوں نیاز فتحپوری کے ذریعے بھی مل چکے تھے اور خواجہ حسن نظامی کے ذریعے بھی۔ لیکن تعلقات میرے اور ان کے مولانا محمد علی کی وجہ سے استوار ہوئے اور بڑھے۔ مولانا محمد علی سنہ نامہ "ہمدرد" کے معاملات میں مولانا دریابادی سے مشورے لیا کرتے تھے۔ مولانا دریابادی مہینے کے مہینے دلّی آتے تھے اور میرے ہاں بھی تشریف لاتے تھے۔ اس وقت سے انھیں میرے ساتھ اور مجھے ان کے ساتھ اخلاص ہے۔ اٹھارہ برس کی مفارقت کے باوجود خلاص میں کمی نہیں ہوئی ہے۔

مولانا دریابادی دینی اور دنیاوی علوم سے مالا مال ہیں۔ اور دنیاوی علوم سے بھی دین کی خدمت کر رہے ہیں صرف زبان اور قلم ہی ان کے دین دار نہیں ہیں عمل میں بھی کامل دین داری ہے۔ اللہ تعالےٰ ان کے صدقے میں میرا بھی انجام بخیر کرے۔

اکبرالہ آبادی:۔

خان بہادر سید اکبر حسین اکبرالہ آبادی کی اور خواجہ حسن نظامی کی بڑی یاد اللہ تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے مسلسل خط کتابت کرتے تھے۔ میں بھی گاہے گاہے خط لکھ دیتا تھا۔ ۱۹۱۲ء میں میری پہلی شادی کے موقع پر خواجہ صاحب

نے حضرت اکبر کو بھی دعوت نامہ بھیجا تھا اور ان دو مصرعوں میں مبارک باد آئی تھی ۔ "

واحدی کو دولی مبارک ہو یعنی شادی ہوئی مبارک ہو

میں نے دیکھا حضرت اکبر کو فقط ایک مرتبہ ، اور ایک دو دن وہ میرے ہاں مہمان رہے ۔ البتہ حضرت اکبر کے چھوٹے بیٹے سید ہاشم پہلے آ چکے تھے اور کافی دن میرے ہاں ٹھہرے تھے ۔ حضرت اکبر ہاشم کے انتقال کے بعد تشریف لائے ۔ اور خواجہ صاحب کے ہاں مہینہ سوا مہینہ رہے ۔ ارادہ واپس جانے کا نہیں تھا ۔ درگاہ سلطان نظام الدین اولیا رحمت اللہ علیہ میں دفن ہونے کا تھا ۔ لیکن اتفاق سے خواجہ صاحب کی بیٹی حور بانو کی شادی اسی زمانے میں ٹھہر گئی ۔ حضرت اکبر حور بانو کو ہاشم سے بیاہنے کی نیت رکھتے تھے ۔ حور بانو کی شادی ٹھہرنے سے ہاشم کی یاد ستانے لگی اور وہ یہ کہہ کر الہ آباد چلے گئے کہ " میں شادی کا منظر برداشت نہیں کرسکوں گا ۔ شادی ہو جائے تو پھر آ جاؤں گا ۔ " مگر موت نے دوبارہ آنے نہیں دیا ۔ خواجہ صاحب موت کے وقت الہ آباد پہنچ گئے تھے ۔ خواجہ صاحب کی گود میں حضرت اکبر نے جان جان آفریں کو سپرد کی تھی ۔

جس طرح علامہ اقبال کی شاعری کا جواب نہیں ہے اسی طرح حضرت اکبر کی شاعری بھی بے نظیر ہے ۔ آج جو ہو رہا ہے اسے حضرت اکبر پون صدی پہلے لکھ چکے ہیں ۔

" نظام المشائخ " میں علامہ اقبال کا کلام بہت چھپا کرتا تھا ۔ " مخزن " کے بعد ان کا کلام " نظام المشائخ " ہی کے لئے وقف تھا ۔ لیکن حضرت اکبر کا کلام " نظام المشائخ " میں اتنا چھپا کہ " کلیات اکبر " میں ایک عنوان ہے ـــــ " نظام المشائخ " کے لئے " ۔

سردار دیوان سنگھ مفتوں :

سردار دیوان سنگھ مفتوں بھی " نظام المشائخ " اور خواجہ حسن نظامی ہی کے ذریعے ملے ہیں ۔ اگرچہ آخر میں سردار صاحب اور خواجہ صاحب کی بگڑ گئی تھی لیکن سردار صاحب نے مجھ سے تعلق ترک نہیں کیا تھا اور میں نے بھی وضع کو نہیں بدلا تھا ۔ اور خواجہ صاحب اس میں کبھی مزاحم نہیں ہوئے ۔ کراچی آنے کے بعد میری ان کی خط کتابت ہوتی ہے ۔

سردار صاحب جس کے دوست ہیں ۔ اس پر اپنا سب کچھ نثار کرنے کو تیار رہتے ہیں اور جس کے دشمن ہو جاتے ہیں اس کے بری طرح پیچھے پڑتے ہیں ۔

سردار صاحب کا ہفت روزہ ریاست بڑا شاندار اور زور دار پرچہ تھا ۔ بحیثیت اخبار نویس سردار صاحب کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا ۔

" نظام المشائخ " نے مجھے کن کن کی ملاقات کا شرف بخشا ، یہ میں لکھ سکتا تھا ۔ " نظام المشائخ " نے کیا خدمت

اردو کے سپاہی

شمیم احمد

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی

تعلیم اور وہ زبان جس میں تعلیم دی جا رہی ہے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ زبان نہ صرف افہام و تفہیم کا ذریعہ ہے بلکہ وہ تعلیم کو طالب علم کی ذات کا ایک حصہ بناتی ہے۔ اس لئے تعلیم کی ہر سطح پر وہ ذریعۂ اظہار نہایت اہم ہو جاتا ہے جس سے معلم اور طالب علم دونوں کام بھی لیتے ہیں اور ایک دوسرے کے خیال اور شخصیت سے ربط بھی پیدا کرتے ہیں۔ ہمارے ناقص نظام تعلیم کی وجہ سے معلم اور طالب علم کے درمیان یہ رابطہ ٹوٹ گیا ہے جس کی وجہ سے معلم کی بات طالب علم کے دل تک نہیں پہنچتی اور طالب علم معلم سے وہ استفادہ نہیں کر سکتا جس کی ضرورت اور اہمیت کا نام لے کر تعلیم کا آغاز کیا جاتا ہے۔"

جامعۂ کراچی کے شیخ، مشہور ماہر تعلیم اور ادیب جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی جب اتنی بات کہہ چکے تو میں نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا کہ ڈاکٹر صاحب عہد غلامی میں جب ذریعۂ تعلیم انگریزی زبان تھا اس وقت معیار تعلیم موجودہ معیار سے بلند تر تھا۔ اگر زبان کو آپ سب سے بنیادی مسئلہ قرار دے رہے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ قومی زبان کے اختیار کرنے کے بعد معیار تعلیم کو پست ہونے سے نہیں روکا جا سکتا اور وہ برابر گر رہا ہے؟ ڈاکٹر صاحب نے جو بہت توجہ سے میری بات سن رہے تھے نہایت مدھم آواز میں جواب دیا: "آپ نے اس سوال میں بہت سی چیزوں کو گڈمڈ کر دیا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ بات اس وقت نہیں کہی جا سکتی کہ ہم نے قومی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنا لیا ہے۔ کسی بات کی خواہش، کسی فیصلے اور عمل کے درمیان کچھ وقت لگتا ہے۔ لہٰذا ہم یہ ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ ہم نے اپنی زبان کو واقعی عملاً ذریعۂ اظہار بنا لیا ہے کیونکہ اس کی افادیت اس وقت تک ظاہر نہیں ہو سکتی جب تک وہ پورے ملک میں یکساں طور پر رائج نہ کر دی جائے۔ جب کہ حال یہ ہے کہ مغربی پاکستان میں کالجوں، اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں زیادہ تر ذریعۂ تعلیم انگریزی ہی ہے اور بعض مضامین اردو میں پڑھانے سے اس مسئلہ کی اصل افادیت حاصل بھی نہیں کی جا سکتی۔ دوسرے قومی زبانوں کو اس وقت تک مؤثر ذریعۂ تعلیم نہیں بنایا جا سکتا جب تک طالب علموں کو اس خوف سے نجات نہیں مل جائے گی کہ جب وہ اعلیٰ ملازمتوں کے حصول میں کوشاں ہوں گے تو وہاں بجائے اردو اور بنگالی کے انہیں انگریزی زبان میں اپنی لیاقت اور صلاحیت کا ثبوت دینا ہوگا۔"

ڈاکٹر صاحب کی آواز میں ایک گداز سا معلوم ہو رہا تھا جو افسردگی اور مایوسی کا تاثر دے رہا تھا۔ انہوں نے میرے سوال کی ایک اور الجھن کو واضح کرتے ہوئے فرمایا: "آپ نے معیار تعلیم کی پستی کو صرف نظام تعلیم کے موازنے سے ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے جب کہ آپ کو یہ اچھی طرح معلوم ہوگا کہ ہمارے بزرگوں نے انگریزی انگریزوں سے پڑھی تھی۔ خود میں نے انگریز استاد سے انگریزی پڑھی تھی۔ لہٰذا ان استادوں نے اپنی مادری زبان اور قومی زبان کو اپنے طالب علموں کے لئے ایک ایسی مفید اور ذاتی دلچسپی کا نمونہ بنایا کہ ان کے شاگرد اگر اہل زبان نہیں تو زبان داں ضرور بن گئے تھے۔ لیکن جب یہ عنصر آہستہ آہستہ آزادی کی تحریکات سے خارج ہوا تو ان انگریزوں کے شاگردوں نے بھی اپنے شاگردوں کو انگریزی کے بارے میں اتنا کچھ دیا کہ وہ صحیح جملہ لکھ یا بول سکیں لیکن اس کے بعد جو نسلیں پیدا ہوئیں وہ یکے بعد دیگرے اپنی پچھلی نسل کے مقابلے پر انگریزی کے مزاج اور اس پر قدرت سے دور ہوتی گئیں چنانچہ آج جو حضرات کالجوں اور اسکولوں میں انگریزی پڑھاتے ہیں، اول تو ان ہی کے بارے میں یہ شکوک ہے کہ وہ اس زبان کو واقعی جانتے بھی ہیں یا نہیں۔ چہ جائیکہ وہ اس ناقص ذریعۂ اظہار سے دوسرے مضامین کی تدریس کا کام بھی لیں۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ سوائے یاد کر لے رٹنے اور نوٹس کے ذریعے امتحان پاس کرنے اور کرادینے کے علاوہ اس وقت ہمارے یہاں کچھ نہیں ہو رہا ہے۔ اپنی قومی زبان ان کو اس لئے زیادہ بہتر مواقع فراہم نہیں کر رہی ہے کہ ابھی انگریزی اصل حکمراں ہے اور قومی زبان احساس کمتری کی علامت بنی ہوئی ہے۔" ڈاکٹر صاحب نے یہ بات اتنے موثر پیرائے میں کہی کہ میرا ذہن ایک بڑی الجھن سے نجات پا گیا اور مجھے مولانا صلاح الدین مرحوم کا وہ تجزیہ یاد آگیا جو انہوں نے کراچی یونیورسٹی اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے بارے میں ایک انٹرویو کے درمیان کیا تھا۔ میں نے مولانا سے کراچی یونیورسٹی کے اس فیصلے کے متعلق تاثرات ظاہر کرنے کے لئے عرض کیا تھا جو ذریعۂ تعلیم کے بارے میں مولانا کی زندگی میں ہی سامنے آگیا تھا۔ مولانا نے کہا تھا: "یقین کیجئے مجھے کراچی یونیورسٹی کے اس فیصلے پر بے حد حیرت ہوئی ہے کیونکہ میرے اندازے کے مطابق کراچی یونیورسٹی وہ آخری یونیورسٹی تھی جہاں ذریعۂ تعلیم سب سے آخر میں بدلے گا۔ کیونکہ کراچی میں اس بات کو نظر انداز کرنے کے کئی بہانے بہت قوی تھے۔ ایک تو یہ شہر مختلف نسلوں کی آبادی پر مشتمل ہے۔ دوسرے اس کی کاسموپولیٹن حیثیت بھی ہے، عیسائی، غیر ملکی طالب علم اور خاندان اور بیرونی ممالک کے سفارت خانوں کے عملوں کے خاندان وغیرہ اس لئے میں سوچ رہا تھا کہ سب سے پہلے پنجاب یونیورسٹی یہ قدم اٹھائے گی پھر پشاور یونیورسٹی اور آخر میں مجبوراً کراچی یونیورسٹی بھی۔ مگر یہاں تو نقشہ بالکل الٹ گیا ہے جس کا سہرا میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے سر باندھتا ہوں جن کی ذاتی مساعی اور دلچسپی سے یہ کارنامہ ظہور میں آیا ہے"۔ مولانا نے یہ بھی کہا تھا کہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ایک نڈر انسان ہیں اور وہ حق بات کہنے میں کبھی پس و پیش نہیں کرتے۔ مجھے نہیں معلوم مولانا کا یہ تجزیہ کہاں تک درست ہے مگر مجھے ذاتی طور پر اس کی صداقت کا اس وقت احساس ہوا تھا جب کراچی گرامر اسکول کی سالانہ تقریب انعامات میں انہوں نے صدارتی تقریر فرمائی تھی (کراچی گرامر اسکول یورپین طرز کا ایک نہایت اعلیٰ تعلیم کا ادارہ ہے) اس تقریر میں ڈاکٹر قریشی نے گرامر اسکول کے بانیوں کو خطاب کر کے کہا تھا کہ آپ ایک ایسی نسل پیدا کر رہے ہیں

جس کا تعلق پاکستانی عوام اور اس قوم کی اکثریت سے نہیں ہے۔ وہ خود کو اس قوم کا فرد نہیں بلکہ حاکم سمجھ کر باہر کرتے ہیں اور ساری زندگی شدید ترین ذہنی انتشار اور نفسیاتی الجھنوں کا شکار رہتے ہیں۔ وہ اپنے ماضی کے سرمائے سے ناواقف ہوتے ہیں اور قومی آثار کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کی نظریں سوئے کوفہ و بغداد نہیں بلکہ سوئے لندن و پیرس رہتی ہیں" مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ اس تقریر کا گرامر اسکول کے منتظمین پر کتنا شدید ردِعمل ہوا تھا۔

تو جیر ذکر اس وقت اس انگریزی کا ہے جو ڈاکٹر صاحب مجھ سے فرما رہے تھے "تعلیم خیالات و افکار کو حاصل کرنے کا نام ہے زبان سیکھنے کا نہیں۔ طالب علموں اپنی تعلیم سے جو بے شوقی پیدا ہو رہی ہے اس میں ایک تو یہ سبب کام کر رہا ہے کہ ہمارا موجودہ معاشرہ تعلیم کو علم حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں بلکہ نوکری حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ اور دوسرے اُن تک خیالات و افکار کی درخشانی پہنچتی ہی نہیں وہ تو صرف تقلید اور نقل کو اصل سمجھنے لگے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ انگریزی نے اس پورے نظام کو اندر سے چاٹ کر کھوکھلا کر دیا ہے" ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ مجھے انگریزی سے کوئی کد نہیں اگر وہ واقعی ہمارے لئے مفید ہوتی تو یقیناً پچھلے ڈیڑھ سو سال میں ہمارے یہاں انگریزی کے دو چار ادیب اور لکھنے والے ضرور پیدا ہو جاتے یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ کوئی غیر ملکی زبان تخلیقی جوہر کو نکھارنا تو درکنار اس کو اور مرجھا دیتی ہے۔ انگریزی پر عبور نہ ہونا اور اس میں نہ لکھ سکنے کی وجہ سے ہمارے یہاں کے ذہین افراد میں ایسا احساس کمتری پیدا ہو جاتا ہے جو انہیں ملکی زبان میں بھی کچھ کرنے سے باز رکھتا ہے۔ لہٰذا میرا خیال ہے کہ ہمارے طالب علموں کی ذہنی پرورش اس وقت تک ممکن نہیں جب تک وہ ان امراض سے نجات نہ پائیں گے"

ڈاکٹر صاحب میں مجھے یہ بات بہت ہی نظر آئی کہ جب وہ پاکستان کے موجودہ ماحول اور تعلیمی نظام پر بہت دُکھے ہوئے لہجے میں بات کر رہے تھے تو ان کے جملوں میں بے پناہ کرب اور تکلیف کا احساس ہوتا تھا مگر ان کا چہرہ بے حد پُرسکون تھا اور ایک بار بھی ان کی آواز بلند نہیں ہوئی جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کے یہ تمام خیالات نہایت ٹھنڈے دل و دماغ سے ان مسائل پر غور و فکر کا نتیجہ ہیں۔ انہوں نے کوئی ایسی بات نہیں کی جو پُرجوش ہو یا اس سے جذباتیت کا اظہار ہوتا ہو وہ ایک سچے ماہرِ تعلیم کی حیثیت سے ہر مسئلہ خود اٹھاتے اور اس کا تجزیہ کرتے پھر اس کا نتیجہ نکالتے انہیں حال سے زیادہ مستقبل کی فکر تھی۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ جس قوم کو اپنی زبان سے محبت نہیں ہوتی اس میں خود اعتمادی کا فقدان ہوتا ہے۔ زبان تعمیر ملت کی پہلی اینٹ ہے۔ وہ کہہ رہے تھے "کسی قوم کے لئے احساس کمتری سے زیادہ نقصان دہ امر کوئی اور نہیں ہوتا۔ جس کا نتیجہ ہمیشہ نقالی، تقلید اور ذہنی مردنی میں نمودار ہوتا ہے۔ ایسی قوم کو دراصل خود سے، اپنی تاریخ سے اپنی تہذیب سے نفرت ہو جاتی ہے اور یہ احساس کمتری اس قوم کی ساری صلاحیتوں کو دیمک کی طرح چاٹ جاتا ہے۔ پاکستان کے قیام کے بعد یہ مسئلہ اور زیادہ اہم ہو گیا ہے مگر ارباب حل وعقد اس سے چشم پوشی کر رہے ہیں۔ جس کا انجام اتنا برا ہو گا کہ اس کے تصور سے بھی خوف آتا ہے۔ ہم خود سے اپنے قومی شعور اور اپنی تہذیب سے اپنے جتنے رشتے کاٹ رہے ہیں اتنے ہی ہم ترقی اور اعلیٰ مقاصد سے دور ہٹ رہے ہیں" ڈاکٹر صاحب نے ایک اور مسئلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "کوئی قوم کسی دوسری قوم کی زبان

میں اپنے خیالات کا اظہار نہیں کرسکتی اور یہ بات بے حد المناک ہے کہ ہم انگریزی میں کتابیں اس لئے نہیں لکھتے کہ اس پر عبور نہیں - اور اردو کو اس قابل نہیں سمجھتے کہ اس میں کوئی قابلِ ذکر کتاب شائع ہو - ہمیں آزاد ہوئے اٹھارہ سال گزر رہے ہیں مگر اہم اور اجتماعی مسائل پر اردو میں کتابوں کا فقدان ہے یہ صورتِ حال اس لئے اور بھی ہولناک ہے کہ یہ خلا جن انگریزی کتابوں سے پر کیا جارہا ہے وہ ہر سطح پر ہماری جڑیں کھوکھلی کررہی ہے "

میں نے ڈاکٹر صاحب سے ایک سوال اور کیا اور وہ یہ تھا کہ بعض مقامی انگریزی اخبارات نے انگریزی کے حق میں ایک مہم چلائی تھی اس کی سب سے معقول اور غالباً تنہا دلیل یہ تھی کہ مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کے درمیان انگریزی کے علاوہ کوئی رابطہ اور رشتہ نہیں ہے - ڈاکٹر صاحب نے اس پر مسکرا کر یہ کہا تھا کہ وہ بیچارے اپنے روزگار کی طرف سے پریشان ہورہے ہوں گے - کہ اگر انگریزی کا خاتمہ ہوگیا تو پھر وہ کیا کریں گے اور پھر سوالیہ انداز میں فرمایا " آپ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان خلیج وسیع کرنا چاہتے ہیں یا اسے کم کرنا چاہتے ہیں - اگر وسیع کرنا چاہتے ہیں تو پھر موجودہ حالات کو برقرار رکھئے ورنہ پاکستان کے دونوں حصوں کے افسروں اور متعلقہ کاروباری افراد کو ابتدا میں انگریزی کی جگہ بنگلہ اور اردو پڑھنا چاہئے - تاکہ مغربی پاکستان کے اہل کار مشرقی پاکستان جاکر اجنبی نہ معلوم ہوں اور مشرقی پاکستان کے افراد مغربی پاکستان کی زبان سے بیگانہ نہ ہوں - اور اگر آپ اسی اصول کے تحت عوام کو بھی انگریزی کی جگہ یہ دونوں زبانیں پڑھائیں تو آپ دیکھیں گے کہ یہ دونوں خطے جو شاید آج اجنبی نظر آرہے ہیں کل ایک دوسرے میں مدغم نظر آئیں گے اور خلیج وسیع ہونے کے بجائے معدوم ہوجائے گی " ڈاکٹر قریشی صاحب کا خیال تھا کہ اگر پچھلے اٹھارہ سال میں یہ بات اصولی طور پر مان لی جاتی تو اس وقت ہماری دو نسلیں ایک دوسرے کی زبان سے آگاہ ہوچکی ہوتیں اور ایک رشتے میں پیوند ہونے کے باوجود ہم بیگانہ نہ ہوگئے ہوتے -

اس موقع پر میں نے ڈاکٹر صاحب سے ایک چبھتا ہوا سوال کیا جس پر وہ خاصے ہنسے سوال یہ تھا کہ آپ نے اپنی تمام اہم کتابیں انگریزی میں کیوں لکھیں - اُن کا جواب تھا کہ اُن میں سے ایک تو تحقیقی مقالہ تھا جو کولمبیا یونیورسٹی کی فرمائش پر لکھا گیا تھا - اور باقی دو کتابوں کا مقصد یہ تھا کہ باہر کی دنیا کو تحریک پاکستان اور مسلمانوں کے بارے میں صحیح حقائق معلوم ہوں - میں نے عرض کیا کہ صحیح حقائق کا اندازہ تو ابھی پاکستان کے باشندوں کو بھی نہیں ہوا ہے اس لئے آپ اُن کے اُردو ترجمے جلد از جلد شروع کردیجئے تاکہ پاکستان کے عوام بھی اُن سے بہرہ مند ہوسکیں - ڈاکٹر صاحب نے اس کا وعدہ کرتے ہوئے کہا کہ میں بہت جلد کام کروں گا -

ڈاکٹر صاحب کے پاس سے میں بہت کچھ لے کر اٹھا - وہ ہماری تہذیب - ہمارے سیاسی شعور اور ہماری قومی تحریک فکر کے ایسے نمائندے ہیں جن کی تعداد روز بروز کم ہوتی جارہی ہے - اور اگر ہمارے معاشرے نے ان بجھتی ہوئی شمعوں سے روشنی حاصل نہ کی تو پھر سوائے ایک اتھاہ اندھیرے کے کچھ باقی نہیں رہے گا -

○

سید قدرت نقوی

ادب میں حقیقت کی اثر آفرینی

غالب نے کیا خوب کہا ہے

ہرچند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو　　بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

مشاہدۂ حق سے مراد حقیقت اور بادہ و ساغر اس کے محسوس روپ ہیں، گویا حقیقت نام ہے کسی شئے کی ماہیت، ہئیت اور صفات کے مجموعے کا۔ جیسے انسان حیوان ناطق ہے، اور عموماً اس باطنی رخ کو حقیقت کہتے ہیں۔ جو عام نگاہوں سے روپوش ہو، مثلاً زندگی عدم سے اور حرکت سکون سے وجود پذیر ہوتی ہے، مگر عرف عام میں اٹل، سچ اور فی الواقع امر کو بھی حقیقت ہی کا نام دیا جاتا ہے، سورج مشرق سے نکلتا ہے، ایک حقیقت ہے، اکبر ہندوستان کا شہنشاہ تھا یہ بھی حقیقت ہے، لیکن یہ جملے حقیقت ہونے کے باوجود کے ادب نہیں ہیں، کیونکہ ان کے ذریعہ قاری، سامع اور ناظر پر کوئی اثر نہیں ہوتا، ذہن میں کوئی تصور نہیں ابھرتا کسی قسم کا حظ حاصل نہیں ہوتا، اس لئے حقیقت کو جیسی وہ ہے اسی طرح پیش کرنا، ادب نہیں کہا جا سکتا، بلکہ حقیقت کو ادب میں اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ وہ بااثر ہو، کوئی تصویر ابھرے، اور حظ کا ذریعہ ہو، سورج مشرق سے نکل رہا ہے کو جب ادبی حقیقت کے قالب میں ڈھالیں گے تو کم از کم یہ کہا جائیگا، مشرق سے ایک سونے کا تھال ابھرتا نظر آ رہا ہے۔ یا میر انیس کے الفاظ میں کہیں گے

تھا چرخ اخضری پہ یہ رنگ آفتاب کا　　کھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا

اور اکبر ہندوستان کا شہنشاہ تھا کو جب ادبی حقیقت کا روپ دیں گے تو کہیں گے، اکبر کے سامنے ہندوستان کے تمام راجہ مہاراجہ اپنا سر جھکاتے تھے، یا واقعہ کربلا میں یہ حقیقت کہ حق غیر منقلب اور باطل منقلب ہے، علامہ اقبال اس طرح بیان کرتے ہیں،

حقیقت ابدی ہے مقام شبیری　　بدلتے رہتے ہیں انداز کوفی و شامی

سب سے پہلے حقیقت کا احساس و ادراک ہوتا ہے اس کے بعد اس کے اظہار کی منزل آتی ہے، فلسفی ایک حقیقت کے ادراک کے بعد اس کو بیان کرے گا، مثلاً وہ شبنم کے غائب ہونے کا یہ سبب بتائے گا کہ سورج کی حدت کے باعث شبنم ختم ہو جاتی ہے یہ ایک حقیقت ہے شاعر اسی حقیقت کو اس طرح بیان کرتا ہے۔

شعاعِ مہر خود بیتاب ہے جذبِ محبت سے ‏ ‏ حقیقت ورنہ سب معلوم ہے پروازِ شبنم کی

مورخ کسی واقعہ کو بلا کم و کاست بیان کر دیتا ہے لیکن جب وہی واقعہ ادیب و شاعر بیان کرتے ہیں تو ان کا انداز کچھ اور ہی ہوتا ہے واقعہ کربلا کے نتیجہ کو مورخ اس طرح بیان کرے گا کہ امام حسین علیہ السلام قتل کر دیئے گئے اور یزید کی فتح ہوئی لیکن شاعر اس حقیقت کے پس پردہ جو حقیقت ہے اس کو بھی سامنے لے آتا ہے۔

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے ‏ ‏ اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

گویا دونوں کے اظہار میں فرق ہوتا ہے اسلئے اب حقیقت کے اظہار کے دو پہلو ہوئے ایک عام دوسرا خاص یا ادبی انداز اظہار۔ فلسفی و مورخ وغیرہ کا انداز عام ہوتا ہے، اور شاعر و ادیب کا انداز خاص، کیونکہ یہ تخیل سے کام لے کر اس حقیقت میں رنگ آمیزی کرتے ہیں تاکہ وہ حقیقت اثر انداز ہو، اس سے حظ حاصل ہو، اگر مجرد ہے تو محسوس بن جائے، اس کا کوئی واضح تصور ذہن میں بن سکے، فلسفہ و تاریخ وغیرہ کے برعکس، ادب میں حقیقت پسِ منظر میں چلی جاتی ہے، نہ بدلتی ہے اور نہ ختم ہوتی ہے بلکہ اثر اندازی کے لئے جو ذرائع استعمال کئے جاتے ہیں ان کی اوٹ میں اوجھل ہوتی ہے اگر ایسا نہ ہو تو فلسفہ، تاریخ اور ادب میں کوئی امتیاز نہیں ہو سکتا اور یہی حال دیگر علوم و فنون اور ادب کا ہے۔

ادب میں حقیقت کی ماہیت برقرار رہتی ہے مگر واقعیت اور اصلیت کو اثر آفرینی کی خاطر مختلف روپ دیئے جاتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر ادیب و شاعر کے پیشِ نظر اس کے قاری، سامع اور ناظر ہوتے ہیں، وہ حقیقتِ مدرکہ کو جب پیرایۂ اظہار بخشتا ہے تو متوقع ہوتا ہے کہ یہ ادراک و احساس دوسروں تک پہنچکر وہی اثر کریگا جو مجھ پر ہوا ہے۔ گویا ادیب و شاعر اور قاری، سامع اور ناظر کے درمیان ایک شعوری اشتراک ہوتا ہے تاوقتیکہ یہ اشتراک نہ ہو، تاثیر کا امکان نہیں ہوتا، یہ اشتراک مشاہدے علم اور احساس کے اشتراک پر مبنی ہے اگر ایسا نہ ہو تو پھر دونوں میں اختلاف کی صورتیں ظہور پذیر ہو سکتی ہیں مثلاً ادارۂ مصنفین ملتان کے ہفتہ وار تنقیدی اجلاس میں اقبال شاہ گیلانی کی نظم "شام" میں تزئیب شام مختلف درختوں کے سایوں کو متشکل کرنے کی خاطر کہا تھا۔

ڈھلتے سورج نے بھی دیکھا
اونچے نیچے پیڑوں پر سے
ہاتھی، گھوڑے، بندر اترے۔
ڈگر ڈگر پر ناچے
اندھیارے انگڑائی لے کر گلی گلی سے اٹھے
جھومتے ہاتھی، گھوڑے لے کر
فوج بنا کر

بیچارے سورج پر ٹپکے ۔

اس پر ایک صاحب نے یہ اعتراض کر دیا کہ ہاتھی گھوڑے پیڑوں پر سے نہیں اتر سکتے ، اور ہاتھی گھوڑوں کی فوج سے سورج پر حملہ نہیں کر سکتے ، کیونکہ معترض اور شاعر کے مشاہدے ، علم اور احساس میں اشتراک نہ تھا ، اس لئے اس نے یہ اعتراض کر دیا ، اس کا ذہن صرف حقیقت واقعیہ تک پہونچ کر رہ گیا ، اگر وہ یہ سوچتا کہ حقیقت واقعیہ یہاں مقصود نہیں ہے بلکہ ان جانوروں کو تشبیہ اور استعارے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے تو اعتراض نہ کرتا ۔

اسی طرح جب کوئی ادیب و شاعر کسی حقیقت کو متشکل کرتا ہے تو وہ اس حقیقت کو جو اس کا مقصود ہوتا ہے اس انداز سے متشکل کرتا ہے کہ قاری ، سامع اور ناظر کا ذہن شاعر کی ذہنی رسائی کی منزل تک نہیں پہونچ پاتا یا الفاظ کی مقصود کے ساتھ تطبیق میں الجھن پیدا ہو جاتی ہے ، فرخ درانی کی نظم " بازگشت " اسی انداز کی ہے ،

میں اندھا بھکاری
طویل عمر تک
جانے والوں کے ماتم میں
آبادیوں سے بہت دور ویران ٹیلوں کی تنہائیوں میں بھٹکتا رہا ۔
کہر آلود شاموں کے یخ بستہ ماحول میں
بن خنک مقبروں اور نم دار مٹی کی کچی سی بدبو سے بھیگی ہوئی خانقاہوں کے ویران ماحول میں سر پٹکتا رہا ۔
اور خلاؤں میں کھو کر بچھڑ جانے والوں کو ہر بار آواز دیتا رہا اور کہتا رہا ۔
ساتھیو ! تم کہاں کھو گئے ! ؟
اور خلاؤں سے ہر بار وہ مجھ کو آواز دیتے رہے اور کہتے رہے ،
تم کہاں کھو گئے ؟

اس نظم پر بھی ادارۂ مصنفین ملتان کے تنقیدی اجلاس میں بحث ہوئی ، قاری و سامع نظم کے کردار " اندھا بھکاری " اور مرکزی خیال کہ ہماری جستجو اور سوال کا ماحصل ہماری جستجو اور سوال ہی ہے " تم کہاں کھو گئے " کا جواب " تم کہاں کھو گئے " ہے میں مطابقت پیدا نہ کر سکے خیال و کردار میں فرق اس وجہ سے ہے کہ اگر " میں " کو خیالات کے بموجب متصف کیا جاتا تو الجھن پیدا نہ ہوتی ، مثلاً " میں اندھا بھکاری " کی جگہ اگر کہدیا جاتا " میں حیراں و غمگین و تنہا " تو یہ الجھن دور ہو جاتی ، یہاں بات واضح ہے کہ شاعر کی ذہنی رسائی اور قاری و سامع کی ذہنی رسائی میں صرف اس لئے اختلاف رہا کہ شاعر نے " اندھا بھکاری " کہہ کر خود کو تنہا ، مجبور ، بے یار و بے وسائل قرار دیا ۔ لیکن عرف عام میں یہ باتیں بھکاری سے نسبت نہیں رکھتیں اسی وجہ سے قاری و سامع نظم کے خیال و کردار میں تطبیق پیدا کرنے سے قاصر رہے ، اس پر یہ بھی اعتراض کیا گیا کہ اندھا " کہر آلود شام " کو محسوس کرنے سے قاصر ہے کیونکہ کہر کا احساس آنکھ سے ہوتا ہے اور تاریکی

کا احساس بھی قوت باصرہ کی بدولت ہوتا ہے، یہ اعتراض بھی عدم اشتراک علم و مشاہدہ و احساس پر مبنی ہے، حالانکہ یہ بات اظہار میں اثر آفرینی کی ایک جہت ہے جو تصور کی تکمیل کا ذریعہ ہے کہر اور تاریکی پر اعتراض حقیقت واقعیہ کے پیش نظر کیا گیا ورنہ یہ بات قابل اعتراض نہ تھی۔

عدم اشتراک علم کی وجہ سے حقیقت بدل بھی جاتی ہے یا اس تک رسائی نہیں ہوتی اور حظ و تاثر کا فقدان رہتا ہے،
اس سلسلہ میں الفاظ و اصطلاحات وغیرہ کے معنی سے عدم واقفیت کا مسئلہ زیر بحث لایا جا سکتا ہے، مثلاً غالب

رنج رہ کیوں کھینچئے؟ واماندگی کو عشق ہے　　اُٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے

اس شعر میں اکثر شارحین نے " واماندگی کو عشق ہے" اور "منزل" کو عام معروف معنی کی روشنی میں دیکھا اور غلط مطلب بیان کر دیا، بعض نے الجھن کو دور کرنے کے لئے "کو" "سے" سے بدل دیا، یہ سب اس لئے ہوا کہ "عشق" اور "منزل" کے منطبق معنی کی جستجو نہیں کی گئی، شارحین نے "کو" اور "سے" کی مناسبت سے دو مطلب متعین کئے۔

(۱) "چونکہ ماندگی کو ہم سے عشق ہے اس لئے ہم رنج راہ کیوں کھینچیں ہمارا جو قدم نہیں اٹھتا یعنی واماندہ ہے، ہم کو سمجھنا چاہیئے کہ گویا وہ منزل میں ہے"

غور فرمائیے کہ اس شرح سے کیا وضاحت ہوئی؟ اور اس نے شعر میں کیا خوبی پیدا کی" واماندگی کو ہم سے عشق ہے" کیوں ہے؟ اس کا کوئی جواب نہیں، یہ دعویٰ ہے بلا دلیل، قدم کیوں نہیں اٹھ سکتا؟ جو قدم نہ اٹھے اس کو منزل میں کیسے سمجھ لیا جائے؟ دوسرا مطلب یہ بتایا جاتا ہے،

"چونکہ ہمیں واماندگی سے عشق ہے، اس لئے ہم رنج راہ کیوں کھینچیں؟ ہمارا قدم اٹھ نہیں سکتا اور وہی منزل ہے" اس میں بھی وہی قباحت ہے کہ واماندگی سے کیوں عشق ہے؟ اور جو قدم اٹھ نہیں سکتا وہ منزل میں کیسے ہے؟ نہ اُٹھنے والا قدم کیسے بنا؟ بات دراصل یہ ہے کہ "عشق ہے" بمعنی آفریں، شاباش، سلام ہے استعمال ہوا ہے، قدیم میں یہ معنی بھی مروج تھے فقرہ میں یہ اصطلاحی حیثیت سے بطور کلمہ تحسین استعمال ہوتا تھا انہی کی اصطلاح شعر میں داخل ہوئی، چنانچہ ان اشعار میں اسی معنی میں نظم ہوا ہے،

دل خانۂ خدا ہے، خدا لا شریک ہے　　اے سوز تیرے دل میں سمانے کو عشق ہے
عشق ہے رنگ کو آتا کہ یہ کس خوبی سے　　بوسہ لیتا ہے ترے ہاتھ کی زیبائی کا

غالب کے شعر میں بھی اسی معنی میں نظم ہوا ہے، نیز منزل بمعنی مقام مقصود نہیں ہے بلکہ بمعنی پڑاؤ، شاعر یہ کہتا ہے، کہ ہمارا جو قدم پڑاؤ میں ہے یعنی ہم جہاں رکے ہوئے ہیں وہاں سے آگے واماندگی کی وجہ سے بڑھ نہیں سکتے اس واماندگی کو آفرین ہے کہ جس کی بدولت ہم راستہ کے مصائب سے بچ گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ عشق اور منزل کے معنی کی عدم تلاش کی بدولت حقیقت اسی سے دور ہی رہی اور شارحین نے اس کو بالکل ہی بدل دیا، اسی لئے کماحقہ، حظ و تاثر حاصل نہیں ہو پاتا۔ اسی قبیل کا یہ شعر

بھی ہے ،

رنگ شکستہ صبح بہار نظارہ ہے یہ وقت ہے شگفتن گلہائے ناز کا

عام طور پر " رنگ شکستہ " کا مطلب " اڑا ہوا رنگ " لیا جاتا ہے جو شعر کے دوسرے لفظوں کے ساتھ میل نہیں کھاتا ۔ اسی لئے اس شعر کا مطلب بیان کرنے میں شارحین نے تاویلات کا سہارا لیا ہے ، اگر دوسرے الفاظ کو پیش نظر رکھکر " رنگ شکستہ " کے معنی متعین کئے جاتے تو یہ الجھن دور ہو جاتی ، مگر ہوا یہ کہ ذہن ، عام اور مشہور معنی کی طرف منتقل ہوا ۔ خاص معنی سیاق و سباق کی روشنی میں تلاش نہ کئے گئے یہاں " رنگ شکستہ " کے معنی حالت خمار یعنی نشہ ٹوٹنے کی کیفیت ہیں ، نشہ ٹوٹتے وقت جو عجیب و غریب کیفیت ہوتی ہے ، شاعر نے اس حالت میں محبوب کو دیکھا ہے تو فرط حسن اور ناز و انداز کی وہ کیفیات سامنے آئیں جو عالم ہوش یا حالت نشہ میں نہیں تھیں ، اسی لئے صبح بہار نظارہ سے اس کو تعبیر کیا جنہیں اس کا علم اور مشاہدہ نہیں اور " اڑا ہوا رنگ " معنی لے کر شعر کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں وہ ناکام رہتے ہیں ، ان پر اس شعر کا نہ اثر ہوتا ہے اور نہ پوری طرح حظ اٹھاتے ہیں کیونکہ ان کی حقیقت تک رسائی نہیں ہوتی ،

ادب میں تصویر آفرینی کا عمل حظ و تاثر کا بہت موثر ذریعہ ہے ، حقیقت کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ اس کی ایک تصویر بن جائے محسوس کو معلوم کی شکل اور مجرد کو محسوس کی صورت دی جاتی ہے تاکہ اثر کا حصہ ہو ، اس تصویر آفرینی میں تصور کا دخل ہوتا ہے ، ادیب و شاعر تخیل سے کام لے کر حقیقت کی تصویر پیش کرتے ہیں ، لیکن اس میں بھی قاری ، سامع اور ناظر اسی وقت متاثر و محظوظ ہوں گے جب وہ اس کا تصور قائم کر سکیں گے ، تصور کا قیام مشاہدے ، علم اور احساس پر مبنی ہوتا ہے ، غالب صرف یہ کہنا چاہتا ہے کہ آزادمنش انسان پر غم کا اثر بہت ہی خفیف ہوتا ہے وہ اس بات کو اس انداز میں بیان کرتا ہے ۔

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

ظاہر ہے کہ پہلے مصرع کا ہم پر کوئی خاص اثر مرتب نہیں ہوتا ، حالانکہ حقیقت پوری طرح بیان کر دی گئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مصرع سے ہمارے ذہن میں کوئی تصور نہیں ابھرتا ۔ مصرع میں یکے بعد دیگرے کئی تصور ابھرتے ہیں اور اثر کا سبب بنتے ہیں یہ سب اشتراکِ مشاہدہ ، علم و احساس کا کرشمہ ہے اگر حقیقت کا تصور بصورت تصویر قائم نہیں ہو سکے گا تو اثر ، کیف اور حظ مفقود رہے گا یا مکمل نہ ہوگا مثلاً غالب کا شعر ہے ۔

قمری کف خاکستر و بلبل قفس رنگ اے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے ؟

اس شعر میں " قمری کف خاکستر " تو بن جاتا ہے لیکن " بلبل قفس رنگ " کا تصور نہیں ابھرتا اور اگر ابھرتا ہے تو ناقص ، کیونکہ بلبل کے متعلق ہمارا مشاہدہ و علم نہیں ہے اور اگر ہے تو ناقص یعنی ہم گدم کو بلبل سمجھتے ہیں ، اسی لئے قفس رنگ کی تعبیر میں الجھ جاتے ہیں ، اگر یہ علم ہو کہ بلبل نہایت خوش رنگ پرندہ ہے اور اس کے پروں میں مختلف شوخ رنگوں کی آمیزش ہے اور اسی کے پیش نظر بلبل کو قفس رنگ کہا گیا ہے تو حقیقت اسی کی منزل آسان ہو جائے ۔

ادراک حقیقت کے سلسلے میں بیرونی ادب کو دو حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے ایک تو یہ کہ حقیقت اور اس کا متشکل زندہ دونوں غیر مانوس ہوں۔ مثلاً گوئٹے فاؤسٹ میں ہیلن کی آمد کا اعلان اس طرح کرتا ہے۔

"ایک دفعہ وہ پھر ارغوانی سمندر کی سطح پر سرگرم سفر ہے، بادبان اس کو وطن لے جا رہے ہیں۔ ٹرائے کے آتش زدہ میناروں پر پھر گولہ باری ہو رہی ہے اور سرخ سرخ جھاگ کے پار وہ نظر آ رہے ہیں"۔

کیونکہ اس میں "ہیلن" کا نام نہیں اس لئے اس اعلان سے جو تصور ابھرتا ہے وہ ہیلن اور اس سے متعلق خونریز جنگوں کی تصویر پر مبنی نہیں ہوتا وجہ صرف یہ ہے کہ ارغوانی سمندر اور سرخ سرخ جھاگ سے جنگوں کا واضح تصور پیدا نہیں ہوتا۔ صرف ٹرائے کے آتش زدہ مینار" سے خفیف سا اشارہ ملتا ہے، لیکن واضح حقیقت سامنے نہیں آتی، بلکہ شفق کے انعکاس کا تصور پیدا ہوتا ہے

دوسرا پہلو یہ ہے کہ حقیقت کا ادراک تو ہو جائے لیکن بنیادی حیثیت رکھنے والے عنصر کے عدم مشاہدہ کی وجہ سے تصور مکمل نہیں ہوتا اور پورا پورا کیف و حظ حاصل نہیں ہوتا، ورڈز ورتھ کی مشہور نظم "ڈیفوڈلز" کو دیکھئے، حقیقت کا ادراک تو ہو جاتا ہے کہ فطرت کا حسن جو مسرت بخشتا ہے وہ اور کہیں نصیب نہیں ہوتی لیکن نظم میں مرکزی عنصر "ڈیفوڈل" ہے جس کا تصور ہم عدم مشاہدہ کی بدولت قائم نہیں کر سکتے اسی وجہ سے ذہن قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتا ہے کیونکہ بغیر ڈیفوڈل کے تصور ناقص رہتا ہے۔ گویا ایک جسم تو بنتا ہے، مگر بغیر چہرے کے جس کی وجہ سے پہچان نہیں سکتے اور تشخیص نہیں کر سکتے اگر ڈیفوڈل کی جگہ کوئی متعارف پھول ہوتا تو ہمارے لئے یہ کمی نہ رہتی، کیونکہ فطرت پس منظر میں چلی جاتی ہے اور پیش منظر میں "ڈیفوڈل" رہتا ہے جس کو ہم اپنے ذہن میں متشکل نہیں کر سکتے۔ انتہا یہ کہ شارحین اور لغت نویسوں کی وضاحت کے باوجود بھی ہم اس کی شکل متعین کرنے سے قاصر ہی رہتے ہیں، ہم میں سے جو بغیر مشاہدے کے یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے اس نظم سے پورا کیف حاصل کیا ہے اس کا یہ دعویٰ کوئی بھی ذی فہم قبول نہیں کرے گا کیونکہ نظم بغیر تصور کے کیف نہیں بخش سکتی اور تصور "ڈیفوڈل" کے بغیر مکمل نہیں ہوتا، یہ تصور مشاہدے کے بغیر ناممکن ہے۔ اگر شاعر اور قاری دونوں میں اشتراک علم ہو تو پھر ایک مفروضہ بھی حقیقت کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے عرفی

آشیانِ زغن و زاغ نہ چیدم بر سر   سر قدم ساختہ در خار مغیلاں رفتم

مجنوں کے متعلق مشہور ہے کہ وہ صحرا میں بے حس و حرکت کھڑا رہا اور اتنی مدت تک کہ چیل کوؤں نے اس کے سر پر گھونسلے بنا لئے۔ یہ مفروضہ ادب میں بطور حقیقت پیش ہوتا ہے یا غالب کہتے ہیں۔

ہم نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد   سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

اس کے برعکس ایسا بھی ہوتا ہے کہ عدم اشتراک کی وجہ سے ایک حقیقت کو حقیقت تسلیم نہیں کیا جاتا جب شیکسپئر نے جولیس سیزر میں یہ لکھا

"THE CLOCK HATH STRIKEN THREE."

"گھنٹے نے تین بجائے ہیں" تو تمام نقادوں نے اعتراض کر دیا کہ شیکسپئر نے غلط لکھا ہے، کیونکہ سیزر کے عہد میں کلاک یعنی مشینی گھنٹہ نہیں تھا۔ یہ اعتراض ان لوگوں نے اس لئے کر دیا کہ انہیں اعلان وقت کی روایات کا علم نہ تھا اور غلطی سے انہوں

نے گلاک کو صرف مشینی گھنٹہ تصور کر لیا، حالانکہ اس عہد میں پہریدار گھنٹہ بجایا کرتے تھے۔ اور شیکسپیر کا مقصود بھی یہی پہریداروں والا گھنٹہ تھا۔

ادب میں حقیقت کی اصلیت کو بھی مختلف روپ دیئے جاتے ہیں، اس کے اسباب بھی وہی ہیں کہ حظ، کیف اور اثر حاصل ہو اور تصور ابھر سکے چنانچہ اردو میں واقعات کربلا پر مشتمل مرثیوں اور قدیم داستانوں، قصوں اور کہانیوں کے غیر ملکی کرداروں کو مقامی اور متعارف روپ میں اسی وجہ سے پیش کیا جاتا ہے، گویا حقیقت کی اصلیت کو فنی تقاضوں کی بنا پر مختلف روپ دیئے جاتے ہیں، اس سلسلہ میں لوکوان (LAOCOON) کے حادثہ کو مثال بناتا ہوں۔ لوکوان (LAOCOON) قدیم یونانی روایات میں ٹرائے یا ایشیائے کوچک کے قدیم شہر الیدم کے شاہی خاندان کا فرد تھا، سمندر کی دیوی کے لیے بیل کی قربانی کرتے وقت سمندر سے اژدھے نکلے اور لوکوان کے دونوں بیٹوں کو لپیٹ میں لے لیا، لوکوان کی اژدھوں سے جنگ ہوئی اور مارا گیا، اس واقعہ کو ورجل نے نظم میں پیش کیا ہے اور گیسنڈر نے اس کا مجسمہ سنگ مرمر سے تیار کیا، جو بت تراشی کا شاہکار مانا جاتا ہے، نظم اور مجسمہ میں حقیقت ایک ہی پیش کی ہے یعنی لوکوان اور اژدھوں کی جنگ، لیکن اصلیت دونوں میں مختلف ہے۔ ورجل نے لوکوان کو مذہبی پیشوا کی عبا قبا میں ملبوس دکھایا ہے، مختلف دردناک آوازوں کے ذریعہ منظر کی ہیبت اور حالت کرب کو پیش کیا ہے، لیکن بت تراش نے جسم کا بالائی حصہ عریاں رکھا ہے تاکہ اعضا میں تشنج کی کیفیت واضح ہو سکے بازوؤں کی مچھلیوں کا ابھار اور سینہ کی پسلیوں، کھچاؤ، زورآزمائی، اضطراب اور برداشت کی نشاندہی کرتا ہے، چہرے پر حالت کرب وسکون، ضبط وتحمل کے امتزاج سے ہیبت وتکلیف کا تاثر منتقل کیا ہے، ظاہر ہے کہ دونوں نے ایک حقیقت کی اصلیت میں فرق اپنے فنی تقاضوں کی وجہ سے کیا ہے تاکہ اثر میں کمی واقع نہ ہو، ورجل کے ہاں حقیقت کی اصلیت ملبوس ہے وہی اصلیت بت تراش کے ہاں عریانی ہے۔

ہر صاحب فن اس اصلیت کو حسب موقع تاثر کی خاطر بدل ڈالتا ہے، داستانوں وغیرہ میں بھی یہی عمل ہوا اس کو ایک اور واضح مثال کی روشنی میں سوچیئے! ہمارے ملتان کا مقامی لباس ڈھیلا ڈھالا لمبا کرتا، لمبی چوڑی چادر (تہمد) جس کی ڈابیں دونوں طرف لٹکتی ہیں، ایک خاص وضع کی پگڑی، ہے، یہ علاقائی لباس ہے، اس لباس میں ملبوس ایک استاد مکرم کسی کالج میں درس دینے کے لئے تشریف لے جائیں تو ان کی اس ہیئت کذائی کا ردعمل یا اثر قابل دید ہوگا، طلباء کے لئے تو یہ ہیئت وجہ تمسخر بن جائے گی، کیونکہ یہ لباس ان کے لئے اس جگہ غیر متعارف ونامانوس ہوگا اس لئے کہ بے محل ہے، مگر وہ استاد مکرم اس لباس میں خود کو بھی شرمندگی کے بار میں دبا ہوا محسوس کریں گے، کالج میں ان کی شخصیت کا تاثر قائم نہیں رہے گا، اس لئے یہ استاد مکرم کالج میں شخصیت کا تاثر قائم رکھنے کے لئے خود کو ایک متعارف لباس میں پیش کرتے ہیں، مگر یہی استاد مکرم جب اپنے دیہاتی مسکن میں پہنچتے ہیں تو وہی علاقے کا لباس استعمال کرتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں کیونکہ وہاں تاثر کا مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔

مندرجہ بالا مثالوں سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ کسی حقیقت کی اصلیت کو اثر کی خاطر منقلب کیا جا سکتا ہے، میر انیس، مرزا دبیر، میر امن اور دوسرے مرثیہ گویوں اور داستان نویسوں پر اکثر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنے غیر ملکی کرداروں کو مقامی رنگ

میں پیش کیا ہے اور یہ حقیقت سے انحراف ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اس مسئلہ میں معترضین نے حقیقت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی، یہ مسئلہ حقیقت کی اصلیت سے متعلق ہے، اصلیت میں تغیر ہوتا رہتا ہے۔ اور ہمارے لکھنے والوں نے نہایت ژرف نگاہی اور نفسیات شناسی سے کام لیا ہے کہ لباس یا دیگر اشیاء متعارفہ کو پیش کیا جو قاری، سامع اور ناظر کے مشاہدے کے مطابق ہیں تاکہ وہ تصور قائم کر سکیں اور اثر خاطر خواہ مرتب ہو۔ ادیب و شاعر اور قاری، سامع، ناظرین ذہنی اشتراک اسی طرح قائم ہو سکتا تھا۔ چنانچہ داستانوں وغیرہ میں یہی حال اشیاء کا ہے، مثلاً آپ کے سامنے "دسہری آم" کا نام لیا جائے تو آپ کے ذہن میں، مزہ، شکل اور رنگ کے علاوہ وقت مقام اور رفقا سمیت دسہری آم کا تصور ابھر آئے گا، آپ کے لئے یہ مانوس ہوگا لیکن اس کی جگہ اگر "چیکو" کا ذکر کیا جائے تو جن لوگوں نے اسے نہیں دیکھا ہے وہ اس کا تصور نہیں کر سکتے۔ سمجھانے کے باوجود کہ ایک میٹھا پھل ہوتا ہے جسامت اور رنگ میں آلو کی مانند والے دار گودا ہوتا ہے سیاہ رنگ کے لمبے بیج ہوتے ہیں، امرود کی مانند چھیل کر اور بغیر چھیلے دونوں طرح کھاتے ہیں۔ اس طویل وضاحت کے باوجود آپ کا ذہن چیکو کا تصور کرنے سے قاصر ہے، جہاں یہ موڑ آتا ہے وہیں تصور کے تسلسل میں خلا واقع ہو جاتا ہے، اس خلا سے تاثر مجروح ہوتا ہے، اسی لئے جن حضرات نے ملکی رنگ، خصائص، خصائل، اشیاء وغیرہ کو اپنایا۔ انہوں نے درست اقدام کیا، کیونکہ انہوں نے حقیقت کو برقرار رکھا اور اصلیت میں تبدیلی کر دی تاکہ تصور میں خلا واقع نہ ہو اور تاثر مجروح نہ ہو قاری، سامع اور ناظر پوری طرح کیف و حظ حاصل کرے

اس مسئلہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ غیر ملکی ادب کے جتنے بھی ترجمے ہوئے وہ ہمارے ادب عالیہ میں کوئی مقام حاصل نہ کر سکے۔ بالخصوص یورپی ادب کے تراجم کو کوئی مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ انتہا یہ کہ وہاں کے شاہکار بھی یہاں مقبول نہ ہو سکے۔ "فاؤسٹ" جرمنی ادب کا شاہکار مانا جاتا ہے اس کے کئی بہترین ترجمے ہوئے لیکن نامقبول، اسی طرح "ڈیوائن کومیڈی" اطالوی ادب کا شاہکار ہے لیکن اس کا عمدہ ترجمہ بھی مقبول نہ ہو سکا کیونکہ ان میں پیش کردہ حقیقت کا تو ادراک ہو جاتا ہے لیکن اصلیت نامانوس ہونے کے سبب سے تصور میں خلا پیدا ہوتے ہیں اور حصول حظ و کیف میں رکاوٹ کا سبب بنتے ہیں، تاثر مجروح ہوتا ہے بنا بریں قبولیت کے درجے کو یہ کتابیں نہیں پہنچ پائیں، یہی حال شیکسپیئر کے ڈراموں کا ہے کہ ان کو قبولیت عامہ حاصل نہ ہو سکی۔ ترجمے بھی ہوئے، کھیلے بھی گئے اور فلمائے بھی گئے لیکن ادراک حقیقت کے باوجود تاثر مفقود اور قبولیت ناپید رہی۔ ان کے مقابلہ میں دیکھئے! "امراؤ جان ادا۔ انارکلی، آگ کا دریا" وغیرہ کا ہمارے ہاں ایک ادبی مقام ہے۔ کیونکہ اصلیت مانوس انداز میں پیش کی گئی ہے آغا حشر کے ڈرامے مقبول ہیں گو ان میں سے بعض شیکسپیئر سے مستعار قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ مگر ان کی مقبولیت کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان میں اصلیت کو بدل کر اپنا رنگ دے کر پیش کیا گیا ہے "آگ کے دریا" میں بھی قدیم تاریخ ہند، بدھ مذہب کے زوال کا زمانہ، عہد قبل اسلام کو محسوس و مانوس اصلیت میں پیش کیا ہے۔ اور اسی طرح لندن میں کرداروں کی اصلیت محسوس و مانوس انداز میں پیش ہوئی ہے۔ اسی لئے تصور کے تسلسل میں خلا واقع نہیں ہوتا اس کی مقبولیت کا راز بھی اسی میں مضمر ہے۔ ہمارے ہاں فاؤسٹ کے مقابلہ میں چودہری افضل حق کی کتاب "زندگی" مقبول ہے کیونکہ اصلیت مانوس ہے۔ اور ڈیوائن کومیڈی کے مقابلہ میں "جاوید نامہ" اہم ہے۔ زبان کی تبدیلی کے باوجود

باقی بر صفحہ ۱۳۰

نظامی بدایونی

سر راس مسعود اور اردو ادب*

میں نے مرحوم کو سب سے پہلے ۱۸۹۲ء کے آل انڈیا مسلم تعلیمی کانفرنس کے اجلاس میں جو کانفرنس کا اوّل اجلاس تھا علی گڑھ میں دیکھا تھا۔ اس وقت ان کی عمر پانچ سال کے قریب تھی اس کے بعد ان کی طالب علمی کا زمانہ شروع ہو گیا، علیگڑھ میں ان کی تعلیم و تربیت سر سید کی وفات کے بعد سر تھیوڈر ماریسن کی نگرانی میں ہوئی۔ میٹرک پاس کرنے کے تھوڑے عرصہ کے بعد وہ ولایت بھیج دیئے گئے اور آکسفورڈ کے مشہور نیو کالج میں داخل ہو گئے۔ وہاں سے انہوں نے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور بیرسٹری کا امتحان بھی پاس کیا۔ ۱۹۱۲ء میں پٹنہ میں وکالت شروع کی۔ لیکن وکالت کے پیشہ کا ماحول ان کی طبیعت کی رفتار کے ناموافق تھا اس لئے وہ تھوڑے دنوں کے بعد پٹنہ ہی میں گورنمنٹ ہائی سکول میں ہیڈ ماسٹری کے عہدہ پر مقرر ہوئے اور وہاں سے ترقی پاکر گورنمنٹ کالج کٹک میں تاریخ کے پروفیسر ہو گئے۔ ابھی اس عہدہ پر پہونچے ہوئے ایک سال سے زیادہ مدت نہ گذری تھی کہ سرکار آصفیہ میں ناظم تعلیمات کا عہدہ خالی ہوا اور وہ ۱۹۱۵ء میں حیدر آباد بلا لئے گئے

ظاہر ہے کہ ان کی تربیت ایسے ماحول میں ہوئی تھی۔ کہ انہیں مشرقی علوم میں دستگاہ حاصل کرنے کا موقع نہ ملا تھا۔ البتہ انگریزی زبان اور اس کے ادب پر ان کو ایسی قدرت حاصل تھی کہ اچھے اچھے انگریز ادیب ان پر رشک کرتے تھے، وہ فرانسیسی زبان بھی خوب جانتے تھے۔

ولایت کے دوران قیام میں ہی ان کو باوجود اس کے کہ اردو فارسی کے ادب میں ان کی پوری تعلیم نہ ہوئی تھی۔ اردو اساتذہ کے کلام پڑھنے کا شوق پیدا ہو گیا تھا، فرمایا کرتے تھے کہ ولایت میں جب وہ کالج کی چھٹیوں میں وہاں کے سبزہ زاروں اور پُر لطف مناظر کی سیر کرنے کے لئے شہر کی آبادی سے باہر جاتے تھے اپنے انگریز دوستوں کو "زہر عشق" کے وہ اشعار جو بے ثباتیٔ دنیا پر شاعر نے لکھے ہیں، سنایا کرتے تھے اور انگریزی میں ان کا مطلب سمجھا کر داد حاصل کرتے تھے۔

ہندوستان پہونچکر انہوں نے اردو اساتذہ کے دیوانوں کو بالاستیعاب پڑھنا شروع کر دیا اور نہ صرف شعراء کے کلام کو پڑھتے تھے بلکہ اردو ادب کی نثر کی مشہور اور مستند کتابوں کا بھی مطالعہ کرتے تھے۔ اسی زمانہ میں انہوں نے مستند شعراء اور نثر نگاروں کی تصانیف سے ایک انتخاب "نصاب اردو" کے نام سے تالیف کیا جس میں نظم و نثر کے مستند اردو ادب کے نمونے جمع

---

* ۲۹ مئی کو راس مسعود ایجوکیشن اینڈ کلچر سوسائٹی آف پاکستان کی طرف سے کراچی میں یوم راس مسعود منایا گیا جس کی روداد قومی زبان کے [illegible]

گئے ہیں اور جس سے اردو ادب کے ساتھ ان کی گہری دلچسپی کا پتہ چلتا ہے، یہ مجموعہ ۱۹۱۶ء میں نظامی پریس بدایوں سے چھپ کر شائع ہوا اور عرصہ تک کلکتہ یونیورسٹی کے انٹرمیڈیٹ کے نصاب میں داخل رہا ۱۹۴۳ء میں اس مجموعہ کا دوسرا اڈیشن "مستند اردو کے نمونے" کے نام سے نظامی پریس بدایوں نے شائع کیا۔

۱۹۱۳ء میں ان کی زندگی کا ایک دلچسپ واقعہ قابل ذکر ہے جس نے اردو ادب کی عملی خدمت پر ان کو آمادہ کیا، ان دنوں وہ پٹنہ سے دہلی گئے ہوئے تھے کہ ان کی ملاقات اپنے ایک فرانسیسی دوست سے جو سیاحت کی غرض سے ہندوستان آئے تھے، ہوئی، باتوں باتوں میں ان سے اردو ادب کے متعلق گفتگو چھڑ گئی اور فوراً غالب کا ذکر آ گیا، اور یہی وہ گھڑی تھی کہ مرحوم کو یہ دھن لگ گئی کہ اردو اساتذہ کے کلام کے نفیس اور پاکیزہ ایڈیشن شائع ہوں، فرانسیسی دوست کی اس گفتگو کا ان کے دل پر کیا اثر ہوا، اس کا اندازہ ان کے مندرجہ ذیل الفاظ سے بخوبی ہوتا ہے جو انہوں نے بحیثیت صدر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۳۰ء میں بنارس کے اجلاس میں فرمائے تھے۔ آپ نے فرمایا۔

"میں اپنی ایک دفعہ کی ذلت کو کبھی نہیں بھول سکتا جب میں اتفاقاً اپنے ایک فرانسیسی دوست کے ساتھ دہلی جا نکلا، ان کے لئے دیوان غالب کی ایک جلد خریدنے کا ذمہ لیا اور اس غیر فانی شاعر کے کلام کی ایک ستھری جلد کی تلاش میں دلی کی گلیوں میں مارا مارا پھرا، لیکن جو بہتر سے بہتر نسخہ دستیاب ہوا وہ اس سستے زرد رنگ کے کاغذ پر چھپا ہوا تھا جس سے یورپ میں لوگ اپنے بوٹ بھی نہ صاف کرنا چاہیں گے۔ جب میں نے یہ کتاب اپنے فرانسیسی دوست کے ہاتھ میں دی اس وقت اس کے چہرہ سے تعجب اور حیرت کے جو آثار نمودار ہوئے ان کے تصور سے میں اب تک کانپ جاتا ہوں، اُسے کبھی یقین نہ آتا تھا کہ میری مادری زبان کے سب سے بڑے شاعر کے کلام کا یہ بہترین نسخہ تھا جو خود اس شاعر کے وطن عزیز میں دستیاب ہوا"

مرحوم کو دیوان غالب کے بہترین نسخے کی تلاش میں جس دقت سے ناکامی ہوئی اسی وقت سے انہیں یہ فکر پیدا ہو گئی کہ کوئی صورت ایسی ہو کہ اردو شعراء کے دیوان بھی اسی شان اور نفاست کے ساتھ چھپ کر نکلیں جس طرح سے انگلستان اور فرانس جیسے مہذب ممالک میں وہاں کے شعراء کے مجموعے شائع ہوتے ہیں۔

اس خدمت کو انجام دینے کے لئے انہوں نے ہندوستان کے مطابع پر نظر ڈالی تو ان کی سب سے پہلی نگاہ منشی رحمت اللہ رعد مرحوم کے نامی پریس کانپور پر پڑی جس نے دیوان حافظ، مثنوی مولانا روم، آثار الصنادید، مسدس حالی وغیرہ کے نفیس ایڈیشن طبع کرکے اردو فارسی کی کتابوں کے دلفریب اور دلکش نسخے شائع کئے تھے اور اس زمانہ میں نام پیدا کیا تھا، فرانسیسی دوست کی ملاقات کے تھوڑے ہی دنوں بعد انہوں نے منشی رحمت اللہ رعد مرحوم کو ایک خط لکھا جس میں فرانسیسی دوست کی ملاقات کے حوالہ سے استدعا کی کہ وہ "اردو کی اساتذہ کے کلام کے خوش نما ایڈیشن چھاپنے کا انتظام کریں"۔

مئی یا اپریل ۱۹۱۳ء میں جبکہ راس مسعود کا مذکورۂ بالا خط منشی صاحب مرحوم کے پاس پہونچ چکا تھا مجھ سے منشی صاحب سے کانپور میں ملاقات ہوئی۔ منشی صاحب مرحوم ہمارے ملک کے نامور طابع اور ناشر ہی نہ تھے بلکہ وہ اردو کے ایک اچھے ادیب اور جرنلسٹ بھی تھے اور مجھے ۱۸۹۰ء میں جب میں اپنی طالب علمی کے زمانہ میں ان کے اخبار "عالم تصویر" کی نامہ نگاری کرتا تھا ان کی شاگردی کا فخر حاصل ہوا تھا، وہ میرے مضامین کو اپنی اصلاح کے بعد اخبار میں درج کرتے اور اصلاح شدہ اصل مضمون میرے پاس یہ لکھکر واپس کر دیتے کہ "صاحبزادے غلطیوں کی اصلاح کو غور سے دیکھو" ان کے اس شفقت آمیز برتاؤ نے ۱۹۰۳ء میں مجھے صحیح اخبار نویس بنا دیا جس کی وجہ سے ۱۹۰۵ء میں اپنا مطبع نظامی پریس کے نام سے جاری کرنا پڑا۔ پریس کے انتظام میں جب مشکلات پیش آئیں تو منشی صاحب کے مشوروں سے مجھے مدد ملتی رہی، ۱۹۱۳ء کی ملاقات بھی اسی سلسلہ میں ہوئی تھی، اس ملاقات کے بعد جب میں رخصت ہونے لگا تو اثنا گفتگو میں فرمایا :-

" میاں صاحبزادے ایک چیز اور لیتے جاؤ جو تمہارے لئے میں نے محفوظ رکھی ہے "

بکس کھول کر ایک خط نکالا جو اردو میں لکھا ہوا تھا اور وہی خط تھا جو راس مسعود مرحوم نے ان کو دیوان غالب کی طباعت کے متعلق لکھا تھا، فرمایا "کیا تم ان سے واقف ہو جن کا یہ خط ہے ؟" میں نے کہا " یہ خط سر سید مرحوم کے پوتے مسعود کا ہے میں نے ان کو ۱۸۹۴ء میں ان کی بسم اللہ کے دن دیکھا تھا" فرمایا "تم نے جس بچہ کو آج سے بیس سال پہلے دیکھا تھا اب وہ بڑا آدمی ہے، اس کا یہ خط لیتے جاؤ اور اس کے منشاء کو پورا کرو، وہ اردو ادب کا دلدادہ ہے، اور تمہارا بھی یہی مذاق بلکہ یہی پیشہ ہے"۔

میں نے بدایوں آکر دیوان غالب کی طباعت کے متعلق مسعود مرحوم سے مراسلت کا سلسلہ شروع کر دیا انہوں نے لکھا کہ مجھ سے مرادآباد آکر اس بارہ میں سید محمد علی کی کوٹھی پر مل لو۔ سید محمد علی مرحوم اس وقت وہاں ڈسٹرکٹ جج تھے، میں تو مرادآباد پہونچا لیکن اسی روز وہ ایک ضروری تار پہونچنے پر علیگڑھ چلے گئے، مرادآباد میں تو ملاقات نہ ہو سکی لیکن پہلی ملاقات ان سے کچھ دنوں بعد علیگڑھ میں ہوئی اور دیوان غالب کی طباعت کو دلکش اور دلچسپ بنانے کے متعلق انہوں نے ایسے ایسے مفید مشورے دیئے کہ میں حیران رہ گیا کہ اس عمر میں اُن کی نظر حسنِ طباعت اور ترتیب و تصحیح کے متعلق کیسی وسیع ہے، سب سے پہلی بات تو انہوں نے یہ بتائی کہ جو نسخہ چھپے وہ بہترین کاغذ پر جلی قلم سے نہایت خوشخط ہو، صحت کا خاص خیال رکھا جائے اور اشارات املائی سے بھی مزین ہو۔ فرمایا کہ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ اشارات املائی شعر کے مطلب کو بڑی حد تک حل کر دیں گے، چنانچہ پہلا ایڈیشن ان کی ہدایتوں کے مطابق ۱۹۱۴ء میں نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ اس کی پہلی کاپی اُن کے پاس اُس روز پہونچی تھی جب کہ علیگڑھ میں اُن کی شادی کا جلسہ جا رہا تھا، انہوں نے اس کی رسید میں جو خط بھیجا اس میں لکھا "اس نسخہ کو دیکھکر میری خوشی کی انتہا نہ رہی اور شادی کی خوشی دو بالا ہو گئی "۔

اسی زمانہ میں آپ نے ادب اردو کی ترقی کے لئے ایک اسکیم بنائی اور اس کو عملی صورت دینے کے لئے نظامی پریس بدایوں

کا انتخاب کیا، اس کے متعلق اپنے احباب کے نام جنھیں آپ نے اردو ادب کی ترقی کا حامی خیال کیا تھا ایک گشتی خط جاری کیا۔ اس میں آپ نے اس اسکیم کو اپنے ان اثرات کا مرہون منت بتایا تھا، جو ان کے قلب پر اپنے فرانسیسی دوست کے لئے دیوان غالب کے بہترین اور خوشنما نسخے کے حصول کی ناکامی کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے، اس اسکیم کے تحت جب دیوان غالب کا دوسرا ایڈیشن منشرح نکلا تو اُن کی سفارش پر اعلیٰحضرت تاجدار دکن نے اس اسکیم کی سرپرستی قبول فرمائی اور جو کتابیں اس سلسلہ میں شائع ہوں اُن کو سلسلۂ آصفیہ کے نام سے موسوم کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی، دیوان غالب کے کئی ایڈیشن، میرانیس کے تمام مراثی تین جلدوں میں، مولانا طباطبائی کے مدون کئے ہوئے اور خواجہ میر درد کا دیوان نواب صدر یار جنگ کے مقدمہ کے ساتھ شائع ہوا مگر ان کتابوں کی نکاسی کی رفتار خلاف توقع سست رہی جس کا تذکرہ انہوں نے بنارس کے خطبۂ صدارت میں مندرجۂ ذیل الفاظ میں افسوس کے ساتھ کیا :۔

"اردو شعراء کا کلام جس ذلیل حالت میں شائع ہوتا ہے اس کی ذلت کو دور کرنے کے خیال سے چند سال ہوئے کہ دوستوں کی مدد سے میں نے اپنے ایسے بڑے بڑے شعراء کے کلام کو جیسے کہ میر اور انیس عمدہ چھپے ہوئے نسخوں میں شائع کرنا شروع کیا۔ لیکن مجھے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ میرے ہم وطن اس کے لئے تو تیار ہیں کہ ردی ناولوں پر جو تیسرے درجہ کی انگریزی میں لکھے گئے ہوں سات روپیہ خرچ کر دیں لیکن خود اپنے بڑے مصنفوں کی تصانیف کے دیدہ زیب نسخوں پر چار روپے بھی خرچ کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ ہم دوسروں سے یہ توقع کرنے کا کیا حق رکھتے ہیں کہ وہ ہمارا احترام کریں جب کہ ہم خود اپنی چیز کا احترام کرنے کے لئے تیار نہیں"۔

حیدرآباد پہنچتے ہی اعلیٰحضرت حضور نظام کی حکومت کی یہ تجویز کہ اعلیٰ تعلیم کو ملکی زبان میں دینے کے لئے ایک یونیورسٹی قائم کی جائے مسعود صاحب کے سامنے آئی، انھیں اردو ادب سے طبعی دلچسپی تھی اور وہ اس مسئلہ پر عرصہ سے غور کر رہے تھے اب ارکین سلطنت آصفیہ سے تبادلۂ خیال کرنے کے بعد انہیں کامل یقین ہو گیا کہ بدنصیب ہندوستان دوسرے مہذب ممالک کی طرح اس وقت تک تعلیم یافتہ نہیں بن سکتا اور نہ اس کے چہرے پر سے جہالت اور ناخواندگی کا بدنما داغ دور ہوگا جب تک کہ ملکی زبان میں اعلیٰ التعلیم نہ دی جائے، وہ یہ کہا کرتے تھے کہ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ مادری زبان میں اعلیٰ التعلیم پاکر جب لوگ نکلیں گے تو عوام میں علمی خیالات کی لہر خود بخود دوڑ جائے گی اور اس طرح سے ہندوستان میں عام ناخواندگی کا جو دور دورہ ہے، وہ دور ہو جائے گا، موجودہ تعلیم کی مذمت جو غیر ملکی زبان میں دی جاتی ہے وہ بلا خوف لومۃ لائم اکثر پبلک جلسوں میں کیا کرتے تھے ۱۹۳۶ء میں سینٹ ہاؤس کلکتہ میں آپ نے فرمایا تھا:۔

"جن لوگوں نے ہمارے نظام تعلیم کو مرتب کیا ہے وہ اس میں ایک ایسے اصول پر عمل کرنے کے مجرم ہوئے ہیں جس کی زبانی تبلیغ بھی وہ اپنے ملک میں نہیں کر سکتے تھے، انہوں نے اس بدیہی بات کی طرف توجہ نہیں کی کہ ہر

شخص اپنی مادری زبان ہی کو سہولت کے ساتھ سمجھ سکتا ہے اور اگر کسی کو بغیر وقت ضائع کئے کوئی علم حاصل کرنا ہے تو اس مقصد کے لئے مادری زبان کا استعمال لازم ہے ۔"

حیدرآباد کی نظامت تعلیم کے فرائض کے ساتھ ساتھ انہیں نواب عماد الملک بہادر کے انتقال کے بعد انجمن ترقی اردو کا صدر منتخب کیا گیا ۔ اردو ادب کے وہ ہمیشہ سے حامی تھے ۔ اب ان کو اس شعبۂ اردو ادب کی عملی خدمت کرنے کا موقع ملا ۔ اس انجمن کے لئے انہوں نے انگریزوں تک سے چندے وصول کئے اور نہ صرف انگریزوں سے بلکہ جاپانی قوم کے علم دوست لوگوں کو جاپان کے قیام کے زمانہ میں انجمن کا ممبر بنایا ۔ جاپان کے نظام تعلیم کے متعلق جاپان سے واپس آکر انہوں نے جو رپورٹ سرکار نظام کو دی تھی اس کا اردو ترجمہ "جاپان کا تعلیمی نظم ونسق" کے نام سے انجمن ترقی اردو نے شائع کیا ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے جاپانی قوم کے علمی اور صنعتی ترقی کے راز کو معلوم کر لیا تھا ۔

اردو ادب اور شاعری میں جو پاکیزہ ذوق اور وسیع نظر وہ رکھتے تھے ، اس کا ثبوت اردو شعرا کے تذکرے سے ملتا ہے جو انہوں نے ۱۹۲۱ء میں " انتخاب زرین" کے عنوان سے لکھا تھا ۔ اور نظامی پریس بدایوں نے شائع کیا ، اس تذکرہ کی تمہید میں اردو شاعری کی نسبت انہوں نے لکھا ہے ،

> " یہ مجموعہ انتخاب زرین کے نام سے جو آج پیش کیا جاتا ہے نہ صرف ناظرین کے تفنن طبع کا سبب ہوگا بلکہ ان لوگوں کو جو اردو نظم کی خوبیوں کے ایک گونہ منکر ہیں ثابت کرے گا ۔ کہ وہ اس معاملہ میں غلطی پر تھے اور اس مجموعہ کے مطالعہ سے ظاہر ہو جائے گا کہ اردو شاعری کے بہترین حصہ کا کسی دوسری قوم کی اچھی سے اچھی نظم سے مقابلہ کیا جائے تو اول الذکر کا درجہ گرا ہوا نہ رہے گا ۔ درحقیقت جب اس بات پر غور کیا جاتا ہے کہ اردو زبان ہے جس کا شمار زمانۂ حال کی نوزائیدہ زبانوں میں ہے تو یہ ایک معجزہ معلوم ہوتا ہے کہ اس قدر قلیل مدت میں اردو نظم کو وہ جلا دی گئی جو مہذب اور شستہ خیالات کے لئے اصل الاصول ہے ۔"

ایڈورڈ مارگن فارسٹر جو ایک مشہور انگریزی ناول نویس ہیں مسعود مرحوم کے انتقال کے بعد ایک مضمون میں لکھتے ہیں "یہ نکتہ فراموش نہیں ہونا چاہئے کہ روحانی طور پر مسعود شاعر تھے" ۔ اس انگریز ادیب نے یہ جو کچھ لکھا ہے اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ مرحوم کو فارسی ، اردو ، انگریزی ، اور عربی شعراء کے ہزاروں بلکہ لاکھوں اشعار زبانی یاد تھے ۔ اور وہ انہیں نہایت شوق ، جوش اور برجستگی کے ساتھ پڑھا کرتے تھے ، لیکن میں نے ایک دفعہ ان سے سوال کیا کہ " جب شعر وسخن سے آپ کو اس قدر دلچسپی ہے تو آپ شعر کیوں نہیں کہتے ؟" فرمایا " میں نے ایک دفعہ چند فارسی اشعار کا انگریزی نظم میں ترجمہ کرنے کی ضرور کوشش کی تھی لیکن میری طبیعت شاعری کی پابندیوں کی زحمت اٹھانے کی متحمل نہیں ہوئی اس لئے میں نے اس طرف کبھی توجہ نہیں کی" اس میں شک نہیں کہ اشعار کو زبانی یاد رکھنے میں ان کا حافظہ اس قدر قوی تھا کہ لوگ تعجب کرتے تھے ، مولانا حالی کے صد سالہ جوبلی کے موقع پر ایک پرائیویٹ صحبت میں سر اقبال کی موجودگی میں جب ان کے اشعار مسعود نے زبانی سنانا شروع کئے تو ایسا تار بندھا کہ

سر اقبال کو یہ کہنا پڑا کہ "آپ کو میرا اتنا کلام یاد ہے کہ خود مجھے بھی اتنا زبانی یاد نہیں"

رائٹ آنریبل ایچ اے ایل فشر انگریزی کے مشہور ادیب نے ان کے ادبی کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا "سچ یہ ہے کہ ایسی نمایاں قوت اور ایسے دل کشی والے انسان سے ٹھیک ٹھیک ایسے ہی کارناموں کی توقع ہونی چاہیئے تھی"

اگر مسعود مرحوم کی ایک دوسری تالیف کا جس نے اردو ادب میں ایک قابل قدر اضافہ کر دیا اس مضمون میں ذکر نہ کیا جائے تو نا انصافی ہوگی۔ یہ کتاب سر سید مرحوم کے خطوط کا مجموعہ ہے جسے ۱۹۲۲ء میں مسعود نے تالیف کیا تھا اور جو مولوی عبداللہ جان صاحب وکیل سہارنپور کے مقدمہ کے ساتھ نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوئی۔ مقدمہ نگار مرحوم نے بالکل صحیح لکھا ہے: ـ

"اگر سر سید راس مسعود مکتوبات جمع کرنے اور ان کے چھپوانے کا اہتمام نہ کرتے تو بلا شبہ مزید مدت گذرنے پر سید اعظم رحمۃ اللہ کی ان تحریرات کے بیش بہا ذخیرہ کا وجود بھی دنیا میں قائم نہ رہتا اور ملک اس کے استفادہ سے ہمیشہ کو محروم رہ جاتا۔ سید راس مسعود کا یہ ساری قوم کے سر پر احسان ہے کہ انہوں نے اس ضروری کام کا بوجھ اپنے کندھوں پر لے کر قوم کو اس کے اخلاقی فرض سے سبکدوش کر دیا"

مسعود مرحوم کا ذاتی کتب خانہ جس میں ہر زبان کی کتابیں موجود تھیں، نہایت نفیس تھا، صرف یہی نہیں کہ کتابیں الماریوں کی ترتیب و زینت بنی ہوئی ہوں بلکہ ان کے مطالعہ سے ان کے دماغ میں ان کے مضامین کا بڑا حصہ موجود تھا بات بات پر وہ مشہور مصنفین کے اقوال کے حوالے دیتے تھے۔ خلاصہ یہ کہ ان کی مجالست ہر ادبی ذوق والے کے لئے ایک پر لطف صحبت ہوتی تھی، خواجہ غلام السیدین نے جنھیں علیگڑھ میں ان کی وائس چانسلری کے زمانہ میں ان کے ساتھ کام کرنے کا موقعہ ملا تھا۔ ایک مضمون میں بہت صحیح لکھا تھا: ـ

"طلبا جو کم از کم خیالات اور جذبات کی دنیا میں بلندی اور پاکیزگی، اور خلوص کے جویا ہوتے ہیں جن کی فطرت ادب میں اپنے ذوق جمال کی تسکین چاہتی ہے ان کی (سر راس مسعود کی) صحبت کو ایک ادبی نعمت تصور کرتے تھے"

واقعہ یہ ہے کہ اردو ادب کی ترقی کی بہت سی اسکیمیں مرحوم کے انتقال سے عالم خیال میں رہ گئیں اردو ادب کو ان کی رحلت سے ناقابل تلافی نقصان پہونچا۔

یہ اسکیمیں کیا تھیں اس کی تفصیل مشکل ہے کیونکہ مجھے ان کی زندگی کے آخری دو تین سالوں میں جبکہ وہ بھوپال رہے۔ ان سے ملاقات کا موقع نہ ملا۔ وہ اپنی اسکیموں کا ذکر اپنے گرد و پیش کے لوگوں سے اس وقت کر دیتے تھے جب کہ کوئی تجویز ان کے دماغ میں آتی تھی، انتقال سے تقریباً ایک سال پہلے غالباً ۱۹۳۶ء کے آخر میں انہوں نے مجھے لکھا تھا کہ "مجھ سے بھوپال آکر ملو میں نے اردو کے متعلق ایک نئی اسکیم سوچی ہے اس کا حال زبانی کہوں گا" صرف خط ہی نہیں لکھا بلکہ بدایوں کے ایک معتمد شخص ان سے بھوپال جا کر ملے تو ان کے ذریعہ سے زبانی پیغام بھی بھیجا لیکن یہ وہ زمانہ تھا کہ خود علیل تھا اس

لیے ملاقات کی نوبت نہ آئی یہاں تک کہ ۳۰ جنوری ۱۹۴۷ء کو وہ اردو ادب کی محبت اور اس کی اسکیموں کو دماغ میں لیتے ہوئے ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔

یہ مضمون ختم نہ کرنے پایا تھا کہ انجمن ترقی اردو بھوپال کے معتمد حضرت مائل نقوی کا ایک مضمون "زمانہ" میں نظر سے گزرا جس میں انہوں نے سر راس مسعود کی ان دلچسپیوں کا ذکر کیا ہے جو بھوپال کی ادبی فضا میں ان سے ظہور میں آئیں انہوں نے لکھا ہے کہ مرحوم نے اپنے ذاتی صرف سے وہاں دارالتصنیف کی بنیاد ڈالی تھی اور اس ادارہ کو وہ بڑے پیمانہ پر عملی صورت اس طرح دینا چاہتے تھے کہ کسی پر فضا پہاڑی مقام پر ایک درجن کوٹھیاں تعمیر کرائی جائیں۔ اور ہر کوٹھی کو علم و ادب کے کسی شعبہ سے منسوب کر کے اسے جملہ لوازمات سے مکمل کر دیا جائے۔ پھر ہر فن کے ماہر کی خدمات کم از کم ڈھائی سو روپیہ ماہانہ پر حاصل کی جائیں اور ان سے یہ معاہدہ کر لیا جائے کہ ہر سال چھ ماہ تمام علائق سے منقطع ہو کر کوٹھی میں قیام کریں اور تین سال کے بعد اپنے فن پر ایک رسالہ تیار کر دیا کریں، انہوں نے اس اسکیم کو عملی صورت دینے کے لئے پندرہ لاکھ روپیہ کا تخمینہ کیا تھا اور فرمایا تھا کہ وہ اس رقم کو آسانی سے جمع کر لیں گے جگہ کا بھی انتخاب کر لیا تھا جس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ یہ بھی کہا تھا کہ میری زندگی کا یہ آخری کارنامہ ہوگا لیکن مشیت کو یہ منظور نہ تھا مائل صاحب کے اس مضمون کو پڑھ کر مجھے مرحوم کے اس خط کا خیال آ گیا جو ۱۹۳۶ء میں انہوں نے مجھے بھوپال بلانے کے لئے بھیجا تھا کہ ہو نہ ہو اس اسکیم کے متعلق مشورہ کے لئے میری طلبی ہوئی ہوگی جس کی نوبت نہ آئی معلوم نہیں ڈاکٹر مولانا عبدالحق "بابائے اردو" سے بھی مرحوم نے اس اسکیم کا ذکر کیا تھا یا نہیں۔ میرے خیال میں ان سے بھی مشورہ کا موقع نہ ملا اور یہی وجہ ہے کہ اپنے دوستوں کے مشورہ کے بغیر اس اسکیم کو پبلک کے سامنے نہ لا سکے اور دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اب اردو ادب کے حامیوں کا بالخصوص بزرگان علیگڑھ کا یہ فرض ہے کہ وہ اسکیم پر غور کریں۔

(بقیہ ص ۲۴)

[illegible]ملیت مانوس ہے اور ذریعہ کیف و تاثر۔

پس ادب میں حقیقت کو بہر حال برقرار رکھا جاتا ہے مگر اصلیت و واقعیت کو تاثر کے پیش نظر و بیشتر تبدیل کئے بغیر کام نہیں [illegible]تا۔ یہ اس وجہ سے کرنا پڑتا ہے کہ ذہنی کینوس پر جو منظر مرتب ہو اس میں خلا واقع نہ ہو۔ قوت متخیلہ، قوت سامعہ و باصرہ کی مدد سے [illegible]ت الشعور کے خزانہ سے اشیاء بر آمد کر کے ذہنی کینوس پر مکمل تصاویر و مناظر پیش کرے تاکہ پورے طور پر کیف و حظ حاصل ہوا [illegible]ر خاطر خواہ اثر مرتب ہو۔

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

انجمن کی مطبوعات

کتاب	مصنف	قیمت
پاپولر انگریزی اردو ڈکشنری۔	از بابائے اردو	۵۰-۵ روپے
وضع اصطلاحات۔	وحیدالدین سلیم	۰۰-۷ "
داستان زبان اردو۔	ڈاکٹر شوکت سبزواری	۰۰-۵ "
کیفیہ۔	پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی	۵۰-۴ "
سید احمد خاں، حالات و افکار۔	از بابائے اردو	۰۰-۴ "
غالب، فکر و فن	ڈاکٹر شوکت سبزواری	۰۰-۵ "
تلخیص الاردو (رسالہ "اردو" کا انتخاب)		۵۰-۵ "
مقالات گارساں دتاسی حصہ اول		۰۰-۱۰ "
اردو تھیٹر (تین جلدوں میں)	ڈاکٹر عبدالعلیم نامی۔ قیمت فی جلد	۰۰-۷ "
سعادت یار خاں رنگین (حالات و کلام)	ڈاکٹر صابر علی خاں	۷۰-۵ "
محمد حسین آزاد (جلد اول۔ حالات)	از ڈاکٹر اسلم فرخی	۰۰-۸ "
محمد حسین آزاد (جلد دوم۔ ادبی کارنامے)	" " "	۰۰-۱۵ "
جلال لکھنوی۔ (حالات و انتخاب کلام)	ڈاکٹر محمد حسن	۰۰-۳ "
سرشار کی ناول نگاری۔	ڈاکٹر لطیف حسین ادیب	۵۰-۶ "
سودا۔ (حالات اور تبصرہ بر کلام)	شیخ چاند مرحوم	۰۰-۷ "
نیا ادب۔	پنڈت کرشن پرشاد کول	۵۰-۴ "
آرٹ ان اردو پوئٹری (انگریزی)	شہاب الدین رحمت اللہ	۷۰-۶ "
فن شاعری (بوطیقا)۔ ارسطو۔	مترجم پروفیسر عزیز احمد	۵۰-۲ "

انجمن ترقی اردو۔ بابائے اردو روڈ کراچی

رفیق خاور

اردو شاعری کا مزاج

شاعری کی کائنات تین بنیادی اصناف پر مبنی ہے، گیت، غزل اور نظم۔ جو باہم مل کر ایک ابدی مثلث بناتی ہیں۔ ان میں سے گیت قاعدہ ہے اور باقی دو اصناف اضلاع ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اس تثلیث کے حدود میں اردو شاعری کو زیادہ سے زیادہ پھیلاتے ہوئے اسے زیادہ سے زیادہ سمٹانے کی کوشش کی ہے۔ اور وہ یوں کہ اول سے آخر تک اس کی تمام پہنائی کا افقی مشاہدہ کرتے ہوئے جو اس کی تاریخ سے عبارت ہے، اس کا عموداً جائزہ لیا ہے تاکہ اس کے اہم نوکیلے نکات کو نمایاں کیا جا سکے۔

باطن اور خارج، شاہد اور مشہود کے اس تعلق سے ایک ثنویت خود بخود ابھر آتی ہے۔ ایک مشرقی نقاد جس کے ذہن میں گوناگوں مغربی علوم و معارف خصوصاً نسلیات، عمرانیات اور نفسیات نے تحرک پیدا کیا۔ ایک تخلیقی ابال مغرب سے فروغ نظر حاصل کرنے کے بعد اپنے ادب کو ایک نئے زاویۂ نگاہ سے دیکھنے اور پرکھنے پر آمادہ ہوا۔

تشکیل نو کا یہ تقاضا دور جدید کی بیخ و بنیاد میں شامل ہے۔ یعنی ہمارے یہاں اہل مغرب کے متحرک نظام سے داخلی و تہذیبی سطح پر جو تصادم ہوا ہے اس کے پیش نظر ہم اپنے نظام حیات اور نظام فکر و عمل کے ساتھ ساتھ ادب و فن اور نقد و نظر میں کیسے تغیر پیدا کریں۔ یہ ایک تدریجی عمل تھا جس میں بلند تر مدارج تک رسائی رجعت اور انجماد کی راہ سے ہونے کے باعث خاصی دشوار تھی۔ وزیر آغا نے جس اہتمام اور سعی بلیغ سے یہ مہم سر کی ہے وہ جوئے شیر لانے کے مترادف ہے اور اس کا اندازہ ہر ورق سے ہوتا ہے۔ سب سے کٹھن مرحلہ علمی و ذہنی حیثیت سے جدید ترین عالمی سطح تک رسائی۔ مغربی علوم اور ادب و نقد پر کما حقہ عبور کے بغیر ناممکن ہے کیونکہ اس کے معنی خارجی اثرات کے جذب و تحلیل کے بعد ایک ایسے رجحان کی نمود ہے جو خارجی اکتسابات پر حادی ہو کر غور و فکر کا باعث ہو اور آسمان سے زمین یعنی اپنی حیات اور ادب و فن کی طرف رجوع ہو۔ وزیر آغا کے یہاں اس مقام تک پہنچنے کے لئے پوری کاوش نمایاں ہے۔

سب سے اہم سوال لائحۂ عمل کا ہے۔ آیا ہم اپنی توجہ صرف اُس امر پر مرکوز کریں جو مقصود بالذات ہے یعنی

اردو شاعری کا مزاج یا ان تمام عوامل کی بھی توضیح کریں جو اس کی تشکیل میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں ۔ بنیاد بہرحال مقدم ہے اور اگر ہم عمرانی، نفسیاتی اور دیگر اسباب کا سراغ لگا سکیں جو ہماری شاعری کو ایک مخصوص وضع عطا کرنے کا باعث ہوئے ہیں تو اس سے یقیناً ہمیں صحیح نتائج اخذ کرنے میں بڑی مدد ملے گی ۔

مصنّف نے یکے بعد دیگرے ان تمام عوامل کی مفصل توضیح کی ہے جن سے اردو شاعری کا مزاج متعین ہوا. چونکہ یہ اوپری سطح سے پاتال تک جانے کا معاملہ تھا اس لئے تاریخ، عمرانیات اور نفسیات کے بوقلموں مسائل خود بخود اُٹھ کھڑے ہوئے اور انہیں شرح و بسط سے زیر بحث لانا پڑا ۔ اس سے عجب نہیں جنگل میں کھو جانے کا احساس پیدا ہو۔ مگر اس سے کوئی مفر نہیں ۔ اگر شاعری محض دل و دماغ کی پیداوار نہیں اور ان ثنویتوں سے ابھرتی ہے جو اس کتاب کا سنگ بنیاد ہیں تو لامحالہ ان مآخذ کا ذکر لازم ہے جن سے یہ ثنویتیں ہیں ۔ مجموعی طور پر یہ ساری کاوش ایک طویل توجیہہ یا حسن تعلیل معلوم ہوتی ہے ۔ اور کہیں اس پر تاویل کا گمان بھی گزرتا ہے ۔ سوال صرف نوعیت کا ہے ۔ ورنہ توجیہہ کی حد تک دینی، مادی، سائنسی، ہر قسم کی توجیہیں ممکن ہیں ۔ مثال کے طور پر قدیم و جدید سماویات (ہیئت و نجوم) کی بنا پر حیات و کائنات کی مکمل توجیہات کی گئی ہیں اور منطقی طور پر اتنی ہی تسلی بخش ہیں ۔

سوال صرف اتنا ہے کہ کوشش فی نفسہٖ کتنی عالمانہ، محققانہ، معتبر اور خیال انگیز ہے ۔ اس پر مصنف کی ذہانت، ژرف نگاہی، خوش ذوقی اور تحقیقی صلاحیت کی کس حد تک چھاپ ہے ۔ اس بارے میں اختلاف کی شاید ہی گنجائش ہو ۔ نظری اعتبار سے بھی اختلاف کی گنجائش اس صورت میں ہے کہ ان سائنسی، عمرانی اور نفسیاتی نظریات کو محل نظر ٹھہرایا جائے جو فی زمانہ مقبول ہیں جن کی بنیا مشاہدہ و تحقیق پر ہے اور جن سے بالالتزام اخذ نتائج کیا گیا ہے لہٰذا ان حقائق و بصائر کو تمام و کمال جان لینے کے بعد جن کی مصنف نے توضیح کی ہے ۔ ہم خیالی کا سوال علمی استعداد، ناقدانہ بصیرت اور تحقیقی صلاحیت سے بالکل جدا ہے ۔ اس سلسلے میں قاری کے فہم و شعور کے مطابق رخنوں کا احساس ناگزیر ہے ۔ مثلاً یہ بیان کہ " اسی طرح سردی ۔ بہار ۔ گرمی اور خزاں دائرہ ازلی و ابدی ہے ۔ چاند کی تگ و تاز بھی ایک دائرے کے تابع ہے ۔ چاند ہوتے ہوتے مکمل ہوتا ہے ۔ پھر آہستہ آہستہ گھٹنے لگتا ہے اور ایک رات ایسی بھی آتی ہے کہ اس کا وجود تک باقی نہیں رہتا ۔ اس رات عدم (یا رحم مادر) سے دوبارہ جنم لیتا ہے اور ایک بار پھر دائرے کے عمل سے گزرتا ہے ۔" ظاہر ہے کہ سردی، بہار، گرمی اور خزاں کا دائرہ عالمی حیثیت سے نہ ازلی و ابدی ہے نہ یکساں ۔ اسکیموں کی برفانی دنیا میں بہار و خزاں کا ذکر کہاں ؟ پھر چاند کا گھٹنا بڑھنا تمام تر انسانی مشاہدہ کی حد تک ہے وہ نہ مرتا ہے نہ دوبارہ جنم لیتا ہے، یا پھر دائرے سے گزرتا ہے ۔ لہٰذا رات، عدم یا رحم مادر کا تصور محض خیالی ہے ۔

اسی طرح یہ قول کہ قدیم انسان " حال" کے جنگل کا باسی ہے ۔ چونکہ وہ پودے اور جانور کی طرح جنگل سے پوری طرح

منسلک ہے۔ اس لئے اس کے ہاں چھونے اور سننے کی حسیات بہت تیز ہیں۔ یوں بھی جنگل اس کی نظروں کے سامنے ایک دیوار سی کھڑی کر دیتا ہے۔"

قدیم انسان صحراؤں، پہاڑوں اور برفستانوں کا باسی بھی رہا ہے۔ اس کلیہ کا اطلاق ان پر کیسے ہو؟

غزل کے سلسلے میں افریشیا سے استدلال کیا گیا ہے اور اس صنف کو یورپ کے برخلاف یہاں کی مخصوص پیداوار قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ یہیں زرخیزی اور جز کے مقابلے میں کل کا غلبہ رہا ہے اور غزل نے اُس وقت جنم لیا، جب جز کل سے ستابی کر کے پھر اسی کے ساتھ چپک گیا۔ اگر افریشیا واقعی افریشیا ہے تو اس میں افریشیا بھی ہے اور بے شمار ایشیائی ممالک بھی، لیکن غزل صرف ایران میں پیدا ہوئی اور وہ بھی ابتدائً نظم کی صورت میں کیونکہ غزلِ مسلسل درحقیقت نظم ہی ہے۔ ہندوستان، افغانستان اور ترکی میں غزل کوئی خود رو صنف نہیں۔ خود ایران میں جز (شعر) کی کل سے مغائرت قافیہ کی مرہونِ منت ہے۔ جس نے شاعروں کی توجہ کو بتدریج مسلسل جذبہ سے پرے ہٹا دیا۔ اگر جذبہ کو واقعی اس میں کوئی دخل تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ غزل میں جذبہ کا وجود شروع سے لے کر آج تک تقدیر سے ہے اور اتفاقات ہی سے رہا ہے۔ اس سلسلہ میں قوی احتمال یہ ہے کہ نظریہ حقیقت پر غالب آگیا ہے۔ اور معاملہ کو جوں توں کر کے توجیہہ کے چوکھٹے میں فِٹ کرنا ہی پڑا۔

کتاب میں برصغیر کے معاشرے کو برابر ٹھہرا ہوا زرعی معاشرہ قرار دیا گیا ہے جس میں باہر سے آنے والے خانہ بدوش ہی تحرک پیدا کرتے رہے ہیں۔ "ANTIQUITIES OF INDIA" کی (MAURICE) میں اس کے برعکس ہندی کلچر کو قدیم ترین زمانے میں چار دانگ عالم میں پھیلتا ہوا دکھایا گیا ہے۔

یہاں یہ دہرانے کی ضرورت نہیں کہ مصنف نے گیت کو معاشرے کی کس حالت کی پیداوار قرار دیا ہے اور نظم کے بروئے کار آنے کی شرط کیا ٹھہرائی ہے۔ سوال یہ ہے کہ گیت برصغیر یا افریشیا تک ہی محدود نہیں۔ یورپ میں بھی چپہ چپہ گیتوں کی صدا سے معمور رہتا ہے۔ مانا کہ گیت اُس وقت جنم لیتا ہے جب سوسائٹی اپنے بوجھل جسم میں روح کی پہلی "کروٹ" محسوس کرتی ہے مگر یہ کروٹ تو کہیں بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ کیوں نہ کہا جائے، جو زیادہ آسان بھی ہے اور قابلِ فہم بھی، کہ گیت ایسے شدید احساس کی پیداوار ہے جس سے الفاظ خود بخود موسیقی کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں؟

غزل کے شعر اور نظم میں احساس کا فرق ہے یا کنواس کا؟ مصنف کی توجیہیں بڑی خیال انگیز بھی ہیں اور دلآویز بھی۔ بعض اوقات وہ دل کو بہت لگتی بھی ہیں اور انسان اس کشمکش و پیچ میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ انھیں قبول کرے یا نہ کرے۔ مگر غزل اور نظم کے باہمی فرق کی توجیہیں جتنی پرکشش ہیں اتنی ہی وسوسہ آفریں بھی ہیں۔ غزل کل کی جانب سے مایہ لیتی ہے۔ ہر اندر کی طرف سے مایہ کی طرف حسن بھرتی ہے اور اس حسن کا سارا زور رانگ الہامی

کیفیت کے باعث ہے ۔ اسی لئے غزل کا طریق استخراجی ہے ۔ چونکہ یہ آغاز ہی کل سے کرتی ہے اور اسے کل سے اخذ ہوئی قوت براہ راست اپنے اظہار کا وسیلہ بناتی ہے ۔ اس لئے اس کے شعر کا تاثر بھی فوری ہوتا ہے ۔ نظم استقرائی طریق کے تابع ہے ۔ اس کا طریق تحلیلی اور تجزیاتی ہے ۔

کیا مرثیہ (انیس و دبیر کی مخصوص صنف) کل سے آغاز نہیں کرتی اور اس سے حاصل شدہ قوت کو وسیلۂ اظہار نہیں بناتی ؟ کیا اس کا سارا زور ایک الہامی کیفیت کے باعث نہیں ؟ کیا اس کا اثر ہر ہر شعر اور کل نظم میں فوری نہیں ؟ استخراج کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ۔ یہ اس غلط فہمی کی بنا پر ہے کہ غزل کسی نکتہ یا خیال کی شکل میں نتائج پیش کرتی ہے ۔ سوال حسن تاثر کا ہے جو کبھی جذباتی ہوتے ہوئے وجد و کیف پیدا کرتا ہے اور کبھی غیر جذباتی ہوتے ہوئے کسی حکیمانہ نکتہ ، نازک خیالی ، موشگافی یا پند و نصیحت کا روپ دھارتا ہے ۔ غزل کی کل سے وابستگی کا مغالطہ اسکی تعمیم سے پیدا ہوا ہے جس میں معین علامات اور مضامین برتے جاتے ہیں لیکن جیسا کہ خود مصنف نے آگے چل کر کہا ہے ، جدید غزل میں یہ طریقہ موقوف ہو گیا ہے اور جیسے نظم میں بیان کی روش آزاد ہے اور اس کے ساتھ علامات اختراعی ہیں اسی طرح غزل میں بھی ہے ۔ مثلاً

طناب خیمۂ گل تھام ناصر
آج ہم ساتواں در کریں گے
نہر کیوں سو گئی چلتے چلتے

نظم میں تحلیل ، تجزیہ یا استقرا — اس میں بھی حقیقت سے زیادہ شوخیٔ فکر کو دخل ہے ۔ فرق صرف اجزا کے ربط باہمی اور نظم و ترتیب (INTEGRATION) کا ہے جو نظم میں اس لئے وسیع ہے کہ وہ طویل بھی ہے اور مسلسل بھی ۔ اور غزل کے اشعار میں روابط سمٹے ہوئے ہیں ۔ گویا فرق درخت اور بیج کا ہے پتے ، شاخیں اور تنا ، بیج کے اندر جوہری شکل میں مضمر ہیں ۔ اور نظم میں واشگاف طور پر ۔ غزل کا شعر ہے

حسینوں میں ہیں کچھ وہی حسن والے
کہ جو حسن کو عارضی جانتے ہیں

اور نظم "حقیقت حسن" بھی اسی کی ترجمانی ہے ۔ کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ غزل کے شعر میں شاعر (دونوں کا مصنف اقبال ہی ہے) نے کل سے انفرادیت کی طرف رجوع کیا اور نظم میں یہ روش خود بخود اس کے برعکس ہو گئی ؟ نظم کے اشعار کو فرداً فرداً لیا جائے تو ان سے بھی قوت چھلک چھلک پڑتی ہے ۔ الہام غزل اور نظم دونوں میں یکساں ہے ۔

عمرانیات ، نفسیات اور نسلیات کے طویل چکر لگانے کے باوجود مجموعی طور پر نقاد کا موقف یہی قرار پاتا ہے کہ ماحول اور شاعری یا زندگی اور شاعری میں ایک بنیادی ، ناگزیر تعلق ہے ۔ مشکل یہ ہے کہ خود حالات یا زندگی کسی معین

رہا ہو جاتے ہیں۔ غزل اپنی کلیت کے باوجود اسی آزادہ روی اور لاابالیانہ پن ہی کی مظہر رہی ہے کیونکہ اس نے حقیقی احساسات سے کہیں زیادہ خیال آرائی، مضمون آفرینی اور تفنن پر زور دیا ہے۔ حالی کے "مضامین خیالی" یاد رکھیں۔ بے شمار نظمیں ایسی ہیں جو اعلیٰ شاہکار ہوتے ہوئے اس کرب باطنی سے بیگانہ ہیں جسے مصنف نے شاعری کی کسوٹی مقرر کیا ہے مثلاً "کیٹس کی 'لامعہ' LA BELLE DAME SANS اور کولرج کی "ANCIENT MARINER" اور کرسٹابل۔ ڈرامے خصوصاً میڈیاں، کسی کرب کی نشان دہی نہیں کرتیں۔ بعض بہترین نظموں میں کرب ایسی انفعالیت یا شدت کا باعث ہوا ہے جو پیدا ہونے کی بجائے پنہاں ہوتا تو زیادہ فن کارانہ ہوتا۔ "سمندر کا بلاوا" میں داخلیت کی ادتو ضرور دوڑی ہوئی ہے لیکن کیا شعری رچاؤ بھی اسی شدت سے ہے؟۔ اپنی بھرپور رمزیت اور معنویت کے باوجود جس کی اہمیت اپنی جگہ پر ہے، کیا اس میں شاعری سمندر ہی کی جھاگ کی طرح چھچھلتی ہوئی نہیں، اور اس کی بندش۔ ڈھیلی ڈھالی، میکانی نظم کی سی بندش:

"مرے پیارے بچے، مجھے تم سے کتنی محبت ہے۔ دیکھو، اگر یوں کیا تو برا مجھ سے بڑھ کر نہ کوئی بھی ہوگا۔ خدایا خدایا"

محض داخلیت پر اتکاز کہاں تک شاعری کا صحیح پیمانہ ہے اور اس نے مصنف کی کس حد تک رہنمائی کی ہے ڈاکٹر خالد پر تبصرہ سے عیاں ہے۔ جن معنوں میں وزیر آغا داخلیت کے قائل ہیں۔ خالد اس سے بہت دور ہے۔ "کتبہ" اور "حسن کوزہ گر" دونوں شاعر کی اکثر نظموں کی طرح ترجمہ ہیں اور ان کا محرک کوئی اشتراک احساس بھی نہیں، بلکہ مشغلۂ فن ہے اس کے یہاں فرد کی کلبلاہٹ رعنائی خیال سے زیادہ نہیں۔ دراصل خالد اس نئے انداز فکر کا نمائندہ ہے جس کا مطمح نظر فن یعنی جمالیاتی پیشکش ہے اسی لئے راشد نے اپنے ایک مضمون میں اس سے صرف نظر کیا ہے۔ اگر مصنف اپنے نظریے کے شکنجے میں اس قدر جکڑا ہوا نہ ہوتا تو شاید وہ اس حقیقت کو پالیتا کہ شاعری کا جدید ترین رجحان ایک ایسا آزاد شعور ہے جو وارستۂ ہر مشرب ہے اور اقبال یا ترقی پسندوں اور نظریہ پسندوں کے گروہ سے بہت آگے نکل چکا ہے۔

بایں ہمہ جہاں تک پس منظر کا تعلق ہے، مصنف نے برصغیر اور افریشیا نیز عالمی تاثر کے جو نوکیلے پہلو اجاگر کئے ہیں وہ اسی کا حصہ ہیں ماخوذ کے ساتھ ساتھ معتد بہ مقدار میں ذاتی توضیحات اس کی خاص عطا ہیں جو اسے منفرد حیثیت عطا کرتی ہیں۔ ان کی اہمیت اس لئے بھی زیادہ ہے کہ وہ مضمون تازہ ہیں اور ان سے مروجہ آراء تصورات میں نمایاں تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ یہ توضیحات آثار قدیمہ کی کھدائی سے دستیاب شدہ نادر انکشافات ہیں جو اچھوتے بھی ہیں اور اہم بھی۔ اور ان کے اثرات دوررس۔ ابتدائی تجزیہ سے اردو زبان اور شاعری کے مزاج کے بارے میں جو وضاحتیں کی گئی ہیں ان کے مقبول اور درست ہونے میں شبہ نہیں۔ مثلاً یہ کہ پراکرتیں درحقیقت برصغیر کی

کتاب کے پہلے حصے میں جو نتائج حاصل ہوئے ہیں ان کا دوسرے حصے میں تمام اردو شاعری پر اطلاق بالاکثر نہایت صائب ہے اور سابقہ کوششوں پر نمایاں پیشقدمی ظاہر کرتا ہے۔ اقبال، جوش، فیض، راشد وغیرہ پر اظہار رائے جسارت کو انتہائی چابکدستی اور بردباری سے آمیز کرتا ہے۔ جہاں کہیں کوئی کسر رہ گئی ہے وہاں مطالعہ مصنف کا ساتھ نہیں دے سکا۔ مثلاً آتش یا غالب کے سلسلے ہیں۔ آتش میں داخلیت برائے نام ہے اور وہ زیادہ تر لکھنؤ کی خارجیت ہی کا حصہ دار ہے۔ غالب اتنا ہی مجموعۂ ضد جتنے دوسرے شاعر۔ مثلاً کیا ذوق کے ہاں مست کر دینے والی وحدت الوجود نہیں؟ ہوس پرستی کی عاشقی نہیں، عشق حقیقی نہیں؟ ادنیٰ آرزوؤں کا طوفان نہیں؟ ہر طرح کے جذبات کا طوفان نہیں؟ جب غزل کل ہی سے قوت حاصل کرتی ہے تو کیا وہ کل کے مشترکہ سرمایہ مضامین، تصورات اور علامات سے اکتساب نہیں کرے گی؟ تصوف کے لئے صرف غالب کی طبیعت ہی مچل نہیں گئی، بلکہ ہر چھوٹے بڑے فارسی و اردو شاعر کی طبیعت مچل گئی ہے کیونکہ یہ ان کا آبائی ورثہ ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب پابستگی رسم و رہ عام میں خالص غزلگو ہے اور اس کی غزل وہی معجون مرکب جو دوسرے شاعروں کے یہاں ہے۔ اس سلسلہ میں نقاد کا "پس منظری نظریہ" آڑے آجاتا ہے جس سے احوال واقعی نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔

ان مقامات آہ دفغاں کے علاوہ جو نقاد کے لئے بھی، آہ و فغاں کے مقامات ہیں اور اس کے موضوعات کیلئے بھی بعض مقامات پیشکش سے تعلق رکھتے ہیں۔ از انجملہ ایک کا تعلق علامات سے ہے، یہاں سوال محض ابلاغ کا نہیں جیسا کہ شاعری میں علی العموم محض ادائیگی ہی کا سوال نہیں ہوتا بلکہ یہ ہے کہ اس ابلاغ یا ادائیگی کی سطح کیا ہے۔ کلام کا طرۂ امتیاز محض تشبیہ، استعارہ، کنایہ، علامت بجائے خود نہیں بلکہ ان کی نوعیت ہے کیا وہ برملا ہیں یا در پردہ اور ان میں ایمائی وسعت کس قدر ہے۔ یہیں سے تصویر اور تکنیک کا سوال بھی پیدا ہوتا ہے۔ اگر صرف مطلوبہ خیال کو سوسائٹی کے ذہن نشین کرنا مقصود ہے تو وہ نثر میں زیادہ وضاحت کے ساتھ ممکن ہے۔ یہ فرق مدارج ہی تو ہے جو زندگی کی طرح شعر و ادب میں بھی اہمیت رکھتا ہے۔ فرانسیسی علامت نگاروں نے علامت کا رشتہ ایک کائناتی تصور سے وابستہ کیا تھا۔ اس لئے اس میں ایمائیت کی انتہائی وسعت مقدر تھی۔ اگر ہم اتنا دور نہ جائیں اور یہ ضروری بھی نہیں، تو ڈبلیو بی ایٹس اور دوسرے شاعروں کی طرح علامت میں ایک جہان معنی و اشارات پیدا کر سکتے ہیں اور کچھ علامات ہی پر موقوف نہیں، کوئی وسیلہ بھی جو اچھوتی جھلکیاں پیدا کرے کلام میں ارتفاع کا باعث ہے۔

داخلی پہلو پر بحث کرتے کرتے ہمیں سے خارجی پہلو سے قطع نظر نہیں کرنا چاہئے۔ اور یہ ایک باذوق نقاد کا نہایت حسین، سلجھا ہوا طرز تحریر ہے جس سے غیر معمولی صلاحیتیں نمایاں ہیں۔ عبارت بیک وقت متوازن بھی ہے اور شاعرانہ بھی۔ جس سے جابجا شوخیٔ طبع کے کوندے لپک لپک پڑتے ہیں۔ ہمیں کہیں بھی زیب داستان کی طرف میلان دکھائی نہیں دیتا بلکہ نثر کا مدلل اور معتدل اسلوب برابر برقرار رکھا گیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب اتنی ہی ادبی و ذوقی بھی ہے جتنی انتقادی۔

اسد اد صابری

اخبار ”ہمدرد“ کی ابتدائی حالت

انیسویں صدی کی ابتدا میں جاری ہونے والے اخبار ہمدرد دہلی، اخبار الہلال کلکتہ اور رسالہ اردوئے معلی علی گڑھ وغیرہ نے جو تاریخی ملکی، ملی اور ادبی خدمات انجام دی ہیں انھیں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

ان اخبارات و رسائل میں مولانا حسرت موہانی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد کے زریں خیالات زینت پزیر ہوتے تھے۔ اور ان کی قلم وہ جوہر دکھاتی تھی۔ کہ طاغوتی طاقتیں ہل جاتی تھیں اور سامراجی ایوانوں میں زلزلے پڑ جاتے تھے۔

اس مضمون کا تعلق اخبار ہمدرد کی ابتدائی حالت سے ہے۔ میرے سامنے اس اخبار کے ابتدائی زمانہ کے ۱۴ پرچے ہیں[1] جن سے اس زمانے کی حالت کا پتہ چلتا ہے۔

یہ اخبار ۲۳ رفروری ۱۹۱۳ء کو کوچہ چیلان دہلی سے روزانہ جاری ہوا۔ ایک ورق یعنی دو صفحات پر مشتمل تھا ۳۰×۲۰ سائز پر نکلتا تھا۔ ہمدرد پریس سے طبع ہوتا تھا۔ اس کی چھپائی لیتھو کی نہیں تھی بلکہ اردو ٹائپ میں ہوتی تھی۔

سرورق کے شروع میں ”واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً“ تحریر ہے اس کے بعد جامع مسجد دہلی کی تصویر دی گئی ہے جس کے نیچے یہ عبارت لکھی ہے۔ ”جنگ بلقان کی تازہ خبریں اور ان پر تنقید“

یہ اخبار جنگ بلقان کے خاتمے کے وقت جاری ہوا۔ بلکہ ایک مہینے کے بعد وسط مارچ میں ترکی کی صلح بھی ہوگئی تھی ان چودہ پرچوں میں سوائے جنگ بلقان کی خبروں اور ان پر تبصروں کے یا ترکی حکومت کو قرضہ تمسکات کی شکل میں دینے کے بارے میں اپیل کرنے کے اور کوئی ملکی و غیر ملکی خبر شائع نہیں ہوئی۔ مولانا حالی نے ہمدرد کو قوم کا صحیح ہمدرد ہونے کی دعا ایک رباعی میں کی ہے جس کو مولانا محمد علی مرحوم نے اخبار ہمدرد کے پہلے شمارے ۲۳ رفروری ۱۹۱۳ء میں شائع کیا ہے۔ ”مولانا حالی

---

[1] مولوی عبدالملک صاحب مدینہ منورہ میں رہتے ہیں۔ ان سے ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا ان کے پاس ”ہمدرد“ کے ۲۳ فروری تا ۶ مارچ اور ۲۰ ر ۲۱ مارچ ۱۹۱۳ء کے پرچے ہیں چنانچہ انہی پرچوں کی بنیاد پر یہ مضمون لکھا گیا ہے۔

مدظلہ العالی نے باوجود ضعف پیرانہ سالی ہماری التماس، التجا نہیں بلکہ ہٹ کو مسترد نہیں فرمایا - اور ہم کو بھی اپنے گلستان تخم سے خوشہ چینی کر کے ایک ڈالی تیار کرنے کی اجازت دی ہے جو نہ صرف ناظرین کی قدردانی کو بڑھانے بلکہ رب العالمین کے محیط رحمت کو جوش میں لانے کے لئے پیش کی جاتی ہے ؎

عزت کی تمنا ، نہ خطابوں کی طلب　　اک قوم کی خدمت کی ہے خواہش یارب
ہمدرد کو اسم بامسمیٰ کیجو　　اس نام کی لاج ترے ہی ہاتھ ہے اب

یہ اخبار کن واقعات سے مجبور ہو کر اور کن اغراض کے ساتھ مولانا مرحوم نے جاری کیا تھا - اس کا اظہار بھی آپ نے ۲۳ فروری ۱۹۱۳ء کے پہلے شمارے کے افتتاحی مقالے میں کیا ہے - عنوان ہے "نقیب ہمدرد"۔

" ہمدرد جاری کرنے کا خیال ایک فی البدیہہ نتیجۂ فکر نہیں کہ وزن اور قافیہ کے قالب میں ڈھل کر ایک ذرا دیر میں احباب کی مجلس میں ہلچل ڈال دے کسی گھبرائے ہوئے دل کا ایک عارضی جذبہ نہیں جسے قوت باہمہ پلک مارتے صورت کا لباس پہنا کر موجود کر دے - بلکہ یہ نتیجہ ہے اخباری دنیا میں عرصہ تک رہ نوردی کرنے سینکڑوں ٹھوکریں کھانے اور بہت سے نشیب و فراز دیکھنے کا - بہت غور و خوض کے بعد قوم کی زندگی کا خلوت کدوں سے لے کر بازاروں تک بالاستیعاب مطالعہ کرنے - ہم نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ قوم کے لئے ایک ایسا رفیق سفر تیار کریں جو منزل مقصود کا راستہ دور ہی سے نہ دکھا دے بلکہ گم گشتگان براہ کے ساتھ ساتھ برہنہ پا ہو کر ... ایسا قصے کو پیدا کریں جو اصلی داستان کو خود اس کی زبان الف لیلیٰ کی طرح ہر روز سنا کرنا تمام چھوڑ دیا ہے - اور جب تک قوم کی فلاکت اور نکبت ختم نہ ہو یہ داستان بھی تمام نہ ہو - بلکہ ہر روز اس سے نئی شاخیں پھوٹتی رہیں اور نئے درد اٹھتے رہیں ؎

زشرح قصہ من رفتہ خواب از چشم خواصاں را
شب آخر گشتہ وافسانہ از افسانہ می خیزد

۲۷ اپریل ۱۹۱۲ء کے کامریڈ میں ہم نے انہی امور کو پیش نظر رکھ کر ہمدرد کے مقصد اور مبلغ کے متعلق ایک مبسوط بحث کی تھی اور انہی خیالات کو دل میں لے کر دہلی کا ..... سفر باندھا ... ہمدرد کے اجراء ..... [ل] ٹائپ کی ترتیب و ترکیب سے واقف کار جماعت فراہم کرنے میں جو تلخ تجربہ ہمیں ہوا ہے اگر ان کی تفصیل سے مندمل زخموں کے تازہ ہونے کا خوف نہ ہوتا تو آج ناظرین کے روبرو اس ایک پرت کے دسترخوان پر لون مرچ کی چٹنی کے سوا کچھ نہ ہوتا - البتہ کل ڈاکٹری مشورے کے بعد بھرے ہوئے زخم کے ٹانکے توڑے جائیں گے - اس وقت ہم ناظرین سے صرف اتنا ہی پوچھنے پر اکتفا کرتے ہیں ؎

زخم دل گر نظر نہیں آتا　　بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی

[ل] اس عبارت کے بعد بارہ سطریں غائب ہیں -

ہماری شرمساری اور محجوبی کا یہ عالم ہے کہ چلمن سے پردہ کی نوبت پہنچتی جاتی ہے تاہم خیریت یہ ہے کہ ہم مردم چشم احباب کے شکووں میں ایک طرح کی تلخ شیرینی ہوتی ہے یہ اگر جاری رہیں تو مزہ آتا ہے اگر بند ہوجائیں تو یاد آتے ہیں۔ مگر قوم کے بزرگ اور مخدوم کی شکایت سننے کا زمرہ نہیں۔ ہم اپنے احباب کو طوعاً نہیں تو کرہاً کر ہی لیتے ہیں۔ لیکن جناب قبلہ و کعبہ نواب وقار الملک بہادر مدظلہ کا والا نامہ جو ابھی موصول ہوا ہے ایک ایسی زبردست تحریک ہے جس نے صبر و شکیبائی کے آخر بند توڑ ڈالے اور ہمدرد کو بنیان اور شلوار ہی پہنے خلوت کدہ سے ویسے ہی نکل کر برہنہ پا دوڑنا پڑا۔ لیکن برائے خدا اس ایک ورقہ کو ہمدرد نہ سمجھئے ہمدرد تو وہی ہوگا۔ جس کا تعارف اس مضمون کے شروع میں مجملاً اور ۲۷ راپریل کے کامریڈ میں مفصلاً کیا جاچکا ہے۔ البتہ یہ ہمدرد کا نقیب ہے یا اس کا حاجب در ؎

یک فروغ رخ ساقیست بجاں افتادہ

ایک یہ وجہ بھی ہے کہ قسطنطنیہ اور میدان جنگ سے ہمیشہ دوسرے تیسرے روز تار آتے رہتے ہیں۔ اور ہم نہیں جانتے کہ ان تاروں کو مسلمانان ہندوستان کے دلوں کے کھٹکے سے وہ کون سی اشراقی نسبت ہے کہ ادھر دفتر میں تار چھپا اور ادھر استفساری تار اور خطوط آنے شروع ہوئے۔ یہ کام اس قدر بڑھ گیا ہے کہ کئی محرر بھی ختم نہیں کرسکتے۔ دن بھر جوابات تحریر کرنے سے ہزار درجہ بہتر ہے کہ ہمدرد کا نقیب خود روزانہ ہر خورد و بزرگ کے دروازہ پر حاضر ہوکر روز میدان کارزار کے حالات سنا آیا کرے۔

یہ اخبار ۱۹۱۲ء کے آخری مہینوں میں شائع ہوجاتا۔ لیکن اس کو لیتھو کے بجائے ٹائپ میں چھاپنے کا ارادہ تھا۔ اس لئے اس کے ٹائپ کے آنے میں کافی دیر لگی۔ اور منتظمین کو کافی پریشان ہونا پڑا۔ اور کافی دیر کے بعد ٹائپ وصول ہوا۔ جس کی داستان مولانا محمد علی مرحوم کی قلم سے ۲۴ و ۲۵ رفروری ۱۹۱۳ء کے شماروں کے صفحات میں پڑھئے۔ عنوان ہے "آپ بیتی"

"جو جسم میدان شہود سے بھی بھلی یا بری طرح گھر کر ایک دفعہ زیر زمین دفن ہوچکا ہے اس کو لحد سے نکالئے ڈاکٹری قاعدے سے اس کی تشریح کرلی اور احباب کو نشتر کھائی ہوئی رگیں دکھانے میں کچھ لذت نہیں مگر ہم کل کے پرچے میں وعدہ کرچکے ہیں اس لئے رقص بسمل کا تماشا ہی سہی۔ لیکن اپنے خونچکاں کفن کے کروڑوں بناؤ انہیں ضرور دکھائیں گے اور انہی کی داد لیں گے۔

اجرائے اخبار کا تہیہ کرنے کے بعد ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ ٹائپ کی فراہمی ایک ایسے کارخانہ کے سپرد کریں۔ جو ایشیا بھر میں تو ضرور باعتبار وسعت و کاروبار سب سے بڑا ہو۔ اہل مطابع واقف ہیں کہ جان ڈکسن کمپنی کے کارکن سامان انطباع کی بہم رسانی میں الہ دین کے چراغ والے موکلوں سے کسی طرح کم نہیں۔ اسی حسن ظن کی بنا پر ہم نے اس معاملہ کو ان سے رجوع کیا۔ ٹائپ کی جو اقسام ہم نے دیکھی تھیں۔ ان میں خلیل سرکس کا نمونہ سب سے زیادہ پسند آیا۔ اور اسی کے منگانے کی جان ڈکسن کمپنی سے فرمائش کی۔ مارچ ۱۹۱۲ء میں ہم نے خلیل سرکس سے دریافت کرلیا تھا۔ کہ اگر ہم ان کے یہاں کے ڈھلے ہوئے ٹائپ کی فرمائش بھیجیں تو وہ کتنے دن میں اس کی تعمیل کرسکیں گے۔ ان کے جواب آنے کے بعد اس اطمینان پر کہ تعمیل فرمائش ایک ہفتہ میں ہوسکے گی۔ ہم نے جون میں ٹائپ کی فرمائش بھیج دی اور ہدایت کی کہ پارسل ڈاک کے ذریعے سے بھیج کر تعمیل فرمائش کی اطلاع تار سے دیں خلیل مگر

[illegible] ٹائپ ہو سکتی" "اس نہیں ہو سکتی" کو جب جب انقلاب سمجھ کر ہم نے
ڈکسن کمپنی کو لکھا کہ ٹائپ جب بمبئی پہنچے تو وہاں سے دہلی کو بذریعہ پسنجر ٹرین روانہ کیا جائے یہی تاخیر کچھ کم نہ تھی کہ خلیل سرکس نے ہمیں اطلاع دی کہ ٹائپ وسط اگست میں روانہ ہو نہ سکا۔ اس لئے ۲ ستمبر کو روانہ کیا جاتا ہے۔ اس پر ستم یہ ہے کہ ہماری ہدایت کو نظر انداز کر کے ٹائپ کو بجائے ڈاک کے جہاز میں بھیجنے کے ایک سست رفتار جہاز میں روانہ کیا۔ ٹائپ ۸ راکتوبر کو بمبئی پہنچا اور ۱۲ ارکو پسنجر ٹرین سے دہلی روانہ کیا گیا اس پر بھی ہم نے شکر کیا کہ ہماری پریشانی اور ہمدرد کے نادیدہ مشتاقوں کی انتظار کی میعاد ختم ہوئی مگر معلوم ہوا کہ ہنوز ؎

پائے مالنگ است و منزل ناپدید — دستِ ما کوتاہ و خرما بر نخیل

ٹائپ دہلی کے اسٹیشن پر پہنچ گیا مگر ریلوے کی رسید کا ہنوز پتہ نہیں۔ پریں وجوہ میں سارا دن ختم ہوا۔ پھر اتوار آن پڑا۔ دوسرے دن اسٹیشن پر تفتیش و تفحص کے بعد معلوم ہوا کہ پارسل ہمارے نام نہیں بلکہ بنک کے نام ہے اور بنک ہی۔ پارسل وصول کرنے کا مجاز ہے۔ چنانچہ بنک سے استمداد کی گئی۔ مگر معلوم ہوا کہ بنک بھیجنے کے لئے جو رسید تیار کی گئی تھی۔ وہ کمپنی کے ایجنٹ نے تلف کر دی تھی اور دوسری رسید تیار کر کے بھیجی تھی۔ لیکن دسہرہ کی تعطیل کے باعث چند روز کے لئے بند ہے اور رسید کا ملنا ملتوی۔ ناچار بجز اس کے کہ اختتام تعطیل کا انتظار کیا جائے۔ چارہ کیا تھا؟

"ستم پر ستم یہ کہ بنک کھلنے پر پوری قیمت کا مطالبہ کیا جاتا ہے اور جو نصف رقم قیمت پیشگی ادا کر چکے ہیں اس کی مجرائی د خصوبی کا ذکر تذکرہ نہیں۔ جان ڈکسن کمپنی کو تار دیا جاتا ہے اور جب تک ان کی تحریر نہیں آجاتی۔ بنک نصف رقم منہا نہیں کرتا۔ مگر کیا داستان غم ختم ہو گئی؟ ہرگز نہیں ابھی تو اکتوبر میں ہیں اور فروری تک راہ میں بہت سے مراحل طے کرنا باقی ہیں۔ ع

بہ پایاں آمد ایں دفتر حکایت ہم چناں باقی

۲۴ رفروری ۱۹۱۳ء

۸ اکتوبر کے ہندوستان آئے ہوئے اور پسنجر ٹرین کے سفر کردہ پارسل کو جب ۲۲ راکتوبر کو خدا خدا کر کے کھولا جاتا ہے تو جن حروف کی اردو میں ضرورت رہتی ہے ان میں بعض ندارد اور بعض بہت کم اور جن کی بہت کم ضرورت پڑتی ہے ان میں اکثر بہت زیادہ۔ حالانکہ فرمائش کے ساتھ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی ایک کاپی اسی غرض سے بھیج دی گئی تھی کہ تناسب و تقسیم حروف کا اندازہ اس سے اچھی طرح کر کے اسی نسبت سے حروف بھیجے جائیں۔"

"اس ٹائپ کے ہم تک پہنچنے سے قبل ہی ہم نے ۱۶ راکتوبر کو احتیاطاً ٹائپ کی ایک بڑی مقدار کے لئے فرمائش بذریعہ تار بھیج دی تھی۔ مگر اب معلوم ہوا کہ ہمارے کرم فرماؤں کی فہرست میں محکمہ تار کا نام درج ہونا باقی رہ گیا تھا جو اب ہو گیا۔ جان ڈکسن کمپنی کو جو تار دیا گیا اس کے الفاظ تھے کچھ اور۔ اور پڑھے گئے کچھ اور۔ اس کا علم ہوتے ہی ہم نے تصحیح کی۔ مگر قاصد برق اس سے پہلے ہی غلط پیغام خلیل سرکس تک پہنچا چکا تھا اور جب اس غلطی کی تصحیح کی گئی تو وہ بھی تار کی عنایت سے غلط ہوئی۔ ہاں یہ

تو عرض کرنا ہی رہ گیا کہ ستمبر میں خلیل سرکس نے کچھ باقی حروف کا پارسل بمبئی روانہ کیا تھا اور احسان جتایا تھا کہ یہ ڈاک کے جہاز سے روانہ کیا جاتا ہے۔ مگر خوبیٔ قسمت نے سمندر کی طنابیں کھینچ دیں اور پارسل کو ارض ہند کی جگہ سرزمین اسٹریا میں پہنچا دیا - یہ پارسل ٹریسٹ سے واپس آکر جنوری میں ہمیں ملا۔ مگر اس میں وہی حروف نکلے جن کی مقدار کثیر یہاں پہلے ہی سے "زینت طاق نسیاں" تھی -
اب دسمبر کی بیسویں تاریخ آئی اس تاریخ پر ہم نے ٹائپ کی موجودات اور مطلوبات کا جائزہ لے کر باقی مقدار ٹائپ جس کے بغیر ہمدرد کے آٹھ صفحے نکل ہی نہیں سکتے - ڈکسن کمپنی کی وساطت سے طلب کیا۔ ۲۰ دسمبر ۱۹۱۲ء کے خط کا جواب ڈکسن کمپنی نے ۳ جنوری کو دیا۔ جس میں لکھا کہ بڑے دن کی تعطیل کی وجہ سے فرمائش کی طرف توجہ نہ ہوسکی - یہ داستان غم تھی اب افسانہ امید سنیئے - حال میں خلیل سرکس کی طرف سے جواب آیا ہے کہ ۱۱ مارچ کو ٹائپ بذریعہ جہاز باربرداری روانہ کیا جائے گا - یہ اطلاع ملتے ہی ہم نے بذریعہ تار ان سے استدعا کی کہ اگر اس سے کسی قدر پہلے اور ڈاک کے جہاز میں ٹائپ بھیج دیں تو بڑی مہربانی ہوگی - کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ ؎

نالہ جز حسن طلب اے ستم ایجاد نہیں　　　ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں

ہم ابھی تک اس خوشگوار یا نہ خوش گوار یوک و مگر کے گرداب میں پھنسے ہوئے ہیں ؎

کنوں چہ چارہ کہ در بحر غم بہ گردابی　　　فتادہ کشتی صبرم زباد بان فراق

۲۵ فروری ۱۹۱۳ء

ترکوں کا دشمن گرچہ بہت طاقتور تھا - اور اس کو ہر طرح کی امداد عیسائی ملکوں سے مل رہی تھی - مگر پرستاران توحید کبھی طاقت و قوت سے مرعوب نہیں ہوئے ہمیشہ معمولی سی طاقت لے اپنی سی چوگنی طاقت سے مقابلہ کیا اور کامیاب ہوئے اس جنگ بھی یہی حالت تھی - ترکوں نے دشمن کی بڑی طاقت سے ٹکر لی - اور کامیابی و کامرانی حاصل کی - چنانچہ میدان جنگ کی خبریں ہمدرد اخبار میں بھی چھپ رہی تھیں - ۳ مارچ ۱۹۱۳ء کا اخبار لکھتا ہے -

"متواتر ہزیمتوں نے بلغاریوں کو اس قدر بے حوصلہ کر رکھا ہے کہ اب ان میں تنہا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں رہی" طوفان ارسلان" پر جب دھاوا کیا ہے تو بلغاریوں کی امداد کے لئے سرفی و جبلی (مانٹینگرین) فوجیں بھی موجود تھیں مسلمانوں کا شمار کچھ اوپر تین ہزار تھا اور عیسائیوں کی تعداد گیارہ ہزار سے کچھ ہی کم تھی مگر جب دلوں میں کم من فئة قليلة غلبت فئة كثيرة باذن الله والله مع الصابرين (کتنے چھوٹے چھوٹے گروہ ہیں جو خدا کے حکم سے بڑی بڑی جماعتوں پر غالب آئے ہیں - خدا مستقل مزاجوں کے ساتھ ہوتا ہے) کا جوش ہو ان کی اقلیت پر تعداد کی اکثریت کبھی کوئی مخالف اثر نہیں ڈال سکتی - آخر نتیجہ وہی نکلا جو بدر و حنین یرموک و اجنادین میں تاریخ متعدد مرتبہ دیکھ چکی تھی - صلیب نے ہزار جال بچھائے مگر مصلوب ہی ہونا پڑا - اور وہی ہلال جس کے پامال کرنے کی فکریں ہو رہی تھیں - کامیابیوں نے اس کو سر فلک پہنچا دیا - غنیم کے ساتھ بڑے بڑے افسر گرفتار ہوئے - اور خود جنرل کے پاؤں میں بھی بیڑیاں پڑ گئیں - عام سپاہیوں کی گرفتاری کا کوئی شمار [illegible]

سے ملا دیئے۔ بانیہ خالی ہوگیا۔ اور امتناع خلا کا اصول ثابت کرنے کے لئے مجاہدین نے اس کو اپنا لشکرگاہ بنا لیا۔ پرفیزا (پریویزا) کو ناظم پاشاہ مرحوم کی غفلت نے بہت ہی خفیف مقابلے کے بعد بلقانی فتوحات کی تفویض کر دیا تھا۔ لیکن یہ حوالگی یوسف بن تاشفین کی اس حوالگی سے زیادہ دیر تک نہ رہی جس میں ابن تاشفین کے پیش روؤں نے "بلنسیہ" پر اذفونش (الفانسو) کا قبضہ کرا دیا تھا۔ مگر اس کی صدائے تکبیر کی ہیبت ہی سے غاصبوں کے جی چھوٹ گئے۔ اور قبضہ کی "منافع بے شمار" پر قرار کی۔ "سلامت بر کنار" کو ترجیح دینی پڑی۔ "مالتہ" کا معرکہ تھا تو تین ہی گھنٹے کا۔ مگر اس کے زخم شاید تین برس بھی مندمل نہ ہو سکیں گے۔ ترکوں کی مسلسل پیش قدمیوں پر بلقانیوں کو جوش آگیا۔ متحدہ فوجیں "مالتہ" پر حملہ آور ہوئیں۔ اور اس شان و داعیہ سے حملہ آور ہوئیں کہ اب ترکوں کو گویا روئے زمین میں جگہ ہی نہ ملے گی۔ زیر زمیں کچھ گنجائش ہو تو مگر شاہ شجاع فرمانروائے بے شیراز کی تاریخی تقسیم نے یہ صورت بھی اپنے بھائی محمود کے لئے مخصوص کر رکھی تھی۔ یا قوس کی بلند آہنگیاں تکبیر کی صداؤں میں دست و گریباں ہوگئیں۔ مگر یہ تصادم تھوڑی ہی دیر تک قائم رہا۔ اور "آہنگ فرنگ" "طبل غازی" کے شور میں کچھ ایسا گم ہوگیا۔ کہ یا تو متحدہ فوجیں کھلے میدان میں حملہ آور تھیں یا میدان صاف ہوگیا اور قلعہ ہی میں نظر آئیں۔ "مدید" کی لڑائی بھی کچھ اسی وضع کی تھی۔ فرق اتنا تھا کہ وہاں صرف بلغاریوں کو پسپا کرنے پر کفایت کی گئی تھی اور یہاں متعدد قلعے اور استحکامات بھی ان سے خالی کرا لئے۔

اسی قسم کی خبریں ۶ر مارچ ۱۹۱۳ء کے اخبار میں درج ہیں۔ اور دوسرے معرکہ میں مسلمانوں کے شجاعت کے کارنامے بیان کئے ہیں۔

"طرابلس کی معرکہ آرائیوں میں ہنوز کوئی فرق نہیں آیا۔ بہادران عرب بدستور مرنے مارنے پر آمادہ ہیں۔ تیغ و تفنگ کے مقابلہ میں اطالیوں کو کامیابی کی صورت نظر نہ آئی تو تالیف قلوب سے اس معرکہ کو سر کرنا چاہا۔ مقابلہ سے منہ موڑ لیا۔ اور ملاطفت کی کارروائی شروع کر دی۔ "عین درنہ" پر مجاہدین کا قبضہ تھا۔ سپاہ اطالیہ اس کی واپسی لینے کے لئے بیتاب تھی۔ مگر بے بسی کچھ کرنے نہ دیتی تھی۔ جنگ کے انتظار میں عربوں کو دن دوبھر ہونے لگا۔ وکتائی ہوئی طبیعتوں نے خود ہی حملہ کی ٹھہرائی اور رات کی تاریکی میں اندھیر چلانے کو چل کھڑے ہوئے۔ اطالیوں کے استحکامات میں قلعہ "غرایہ" کی مستحکمی ضرب المثل تھی۔ بلند ہمتوں نے اسی کی تاک لگائی۔ ابھی آفتاب کی کرنیں اچھی طرح پھوٹی بھی نہ تھیں کہ زمین خون سے رنگین نظر آنے لگی۔ یہ سماں پندرہ منٹ سے زیادہ نہ رہ سکا۔ اور اتنے ہی سے وقفہ میں جنگ کا فیصلہ ہوگیا۔ اطالیہ کا جھنڈا یا تو قلعہ پر لہرا رہا تھا یا عربوں کے ہاتھ میں نظر آیا۔ جسے وہ اپنے سروں پر اڑاتے ہوئے واپس چلے گئے اور سپاہ اطالیہ دیکھتی رہ گئی۔"

مولانا محمد علی مرحوم نے بھی ۳ر مارچ ۱۹۱۳ء کے اخبار میں ترکی فتوحات کا اس انداز میں ذکر کیا ہے۔

"جنگ کے واقعات کچھ پیچیدہ سے ہو رہے تھے۔ ریوٹر ایجنسی کی سرگرمیاں تو برفباری نے ٹھنڈی کر دیں مگر

شرکۂ عثمانیہ' شرکۂ سوریہ کا بیان ہے کہ سلسلۂ جنگ اب بھی جاری ہے اور ہر سمت سے جاری ہے چنانچہ لیجہ کے بالمقابل لائینس بلغاریوں سے خالی ہوگئیں۔ اطراف بولیر کے علاقے ترکوں نے دوبارہ چھین لیئے۔ جنوبی ادرنہ (ایڈریانوپل) کے حصوں پر ہلال کا جھنڈا لہرانے لگا ہے۔" جیل "تکفور" کا پورا ضلع بلغاریوں کے قبضے سے نکل گیا۔ ترکی فوجیں ہر ایک جانب سے آگے بڑھ رہی ہیں بلغاری پسپا ہوتے جاتے ہیں۔" چار کوئی" پر بڑے معرکہ کا رن پڑا جس میں غنیم کو بیش قرار نقصان اٹھا کر گریز پائی کی مشق تازہ کرنی پڑی۔ عثمانی جنگی بیڑا" سلواری" پر گولی برسا رہا ہے۔ بلغاری فوجیں مقابلہ سے ہٹ کر خاص خاص استحکامات میں پناہ گزیں ہیں۔" ادرنہ" میں غازی شکری پاشا کی بہادرانہ مدافعت سے بلغاریوں کا جی چھوٹ گیا۔ اور اب خود صوفیہ کا نیم سرکاری اخبار "پیر" جس کا اقتباس ۲۵ر فروری ۱۹۱۳ء کے سول اینڈ ملٹری گزٹ میں شائع ہوا ہے۔ صاف لفظوں میں اعلان کر رہا ہے کہ ادرنہ کے سوال کو اب زیادہ اہمیت نہیں دی جاسکتی گورنمنٹ کے لئے اس کا قبضہ نہ کچھ ایسا مفید ہے اور نہ سہل الحصول۔ اب دوسرے مقامات کی تسخیر کے لئے کوشش کرنی چاہیئے"

گورنمنٹ بلغاریہ جنگ کی ناکامیوں کی تلافی اب جاسوسی کے ذریعے کرنا چاہتی ہے۔ بیشتر جنگی مرکزوں میں اس کے جاسوس پھیلے ہوئے ہیں جس میں اکثر گرفتار ہوتے جاتے ہیں۔ خاص قسطنطنیہ میں کئی جاسوس قید ہو چکے ہیں۔ سراسیمگی کا یہ عالم ہے کہ مجلس صلیب احمر تک کو اجازت نہیں کہ مجروحان بلغاری تیمار میں مصروف ہو سکے۔ جرمنی کی انجمن صلیب احمر کو آخر واپس آنا پڑا۔ قیصر ولیم نے سفارش کی مگر پیش نہ گئی۔ ہر وقت یہی اندیشہ محیط ہے کہ ان تیمار داروں کے ذریعے سے فوجی کمزوریاں عالم آشکارا نہ ہو جائیں"

ناعاقبت اندیش اور غفلت شعار و غیر ذمہ دار لوگوں کے ہاتھوں میں اس وقت ترکی حکومت کی باگ ڈور تھی۔ کچھ خود غرض عنصر بھی ان میں داخل تھے۔ جس وقت ترکی فوج کی پوزیشن ہر محاذ پر مضبوط تھی اور ہر معرکہ میں دشمن کو نقصان اٹھانا پڑا تھا اور کافی مقامات دشمنوں سے خالی کرائے گئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود ترکی کے ناخداؤں نے دشمن سے صلح کی گفتگو کا سلسلہ جاری کر دیا تھا اور غیر مقبوضہ و غیر مفتوحہ علاقے بھی دینے کے لئے تیار ہو گئے تھے۔ جب اس قسم کی خبریں ہندوستان میں پہنچیں تو یہاں کا مسلمان تڑپ اٹھا۔ اور ہندوستان کی جماعتوں اور ذمہ دار لوگوں نے ترکی کے سلطان کو لاتعداد تار بھیجے تاروں کا تانتا بندھ گیا۔ مضمون یہ تھا کہ صلح کر کے خدا، رسولؐ اور اسلام کی عزت ہاتھ سے نہ دیجئے۔ ہندوستانی اخبارات نے بھی احتجاجی مقالے لکھے۔ چنانچہ ہمدرد مورخہ ۶ر مارچ ۱۹۱۳ء نے اس[1] صلح کی بات چیت پر یہ تبصرہ کیا تھا۔

"عرصہ ہوا کہ صلح کا طلسم ٹوٹ گیا۔ مگر فسوں گر ابھی باقی ہیں۔ کئی روز سے ریوٹر کے تار اسی قسم کی خبریں دے رہے ہیں جن سے ترشح ہوتا ہے کہ ترکی سلاح خانہ میں قفل ڈال کر پھر اسی صلاح خانہ کی طرف بڑھ رہا ہے کبھی توفیق پاشا اور رحمی پاشا کے بعد دیگے فارن آفس لندن میں جانے سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ یہ پیغام صلح لے کر گئے ہیں۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ شرائط کے متعلق باب عالی کی

---

[1] ہمدرد دہلی ۵ر مارچ ۱۹۱۳ء

کی ہدایت کا انتظار ہے ..... ہمارا پختہ خیال یہ ہے کہ یہ سب افواہیں۔ محمود شوکت پاشا اور انور بے سے ہم کو ہرگز توقع نہیں کہ آل عثمان اور آل عدنان کی آبرو کو ایسا سستا بیچ دیں گے۔"

جب ترکی حکومت کو شکست ہوگئی اور مخالف جنگ میں کامیاب ہوگئے تو مولانا محمد علی مرحوم نے ترکی فوج کی بہادری و اولوالعزمی کی تعریف کرنے کے بعد شکست کی ایک وجہ گفتگوئے صلح کو قرار دیا تھا۔ چنانچہ آپ ۳۰ مارچ ۱۹۱۳ء میں لکھتے ہیں۔

"آخر کار وہی ہوا جس کا عرصہ سے ایک طرف خوف اور دوسری طرف انتظار تھا۔ ایڈریا نوپل کا قدیم اور تاریخی شہر جو بچند وجوہ صلح و جنگ کی بساط پر ایک نہایت اہم مہرہ بن گیا تھا۔ جو پانچ مہینے تک بلغاریوں اور سردیوں کی متفقہ افواج کے محاصرہ کی ضربات پیہم اپنے سینہ پر مردانہ وار لیتا رہا۔ جس پر قبضہ پانے کے خاطر بلغاریہ نے اپنا خون پانی کی طرح بہا دیا جس پر قبضہ رکھنے کے لئے ترکوں نے جان و مال کی قربانی سے مطلق دریغ نہ کیا۔ اور وہ شجاعانہ مقابلہ کیا جو حربی تاریخ میں اپنی نظیر آپ ہی رہے گا ایڈریانوپل آخر کار ۲۶ مارچ کو فتح ہوگیا۔ اور اس کی فتح سے یورپ میں ترکی سلطنت کا عملاً خاتمہ ہوگیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ ایڈریانوپل ہاتھ سے نکل جانے سے ترکی کو حربی اور سیاسی اعتبار سے جو کچھ صدمہ پہنچا ہے اس کی وضاحت خواہ کتنے ہی زوردار الفاظ میں کی جائے بالکل خالی از مبالغہ ہوگی۔ جس وقت تک ایڈریانوپل عثمانی قبضے میں تھا۔ تھریس میں ترکوں کی فوجی حالت اگرچہ پریشان کن ضرور تھی۔ لیکن مایوسی قطعاً نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ "ثالث بالخیر" دول جو ترکی دارالامارت کی اینٹوں سے یورپ کے دارالصلح کی عمارت بنانا چاہتی تھی۔ بلغاریہ سے زیادہ اس امر کے متمنی و منتظر تھیں کہ جس قدر جلد ہو سکے ترکوں کا ایڈریانوپل سے اخراج ہو اور اس طرح بزم مسیحیت اغیار سے خالی ہو جائے۔ ہم مانتے ہیں کہ ترکی کو شکست دی گئی۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ ترکی نے شکست کھانے سے پہلے کس قدر مردانہ وار جان توڑ کر مقابلہ کیا اور کس طرح حریفوں کے دانت کھٹے کر کر دیئے اور لڑائی جاری رکھنے میں کس قدر بیش بہا قربانیاں کر کے اپنی غیرت کا ثبوت دیا۔ ہم مانتے ہیں کہ یورپ میں ترکی حکمرانی کو ناکامیاب ثابت کرنے کی کوشش میں کامیابی ہوئی۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ ترکی پر عرصہ سے مصائب کا جو سلسلہ لامتناہی جاری ہے اس میں وہ خود کہاں تک ذمہ دار ہے اور غدار پہلو ہمسائے کس حد تک خطاوار، اس کی اصلاح کی راہ میں رکاوٹیں ڈالی گئیں۔ دوستانہ صلح کے پردہ میں مخالفانہ دھمکیاں دی گئیں ..... طرابلس کی لڑائی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ جنگ بلقان شروع ہوگئی۔ ایسی حالت میں جو کچھ ترکی سے ہوسکا اس نے کیا۔ اور جو کچھ کیا مردانہ وار کیا۔ رہی شکست سو ہر باغیرت انسان کی نظر میں بہادری کی شکست بزدلی و مکاری کی فتح سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جو کچھ آج ہوا اس کی بڑی ذمہ داری ان وزرائے سابق پر پڑے گی۔ جنہوں نے اعلان جنگ میں یہ شوراشوری اور پھر التجائے صلح میں جس قدر بے نمکی دکھائی۔ جس وقت کامل پاشا کی وزارت کا خاتمہ ہوا اس وقت خود ان کی پارٹی کے جرائد اس کو الزام دے رہے تھے کہ نامردی کی صلح بلاوجہ قبول کی جارہی ہے۔"

ترکی حکومت نے اس جنگ میں مالی امدادی لینے کے لئے قرض حسنہ کا اعلان کیا تھا جس کی اشاعت ہمدرد اخبار نے بھی کی۔ اور اس میں حصہ لینے کے لیے کافی ...

اور کس طریقہ سے منافع ادا کیا جاتا تھا۔ اس کی تفصیل ۲۰ فروری ۱۹۱۳ء کے شمارے میں شائع ہوئی ہے۔

(۱) مدافعت قومی کی غرض سے سلطنت عثمانیہ حسب ارادہ حضرت سلطان المعظم خلد اللہ ملکہ بذریعہ تمسکات خزانہ پچاس لاکھ پونڈ (ساڑھے سات کروڑ روپیہ) قرض لے رہی ہے۔

(۲) ان تمسکات کی کفالت سلطنت نے خاص محصول اراضی سے کی ہے۔

(۳) ان تمسکات کے خریدنے والوں کو پانچ فیصدی کے حساب سے سالانہ منافع دیا جائے گا۔ جو ۳۰ نومبر ۱۹۱۲ء سے محسوب ہوگا۔

(۴) تمام تمسکات کا روپیہ خزانہ عثمانیہ سے یا ممالک بیرونی کے ان بنکوں کی معرفت جن کے نام اخبارات میں شائع کئے جائیں گے۔ پانچ برس میں ادا کر دیا جائے گا۔ اور رقم واجب الادا میں سے محصول سرکاری کی منہائی نہ کی جائے گی۔ ہر سال دس لاکھ پونڈ (ڈیڑھ کروڑ روپیہ) کی تمسکوں کا روپیہ ادا کر دیا جائے گا۔ اور اسی قسم کی پہلی قسط ۳۰ نومبر ۱۹۱۳ء کو ادا کی جائے گی۔

(۵) تمسک تین رقموں کے ہوں گے۔ نصف پونڈ (ساڑھے سات روپے) ایک پونڈ (پندرہ روپیہ) دو پونڈ (تیس روپیہ)

(۶) ہر ایک تمسک کے ساتھ دس چٹھیاں منسلک ہوں گی۔ جن میں سے پانچ اصل رقم کی ادائے گی کے لئے اور پانچ منافع کی ادائیگی کے لئے ہوں گے۔ منافع کی ادائیگی کی چٹھیاں مملکت عثمانی میں سرکاری محصول کی ادائیگی میں زر نقد کی طرح قبول کی جائے گی۔

(۷) سلطنت عثمانیہ اس حق کو محفوظ رکھتی ہے کہ پانچ سال کی میعاد منقضی ہونے سے قبل تمسکوں کی اصل رقم اور اس وقت تک کے واجب الادا منافع کو بیباق کرکے تمسک واپس لے لے

(۸) اصل تمسک قسطنطنیہ سے آئیں گے

(۹) ان تمسکات پر خریداروں کے نام درج نہ ہوں گے۔ تاکہ بلا کسی اندراج سرکاری کے ان تمسکات کو خریدار کسی کو فروخت کرنے کے مجاز ہوں اور تمسکات جس کے قبضہ میں ہوں وہ ادائیگی قرضہ کے وقت اصل رقم اور سال کے سال زر منافع بلا دقت وصول کر سکیں۔

(۱۰) الف - اس وقت تک حسب ذیل بنکوں نے خریداروں کے لئے یہ تمسک منگانا اس شرط پر قبول کیا ہے کہ بنکوں کو دو آنہ فی صدی کمیشن دیا جائے اور ہر معاملہ میں کمیشن کی رقم کم سے کم دو آنہ دینا ہوگی۔

الائنس بنک آف شملہ - بنارس بنک لمیٹڈ بنارس - کراچی بنک لمیٹڈ کراچی - سٹنڈرڈ بنک لمیٹڈ بمبئی - پیپلز بنک آف انڈیا لاہور - لنڈن بنک لمیٹڈ امرتسر - بنک آف اپر انڈیا میرٹھ دی پنجاب بنک لمیٹڈ امرتسر -

(ب) بنک آف بنگال اور بنک آف بمبئی بھی دو آنہ فی صدی کمیشن پر یہ تمسک منگا دیں گے۔ مگر ہر معاملہ میں کمیشن کی رقم کم سے کم ایک روپیہ دینا ہوگی۔

(ج) مذکورہ بالا بنکوں کی تمام شاخیں بھی صدر بنک کی شرح کمیشن پر تمسک منگا دینگی۔

(د) اور بنکوں سے بھی خط و کتابت کی جارہی ہے۔ مگر ہر خریدار کو مجاز ہے کہ جس بنک سے چاہے خود اپنے طور پر شرح کمیشن وغیرہ طے کرکے معاملہ کرلے اور یہی بہتر بھی ہوگا۔

جو خریدار چاہتے ہیں کہ ان کا روپیہ فوراً قسطنطنیہ روانہ کر دیا جائے۔ وہ بنکوں کو ہدایت کر دے کہ اس کا روپیہ فوراً قسطنطنیہ روانہ کر دیا جائے۔ اس کے عوض بنک اپنی رسیدیں انہیں ارسال کردے گا۔ تاکہ جب تمسک قسطنطنیہ سے آجائیں تو اپنی رسیدیں واپس لے کر تمسک انہیں دے دیں۔

انجمن کی مطبوعات

کتاب	مصنف / مرتب	قیمت	
قاموس الکتب۔	بابائے اُردو	۰۰ — ۴۰	روپے
قدیم اُردو۔	بابائے اُردو	۵۰ — ۵	"
مرحوم دہلی کالج	بابائے اُردو	۰۰ — ۴	"
نصرتی (حالات و تبصرۂ کلام)	بابائے اردو	۰۰ — ۵	"
اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام	بابائے اردو	۸۷ — ۱	"
خطبات عبدالحق	بابائے اُردو	۰۰ — ۱۱	"
سب رس۔ مصنفہ ملا وجہی۔	مرتبہ بابائے اُردو	۰۰ — ۶	"
کہانی رانی کیتکی اور کنور اودھے بھان کی	انشاء دھلوی	۵۰ — ۱	"
مضامین سلیم۔ وحید الدین سلیم (تین جلدوں میں) مکمل سیٹ کی قیمت		۵۰ — ۱۲	"
مضامین محفوظ علی	سید محفوظ علی بدایونی	۵۰ — ۳	"
خیالات عزیز	عزیز مرزا	۵۰ — ۴	"
رومیو جولیٹ (شیکسپیر کے ڈرامے کا منظوم ترجمہ)	عزیز احمد	۰۰ — ۵	"
فاؤسٹ۔ گوئٹے	مترجم عبدالقیوم خاں باقی	۵۰ — ۴	"
نصاب اردو (نثر)		۰۰ — ۳	"
مثنوی قطب و مشتری	ملا وجہی۔ مرتبہ بابائے اُردو	۷۰ — ۳	"
مثنوی گلشن عشق۔ ملا نصرتی	مرتبہ بابائے اردو	۵۰ — ۴	"
مثنوی من لگن۔ قاضی محمود بحری	مرتبہ سخاوت مرزا	۵۰ — ۳	"
مثنوی پھول بن۔ ابن نشاطی	مرتبہ شیخ چاند ابن حسین	۰۰ — ۴	"
انتخاب جدید۔ مرتبہ پروفیسر آل احمد سرور۔	عزیز احمد	۰۰ — ۵	"
نصاب اردو (نظم)		۵۰ — ۱	"

گردوپیش

تصویر کا ایک رُخ

معاصر کوہستان کا اداریہ سرکاری "حکمت عملی" پر تبصرہ کرتے ہوئے روزنامہ "کوہستان" لاہور نے قومی زبان کے سلسلہ میں ۱۲ر اپریل کے شمارے میں ایک اہم اداریہ سپرد قلم کیا ہے۔ جس کا ایک حصہ ہم یہاں نقل کر رہے ہیں: "صوبائی وزیر تعلیم ملک خدا بخش بُچّا نے گزشتہ روز ایک تقریب میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "قومی زبان کو اب ملک میں مناسب مقام مل رہا ہے اور لوگ اب اردو میں تقریریں کرتے ہوئے شرم محسوس نہیں کرتے"۔ بلاشبہ اردو کو ماضی کی نسبت اب ہماری ملکی اور قومی زندگی میں بہتر مقام حاصل ہو رہا ہے اور ہمارے وزرائے کرام اور سربراہ مملکت بھی اب قومی زبان ہی کو اکثر ذریعۂ اظہار بناتے ہیں۔ اس کا اثر یہ ہے کہ اہم جلسوں اور تقریبات میں بھی انگریزی کے بجائے زیادہ تر اب اردو ہی کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا جانے لگا ہے۔ لیکن ملک کی قومی زبان اگر انیس سال میں ابھی صرف اتنی وقعت حاصل کر سکی ہے تو اسے قابل رشک تو کجا قابل اطمینان بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ملک میں حکمراں زبان کی حیثیت بدستور انگریزی ہی کو حاصل ہے اور اسی بنا پر نئی پود کے ذہین اور صاحب صلاحیت عنصر کا غالب اور موثر حصہ آج بھی پبلک اسکولوں اور مشنری اداروں میں انگریزی زبان انگریزی لب و لہجہ اور انگریزی آداب و تہذیب سیکھنے پر مجبور ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں ... تمام کلیدی مناصب لامحالہ ان ہی افراد کے حصے میں آتے ہیں جو حکمراں زبان اور آداب و تہذیب پر پورا عبور رکھتے ہیں اردو زبان سے انہیں چاہے کتنی ہی ہمدردی کیوں نہ ہو۔ لیکن عملاً وہ اردو کو حکمراں زبان بنانے میں کبھی موثر کردار ادا نہیں کر سکتے اور نہ وہ اپنی اولاد کو انگریزی کے ماحول سے نکال کر دیسی ماحول کے سانچے میں ڈھالنے کا تصور کر سکتے ہیں۔ دوسری طرف اس نفسیاتی پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ انگریزی نے اپنی حکمت عملی سے ہمارے اندر ایک خاص طبقے کو اپنے رنگ میں رنگ کر اپنی جانشینی کا جو مقام بلند عطا کر دیا ہے وہ اپنی اس ترنگی حیثیت کا تحفظ صرف

انگریزی زبان کی حکمرانی اور انگریزی آداب و تہذیب کی برتری قائم رکھ کر ہی کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزی کی جگہ اردو کو عملاً ایک قومی زبان کی حیثیت سے اختیار کرنے کا معاملہ برابر ٹلتا چلا جا رہا ہے اور ہر تھوڑے وقفے کے بعد ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اس بارے میں تدابیر اختیار کرنا تو دور کی بات ہے، ان تدابیر پر سوچ بچار کے لئے ابھی ربع صدی تک صبر کرنا ہوگا۔"

یوم اقبال انگریزی میں

کراچی کے سماجی کارکن جناب عبدالرحمان چودھری نے یوم اقبال کے سلسلے میں بڑے بڑے ہوٹلوں میں جلسے منعقد کرنے پر شدید نکتہ چینی کی ہے اور کہا ہے کہ یہ جلسے عوام اور خواص میں دیوار حائل کرتے ہیں اور جن لوگوں نے ان جلسوں میں انگریزی میں تقریریں کی ہیں انہوں نے اردو دشمنی کا مظاہرہ کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ دراصل یہی وہ لوگ ہیں جو سرکاری دفاتر میں اردو کے نفاذ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ چودھری صاحب نے امید ظاہر کی ہے کہ آئندہ کسی عوامی جلسے میں انگریزی میں تقریر نہیں کی جائے گی۔

تصویر کا دوسرا رُخ

طلبۂ کراچی کی مہم

کراچی کی مضافاتی بستیوں میں رہنے والے طلبہ نے اردو کو فروغ دینے کی مہم کا آغاز کر دیا ہے ان طلبہ نے قوم کو انگریزی زبان کی محکومی سے نجات دلانے کے لئے اہم ترین فیصلے کئے ہیں اور اعلان کیا ہے کہ سیاسی آزادی اس وقت تک تشنہ رہے گی جب تک کہ اردو کو انگریزی کی جگہ ہر شعبۂ زندگی میں رائج نہ کیا جائے۔ طلبہ کی مختلف جماعتوں کا یہ جلسہ سعود آباد میں خواجہ قمرالحسن کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔ جلسے میں ایس ایم معین الدین احمد نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہم اردو کے فروغ کے لئے پوری طرح جدوجہد کریں گے اور ہر یونین کمیٹی میں جا کر اردو کا پرچار کریں گے اور کوشش کریں گے کہ انگریزی کی لعنت جلد از جلد دور ہو۔ طلبہ نے اپنے مسائل کے سلسلے میں بھی چند مطالبات کئے ہیں اور ان کے لئے جدوجہد کا عہد کیا ہے۔

گورنمنٹ کالج لاہور کے طلبہ کے مطالبات

گورنمنٹ کالج اسٹوڈنٹس یونین لاہور نے یہ مطالبہ کیا ہے کہ یونین کی کارروائی اردو میں مرتب کی جائے۔ یہ واضح رہے کہ یونین کی کارروائی اردو میں کرنے کے لئے طلبۂ کالج اور انتظامیہ کے درمیان کچھ عرصے سے شدید اختلافات ہیں۔

انجمن ترقی اردو لائل پور کا افتتاح

لائل پور میں انجمن ترقی اردو کی مقامی شاخ کا افتتاح ۲۸ اپریل کو ہوا جس کی صدارت زرعی یونیورسٹی لائل پور کے وائس چانسلر جناب ڈاکٹر نیڈ اے ہاشمی نے فرمائی۔ انجمن ترقی اردو لاہور کے ناظم اعلیٰ جناب ڈاکٹر سید عبداللہ نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے حکومت سے مطالبہ کیا کہ اردو کو ملک کے قومی معاملات میں اس کا صحیح مقام دلانے کے لئے فوری اقدام کیا جائے۔ انہوں نے اس امر

پر سخت افسوس کا اظہار کیا کہ اردو کو اس کا جائز مقام نہیں دیا جا رہا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ محض ایک لسانی مسئلہ نہیں ہے بلکہ قومی کردار کی تعمیر اور پاک تہذیب و تمدن کے ارتقا اور شعور ملّی کو پروان چڑھانے کا سوال ہے۔ آپ نے مطالبہ کیا کہ مقابلے کے امتحانات میں اردو کو ذریعۂ اظہار بنایا جائے۔ آپ نے عوام پر زور دیا کہ وہ ذاتی معاملات اور نجی کاروبار میں اردو کا استعمال کریں۔ آپ نے خبردار کیا کہ بعض عناصر ملک میں انگریزی زبان کی برتری و اہمیت کو مبالغہ آمیزی سے پیش کرتے ہوئے اس کو ملکی ترقی کے لئے ناگزیر قرار دینے کی جسارت کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ لائل پور کی زراعتی یونیورسٹی متعلقہ اصطلاحات کا ترجمہ اردو زبان میں کرا رہی ہے آپ نے خیال ظاہر کیا کہ یہ قدم اردو زبان کی عظمت رفعت کو بلند تر کرنے میں سنگ میل ثابت ہوگا۔

بنگالی سیکھنے کا شوق لاہور میں قومی زبان بنگالی کی طرف رجحان برابر بڑھ رہا ہے اور ہر طبقے میں بنگالی سیکھنے کا شوق پیدا ہو رہا ہے۔ بنگالی سیکھنے کے سہ ماہی کورس میں شامل ہونے والوں میں سی ایس پی آفیسر، ممتاز فلم ڈائرکٹر، بینک کے ملازمین، کالجوں کے طلبہ، صحافی اور خواتین بھی داخلہ لے چکی ہیں۔ اس سلسلے میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ بنگالی سیکھنے والوں میں اگر ایک طرف ستر سالہ بزرگ شامل ہیں تو دوسری طرف ایک چار سالہ بچی بھی بڑی باقاعدگی سے بنگالی سیکھ رہی ہے۔

کراچی کے باربروں کا مطالبہ کراچی کی بلدیہ نے اعلان کیا ہے کہ شہر کے تمام اصلاح خانوں اور حماموں کے لئے اردو میں لائسنس جاری کئے جائیں گے۔ بلدیہ نے یہ اعلان پاکستان نیشنل ہیر دریسرز فیڈریشن کی درخواست پر کیا ہے۔

بامقصد تعلیم ۵ مئی کو لاہور میں گلبرگ میں صوبائی وزیر تعلیم جناب خدا بخش بُچا نے سرسید کالج کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا کہ بامقصد تعلیم کے ذریعے ہی معاشرے کی حالت کو درست کیا جا سکتا ہے اور بے مقصد تعلیم عیاشی کی طرح بے سود اور مضر ہے۔ آپ نے کہا کہ انگریزی اداروں کو اردو کی اہمیت کا فوری طور پر احساس کرنا چاہئے کیونکہ وہ دن دور نہیں جب اردو کو سرکاری طور پر امتحانات اور درس و تدریس کے لئے نافذ کر دیا جائے گا۔ لہٰذا ایسے اداروں کو بعد میں جو مشکلات درپیش آئیں گی اور طلبہ کو جو پریشانی ہوگی اس سے بچنے کے لئے ابھی سے اقدامات کی ضرورت ہے تاکہ اردو کو اختیار کرنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔

تعلیمی، تہذیبی اور علمی خبریں

علاقائی زبانوں کی ترقی پاکستان کونسل کے زیر اہتمام ایک مجلس مذاکرہ منعقد ہوئی جس میں "پاکستان آبزرور" کے مدیر عبدالسلام نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ پشتو اور سندھی جیسی علاقائی زبانوں کی

ترقی کے لئے ہر ممکن امداد دی جائے ۔ مسٹر سلام نے یہ توقع ظاہر کی کہ مغربی پاکستان کے عوام اردو کے ساتھ ساتھ بنگلا زبان بھی سیکھیں گے ۔ مذاکرے میں مغربی پاکستان کے صحافیوں نے بھی مختلف مسائل پر مقالات پڑھے ۔

فحش ادب پر پابندی معلوم ہوا ہے کہ حکومت اس امر پر سرگرمی سے غور کر رہی ہے کہ ملک میں ایسے تمام فحش مواد رسائل اور کتابوں پر مکمل پابندی عائد کر دی جائے جس سے نئی نسل کے اخلاق اور ذہن پر برے اور مضر اثرات مرتب ہو سکتے ہیں ۔ خیال ہے کہ اس پابندی کا دائرہ ہر قسم کی فحاشی کی روک تھام کرنے میں موثر ثابت ہو سکے گا اور صرف ادب اور صحافت تک ہی محدود نہ ہو گا بلکہ فلمیں بھی اس کے حلقۂ اختیار میں آ سکیں گی ۔

زیب النسا کے کلام کی مقبولیت برصغیر پاک و ہند کے عظیم مغل حکمراں اورنگ زیب عالمگیر کی صاحبزادی شہزادی زیب النسا کا کلام روس میں بے حد مقبول ہو رہا ہے ۔ زیب النسا کی شاعری کا ترجمہ حال ہی میں روسی زبان میں کیا گیا تھا ۔ جس کو تاجیک اسٹیٹ پبلشنگ ہاؤس نے شائع کیا ہے ۔ مجموعۂ کلام میں زیب النسا کی ۷۰ غزلیں شامل ہیں ۔ یہ ترجمہ روسی شاعرہ تتیانا اسٹریشن ناوف نے کیا ہے اور اس کا دیباچہ رسول خان زادہ نے لکھا ہے ۔

ادارۂ مصنفین کا استقبالیہ چینی ادیبوں کے وفد کے اعزاز میں ادارۂ مصنفین پاکستان لاہور شاخ کی طرف سے ایک استقبالیہ ۲ر اپریل کو دیا گیا تھا ۔ جس میں تقریر کرتے ہوئے چینی وفد کے ایک رکن مسٹر توسوان نے کہا کہ میں لاہور کے شہریوں کو سلام کرتا ہوں ۔ جنہوں نے بھارت حملے کا دنداں شکن جواب دیا ہے انہوں نے مزید کہا کہ چین اور پاکستان کے تعلقات کوئی نئے نہیں ہیں بلکہ ان کے درمیان دو ہزار سالہ قدیم ثقافتی اور خوا ہی تعلقات ہیں ۔ استقبالئے کی صدارت احمد ندیم قاسمی نے کی اس تقریب میں ادیبوں کی بڑی تعداد نے شرکت کی ۔

انجمن حمایت الاسلام مغربی پاکستان کے گورنر جناب ملک امیر محمد خاں نے انجمن حمایت الاسلام کے لئے ایک لاکھ روپے کا خصوصی عطیہ دینا منظور کیا ہے ۔ یہ اعلان انجمن کے ۷۱ ویں سالانہ اجلاس میں صوبائی وزیر تعلیم نے کیا اور اہل ثروت سے یہ اپیل بھی کی ہے کہ انجمن کو دل کھول کر چندہ دیں تاکہ وہ اپنی تعلیمی اور سماجی خدمات جاری رکھ سکے ۔ وزیر تعلیم نے اپنی جیب خاص سے بھی پانچ ہزار روپے دینے کا اعلان کیا ۔

ایک ادیب کی سگ نوازی سینٹ برنارڈ کا ایک کتا جس کا نام ٹاد سر دوم ہے ۱۵ لاکھ ڈالر کی ملکیت کا وارث قرار دیا گیا ہے ۔ یہ کتا امریکہ کے ایک ادیب لوسس بیب کا پالتو کتا تھا ۔ مسٹر بیب ریلوے کی تاریخ کے ماہر تھے اور انہوں نے ۲۰ لاکھ ڈالر کی جائیداد چھوڑی تھی ۔

یادوں کے چراغ

یوم اقبال

مغربی پاکستان کے تمام شہروں میں ۲۱ اپریل کو یوم اقبال کی تقریبات پوری شان و شوکت سے منائی گئیں۔ حکیم الامت شاعر مشرق علامہ اقبال کی ۱۸ ویں برسی کے موقع پر مغربی پاکستان کے تمام اہم شہروں میں شاعر مشرق کو خراج عقیدت پیش کیا گیا اور فاتحہ خوانی، قرآن خوانی کے علاوہ علمی امدادی تنظیموں نے خصوصی جلسے اور مذاکرے بھی کئے، جن میں شاعر مشرق کی تعلیمات پر روشنی ڈالی گئی۔

کویت میں یوم اقبال

بزم ادب اردو کویت کے زیر اہتمام کویت کے ایک اسکول میں یوم اقبال منایا گیا جس کی صدارت پاکستان کے سفیر جناب ایم ایس شیخ نے کی۔ صدیق اسکول، علامہ اقبال کے شیدائیوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس موقع پر تقاریر کے علاوہ مقالے اور منظومات بھی پیش کی گئیں۔ اس جلسے کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس میں عربی کے مشہور اسکالر ڈاکٹر شبیر بھی شریک تھے۔ اور انہوں نے علامہ اقبال کو خراج تحسین پیش کیا۔

یوم اقبال کی ایسی ہی تقریبات بیرون پاکستان کئی جگہ منعقد کی گئی ہیں۔ جن میں لندن اور امریکہ کی تقریبات قابل ذکر ہیں۔ جہاں پاکستانیوں نے بڑی عقیدت سے اپنے قومی شاعر کے حضور نذرانہ عقیدت پیش کیا۔

آئینہ خانے میں

جسٹس انوارالحق کے ارشادات

مسلم ایجوکیشنل کانفرس کے زیر اہتمام ایک تقریب میں مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے جج جناب جسٹس انوارالحق نے کہا:" انسانی فلسفۂ حیات فرد کی شخصیت کو انتہائی مقدس اور انسانی وقار کو اشد ضروری خیال کرتا ہے وہ فرد کو اجتماعی بہبود کے لئے غلام اور تابع مہمل نہیں بناتا۔ اسلام میں فرد اور ملت کا ایک دوسرے سے اتنا گہرا تعلق ہے کہ ایک کا دوسرے کے بغیر تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ حکیم الامت علامہ اقبالؒ کی شاعری میں بھی یہی پیغام ملتا ہے۔"

جناب اے ڈی اظہر کا انٹرویو

جناب اے ڈی اظہر ڈائرکٹر مرکزی اردو بورڈ اور رکن پنجاب یونیورسٹی سنیٹ نے ایک انٹرویو میں کہا ہے کہ کمیشن برائے طلبہ کی رپورٹ میں حقائق کو پوری طرح پیش نہیں کیا گیا ہے۔ کمیشن نے بنگالی بورڈ کی کارگزاری کو سراہا ہے اور اردو بورڈ کے بارے میں غیر تسلی بخش کلمات کہے ہیں۔ جب کہ حقیقت احوال بالکل مختلف ہے۔ انہوں نے کہا کہ اگر انصاف اور اعداد و شمار کو سامنے رکھ کر بنگالی اور اردو بورڈ کی کارگزاری کا موازنہ کیا جائے تو ہر حالت میں اردو بورڈ کا پلڑا بھاری نظر آئے گا۔

اردو بورڈ نے اپنی تمام تر ذمہ داریوں کو سامنے رکھتے ہوئے سات کتابیں جن میں دو سائنس کے موضوع پر ہیں شائع کی ہیں۔ جب کہ بنگالی بورڈ نے صرف پانچ کتابیں شائع کی ہیں اور ان میں بھی سائنس کے موضوع پر کوئی کتاب نہیں اس کے علاوہ ان پانچ کتابوں میں ایک سالانہ رپورٹ بھی شامل ہے۔ جناب اظہر نے صفحات کی تعداد پر بھی یہ موازنہ پیش کیا ہے اور بیان کیا ہے کہ مرکزی اردو بورڈ کی سائنسی مطبوعات ایک ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل ہیں جب کہ بنگالی بورڈ کی کل مطبوعات صرف ساڑھے چار سو صفحات پر مشتمل ہیں۔ جناب اے ڈی اظہر نے کمیشن کے اس رویّے پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے اس پر جانب داری کا الزام لگایا ہے۔

آئینۂ ہند

دہلی میں اہل قلم کی بھوک ہڑتال

سات ادیبوں شاعروں اور صحافیوں نے نئی دہلی میں ۲۲ اپریل سے بھوک ہڑتال کر رکھی ہے انہوں نے یہ ہڑتال ہندوستان میں اردو کے ساتھ ناروا سلوک کرنے کے خلاف احتجاج کے طور پر شروع کی ہے۔ بھوک ہڑتال کرنے والے ادیبوں اور صحافیوں نے الزام لگایا ہے کہ صوبہ اتر پردیش کی حکومت نے اردو کو علاقائی زبان تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے، حالانکہ اردو پاک و ہند کی مقبول ترین زبان ہے۔

ازبکی زبان میں اردو ادب

حال ہی میں راجندر سنگھ بیدی کی منتخب کہانیوں کا مجموعہ "لاجونتی" ازبکی زبان میں روس میں شائع کیا گیا ہے۔ اس مجموعے میں پانچ کہانیاں اور ایک ناولٹ شامل ہے۔ کہانیوں کا ترجمہ محمد جانف رحمان بیردی، زینت اللہ نف اور فتح نیشا باقف نے کیا ہے۔ یہ ترجمہ تیس ہزار کی تعداد میں شائع کیا گیا ہے اور خاصا مقبول ہو رہا ہے۔

دو ماہ پہلے غالب کے کلام کا انتخاب اور مرزا رسوا کا ناول "امراؤ جان ادا" کی اشاعت بھی اسی تعداد میں عمل میں آ چکی ہے۔ مرزا رسوا کے ناول کے مترجم بنی محمدوف ہیں اور غالب کے کلام کا ترجمہ محمد جانف رحمان بیردی نے کیا ہے۔ رسوا کا ناول ازبک زبان میں اتنا مقبول ہوا ہے کہ دو ماہ کی مدت میں سارا فروخت ہو گیا ہے۔ مزید مانگ کے پیش نظر اس کا دوسرا ایڈیشن ساٹھ ہزار کی تعداد میں شائع کئے جانے کی تیاری کی جا رہی ہے۔

جشن اثر

انجمن شعرائے لکھنؤ کی طرف سے حضرت اثر لکھنوی کو خراج تحسین پیش کرنے کے لئے ایک جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں حضرت اثر لکھنوی کی شاعری، تنقید اور شخصیت کو خراج تحسین پیش کیا گیا۔ اس تقریب میں جن حضرات نے حصہ لیا ان میں آنند نرائن قابل ذکر ہیں۔ سردار جسونت سنگھ نے خطبہ استقبالیہ پڑھا۔ اور پھر تقریروں، مقالات اور منظومات کی صورت میں اثر لکھنوی صاحب کی خدمات ادب کا اعتراف

کیا گیا - آخر میں ایک مشاعرہ بھی ہوا۔

ادبی مجلس کریم نگر انجمن ترقی اردو شاخ ضلع کریم نگر کی جانب سے ایک جلسہ ورنگل کے ممتاز شاعر جناب رامیشور راو شاد کی صدارت میں ہوا - انہوں نے اپنے خطبے میں ارشاد فرمایا کہ صرف حکومت کے سہارے کوئی زبان زندہ نہیں رہ سکتی - انہوں نے اردو والوں کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی سعی تیز تر کر دیں تاکہ ان کی اپنی زبان ترقی کرے اور پھلے پھولے -

اودے پور میں سمپوزیم اودے پور میں انجمن ترقی اردو کی شاخ کے زیر اہتمام ایک اردو سمپوزیم منعقد ہوا جس کا افتتاح کرتے ہوئے راجستھان کے وزیر خزانہ جناب بال کرشن کول نے کہا "اردو میری زبان ہے - جس زبان سے میں بنا ہوں اسی زبان میں اپنے جذبات کا اظہار اچھی طرح کر سکتا ہوں" سمپوزیم کی صدارت اعجاز صدیقی نے کی - موضوع گفتگو تھا " اردو ادب میں مشترکہ تہذیب و تمدن "

آصف علی یادگار کمیٹی دلی کے ممتاز شہریوں نے مشہور سیاسی رہنما اور دانشور آصف علی مرحوم کی یادگار قائم کرنے کے لئے امداد کی اپیل کی ہے اور کہا ہے کہ آصف علی صاحب کی یاد میں دلی یونیورسٹی کے تعاون سے اسی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں پوسٹ گریجویٹ طلبہ کے لئے ہر سال ۷۵ - ۷۵ روپے کے تین وظیفے دیئے جائیں گے -

"فن کی جانچ" کی اشاعت ڈاکٹر سیدہ جعفر کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ " فن کی جانچ " شائع ہو گیا ہے جس میں مصنفہ کے تمام اہم مضامین شامل ہیں - یہ مجموعہ نیشنل بک ڈپو حیدرآباد دکن نے شائع کیا ہے۔

نریش کمار شاد کو انعام حکومت پنجاب کی طرف سے اردو، ہندی اور پنجابی زبان کی بہترین کتابوں پر ہر سال انعامات دیئے جاتے ہیں - اس سلسلے میں نریش کمار شاد کو اس سال اردو کے انعام کا مستحق قرار دیا گیا ہے - یہ انعام " میرا کلام " پر دیا گیا ہے - شاد صاحب کے ساتھ کندن کی کتاب "گلزار" کو بھی انعام دیا گیا ہے -

مولانا عبدالماجد کی خدمات کا اعتراف اردو کے مشہور انشا پرداز، مصنف اور مدیر "صدق جدید" جناب مولانا عبدالماجد دریابادی کی علمی اور ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر حکومت اتر پردیش کے محکمۂ تعلیم کی جانب سے ۵ ہزار روپے کا انعام دینے کا اعلان کیا گیا ہے - اردو کے جن اور مصنفین کو انعامات کا مستحق قرار دیا گیا ہے - ان میں ڈاکٹر محمد حسن، میکش اکبرآبادی، شمیم کرہانی، اکبر حیدری، نثار احمد فاروقی، پریم پال، سید اقبال احمد اور دلاور فگار کو اُن کی کتابوں (علی الترتیب) "دھلی میں اردو شاعری کا فکری اور تہذیبی پس منظر"، " نقد اقبال "، "عکس گل"، " میر انیس بحیثیت رزمیہ شاعر"، " دید و دریافت "، " سرشار ایک مطالعہ"، "تاریخ شیراز ہند جون پور"، " شامت اعمال " پر یہ انعامات اس طرح تقسیم کئے گئے ہیں - ڈاکٹر محمد حسن کو پندرہ سو روپے شمیم کرہانی کو آٹھ سو روپے - میکش اکبرآبادی کو بارہ سو روپے اور باقی سب کو پانچ پانچ سو روپے

طاہرہ سعید کا اعزاز اردو کی شاعرہ اور ادیبہ محترمہ بانو طاہرہ سعید کو ریاستی حکومت آندھرا پردیش کی طرف سے شعر و ادب کا ممتاز اعزاز "سنتھانم" پیش کیا گیا ہے۔ یہ اعزاز اس سے پہلے مشہور شاعر مخدوم محی الدین کو بھی دیا گیا تھا۔ اس اعزاز کی تقریب میں گورنر گجرات نے طاہرہ سعید کی شعری صلاحیت کو زبردست خراج تحسین پیش کیا اور ثقافتی امور کے وزیر کی جانب سے طاہرہ صاحبہ کو کیسہ زر اور شال پیش کی گئی۔

ڈاکٹر غلام عمر خاں کو انعام حکومت آندھرا پردیش نے ڈاکٹر غلام عمر خاں استاد شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کی مرتب کی ہوئی کتاب "مینا ستونتی" کو ۱۹۶۵ء کی بہترین کتاب کی حیثیت سے انعام دیا ہے "مینا ستونتی" ملک الشعرا غواصی کی عشقیہ مثنوی ہے جس کا قصہ ہندوستان کی قدیم لوک کتھا "لورک چندا" پر مبنی ہے۔

مسلم یونیورسٹی کا سالانہ جلسہ سرسید ہال مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سالانہ جلسے میں وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی نواب علی یاور جنگ نے طلبہ کو ان کی غیر نصابی سرگرمیوں پر مبارکباد پیش کی انہوں نے اس موقع پر یہ بھی کہا کہ مسلم یونیورسٹی کا نام بدلنے کا مسئلہ بار بار اٹھانے سے بے چینی پیدا ہوتی ہے جو سخت نقصان دہ ہے۔

انجمن ترقی اردو لکھنؤ انجمن ترقی اردو لکھنؤ کی مجلس عاملہ کا ایک جلسہ جناب مولانا عرشی کی صدارت میں منعقد ہوا اس میں ایک تجویز کے ذریعے یہ مطالبہ کیا گیا کہ حکومت یوپی میں جو اردو کا خاص مرکز ہے ہائی اسکول تک اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی موثر کوشش کرے اور ہندوستان کی مختلف ریاستوں کی مثلاً آندھرا، بہار وغیرہ کی طرح یہاں بھی اردو قائم کرے تاکہ اردو پڑھنے والے طلبہ اپنی مادری زبان کی تعلیم سے محروم نہ رہیں اور ان کے دل و دماغ مفلوج ہونے سے بچ جائیں۔

انجمن کی مطبوعات

کاروان صحافت	ڈاکٹر عبدالسلام خورشید	۴ — ۰۰ روپے
مقالات حالی (جلد اول)		۳ — ۰۰ "
غزل اور مطالعۂ غزل۔	ڈاکٹر عبادت بریلوی	۱۰ — ۰۰ "
اردو تنقید کا ارتقاء	ڈاکٹر عبادت بریلوی	۷ — ۵۰ "
روایت کی اہمیت۔	ڈاکٹر عبادت بریلوی	۷ — ۰۰ "
فہرست مخطوطات انجمن ترقی اردو (جلد اول)		۱۰ — ۰۰ "

اس انجمن گل میں

انجمن ترقی اُردو کی مجلس متولیان کا انتخاب اپریل کے آخری ہفتے میں ہوا۔ مندرجہ ذیل حضرات تین سال کے لئے منتخب ہوئے:۔

۱ جناب جسٹس ایس اے رحمٰن
۲ جناب جسٹس انعام اللہ
۳ جناب جسٹس ایم مرشد
۴ جناب راجہ امیر احمد خان صاحب، محمود آباد
۵ جناب ممتاز حسن
۶ جناب پیر حسام الدین راشدی
۷ جناب ڈاکٹر نذیر احمد
۸ جناب احسن احمد اشک
۹ جناب شیخ عبد الخالق عبد الرزاق

صدر انجمن کا پیغام:۔ لائل پور میں انجمن کی شاخ کے قیام پر صدر انجمن جناب اختر حسین کا حسب ذیل پیغام پڑھ کر سنایا گیا۔

"لائل پور میں انجمن ترقی اُردو کی شاخ کا قیام ایک نیک فال ہے۔ وہ لوگ قابل مبارک باد ہیں، جن کی کوششوں سے اس شاخ کا قیام عمل میں آرہا ہے۔ لائل پور پاکستان کا ایک اہم صنعتی مرکز ہے۔ صنعتی مرکزوں میں علمی و ادبی اداروں کی ضرورت، دوسرے

شہروں سے زیادہ ہوتی ہے۔ کیوں کہ صنعت و حرفت کے ہنگاموں میں ثقافتی اقدار دب جاتی ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ لائل پور میں انجمن کی شاخ، ایک خوشگوار ادبی و علمی ماحول پیدا کرنے میں کامیاب ہوگی۔

انجمن ترقی اردو محض ایک ادارے کا نام نہیں، بلکہ یہ ایک زندہ و فعال تحریک ہے۔ جس کا ہماری قومی زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ اگر آپ حضرات نے اِس نکتے کو ذہن نشین کر کے کام شروع کیا تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ کی کوششوں سے اُردو زبان کو فروغ نہ ہو۔

مخطوطات انجمن ترقی اُردو کی دوسری جلد:- انجمن ترقی اُردو کے مخطوطات کی وضاحتی فہرست کی دوسری جلد مکمّل ہوگئی ہے۔ اس میں تقریباً دوسو مخطوطات کے بارے میں توضیحی حواشی ہیں۔ اسے جناب افسر امروہوی نے مرتب کیا ہے۔ توقع ہے یہ جلد آئندہ مالی سال میں شائع ہو جائے گی۔

لغت کبیر اردو:- حیدرآباد دکن کی سابق حکومت کی امداد سے بابائے اردو نے تقسیم سے پہلے ایک اُردو لغت کی تدوین شروع کی تھی لیکن ۱۹۴۷ء کے فسادات میں اس کام سے متعلق تمام کاغذات ضائع ہوگئے تھے۔ پاکستان میں آنے کے بعد بابائے اُردو نے یہ کام دوبارہ شروع کیا۔ ادرالف ممدودہ' الف مقصورہ' ب اور بھ تک کے الفاظ کا مسودہ مکمل کرلیا جو تقریباً دس ہزار صفحات پر مشتمل ہے — اُن کی وفات سے یہ کام جہاں تھا وہیں رہ گیا۔ جس حد تک یہ کام ہوچکا ہے' اسے رسالہ "اُردو" میں بالاقساط شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ پہلی قسط اپریل ۱۹۶۶ء کے شمارے میں شائع ہوئی ہے۔

اشاریۂ مضامین اُردو:- رسالہ اُردو کے چالیس سالہ مضامین کا اشاریہ مکمل کرلیا گیا ہے جو تین حصّوں میں ہے۔ پہلا حصّہ مضامین کی تصنیف وار فہرست پر مشتمل ہے دوسرے حصّے میں تبصروں کی فہرست ہے اور تیسرے میں پہلے دونوں حصّوں کا موضوع وار اشاریہ ہے یہ اشاریہ رسالہ "اُردو" میں قسط وار شائع کیا جا رہا ہے، پہلی قسط اپریل ۱۹۶۶ء کے شمارے میں شائع کی گئی ہے

انجمن کے نئے رکن:- انجمن کی طرف سے رکن سازی کی جو مہم چلائی جارہی ہے، اس کے تحت گذشتہ مہینے مندرجہ ذیل حضرات نے انجمن کی رکنیت قبول کی۔

۱	جناب اے ایس بیگ	اے۔ ۱۔ بلاک ۲ فیڈرل بی ایریا کراچی	(رکن)
۱	منصور علی علوی صاحب	حسینی منزل چسٹنٹ اسٹریٹ کراچی	(رکن)
۱	جناب پیر حسام الدین راشدی	بیت الضیا۔ جمشید روڈ کراچی	(رکن)

خانہ عام میں نئی کتابیں :۔

گذشتہ سہ ماہی میں کتب خانہ عام میں مندرجہ ذیل کتابوں کا اضافہ ہوا :۔

خالد بن ولید	امیر احمد
اردو تنقید پر ایک نظر	کلیم الدین احمد
اردو شاعری پر ایک نظر	" " "
اردو میں سوانح نگاری	ڈاکٹر سید شاہ علی
تخلیق و تنقید	پروفیسر عبد السلام
روح اقبال	ڈاکٹر یوسف حسین خاں
سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقا	ڈاکٹر سید عبد اللہ
مقدمات عبد الحق	
مومن و مطالعہ مومن	ڈاکٹر عبادت بریلوی
ناول کی تاریخ و تنقید	علی عباس حسینی
تذکروں کا تذکرہ نمبر	اشاعت خاص رسالہ نگار
مومن نمبر	" " " "
افکار عبد الحق	آمنہ صدیقی
خطبات مدراس	سید سلیمان ندوی
سرگذشت الفاظ	احمد دین
ہندوستانی لسانیات	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
۱۸۵۷ء	غلام رسول مہر
حالی اور نیا تنقیدی شعور	اختر انصاری دہلوی
حج مبرور و زیارت مقبول	———

۲۰	زاد السعید	مولانا اشرف علی تھانوی
۲۱	معلم الحجاج	سعید احمد
۲۲	حاجی بغلول	سجاد حسین
۲۳	خطوط کی ستم ظریفی	مرزا عظیم بیگ چغتائی
۲۴	اسلام کا نظریۂ حیات	خلیفہ عبدالحکیم
۲۵	قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں	سید ابو الاعلیٰ مودودی
۲۶	قرآن کا نظریۂ سلطنت	ہارون خاں شروانی
۲۷	امراؤ جان ادا	مرزا رسوا
۲۸	ادب اور تنقید	ڈاکٹر سید شاہ علی
۲۹	ادبی تخلیق اور ناول	ڈاکٹر احسن فاروقی
۳۰	اردو غزل	ڈاکٹر یوسف حسین خاں
۳۱	جدید شاعری	ڈاکٹر عبادت بریلوی
۳۲	روح تنقیدی ادب	(انتخاب تنقیدی مضامین)
۳۳	خطبات اقبال	مرتبہ رضیہ فرحت بانو
۳۴	جدید شعرائے اردو	ڈاکٹر عبدالوحید
۳۵	ولی سے اقبال تک	ڈاکٹر سید عبداللہ
۳۶	فلسفۂ اسلام	ڈی اولیری ترجمہ احسان احمد
۳۷	کائنات اور آئن اسٹائن	لنکن بارنٹ ترجمہ آفتاب حسن
۳۸	آتش رفتہ	جمیلہ ہاشمی
۳۹	مختصر تاریخ مرثیہ گوئی	حامد حسن قادری مرحوم
۴۰	لسانی مسائل اور نظریات	شیخ محمد سعید ایم اے
۴۱	فانی اور اُن کی شاعری	ڈاکٹر احسن فاروقی
۴۲	سر سید احمد خاں	بابائے اُردو
۴۳	محمد حسین آزاد (جلد دوم)	ڈاکٹر اسلم فرخی
۴۴	تاریخ پاک و بھارت (جلد دوم)	ہاشمی فرید آبادی
۴۵	عملی تنقید ... جلد ا ...	کلیم الدین احمد

مولوی ظفرالرحمٰن دہلوی مرحوم

ہماری کہاوتیں[۱]

"فرہنگ اصطلاحات پیشہ وران" کی تالیف کے سلسلے میں جو کتابیں پڑھیں ان میں سے بعض میں کہیں کہیں کہاوتیں، پند و حکمت کی باتیں، چٹکلے، اور رمزیہ کلام بھی درج پائے، ان میں سے منتخب امثال و اقوال یادداشت کے لئے نقل کر لئے جن کا ایک دلچسپ مختصر مجموعہ تیار ہو گیا۔

اس زمانے میں دلی سے کہاوتوں کی دو چھوٹی چھوٹی کتابیں (کہانی قصوں کے ساتھ) شائع ہوئیں، اور پھر جولائی ۱۹۴۶ء میں جب انجمن ترقی اردو (ہند) کے رسالے "اردو" میں صوبہ بہار کی مروجہ کچھ ہندوستانی کہاوتیں طبع و شائع ہوئیں تو جی چاہا کہ اپنا جمع کیا ہوا منتخب مجموعہ شائقین کی دلچسپی کے لئے چھپوا دیا جائے، پھر خیال آیا کہ اگر ہندوستانی کہاوتوں کا (جو اب تک لکھی جا چکی ہیں اور متفرق کتابوں میں بٹی ہوئی ہیں) باہمی مقابلے اور انتخاب سے ایک مکمل مجموعہ معنی، مطلب اور محل استعمال کے ساتھ فرہنگ کے ڈھنگ پر شائع ہو جائے تو امید ہے کہ مروجہ ہندی، ہندوستانی قدیم کہاوتوں، مقولوں، الفاظ اور محاوروں کے متعلق شائقین زبان کی معلومات کے لئے نہ صرف مفید بلکہ کارآمد ثابت ہو سکے گا۔ اس خیال کی تائید علامہ محترم ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب زاد برکاتہٗ معتمد انجمن ترقی اردو نے بھی فرمائی اور سچ تو یہ ہے کہ علامہ ممدوح کی تائید، حمایت اور رہبری ہی سے اس کام کی ہمت بندھی[۲]

بہر کارے کہ ہمت بستہ گردد   اگر خارے بود گلدستہ گردد

اللہ کا نام لے کر اس کام کو شروع کیا اور جتنی کتابیں اس مضمون کی دستیاب ہو سکیں ان کی ورق گردانی کی۔ پھر ان کی مندرجہ کہاوتوں وغیرہ کے باہمی مقابلے سے انتخاب کر کے ایک مکمل اور سب پر حاوی مجموعہ بالترتیب تیار کرنے میں بڑی محنت اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا، خیال جتنا آسان تھا عمل اتنا ہی مشکل پایا

کہ عشق آساں نمود اوّل ولے افتاد مشکلہا

کا مصداق بن گیا۔

۱؎ غیر مطبوعہ کتاب "ہماری کہاوتیں" کا مقدمہ ۲؎ یہ مضمون (۱) بابائے اردو کی زندگی میں لکھا گیا تھا۔

اس ضرورت کے لئے جو کتابیں مطالعہ کیں اُن میں سے خاص خاص کے نام سلسلے وار بطور حوالہ اور سند درج ذیل کئے جاتے ہیں ۔

ہندوستانی ضرب الامثال قلمی ۔ تالیف ۱۲۴۳ھ / ۱۸۲۷ء ۔ کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد دکن نشان ۴۸۶ ۔ اس کتاب کا سرورق نہیں اور مولف کے نام و نشان کا بھی کہیں پتہ نہیں ۔ دو حصوں پر مشتمل ہے حصہ اول میں (۱۱۴۳) اور حصہ دوم میں (۱۵۶۰) جملہ (۲۷۰۳) کہاوتیں ہیں اور بلا معنی مطلب و موقع استعمال لکھی ہیں ۔ آخر میں یازدہم جمادی الاول ۱۲۴۳ھ لکھا ہے ۔ سرورق پر پنسل سے ہندی ضرب الامثال تحریر ہے جو شاید کتب خانے والوں نے لکھا ہے ۔ دوسرے حصّے کی بعض کہاوتیں کم درجے کی اور کچھ بناوٹی سی ہیں ۔

خزینۃ الامثال مطبوعہ ۔ ۱۲۷۰ھ / ۱۸۵۴ء مطبع مصطفائی کانپور ۔ یہ کتاب دو حصوں میں ہے (دو نسخے) پہلا نامکمل ص ۱۹۲ تک دوسرا ص ۲۲۴ تک ۔ مولف سید حسین شاہ حقیقت میر منشی ریاست مندراس (مدراس) نے ۱۲۱۵ھ / ۱۸۰۰ء میں تالیف کیا ۔ اور تاریخی نام خزینۃ الامثال رکھا تھا بعد تخرجہ وغیرہ وغیرہ ؎

سالِ تاریخ خواستم کہ کنم ہم زنامش عیاں براہلِ کمال

کرخزینے سے خرج ساٹھ عدد بولا ہاتف خزینۃ الامثال

مرتب عبدالرحمٰن شاکر بن حاجی محمد روشن خاں جنہوں نے اس کو کچھ ترمیم کے ساتھ ۱۲۷۰ھ / ۱۸۵۴ء میں طبع و شائع کرایا ۔ عربی، فارسی اور ہندی ضرب الامثال کا ایک مختصر مجموعہ ہے ۔

خزائن الامثال (دستور الشعراء) قلمی ۔ تالیف ۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۴ء کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد دکن نشان ۲۸۱ ۔ مولفہ حافظ میر شمس الدین فیض دہلوی ابن مولانا امیر الدین خاں بن مولوی رحمت اللہ خاں شاگرد حافظ تاج الدین مشتاق دہلوی اور خواجہ میر درد مُبیّضہ بار دوم ۱۲۸۲ھ ۔ یہ کتاب برائے نذر نواب میر تراب علی خاں بہادر سالار جنگ، شجاع الدولہ مختار الملک حیدرآباد دکن لکھی گئی ۔

لغت، محاورات اور تھوڑی سی ہندوستانی کہاوتوں کا مجموعہ ہے، کہاوتوں کے ساتھ کچھ مختصر سی تشریح بھی ہے ۔

درالبُنیان المعروف بہ شمس البیان قلمی ۔ تالیف ۱۲۸۳ھ / ۱۸۶۴ء کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد دکن نشان ۲۶۶ نادر البُنیان، المعروف بہ شمس البیان فی مصطلحات ہندوستان لف مرزا جان طپش ۔ یہ کتاب چھوٹی تقطیع کے چند اوراق کا مجموعہ ہے جس میں کچھ کچھ محاورات اور مختصر سی کہاوتیں ی ہیں ۔ آخر میں مولف نے حسب ذیل عبارت لکھی ہے ۔ "۲۲ محرم الحرام ۱۲۰۸ھ در بلدۂ مرشدآباد تالیف شد" اس ب کو محمد نصیر الدین نے بلدۂ حیدرآباد دکن میں ۱۲۸۳ھ میں کتابت کیا ۔ اس مخطوطے کی کتابت ان الفاظ پر ختم ہوتی ہے ۔

الحمد للہ والمنۃ کہ ایں نسخہ نادر البنیان مسمی شمس البیان مشتمل بر محاورۂ عوام اختصاص و نوع از روزمرۂ خواص سند از شعر ہندی عبارت از زبان موزوں دہلی است از دست کمترین محمد نصیر الدین باتمام رسید۔

مخزن الاسرار و فوائد قلمی۔ تالیف ۱۲۹۴ھ / ۱۸۷۵ء کتب خانۂ آصفیہ حیدر آباد دکن نشان ۲۷۳۔ مولفہ محمد نصیر الدین نقش اس کتاب کے سرورق پر مندرجہ ذیل عبارت لکھی ہے۔

"...... بندۂ کمترین محمد نصیر الدین نقش نے محاورات اردو ... ٹھیک ٹھیک اخذ کر کے ہندوستانی (عبارت اڑ گئی) .... حسب استدعا بعض احباب یہ کتاب کہ مخزن الاسرار و فوائد ہے، تالیف کی ہوئی نیاز علی بیگ نکہت شاہجہان آبادی کی بے ترتیب اور حشو و زوائد سے پُر .... از بس بھری ہوئی تھی۔ جمع کر کے ترتیب دی ہے۔"

اس کتاب میں محاورات و اصطلاحات کے ساتھ کچھ امثال بھی لکھی ہیں۔ جن کی زبان سلیس اور صاف ہے ان کے معنی و مطالب مع سند کے تحریر کئے ہیں اور نوعیت بھی لکھی ہے۔ آخر میں تاریخ تالیف بایں الفاظ درج ہے ؎

از دست نصیر الدین محمد نقش ایں درقالب اتمام بدیں طور آمد

درصوری و ہم معنوی شد تاریخش ہشتاد و چہار و یکہزار و دو صد ۱۲۸۴ھ

لنگوسٹک پبلیکیشن مطبوعہ ۱۸۷۲ء مطبع ٹربنر اینڈ کمپنی لندن۔ یہ کتاب بحکم سرکار انگریزی (ہند) لکھی گئی۔ اس میں صوبۂ متحدہ آگرہ و اودھ کی مشہور اور مستند مروجہ ہندوستانی کہاوتیں اور مقولے مؤلف نے جگہ جگہ نقل کئے ہیں۔

انشاءِ ہادی النساء مطبوعہ ۱۸۷۵ء بار اول مطبع نارائن دہلی بار دوم ۱۸۸۱ء۔ مولفہ سید احمد دہلوی مولف فرہنگ آصفیہ۔ حسب فرمائش۔ ایس۔ ڈبلیو ڈاکٹر فالن آنجہانی۔ اس کتاب کے آخر میں ان کہاوتوں کا مجموعہ ہے جو متن میں استعمال کی گئی ہیں۔

نجم الامثال مطبوعہ اول ۱۲۹۳ھ / ۱۸۷۶ء دوم ۱۳۰۶ھ / ۱۸۸۸ء طبع سوم مطبع احمدی لاہور۔ مولفہ مولوی نجم الدین صاحب دہلوی مدرس عربک ہائی اسکول دہلی۔ اس کتاب کی طبع سوم پر پنجاب یونیورسٹی کی تقریظ میں ایک نایاب کتاب کہاوت مولفہ واجد علی شاہ والیٔ اودھ کا حوالہ دیا ہے اور اس کی کہاوتوں کا ذکر مقابلتاً کیا ہے۔ یہ تقریظ اخبار انجمن پنجاب لاہور جلد ۱۲۔ ۲۰ رمئی ۱۸۷۶ء اور جلد ۷ نمبر ۱۵ مطبوعہ ۱۴ راپریل ۱۸۷۶ء میں درج ہے جس کو کتاب مذکور مطبوعہ بار سوم کے دیباچہ میں نقل کیا ہے اور "کوکب عیسوی" لکھنؤ سنہ جلد ۹ مطبوعہ ۷ رجون ۱۸۷۶ء کا بھی حوالہ دیا۔

کچہری ٹکنیکلز مطبوعہ ۱۸۷۷ء الہ آباد گورنمنٹ پریس۔ مولفہ مسٹر پیٹرک کارنے کمشنر رائے بریلی (اودھ)

ں کتاب میں جگہ جگہ صوبہ آگرہ و اودھ کی مشہور و مروجہ ہندوستانی کہاوتیں تحقیق سے نقل کی گئی ہیں۔

پیزنٹ لائف ان بہار اینڈ اڑلیسہ

مطبوعہ ۱۸۷۲ء بار اوّل ۱۸۷۷ء بار دوم گورنمنٹ پریس کلکتہ (حسب فرمائش گورنمنٹ برطانیہ ہند) سی۔ ایس ریٹرک ریونڈر ایف ایف کولے کیپٹن مارشل اور لالہ چوکھے لال پنیڈر معاونین میں تھے۔ اس کتاب میں بہار اور اڑلیسہ ی دیہاتی زندگی اور وہاں کے مزدوروں کی کاروباری زبان کے متعلق معلومات فراہم کی ہیں اور اس مقام کی کچھ کہاوتیں بھی لکھی ہیں جو ہندوستانی زبان میں ہیں۔

گنجینۂ زبان اُردو (گلشن فیض) ۱۲۹۷

مطبوعہ ۱۲۹۷ھ / ۱۸۸۰ء مطبع نولکشور۔ مولفہ حکیم محمد ضامن علی جلال لکھنوی۔ نور اللغات کی طرح اس کتاب میں کہاوتیں وغیرہ نقل کی ہیں زیادہ تر الفاظ ور محاوروں پر مشتمل ہیں۔ دیباچہ میں لکھا ہے کہ نواب کلب علی خاں والیٔ رام پور کی فرمائش پر مولف نے یہ محنت ٖوارا کی ہے۔ شعراء نے اس کتاب کی بہت سی تاریخیں کہی ہیں اور تعریفوں سے زمین آسمان کے قلابے ملائے ہیں ایک ماریخ (گلشن فیض ۱۲۹۷) ہے

اے ڈکشنری آف ہندوستانی پرووربز

مطبوعہ ۲۷ رجون ۱۸۸۴ء بار اول اور ۱۸۸۶ء بار دوم، میڈیکل ہال پریس بنارس۔ ٹربز اینڈ کو (لندن) مولفہ ایس۔ ڈبلیو فالن۔ پی، ایچ، ڈی (ہیلے) S. W. FALLON, PH. D. (HALLE) اس کتاب اور اس کے مولف کے متعلق مختصر کیفیت آگے سلسلۂ مضمون میں لکھی ہے وہاں ملاحظہ ہو۔

شرف العلوم حصہ اوّل

مطبوعہ ۱۸۸۵ء مطبع نامی زیب کاشی دہلی۔ مولفہ احمد مرزا صاحب دہلوی یہ تالیف مختلف زبانوں کے الفاظ کا مجموعہ ہے اور بس اکہیں روزمرہ کی مثال دی ہے اور کچھ محض معمولی۔

مخزن المحاورات

مطبوعہ ۱۸۸۶ء مطبع محب ہند فیض بازار دہلی طبع دوم۔ مولفہ منشی چرنجی لال دہلوی میٹرک کلکتہ یونیورسٹی اور مددگار ایڈیٹر مسٹر فالن ان کا اختیاری مضمون سنسکرت تھا۔ اس کتاب میں زیادہ تر محاورے اور کمتر کہاوتیں ہیں جو مسٹر فالن کے مجموعے میں درج ہیں۔ انہوں نے طبع اول کے دیباچہ میں مسٹر فالن کے بہت مختصر کچھ حالات لکھے ہیں۔

ب الامثال مطبوعہ ۱۸۸۷ء بار اول ۱۹۱۰ء بار دوم ۱۹۳۱ء بار سوم مطبع محبوب عالم پیسہ اخبار لاہور مولف حاجی محبوب عالم ایڈیٹر پیسہ اخبار لاہور۔

اس کتاب میں اردو، فارسی، عربی، انگریزی اور پنجابی زبان کی کہاوتیں نقل کی ہیں۔ دیباچہ میں بہت کچھ تالیف لیف، کہاوت کی تعریف اور زبان اردو اور اس مضمون کے متعلق کچھ اظہار رائے کیا ہے۔

مایہ زبانِ اردو، تحفۂ سخنوران (لغت) مطبوعہ ۱۳۰۶ھ / ۱۸۸۹ء مطبع جعفری نخاس جدید لکھنؤ۔ مولفہ حکیم سید ضامن علی جلال لکھنوی۔ حسب فرمائش ڈائرکٹر پبلک لشن بنگال (کلکتہ) تالیف کی گئی۔ محاورات کے سلسلے میں کچھ امثال اور ان کا موقع استعمال بھی لکھا ہے۔ زیادہ تر ے، کنائے اور لغت کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کے آخر میں مولف کے شاگردنے مولف اور کتاب کی تعریف ، باندھ دیئے ہیں جو قدیم شاعرانہ قصیدہ گوئی سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔

ورات ہند، لطائف بے نظیر ۱۳۰۴ھ مطبوعہ ۱۳۰۶ھ / ۱۸۸۹ء مطبع مجتبائی دہلی باہتمام مولوی حافظ عبدالاحد صاحب مولفہ مولوی سبحان بخش صاحب مدرس عربی سابق دہلی کالج۔ مولف اورات کے ساتھ کہاوتیں اور ان کا موقع استعمال لکھا ہے لیکن ابجدی ترتیب نہیں ہے، لغت، محاورات، اصطلاحات رہ، رمز، کنایہ اور کہاوتیں سب خلط ملط ہیں، جو کچھ لکھا ہے وہ یاد سے لکھا معلوم ہوتا ہے۔ کہاوتوں کی زبان البتہ سلیس ہاوتیں ٹھیٹ اور ستھری ہیں۔ بعض جگہ بھول کی وجہ غلطیاں بھی ہوئی ہیں۔

رہند (تحفۂ سخنوراں) مطبوعہ ۱۳۰۶ھ / ۱۸۸۹ء مطبع شوکت جعفری لکھنؤ۔ مولفہ مرزا محمد مرتضیٰ عاشق لکھنوی عرف مجھو بیگ اس کتاب میں صرف حرف الف کے محاورے اور اس کے تحت کچھ امثال لکھی ہیں، اس کی بلدیں شائع کرنا لکھا ہے۔ اس کا نام بہارِ عجم کے وزن پر رکھا ہے۔ آخر میں صرف اس قدر لکھا ہے" الحمد للہ ماہ جون ۱۸۸۹ء بلی جلد بہارِ عجم کی چھپ کر تیار ہو چکی" کہ اس کی کوئی دوسری جلد نہیں ملی، غالباً کوئی دوسرا حصہ چھپا ہی نہیں، اس مختصر ت کی ہمعصر شعرا نے پچاسوں بلکہ سینکڑوں تاریخیں کہی ہیں۔ دیباچہ میں روزمرہ، محاورہ، اصطلاح، کنایہ اور مثل ریف بیان کی ہے۔

ات الخواتین مطبوعہ ۱۹۰۶ء بار اول خادم التعلیم پریس لاہور۔ باہتمام منشی محمد عبدالعزیز صاحب۔ مولفہ مولوی سید احمد علی اشہری۔ اس کتاب میں اصطلاحات زیادہ محاورات کم اور امثال کمتر ہیں۔ ر مدارس کے لئے لکھی گئی معلوم ہوتی ہے۔

ات النساء مطبوعہ ۱۹۱۷ء مطبع کاشی رام سابق نول کشور لاہور و دہلی باہتمام لالہ کاشی رام۔ مولفہ خان صاحب مولوی سید احمد صاحب دہلوی مولف فرہنگ آصفیہ۔ مولف نے اس کو ضرب الامثال کا گنجینہ اور

زبان کا دفینہ لکھا ہے۔ لیکن زیادہ تر عورتوں کی زبان زد کہاوتیں روزمرہ اور محاورے ان کی باہمی خطوط نویسی میں ظاہر کئے ہیں۔ آخر میں کہاوتوں کی ایک مختصر فہرست جو خطوں میں استعمال ہوئی ہیں شامل کردی ہے۔ اس کے سا وجہ تصنیف اور اپنی توصیف بیان کی ہے اور بس اپنے وقت اور اخراجات کو پبلک کی بھینٹ چڑھانا لکھا ہے۔

قرار اللغات (اردو محاورات) مطبوعہ ۱۹۱۹ء نول کشور پریس لکھنؤ۔ مولفہ سید تصدیق حسین قرار شا تلمیذ حضرت امیر مینائی سرورق پر گزارش میں لکھا ہے کہ امیر احمد صاحب امیر مینائی نے حسب فرمائش نواب کلب علی خاں والیٔ رام پور اردو محاورات کا لغت لکھنے کی طرف توجہ کی..... کے بعد مولف نے یہ لغت اپنے تخلص پر نام رکھ کر تیار کیا، آخر میں از ص ۲۰۲ تا ص ۲۰۱۳ مثلیں لکھی ہیں۔ ص ۱۱۳ ص ۲۰۷ فارسی امثال نقل کی ہیں اور لکھا ہے کہ خدا کرے طلبا ان سے فائدہ اٹھائیں۔

ملک کی زبان (محاورات ہندوستان) حصہ اول و دوم مطبوعہ ۱۹۲۴ء بار اول مجیدی پریس کانپور۔ مولفہ محمد منیر صاحب منیر۔ مولف نے دیباچہ میں اپنی اس تالیف کی بہت کچھ تعریف کی ہے گویا ایسی کوئی دوسری تالیف نہیں۔ از ص ۵ تا ص ۱۹۹ کہاوتیں اور ا موقع استعمال لکھا ہے۔

اردو ضرب الامثال و محاورات مطبوعہ ۱۹۲۸ء جید برقی پریس دہلی۔ مولفہ فاضل مقبل دہلوی کتاب میں کہاوتوں کی ایک فصل ہے اور ان کو فقروں میں استعمال کی لیکن یہ استعمال کسی قدر بھونڈا اور بعض جگہ بے معنی اور غلط ہے۔ کہاوتوں میں کہیں کہیں غلطیاں بھی ہیں اور ان استعمال بھی غلط ہے۔ بعض کہاوتیں بناوٹی ہیں اور بہت کچھ غلط سلط مواد ہے، شروع میں محاورے جمع کئے ص ۳۰۷ سے امثال لکھی ہیں، کہاوتیں بے ترتیب ہیں کوئی ابجدی سلسلے میں نہیں۔

بازاری زبان (اصطلاحات پیشہ وران) مطبوعہ سنہ ۱۹۳۰ء مجیدی پریس کانپور۔ باہتمام حاجی محمد ابن حاجی محمد سعید مولفہ محمد منیر صاحب تنیر۔ بازاری مبتذل کلمات و محاورات وغیرہ کا مجموعہ ہے کچھ مروجہ کہاوتیں اور ایک فہرست قصابوں، سوداگروں، دلالوں، وغیرہ کی اصطلاحات کی شریک ہے۔ خود مولف نے لکھا ہے کہ "فحش زبان سے مہذب پارٹی کے حضرات خاص کر مدارس احتراز کریں"

محاورات نسواں (خاص بیگمات کی زبان) مطبوعہ سنہ ۱۹۳۰ء مجیدی پریس کانپور۔ مولفہ محمد منیر صاحب یہ کتاب "ملک کی زبان" کی ایک کڑی ہے اس سے ب اور کچھ نہیں، پہلی کتاب کا گویا نیا نام ہے۔

ومحاورات مطبوعہ ۱۹۳۲ء مسلم پرنٹنگ پریس ریلوے روڈ لاہور مولفہ شیخ دوست محمد بی اے،
بی ٹی ہیڈ ماسٹر ڈی بی ہائی سکول لالیاں اور ایم جلال الدین ہیڈ ماسٹر ونکلر مڈل اسکول
قادر شاہ چھوٹی تقطیع، ۱۲۷ صفحات، طلبا کی ضرورت کے لئے لکھی گئی معلوم ہوتی ہے، مضمون کے اعتبار سے بہت
ہے -

ب الامثال مطبوعہ ۱۳۵۶ھ / ۱۹۳۷ء مکتبہ جامعہ پریس دہلی - مولفہ خواجہ عبد المجید - قصہ کہانیوں پر مشتمل چند
کہاوتوں کا مجموعہ ہے جو عورتوں اور بچوں کی دلچسپی کے لئے لکھی گئی معلوم ہوتی ہے -
ر میں لکھا ہے کہ اس مضمون کو آل انڈیا ریڈیو سے نشر کرنا منظور تھا جو نہ ہو سکا اس لئے طبع کرا دیا گیا -

ص الامثال مطبوعہ ۱۹۳۷ء نایاب برقی پریس دہلی - مولفہ ابوالعامر خواجہ محمد باقر قادری دہلوی -
یہ کتاب مضمون کے لحاظ سے کتاب ضرب الامثال نشان ۲۷ کا مثنیٰ ہے اور اس سے
ہ کچھ نہیں -

سالہ اُردو مطبوعہ جولائی ۱۹۴۰ء انجمن ترقی اردو ہند دہلی - اس رسالہ میں صوبۂ بہار کی مروجہ ہندوستانی
کہاوتیں مرتبہ شاہ مقبول احمد ایم - اے کلکتہ شائع ہوئی ہیں جو زبان اور مضمون کے اعتبار سے
دستانی کہاوتوں کا جز ہیں مقامی الفاظ اور اسلوب بیان کا بہت معمولی سا فرق ہے -

یل اُردو مطبوعہ امپیریل بکڈپو پریس دہلی - مولفہ مولوی سید ظفر حسن صاحب عاصی منشی فاضل ہیڈ
مولوی پارکر ہائی اسکول مراد آباد (یو - پی) طلبا کی معلومات کے لئے محاورات، تلمیحات اور مشاہیر
حالات کا ایک مختصر مجموعہ ہے، شروع میں از ص ۳۳ تا ص ۴۵ تھوڑی سی امثال لکھی ہیں - سرورق پر تاریخ طبع
ی ہے اور نہ کسی دوسری جگہ - بظاہر ۱۹۴۰ء سے قبل کی طبع شدہ معلوم ہوتی ہے -

منی کہاوتیں مطبوعہ پاکٹ ایڈیشن، کتب خانہ سرکاری ہائی سکول چنچل گوڑہ حیدر آباد دکن اس کتابچہ کا سرورق نہیں تھا
اس لئے اس کی تاریخ اشاعت اور مرتب کا نام نہ معلوم ہو سکا - طلبا کے لئے منتخب کہاوتوں
مجموعہ ہے -

ندوستانی کہاوتیں قلمی - از کتب خانہ سید مظفر حسین تاجر پرانی کتب اس کتاب کا سرورق نہیں ہے
اس لئے پتہ نہیں چلتا کہ کس نے اور کب مرتب کی، ظاہری کیفیت سے معلوم ہوتا ہے
بہت پرانی ہے - شاید کسی کی فرمائش پر مسٹر فالن کی کتاب کی نقل کی ہے - کہاوتیں رومن رسم الخط میں لکھی ہیں -
معنی اردو میں - انگریزی خط نہایت باریک اور بہت صاف ہے -

زینتہ الامثال - (جدید مطبوعہ) مطبع انوار احمدی الہ آباد - مولفہ حافظ جلال الدین احمد جعفری مدرس

انٹرمیڈیٹ کالج الہ آباد۔

لغات انگریزی - اُردو

ہندوستانی انگریزی ڈکشنری ۔ ڈاکٹر ہیرس مطبوعہ ۱۷۹۰ء
" " " مولفہ کیپٹن جوزف ٹیلر اور ڈاکٹر ہنٹر مطبوعہ ۱۸۰۸ء
" " " جون شکسپیر مطبوعہ ۱۸۱۴-۲۰-۳۴ء
" " " ڈاکٹر فالن مطبوعہ ۱۸۷۹ء اور ۱۸۸۴ء
" " " فوربز

اسٹنڈرڈ السٹریٹیڈ ڈکشنری (ہندی انگریزی) مولفہ آر سی پاٹھک بی اے ایل ٹی۔ مطبوعہ ۱۹۴۶ء بار دوم۔

لغات اُردو

نوراللغات - جامع اللغات - کریم اللغات - نفائس اللغات

اوپر لکھی ہوئی کتابوں اور لغات کے علاوہ دوسری کئی اور کتابوں کی بھی ورق گردانی کی لیکن ان میں مطلب کی کوئی بات نہ ملی۔ غیر مانوس ہندی الفاظ کے معنی و مفہوم کی صحت کے لئے مستند ہندوستانی انگریزی لغات سے جہاں تک ممکن ہو سکا استفادہ کیا۔

ان سب کتابوں میں جو مطالعہ کی گئیں مسٹر فالن آنجہانی کی کتاب " اے ڈکشنری اوف ہندوستانی پروور بز " میں سب سے زیادہ ہندی ہندوستانی کہاوتوں، مقولوں اور دوسری اسی قسم کی باتوں کا مجموعہ پایا۔

اس موقع پر مذکور الصدر کتاب کے متعلق ایک مختصر کیفیت لکھنا مناسب معلوم ہوتا ہے برطانوی حکومت ہند کے ایما سے ڈاکٹر فالن سرکل انسپکٹر اوف اسکولز صوبہ بہار نے ہندوستانی ڈکشنری کی تالیف کا کام شروع کیا اُن کی امداد کے لئے لائق لائق ہندوستانی اشخاص گورنمنٹ نے مقرر کئے اور ایک بڑا عملہ بصرف زرکثیر اس کام کے انجام دینے کے لئے منظور فرمایا ۱۸۷۹ء میں پہلی بار یہ ڈکشنری طبع ہوئی۔ " ہندوستانی پروور بز " اسی کتاب کا ضمیمہ ہے جو اگست ۱۸۸۴ء میں پہلی بار اور ۱۸۸۶ء میں دوسری بار طبع ہوا۔ مسٹر فالن آنجہانی کے مددگاروں میں مشہور اصحاب (۱) لالہ فقیر چند دہلوی مددگار اوّل (۲) لالہ چرنجی لال دہلوی (۳) لالہ ٹھاکر داس دہلوی (۴) لالہ جگناتھ دہلوی اور (۵) مسٹر ایس۔ ایچ واٹ لنگ ہیڈ ماسٹر ورنیکلر ہائی اسکول دربھنگہ (۶) منشی لیاقت حسین

دیناپوری (۷) پنڈت شونرائن میو کالج اجمیر (۸) سید احمد دہلوی (۹) منشی نہال چند ڈپٹی انسپکٹر مدارس (۱۰) بشیشر ناتھ اور (۱۱) رام پرشاد دہلوی (۱۲) رام ناتھ تواری فرخ آبادی (۱۳) لالہ کشوری لال دہلوی (۱۴) منشی احسان علی رہتکی، (۱۵) محمد محمود میرٹھی - ان کے علاوہ مسٹر بٹ اور مسٹر ٹمپل ایڈیٹروں میں تھے - اور مسٹر پی وہائے مسٹر سی ایس کرپیٹرک ریورنڈ ایف ایف کولے کیپٹن مارشل اور لالہ چوکھے لال پلیڈر معاونین میں تھے - ۳ر جون ۱۸۸۰ء کو مسٹر فالن کا بمقام لندن انتقال ہوگیا اور ان کا باقی کام مسٹر ٹمپل اور مسٹر بٹ نے ترتیب دے کر مکمل کیا - کتاب "ہندوستانی پروربز" کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ مسٹر فالن کے مددگاروں نے نہ صرف کتابوں سے بلکہ جگہ جگہ کے لوگوں سے مل کر اور سن کر بہت سی مقامی کہاوتیں اور اُن کے ساتھ مشہور ہندی مقولے اور دوسری بہت سی ایسی باتیں بھی جمع کر دی ہیں جو کہاوتیں تو نہیں کہی جاسکتیں لیکن ان میں سے اکثر خاص خاص موقعوں پر خاص مفہوم میں بطور کہاوت استعمال کی جاتی ہیں - جن میں سے بعض کا جاننا غیر زبان والوں کو زبان دانی کے لئے بہت مفید ہو سکتا ہے - شاید اسی وجہ سے مسٹر جون بیمز نے اس کتاب کے تعارف میں سرورق پر چند جملوں میں کتاب کی جامعیت کی بہت تعریف کی ہے - اُن کے الفاظ کا خلاصہ و مطلب یہ ہے -

"طالب علم غیر زبان کو اب "پریم ساگر اور باغ و بہار" پڑھنے کی ضرورت نہیں"

"یہ کتاب ایک سال میں اس کو زبان کے متعلق اس قدر سکھا دے گی جتنا کہ دوسری

"کتب دس پندرہ سال میں سکھا سکیں گی"

مذکور الصدر کتاب میں بعض جگہ کہاوت وغیرہ کے معنی مفہوم اور موقع استعمال میں کچھ کوتاہیاں اور غلطیاں بھی ہیں - ملاحظہ ہوں صفحات ۲۴ - ۳۷ - ۷۰ - ۷۲ - ۷۶ - ۱۱۴ وغیرہ جن کو رفع کیا گیا ہے اور معمولی روزمرہ جملوں وغیرہ کو جن کے مفہوم میں کوئی نئی بات نہیں ہے انتخاب میں ترک کر دیا ہے - کہاوتوں کی دوسری تالیفات میں کچھ تو اصلی کہاوتیں ہیں کچھ غیر زبانوں عربی، فارسی، ہندی کی کہاوتوں کے ترجمے - مثلاً "کیا پر کروں سنگھار پیا مورا آندھر" سے "پیا مرا اندھا کس کے لئے کروں سنگھار" (نجم) اور "ماتھے کا کام ٹونا بیل کا گرنا" سے "سر منڈاتے ہی اولے پڑے" اور "ایک پیڑ ہڑے سگرے گانوں کھانسی" سے "ایک انار سو بیمار" وغیرہ - اور بہت سی ایسی ہیں جو اصل یا ہم مطلب کہاوتوں سے الفاظ کو ادل بدل گھٹا بڑھا - یا آگے پیچھے کر کے اسلوب بیان کے فرق سے بنالی گئی ہیں یا کہیں ہم مطلب کہاوت کو اصل کہاوت کے طور پر لکھ دیا ہے - اور فقروں میں استعمال شدہ محاورے اور کہاوتیں بھی شامل کر لی ہیں، مثلاً "ناک کاٹنا اور تاش کے رومال سے پوچھنا" سے "پہلے تو ناک کاٹ لی پھر تاش کے رومال سے پوچھنے لگے" (نجم) یا "اونٹ جب پہاڑ کے تلے آئے جبری جانے نیچے آئے جب جانے" سے "جب تک اونٹ پہاڑ کے نیچے نا آئے تب تک وہ جانتا ہے مجھ سے اونچا کوئی نہیں"

بعوں میں اردو کہاوتوں کی جس کی اصل ہندی یا دوسری زبانوں کی کہاوتیں ہیں اگرچہ خاصی اچھی اور دلچسپ تعداد ہے
ن کی ترقی اردو زبان کی ترقی کے ساتھ وابستہ ہے ۔

وتوں کی زبان کہاوتوں کی زبان زیادہ تر ہندوستانی یا ہندی ہندوستانی ہے جو مختلف مقامی اور بیرونی بولیوں کے ملاپ سے ملک کے ہر حصے میں بولی جاتی ہے ۔ اس کی توضیح کی زیادہ ضرورت
کہاوتوں کا مطالعہ خود اس کا ثبوت ہوگا، تاہم ہندی سے ناآشنا لوگوں کے لئے کہاوتوں میں مستعملہ ناموس ہندی
یا مقامی بولیوں کے ایسے الفاظ کی، جو عام فہم نہیں ہے فصاحت کہاوت کے معنی و مطلب کی تشریح کے ساتھ کردی
ر حسب ضرورت صفحے کے آخر میں ترتیب وار لکھی ہے ۔ اس کے علاوہ کتاب کے آخر میں تحقیق کے ساتھ ایسے الفاظ کی ایک
ت بھی شریک کردی گئی ہے ۔

اوتوں کی قسمیں اس مجموعے میں کہاوتوں کو دو قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے ۔ ایک اصل (معیاری) کہاوت جو انسانی فطرت عادت و اطوار، مشاہدات تجربات اور مسلمات کے اظہار کے موقعوں پر مبنی اور
علوم متعارفہ کہی جاتی ہے ۔ ان کا وجود قدیم اور انسان کے ساتھ باقی رہنے والا ہے ۔ دوسری قسم رسمی اور رواجی کہنا
سب ہے جو مختلف قوم، ذات، برادری کے لوگ اور پیشے جتھے اپنے اپنے حالات خیالات اور کاروباری تجربات
ا پر مقامی بولیوں میں یا اصل الفاظ بدل کر کہاوت کے ہم مطلب مرادف کہاوتیں بنا لیتے ہیں، یہ کہاوتیں حالات کے
سے بدلتی اور مٹتی رہتی ہیں ۔ اس قسم سے زبان کی وسعت اور خیالات کا اندازہ ہوتا ہے ۔ اس لئے ایسی کہاوتوں کو
ں تک ممکن ہو سکا اصل کہاوت کے تحت لکھا گیا ہے ۔ اور ابجدی سلسلے میں جہاں وہ آئی ہیں وہاں ان کی اصل کہاوت
الہ دے دیا ہے، تاکہ ابجدی ترتیب میں بھی ان کا مطالعہ ہو سکے ۔ بعض مولفین نے بازاری اوباش لوگوں کی دل لگی کی فحش
جو کہاوت کے وزن پر ہیں بطور کہاوت لکھ دی ہیں ۔ مثلاً "آئی تو روزی نہیں تو روزہ" پر "آئی تو رمائی نہیں تو خالی
پائی" وغیرہ ان کو نظر انداز کر دیا گیا ہے ۔ بعض نے کہاوتوں کی منظوم صورت بطور کہاوت لکھ دی ہے ۔ مثلاً "ایک
دو کاج" کے بجائے سے

پیپل پوجن میں چلی گنگھبو دکے گھاٹ   پیپل پوجت پی ملے ایک پنتھ دو کاج

یا

چلو سکھی تہاں جائیے جہاں بسیں برج راج   گورس بیچن ہر ملن ایک پنتھ دو کاج

وتوں کے علاوہ دوسری باتوں میں بزرگوں کے پند اور مقولے، حکمت و معرفت کی باتیں، طبعی کیفیات کا اظہار
ت اخلاق کے نمونے فقرے، آوازے، تکیۂ کلام، بجھائیاں، چٹکلے، رمز، پھبتی، کنایہ، طعن، ہجو، دعا، بددعا سب
لیہ شریک ہے ۔ ان میں سے بہت سی باتیں مقبول عام و خاص اور بزبان زد خلائق ہو کر کہاوت کے درجہ کو پہنچ گئی ہیں ۔

اور ہر موقع استعمال ہوتی ہیں ہر ایسی بات کے مقابل حاشیہ پر اس کی وضاحت کر دی ہے اور تشریح و موقع استعمال میں اُس کی کیفیت۔

اب کہاوتوں کے محلِ استعمال کے متعلق کچھ عرض کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ سوچ بچار سے بعض کہاوتوں کے ایک سے زیادہ محلِ استعمال ہو سکتے ہیں لیکن اس الجھن میں پڑنا دردِ سری سمجھ کر صرف وہی محلِ استعمال لکھا گیا ہے جس کے لئے کہاوت وضع ہوئی ہے۔ اور جو بلا تامل سننے والے کے ذہن میں اتر جائے اور اُس کو ایسا معلوم ہو کہ گویا وہ اس کے دل میں ہے۔

کہاوتوں کے متعلق قصّے کہانیاں

بعض کہاوتوں کے متعلق حقیقی اور بناوٹی کچھ قصّے کہانیاں بھی لکھی گئی ہیں ان میں بعض خلاف فطرت من گھڑت ہیں جو بچوں کے دل بہلاوے سے زیادہ نہیں، ان کی نقل بخوفِ طوالت ترک کر دی ہے لیکن خاص موقعوں پر موضوع کہاوت سمجھانے کو کچھ اَتا پَتا بیان کر دیا ہے۔

دہقانی مقولے

کسانی بھائیاں یا دہقانی مقولے بھی دوسری باتوں میں شامل ہیں ان سے کاشتکاروں کے مشاہدے اور تجربے کی بہت سی روائتی باتیں جو ان میں رائج و راسخ ہیں مثلاً موسمی حالات و کیفیات فصلی پیداوار اناجوں کی خاصیت وغیرہ کا دلچسپ پیرائے میں بیان نہایت پر لطف اور سبق آموز ہے اس لئے شائقین کی دلچسپی کو کتاب کے آخر میں بطور ضمیہ شریک کر دیا ہے۔ ان میں اکثر کہن (کہاوت) اور پند کے طور پر کہی جاتی ہیں۔

کہاوت کی تعریف

بعض مولفین نے اپنی کتاب کے دیباچے میں کہاوت کی بڑی لمبی تعریفیں لکھی ہیں اور اب تک اس کی تعریف میں بہت کچھ کہا جاتا ہے۔ عربی میں اس کی تعریف یوں کی ہے۔

اَلمِثْلُ فِی الکَلَامُ کالمِلحِ فی الطعام

اس سے زیادہ اس کی تعریف دریا کو کوزے میں بھرنا ہے۔

کہاوت، دراصل ایک ایسا ادبی چٹکلا ہے جس کے چند گنے بندھے الفاظ جاہل سے جاہل کے لئے سبق آموز ہوتے ہیں اور جو بات بہت مشکل سے سمجھائی جاتی ہے اور پھر بھی سمجھ میں نہیں آتی وہ کہاوت کے الفاظ اسلوب بیان اس کے لئے کبھی نہ بھولنے والا سبق بنا دیتے ہیں اس لئے ان تمام مولفین کا جنہوں نے کسی نہ کسی ڈھنگ سے کہاوتوں کے جمع کرنے اور لکھنے کی تھوڑی یا بہت زحمت گوارا فرمائی ہے ملکی زبان کے ادب پر بڑا احسان ہے اور وہ سب دعائے خیر سے یاد رکھنے کے لائق ہیں۔

مطبوعاتِ انجمن

تاریخ وسیاست :-

کتاب	مصنف / مترجم	قیمت	
کابل و یاغستان	مولوی محمد علی قصوری	۲ — ۲۵	روپے
تذکرہ اہل دھلی	سرسید احمد خان ـ مرتبہ قاضی احمد میاں اختر جوناگڈھی	۵ ـ ۵۰	،،
جغرافیہ قرآن	مفتی انتظام اللہ	۱ — ۵۰	،،
تاریخ پنجاہ سالہ انجمن ترقی اردو	ہاشمی فریدآبادی	۳ — ۵۰	،،
داس کیپٹال (جلد اول)	مارکس ـ مترجم سید محمد تقی	۷ — ۵۰	،،
جنوبی یورپ پر عربوں کے حملے	امیر شکیب ارسلان ـ مترجم نجم الدین شکیب	۴ ـ ۵۰	،،

سلسلۂ اصطلاحات :-

کتاب	مصنف / مترجم	قیمت	
فرہنگ اصطلاحات بنکاری ـ		۴ ـ ۵۰	،،
،، ،، فلکیات ـ		۱ ـ ۵۰	،،
،، ،، کیمیا ـ		۲ — ۲۵	،،
،، ،، جغرافیہ ـ		۱ — ۰۰	،،
اردو زبان میں علمی اصطلاحات کا مسئلہ ـ	بابائے اردو	۰ — ۵۰	،،

سائنس :-

کتاب	مصنف / مترجم	قیمت	
اردو بہ حیثیت ذریعہ تعلیم سائنس	بابائے اردو	۱ — ۰۰	،،
اضافیت	ڈاکٹر رضی الدین صدیقی	۳ — ۰۰	،،
طبیعیات کی داستان	پروفیسر نصیر احمد عثمانی	۸ — ۷۵	،،
قوائے طبیعیہ	ڈاکٹر صادق حسین	۲ — ۲۵	،،
جدید معلومات سائنس	میجر آفتاب حسن	۷ — ۵۰	،،
جراثیمیات	محمد احمد حامی	۲ — ۰۰	،،
حیوانیات	پروفیسر محشر عابدی	۲ — ۲۵	،،
نباتی دباغت	سید امداد علی	۵ — ۵۰	،،
سیر افلاک	مرزا محمد رشید	۳ ۵۰	،،

انجمن ترقی اردو [illegible]

ابو سلمان شاہجہانپوری

نئے خزانے

دسمبر ۱۹۶۵ء کے اردو اخبارات و رسائل کا اشاریہ[1]

موضوعات

---

[1] اس اشاریے میں گزشتہ مہینوں کے ایسے اخبارات و رسائل بھی شامل کئے گئے ہیں جو پہلے دستیاب نہ ہو سکے۔

پیش نظر اشاریہ کی ترتیب میں دسمبر ۱۹۶۵ء اور دیگر مہینوں کے مندرجہ ذیل رسائل سے مدد لی گئی ہے

ماہنامہ	اردو ڈائجسٹ	لاہور	دسمبر ۱۹۶۵ء	سہ ماہی	صدف	کراچی	جلد ۴ شمارہ ۱
"	افکار	کراچی	شمارہ ۱۷۲	ماہنامہ	طلوع اسلام	لاہور	دسمبر ۱۹۶۵ء
"	الرحیم	حیدرآباد	دسمبر ۱۹۶۵ء	"	عارف	لاہور	"
"	الشجاع	کراچی	"	"	فاران	کراچی	"
سہ ماہی	العلم (جنگ نمبر)	"	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۶۵ء	"	فکر ونظر	"	"
—	اورینٹل کالج میگزین	لاہور	نومبر ۱۹۶۵ء	"	قومی زبان	"	"
ماہنامہ	بہائی میگزین	"	نومبر و دسمبر ۱۹۶۵ء	"	کتابی دنیا	"	"
"	بینات	کراچی	دسمبر ۱۹۶۵ء	"	مجلہ گورنمنٹ کالج	"	۱۹۶۴-۶۵ء
"	پیام عمل	لاہور	"	"	مسلمہ (جہاد نمبر)	لاہور	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۶۵ء
"	ترجمان القرآن	"	"	"	نئی قدریں	حیدرآباد	دسمبر ۱۹۶۵ء
"	تہذیب الاخلاق	"	"	ہفت روزہ	المنبر	لائل پور	دسمبر ۱۹۶۵ء
"	ثقافت	"	"	"	آئین	لاہور	"
"	جام نو	کراچی	"	"	چٹان	"	"
"	زاویے	حیدرآباد	"	"	خدام الدین	"	"
"	ساقی	کراچی	دسمبر ۱۹۶۵ء	"	شہاب	"	"
"	سیارہ	لاہور	"	"	قندیل	"	"
"	سیارہ ڈائجسٹ	"	"	"	لاہور	"	"
پندرہ روزہ	صحیفہ اہل حدیث	کراچی	"	.	.	.	.

اشاریہ بابت ماہ دسمبر ۱۹۶۵ء

اردو ادب

ام احمد	وینس	مجلہ گورنمنٹ کالج کراچی ص ۸۰ تا ۹۴ سنہ ۶۵-۱۹۶۴ء
فاروقی، ڈاکٹر محمد	وجودیت اور ادب	العلم کراچی ص ۹۴ تا ۹۸۔ اکتوبر تا دسمبر سنہ ۶۵ء
فاروقی، ڈاکٹر محمد	تاریخ اور ناول	نئی قدریں، حیدرآباد ص ۱۸ تا ۲۱ دسمبر سنہ ۶۵ء
لی مولوی	قصر عارفان	اورینٹل کالج میگزین لاہور۔ ۱۸۱ تا ۲۰۷، نومبر سنہ ۶۵ء
سین صاحب۔ صدر انجمن ترقی اردو	ادب اور موجودہ ہنگامی حالات[1]	قومی زبان ص ۳ تا ۴ دسمبر سنہ ۶۵ء
لم فرخی، ڈاکٹر	سیماب اکبرآبادی کے فنی نظریات	مجلہ گورنمنٹ کالج کراچی ص ۹ تا ۱۵ سنہ ۶۵-۶۴ء
یل پانی پتی، شیخ محمد	سرسید کی ادبی حیثیت	تہذیب الاخلاق۔ ص ۹ تا ۱۶۔ دسمبر سنہ ۱۹۶۵ء
،، جلیل علی خاں	رسالۂ کائنات	
رتبہ:۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی		اورینٹل کالج میگزین لاہور ص ۱ تا ۱۴۔ نومبر سنہ ۶۵ء
حسین، آغا	حالیہ جنگ اور اردو زبان	افکار۔ ص ۲۴ تا ۲۶ سنہ ۶۵ء
اعظمی	افکار تازہ	افکار۔ ص ۲۱ تا ۲۳ سنہ ۶۵ء
مسعودہ سلطانہ	حیات اور تخلیقات جبران	مجلہ گورنمنٹ کالج کراچی ص ۱۲ تا ۲۷ سنہ ۶۵-۶۴ء
شاہجہانپوری	اردو زبان کا ارتقا اور اس کا پس منظر	تہذیب الاخلاق ص ۲۹ تا ۴۳۔ دسمبر سنہ ۶۵ء
ن سروری	اردو ادب کے غیر ادبی مآخذ۔ تاریخ شاہجہانپور۔	قومی زبان ص ۴۸ تا ۵۴ دسمبر سنہ ۶۵ء
ت نیر	ایک خط ایک مضمون[2]	زاویے ص ۱۵ تا ۲۸ ،،
رشید ڈاکٹر	ایک عظیم اور تخلیقی نظم[3]	شہاب ص ۱۰ تا ۱۲ ۱۹ ،،
شید، ڈاکٹر عبدالسلام	پاک بھارت جنگ کا ادب پر اثر	سیارہ ص ۱۹ تا ۲۱ دسمبر سنہ ۶۵ء

---

[1] اسٹوڈنٹس ویلفیئر آرگنائزیشن کے زیر اہتمام مشاعرہ کا خطبہ صدارت

[2] عزیز احمد کے متعلق ایک تنقیدی مضمون۔

[3] عبدالعزیز خالد کی نظم "فارقلیط" کے بارے میں۔

سیدہ جعفر، ڈاکٹر	حسرت کی انفرادیت	الشجاع	ص ۴۵ تا ۴۸	دسمبر ۶۵ء
شمیم احمد	ضمیر کا مسئلہ	؍؍	ص ۱۷ تا ۲۰	؍؍
عبادت بریلوی، ڈاکٹر	گورکی کے چند تنقیدی خیالات	افکار	ص ۱۶ تا ۱۸	۶۵ء
عزام خاں، محمد	کیا غزل میں حسن و عشق ضروری ہے	مجلہ گورنمنٹ کالج کراچی	ص ۳۹ تا ۴۲	۶۵-۱۹۶۴ء
محمد عظیم	ڈاکٹر ژواگو اور نوبل پرائز	نئی قدریں	ص ۲۷ تا ۳۲	۶۵ء
نذر احمد، حافظ	ایک چوری جو رحمت بن گئی	اردو ڈائجسٹ	ص ۱۱۳ تا ۱۱۶	دسمبر ۶۵ء
نعیم صدیقی	دور جہاد کے ادبی اثرات	سیارہ	ص ۲۲، ۲۳	؍؍
وصی احمد بلگرامی	نادرات صغیر بلگرامی[1]	قومی زبان	ص ۵۵ تا ۶۲	؍؍
وقار عظیم، پروفیسر	ادیب، فلسفی اور جنگ	افکار	ص ۱۹، ۲۰	۶۵ء

تاریخ

ابوسلمان شاہجہانپوری	زردشت اور ان کا مذہب[2]	بہائی میگزین	ص ۱۵ تا ۱۷	نومبر، دسمبر ۶۵ء
امداد صابری	دہلی میں مسجدوں اور قبرستانوں کی بربادی	العلم	ص ۱۷ تا ۳۸	اکتوبر تا دسمبر ۶۵ء
انیس فاطمہ بریلوی، سیدہ	علی گڑھ کے شب و روز	؍؍	ص ۳۹ تا ۵۰	؍؍
آباد شاہجہانپوری	آئرلینڈ کا ہولناک قحط	اردو ڈائجسٹ	ص ۱۲۷ تا ۱۴۳	دسمبر ۶۵ء
حسن عطا، شاہ	کیا ابرہہ کے ساتھ ایک ہاتھی تھا؟	کتابی دنیا	ص ۶ تا ۷	؍؍
ساحر، حکیم شجاع احمد	جہاد — معرکہ تبوک کا ایک واقعہ	ساقی	ص ۳ تا ۵	؍؍
شکیب ارسلان، امیر / رئیس احمد جعفری	آثار فتوحات عرب	ثقافت	ص ۳۹ تا ۴۸	؍؍
ضیا	تاریخ اسلام میں سیاسی حاکمیت کے تصور کا ارتقاء	الرحیم	ص ۲۲۴ تا ۲۴۰	؍؍
عتیقی، حکیم عبدالمجید	گاندھی جی فساد کرایا —— مولانا محمد علی کا خط (سلسلۂ کچھ پھول کچھ کانٹے)	شہاب	ص ۸	۲۴ دسمبر ۶۵ء

---

[1] مولوی سید احمد مصنف ارمغان دہلی و کنز الفوائد اور سر سید احمد خاں کے نام خطوط اور کلام

[2] ماہنامہ الرحیم حیدرآباد سے منقول و مقتبس

قومی زبان کراچی

مصنف	عنوان	رسالہ و صفحات	تاریخ
فاتح قائد آبادی	آفاق میں بکھرے ہوئے بت خانے کے سامان۔ تاریخ کے اوراق۔	قندیل ص ۷	۱۲ اردسمبر ۶۵ء
قطب الدین، محمد	دریائے نیل (۱۰)	العلم	اکتوبر تا دسمبر ۶۵ء
مسلم ضیائی	۱۸۵۷ء کی خونی داستان (قسط اول)	〃 ص ۸۳ تا ۹۰	〃 〃
ناز، ایس ایم	اولیائے کرام کا شہر۔ ملتان	قندیل ص ۸ تا ۹ + ۱۱	۱۹ اردسمبر ۶۵ء
ناز، ایم ایس	زمزمہ[1]	〃 ص ۶	۱۲ ار 〃 〃
وحید قیصر ندوی، سید	ورندر عجائب خانہ	ساقی ص ۳۹، ۴۰	دسمبر ۶۵ء
ہارون رشید	گھڑی سازی میں مسلمانوں کا حصہ	سیارہ ڈائجسٹ ص ۸۱ تا ۸۸	〃

تعلیم اور تعلیمی ادارے

مصنف	عنوان	رسالہ و صفحات	تاریخ
محمود احمد عباسی	امروہہ کے اسلامی مدارس	العلم ص ۶۸ تا ۷۴	اکتوبر تا دسمبر ۶۵ء
مودودی، ابوالاعلیٰ	پاکستان کا مستقبل اور طلبہ[2]	ترجمان القرآن ص ۵۵ تا ۶۷	دسمبر ۶۵ء
———	جامعہ تعلیمات اسلامیہ کے شب و روز	المنبر ص ۵ + ۱۱	۱۰ اردسمبر ۶۵ء
———	دیسی تعلیم کی کہانی (۲)	تہذیب الاخلاق ص ۴۰ تا ۵۱	دسمبر ۶۵ء

تمدن و معاشرت اور سیر و سیاحت

مصنف	عنوان	رسالہ و صفحات	تاریخ
حیات ملک	مشرقی پاکستان کے قبائل	سیارہ ڈائجسٹ ص ۱۲۹	〃
خالد محمود پاشا مرتبہ:۔ الطاف حسن قریشی	ایک یادگار بحری سفر	اردو ڈائجسٹ ص ۴۹ تا ۵۲ + ۱۶۱	〃

سائنس

مصنف	عنوان	رسالہ و صفحات	تاریخ
نور بھٹی، محمد	دم دار ستارے	〃 ص ۷۱ تا ۷۸	〃
شاہد، عبدالرشید	طلسمی آنکھ (راڈار)	سیارہ ڈائجسٹ ص ۴۵ تا ۴۸	〃

---

[1] لاہور میں عجائب گھر کے سامنے رکھی ہوئی توپ کی تاریخی کہانی

[2] ایک تقریر جو اسلامی جمعیت طلبہ کے سالانہ جلسے میں ملتان میں کی گئی۔

سیاسیات

شین زبیری	پاکستان اور بھارت کا تصادم	العلم ص ۶۵ تا ۷۶	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۶۵ء
مولانا عبدالرحیم	انقلاب قیادت کا نعرہ یا انتشار کا اعلان	شہاب ص ۸	۱۹ر دسمبر ۶۵ء
صلاح الدین	آگ ہے، اولادِ ابراہیم ہے۔ نمرود ہے	طلوع اسلام ص ۵۳ تا ۵۵	دسمبر ۱۹۶۵ء
لی بریلوی، سید	بھارت کی لادینی حکومت	العلم ص ۹۱ تا ۹۳	اکتوبر تا دسمبر ۶۵ء
لی بریلوی، سید	ہندو قوم کی جارحیت تاریخ کی روشنی میں	〃 ص ۹۹ تا ۱۰۲	〃 〃
لی بریلوی، سید	ہندو مسلمانوں کا قومی مزاج ایک تقابلی مطالعہ	〃 ص ۱۰۳ تا ۱۰۴	〃 〃
سن قریشی	دامن کوہسار میں	اردو ڈائجسٹ ص ۱۵ تا ۲۷	دسمبر ۶۵ء
	سعودی عرب ۔ اہل کشمیر کی پکار پر لبیک کہنے والا۔	ص ۳۹ تا ۴۷	〃
نی	شہری دفاع کا مقصد اور اہمیت	مسلمہ ص ۵۸ تا ۶۰ + ۳۸	اکتوبر تا دسمبر ۶۵ء
ن فیلڈ مارشل صدر پاکستان محمد	ہموطنوں کے نام — ایک نشری تقریر	صدف ص ۶ تا ۸	۶۵ء
ن فیلڈ مارشل صدر پاکستان محمد	نعرہ حق - قومی اسمبلی سے خطاب	العلم ص الف تا ح	اکتوبر تا دسمبر ۶۵ء
غلام احمد	پاک چین دوستی	طلوع اسلام ص ۶۵ تا ۷۷	دسمبر ۶۵ء
غلام احمد	توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسم سامری	〃 〃 ص ۳۳ تا ۳۵	〃
ن انصاری، ماسٹر	بھارت کے رہنما اور احمقوں کی بستی	چٹان ص ۶	۶ر 〃
ن انصاری، ماسٹر	موازنہ (حالیہ جنگ اور اس کے نتائج)	〃 ص ۷ + ۱۸	۲۰ر 〃
ندوی، مولانا	ہمیں اس جنگ سے کیا حاصل ہوا	ثقافت ص ۶۱ تا ۶۵	دسمبر ۶۵ء
ز بھے رام	جدید جہاد عظیم اور ہمارے شعرا	نئی قدریں ص ۱۳ تا ۱۷	۱۹۶۵ء
محمد اسحاق	بھارت تباہی کے دہانے پر	لاہور ص ۶ تا ۷	۲۰ر دسمبر ۶۵ء
نجیب آبادی، مولوی	پاکستان کو بھارت کے بزدلانہ حملہ سے کیا فائدہ پہنچا	العلم ص ۱۳ تا ۱۶	اکتوبر تا دسمبر ۶۵ء
میاں	آزادی کی قیمت	شہاب ص ۹	۱۲ر دسمبر ۶۵ء
عالم	سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے	طلوع اسلام ص ۵۷ تا ۶۴	دسمبر ۶۵ء

فت روزہ المنبر لائل پور سے نقل کیا گیا۔

رفعت	وہ رات	زاویے	ص ۶ تا ۱۲	دسمبر ۶۵ء
رفیق خاور جسکانی	انسانیت کی لوحِ مزار —			
	اقوامِ متحدہ کے سکریٹری جنرل اوتھان کے نام ایک خط	نئی قدریں	ص ۲۲ تا ۲۶	۶۵ء
رئیس احمد جعفری	جنگ کی برکتیں	ثقافت	ص ۳ تا ۷	دسمبر ۱۹۶۵ء
سہمی، انوار الحق	جمہوریت اور ہندو	چٹان	ص —	۲۰ دسمبر ۶۵ء
شریفی، محمد حسام الدین	حبِ وطن اور اس کے تقاضے	فاران	ص ۴۳ تا ۴۶	دسمبر ۶۵ء
شورش کاشمیری	اسلامیہ کالج کے طلبہ سے خطاب	چٹان	ص ۴ + ۱۵	۶ دسمبر ۶۵ء
شورش کاشمیری	گوجرانوالہ میں جلسہ عام (تقریر)	"	ص ۴	" "
شورش کاشمیری	سیالکوٹ میں جلسہ عام (تقریر)	"	ص ۴	" "
شورش کاشمیری	ہمیں جو فتح حاصل ہوئی ہے وہ صرف اللہ کا فضل و کرم ہے[1]	"	ص ۴ + ۱۷	۱۳ دسمبر ۶۵ء
شورش کاشمیری	پاکستان سے ہندوستان کی مخاصمت[2]	"	ص ۴	"
صدیقی، میجر اے آر	بنگال کے شیروں کو آتی نہیں زد بابی	سیارہ ڈائجسٹ	ص ۴۱ تا ۴۴	دسمبر ۶۵ء
عبدالوحید، ڈاکٹر	سوویت اقتصادی امداد اور تیسرا پانچ سالہ منصوبہ	قندیل	ص ۱۳	۵ دسمبر ۶۵ء
عنایت اللہ	پاک فضائیہ	سیارہ ڈائجسٹ	ص ۱۲ تا ۳۲	دسمبر ۶۵ء
غازی، عبدالحمید	مسئلہ رہوڈیشیا	لاہور	ص ۱۰ تا ۱۳	۱۸ دسمبر ۶۵ء
غازی، عبدالحمید	بھارتی آسام اور ناگالینڈ	"	ص ۱۰ تا ۱۱	۲۷ دسمبر ۶۵ء
فضل حسین، سید	بادلوں میں جنگ	سیارہ ڈائجسٹ	ص ۶۱	دسمبر ۶۵ء
کلیم اختر	کشمیر — حفیظ کے "سینے کی آگ"	قندیل	ص ۶	۵ دسمبر ۶۵ء
کوثر نیازی	عالمِ اسلام کے اتحاد میں صدر ایوب اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔	شہاب	ص ۳ + ۱۴	۲۹ دسمبر ۶۵ء
کوثر نیازی	صدر ایوب کا دورۂ امریکہ اور حزبِ اختلاف کا کردار	شہاب	ص ۵	۲۶ " "
ماہر القادری	حمایتِ اسلامی اور فریضۂ جہاد	فاران	ص ۵۴ تا ۵۹	دسمبر ۶۵ء
ماہ منیر	جاگ رہا ہے پاکستان	جامِ نو	ص ۴۷، ۴۸ + ۳۲	"

---

[1] میاں چنوں میں جلسہ عام سے خطاب

[2] اسلامیہ کالج چنیوٹ کے طلبہ سے خطاب۔

محمد شفیع، مولانا مفتی	جہادِ پاکستان	چٹان ص ۷ تا ۸ + ۱۸ ، ۶ دسمبر ۶۵ء
محمد شفیع، مفتی	حالیہ جہادِ پاکستان ... [1]	شہاب ص ۱۰ تا ۱۲ ، ۱۲ دسمبر ۶۵ء
ممتاز لیاقت	حُر مجاہدین — راجستھان کے فاتح	چٹان ص ۱۰ تا ۱۱ ، ۱۳ دسمبر ۶۵ء
منور مادیوان	بھارت میں مسلمانوں پر کیا گزری	اردو ڈائجسٹ ص ۱۰۸ تا ۱۱۰ دسمبر ۶۵ء
مودودی، مولانا سید ابوالاعلیٰ	پریس کانفرنس (راولپنڈی میں)	آئین ص ۱۱ ، ۱۲ دسمبر ۶۵ء
مودودی، مولانا سید ابوالاعلیٰ	جلسہ عام (میر پور میں)	" ص ۱۳ " "
مودودی، مولانا سید ابوالاعلیٰ	نشری تقریر (آزاد کشمیر ریڈیو سے)	" ص ۱۰ " "
مودودی، مولانا سید ابوالاعلیٰ	جلسہ عام سے خطاب (مظفر آباد میں)	" ص ۶ تا ۷ + ۱۲ " "
نائیک، ذکاء اللہ	کشمیر ۱۹۶۵ء	قندیل ص ۵ ، ۵ دسمبر ۶۵ء
——	نشانِ حیدر	سیارہ ڈائجسٹ ص ۳۳ تا ۳۸ دسمبر ۶۵ء
——	شہری دفاع کی اہمیت	مسلمہ ص ۶۱ تا ۶۵ اکتوبر تا دسمبر ۶۵ء
——	پہلی امداد کیا ہے	" ص ۸۲ تا ۱۴۷ " "
——	لبنان ۔ دوستی کا حق ادا جس نے کیا (۸)	قندیل ص ۲ ، ۱۹ دسمبر ۶۵ء
——	سعودی عرب ۔ دوستی کا حق ادا جس نے کیا (۷)	" ص ۲ + ۱۵ ، ۱۲ دسمبر ۶۵ء
——	سیلون ۔ دوستی کا حق ادا جس نے کیا (۶)	" ص ۲ + ۱۵ ، ۵ دسمبر ۶۵ء

شخصیات

اقبال، علامہ

حسن جلیل	اقبال پر ایک نظر	مجلہ گورنمنٹ کالج کراچی ص ۱۸ تا ۲۰ سنہ ۶۵-۱۹۶۴ء
مسعود سلمان	پیامِ اقبال	عارف ص ۲۵ تا ۳۲ دسمبر ۶۵ء

جناح، قائد اعظم محمد علی

ربانی، خالد محمود	قائد اعظم کو سمجھئے	قندیل ص ۸ ، ۲۶ دسمبر ۶۵ء

[1] لاہور کی مجلس مذاکرہ میں حضرت مفتی صاحب کی تقریر

...نظامی — قائداعظم — قندیل ص ۹ + ۱۸ — ۲۶ دسمبر ۶۵ء

...نظامی — قائداعظم کی کہانی سیاست کی زبانی — سیارہ ڈائجسٹ ص ۹ تا ۱۵ — دسمبر ۶۵ء

...ن احمد — قائداعظم اور طالب علم — مجلہ گورنمنٹ کالج کراچی ص ۱۳۰ تا ۱۳۳ سنہ ۶۵-۱۹۶۴ء

غالب

...محمود بیگ — غالب اور تصوف — نئی قدریں ص ۳۳ تا ۴۰ — سنہ ۶۵ء

...ت علی دہلوی، سید — غالب — ساقی ص ۶۲ تا ۶۴ — دسمبر ۶۵ء

دیگر شخصیات

...نقوی، ڈاکٹر — اردو صحافت کا پہلا محقق[۴] — تہذیب الاخلاق ص ۱۷ تا ۲۸ — "

...احمد خاں — بہاء اللہ — بہائی میگزین ص ۵ تا ۹ — نومبر دسمبر ۶۵ء

...لی خاں، پروفیسر — حشمت نیر — زاویے ص ۱۳ تا ۱۴ — دسمبر ۶۵ء

...حمد جعفری — امام مالک کے حالات و سوانح — ثقافت ص ۹ تا ۴۰ — "

...احمد جعفری — رہ نمایان جہاد آزادی[۱] — لاہور ص ۶ + ۱۰ تا ۱۵ — ۱۳ دسمبر ۶۵ء

...احمد جعفری — علامہ شبیر احمد عثمانی رح — شہاب ص ۹ + ۱۴ — ۲۶ دسمبر ۶۵ء

...تبریز خاں — مولانا محمد علی جوہر کی یاد وفا — عارف ص ۴۱ تا ۴۴ — دسمبر ۶۵ء

...ں کاشمیر — حسین شہید سہروردی ـ بسلسلہ قلمی چہرے — چٹان ص ۵ + ۱۵ — ۶ دسمبر ۶۵ء

...ا کاشمیری — قلمی چہرے[۲] — چٹان ص ۵ + ۱۶ — ۱۳ دسمبر ۶۵ء

...ش کاشمیری — قلمی چہرے[۳] — " ص ۴ + ۱۸ — ۲۰ دسمبر ۶۵ء

...ں ـ سید مرتضیٰ حسین — سرسید کے ایک ہم عصر — تہذیب الاخلاق ص ۵۲ تا ۵۸ — دسمبر ۶۵ء

...حسن، سید — عبداللہ ابن سبا — فاران ص ۴۴ تا ۵۰ — "

مولانا حسرت موہانی، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور دیگر رہنماؤں کی زندگی کی بعض جھلکیاں ـ

سردار شوکت حیات خاں، چودھری محمد علی، چودھری محمد حسین چٹھہ، نوابزادہ نصراللہ خاں، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحبان کے قلمی چہرے

حکیم محمد حسن قرشی، حکیم نیر واسطی اور حکیم عبدالمجید عتیقی صاحبان کے قلمی چہرے ـ

مصنف	عنوان	رسالہ	تاریخ
کمال، ڈاکٹر رحیم الدین	پروفیسر جمیل الرحمان	قومی زبان ص ۲۵ تا ۳۰	دسمبر ۶۵ء
محمد ایوب قادری، پروفیسر	مولانا محمد قاسم نانوتوی	الرحیم ص ۴۰۵ تا ۴۱۶	″
ممتاز حسن	سید محمد مرتضیٰ ادیب	لاہور ص ۶ تا ۷ + ۱۰ تا ۱۳ + ۱۵ - ۱۶	
ناظر انصاری	حضرت جگر مرحوم	جام نو ص ۱۳ تا ۲۲	دسمبر ۶۵ء
نیر مسعود رضوی، ڈاکٹر سید	خواجہ نصیر الدین محقق طوسی	ثقافت ص ۸ تا ۲۹	″
واحدی، ملا	مرزا محمد سعید دہلوی	ساقی ص ۶ تا ۸	″
وحیدی الحسینی، مولانا	علامہ غلام علی آزاد بلگرامی	عارف ص ۱۳ تا ۱۸	″
وفا راشدی	مولانا وحشت اور ان کے معاصرین	قومی زبان ص ۴۱ تا ۴۷	″
——	مجاہدین وطن (غازی و شہید)	مسلمہ ص ۴ تا ۴۴	اکتوبر تا دسمبر ۶۵ء
——	حریم ملت کے پاسبان	طلوع اسلام ص ۲۰ تا ۳۷	دسمبر ۶۵ء

صحافت

مصنف	عنوان	رسالہ	تاریخ
خورشید، ڈاکٹر عبدالسلام	حسرت سندباد جہازی اور شیرازہ	ساقی ص ۱۳ تا ۱۶	دسمبر ۶۵ء
محمد تقی، سید	اردو اخبارات ـ تعلیمی خدمات کا سرسری جائزہ	قومی زبان ص ۱۷ تا ۲۴	″
والٹر ولیمز ـ مترجم ضیاء الدین احمد برنی ـ	صحافی کا مذہب	کتابی دنیا ص ۷ تا ۸	″

طب و نفسیات

مصنف	عنوان	رسالہ	تاریخ
محمد سعید دہلوی، حکیم	فطرت سے دوری اور امراض میں پیچیدگی	شہاب ص ۸	۱۲ دسمبر ۶۵ء
آنسہ ممتاز جہاں	انسانی سرشت میں قوت ارادی	مجلہ گورنمنٹ کالج کراچی ص ۱۶ تا ۱۷	۶۵ - ۶۶ء

کتابیات

مصنف	عنوان	رسالہ	تاریخ
سلمان، ابو شاہجہاں پوری	نئے خزانے (جون ۱۹۶۵ء کے اردو رسائل و اخبارات کا موضوع وار اشاریہ)	قومی زبان ص ۶۷ تا ۹۵	دسمبر ۶۵ء
افسر صدیقی امروہوی	گنج ہائے گرانمایہ (انجمن ترقی اردو کے مخطوطات کی وضاحتی فہرست)	قومی زبان ص ۳۱ تا ۴۴	

انیس خورشید	فن کتاب داری میں درس و تدریس کے مسائل	قومی زبان	ص ۱۷ تا ۲۰	دسمبر ۶۵ء
برنی، ضیاء الدین احمد	رسالوں پر طائرانہ نظر	کتابی دنیا	ص ۱۳ تا ۱۶	؍؍

مذہبیات

تفسیر قرآن

علی نقی النقوی، علامہ سید	تفسیر قرآن	پیام عمل	ص ۱۱ تا ۱۲ + ۱۹	؍؍
محمد شفیع، مفتی	معارف القرآن (سورہ ہود آیت ۵۰ تا ۶۰)	شہاب	ص ۷	۵ر دسمبر ۶۵ء
محمد شفیع، مفتی	معارف القرآن (سورہ ہود آیت نمبر ۶۹ تا ۷۳)	شہاب	ص ۶	۲۶ر دسمبر ۶۵ء
مودودی، ابوالاعلیٰ	محمد (۲)	ترجمان القرآن	ص ۱۷ تا ۳۰	دسمبر ۶۵ء
مودودی، ابوالاعلیٰ	درس قرآن حکیم	آئین	ص ۸ تا ۹	۱۲ر دسمبر ۶۵ء

سیرت النبی (صلی اللہ علیہ وسلم)

سلمان۔ شاہجہانپوری ابو	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت ایک مثالی عسکری رہنما کے	الرحیم	ص ۴۱۷ تا ۴۲۵	دسمبر ۶۵ء
مترجم:۔ مولوی محمد احمد	اخلاق النبی صلی اللہ علیہ وسلم	بینات	ص ۲۲ تا ۲۶	؍؍
فارانی، ابوطاہر	ہمارا آقا (صلی اللہ علیہ وسلم)	لاہور	ص ۵	۶ر دسمبر ۶۵ء
فارانی، ابوطاہر	ہمارا آقا (صلی اللہ علیہ وسلم)	؍؍	ص ۲ + ۹	۱۳ر دسمبر ۶۵ء
فارانی، ابوطاہر	ہمارا آقا (صلی اللہ علیہ وسلم)	؍؍	ص ۵	۲۰ر دسمبر ۶۵ء
فارانی، ابوطاہر	ہمارا آقا (صلی اللہ علیہ وسلم)	لاہور	ص ۵	۲۷ر دسمبر ۶۵ء

جہاد

سلمان۔ شاہجہانپوری ابو	الدفاع فی الاسلام	فکر و نظر	ص ۴۲۹ تا ۴۳۶	دسمبر ۶۵ء
عبدالرحمٰن لودھیانوی، ایم	اسلام اور جہاد	خدام الدین	ص ۸ + ۱۱	۳ر دسمبر ۶۵ء
عبدالشکور ترمذی، سید	اسلام میں جہاد کا مقصد اور اس کا مقام	خدام الدین	ص ۷ تا ۹ + ۱۲	۱۷ر دسمبر ۶۵ء
محمد شفیع، مفتی	جہاد کے فضائل و مسائل	بینات	ص ۳۵ تا ۴۶	دسمبر ۶۵ء

مسائل و مباحث

نذیر الحق میرٹھی ، مولانا	ہمارا اسلام مشعل راہ کیسے بن سکتا ہے	المنبر —	۱۰ دسمبر ۶۵ء

وفیات

بمنی ، ضیاء الدین احمد	یادرفتگاں[1]	کتابی دنیا ص ۱۱ تا ۱۲	دسمبر ۶۵ء
ماہر القادری	یادرفتگاں[2]	فاران ص ۱۵ تا ۵	"
وحید الحسن ہاشمی	ڈاکٹر سیف الدین طاہر مرحوم	تہذیب الاخلاق ص ۵ تا ۳	"
—	میاں محمد شریف	" ص ۸	"
—	سیدنا طاہر سیف الدین	قومی زبان ص ۵ تا ۷	"

مطبوعات جدیدہ (نئی کتابوں اور رسالوں پر تبصرے)

نام	مصنف	تبصرہ نگار	حوالہ
آپ بیتی	کیپٹن ظفر حسن ایبک	نور محمد انور	خدام الدین ص ۱۳+۱۴۔۱۷ دسمبر ۶۵ء
آسان علاج	اسد اللہ خاں	ض ۔ ا ۔ ب	کتابی دنیا ص ۶ دسمبر ۶۵ء
ادب کی آڑ میں	رشید احمد لاشاری	———	فاران ص ۶۱ تا ۶۲ "
ارشاد السالکین	مولانا عبد الباطن جونپوری	ض ۔ ا ۔ ب	کتابی دنیا ص ۳ "
افصح العرب والعجم	شاہ حسن عطا	ض ۔ ا ۔ ب	" ص ۲ تا ۳ "
اقبال کے آخری دو سال	عاشق حسین بٹالوی	———	العلم ص ۱۰۵ اکتوبر تا دسمبر ۶۵ء
الطبقات الکبریٰ کا اردو ترجمہ طبقات الاولیاء	عبد الوہاب الشعرانی مترجم : عبد الغنی وارثی	ض ۔ ا ۔ ب	کتابی دنیا ص ۱ دسمبر ۶۵ء
انتخاب جدید	آل احمد سرور و عزیز احمد	———	سیارہ ڈائجسٹ ص ۱۴۰ "
بڑھاپا اور اس کا سدباب	اقبال حسین	———	سیارہ ص ۸۷ "

[1] مرزا بشیر الدین محمود ، مولانا طاہر سیف الدین ، پرو فیسر احسان اللہ بدوی کی وفات پر ادارتی تاثرات ۔

[2] علامہ محمد بشیر الابراہیمی الجزائری رہنما ، مولانا بدر عالم میرٹھی ۔ منشی خلیل اللہ رحمہم اللہ ۔

پاک بھارت جنگ	کلیم نشتر	—	سیارہ ڈائجسٹ ص ۱۴۱ دسمبر ۶۵ء
پنگل کا جزیرہ (ناول)	ایس ایم جمیل واسطی	—	کتابی دنیا ص ۳ تا ۴ ″
تعارف مدنیت	محمد امین جاوید	—	سیارہ ڈائجسٹ ص ۱۴۱ ″
توزک بابری	رشید اختر ندوی	—	″ ص ۱۴۱ ″
حقیقت رمضان	پروفیسر فضل احمد عارف	نور محمد انور	خدام الدین ص ۱۳ ۱۷ دسمبر ۶۵ء
خطبات عبدالحق	عبادت بریلوی	—	سیارہ ڈائجسٹ ص ۱۳۹ دسمبر ۶۵ء
دو شہر ایک کہانی	چارلس ڈکنز مترجم سید قاسم محمود	ض۔ا۔ب	کتابی دنیا ص ۱ تا ۲ ″
رزمیہ نغمات	—	ض۔ا۔ب	″ ص ۴ ″
سب رس	ملا وجہی	—	سیارہ ڈائجسٹ ص ۱۴۱ ″
سودا	شیخ چاند مرحوم	—	″ ص ۱۴۰ ″
سیپ (۵)	ایڈیٹر نسیم درانی	—	″ ص ۸۴ ″
غزوات مقدس	محمد عنایت اللہ وارثی	نور محمد انور	خدام الدین ص ۱۴ ۱۷ دسمبر ۶۵ء
فرینڈز پبلیکیشنز ملتان (پانچ چھوٹے چھوٹے رسائل کا تعارف)		—	سیارہ لاہور ص ۸۶ دسمبر ۶۵ء
قافلہ سخت جاں	اسعد گیلانی	—	″ ص ۸۶ ″
گلبانگ جہاد	—	—	″ ص ۸۵ ″
گلبانگ جہاد، نغمات جہاد، قومی ترانے	—	عمر فاروق خاں	چٹان ص ۵ + ۱۶ ۲۰ دسمبر ۶۵ء
محمد حسین آزاد (جلد اول)	ڈاکٹر اسلم فرخی	—	سیارہ ڈائجسٹ ص ۱۴۰ دسمبر ۶۵ء
معاشرتی و علمی تاریخ	پروفیسر محمد حامی الدین	—	العلم ص ۱۱۸ تا ۱۲۰ اکتوبر تا دسمبر ۶۵ء
مقالات گارساں دتاسی	یوسف حسین خاں و عزیز احمد	—	سیارہ ڈائجسٹ ص ۱۳۹ دسمبر ۶۵ء
وضع اصطلاحات	وحید الدین سلیم	—	″ ص ۱۳۹ ″

اسٹوڈنٹس اسٹینڈرڈ انگریزی اردو ڈکشنری

کے

خاص ایڈیشن

کی چند

خصوصیات

اسٹوڈنٹس

اسٹینڈرڈ انگریزی اردو ڈکشنری

آپ

مفت

بھی حاصل کر سکتے ہیں

اس کا طریقہ بہت آسان ہے

آپ اس ڈکشنری کے لئے پانچ خریدار بنائیے

پانچ ڈکشنریوں کی قیمت مبلغ ایک سو پانچ روپے

انجمن

کو بذریعہ منی آرڈر بھیج دیجئے۔ آپ کو ایک نسخہ بلا قیمت

ارسال کر دیا جائیگا

انجمن ترقی اردو۔ اردو روڈ کراچی

خاندان کے مستقبل کی ضمانت
نیو جوبلی انشورنس پالیسی
ضعیفی کا سہارا
نیو جوبلی انشورنس پالیسی
انکم ٹیکس میں بچت کا ذریعہ
نیو جوبلی انشورنس پالیسی
آپکے بچوں کی تعلیم کی ضامن
نیو جوبلی انشورنس پالیسی